جہان درس وتدریس کی عبقری شخصیت عمدۃ المدرسین، سلطان الاساتذہ، شیخ القرآن

حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی

کی حیات وخدمات اور قلمی رشحات پر ایک وقیع دستاویز

بنام

مقالاتِ شیخُ القرآن

جمع وترتیب

کمال احمد علیمی، نظامی

دارالعلوم علیمیہ، جمداشاہی، بستی، یوپی

باہتمام

• الحاج وصی الدین نورانی • الحاج بشیرالدین نورانی

• الحاج شمس الدین برکاتی • الحاج شہنشاہ حسین برکاتی، جمداشاہی

ناشر

مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر جمداشاہی بستی

دارالبرکات للنشر والتوزیع لکھنؤ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

جہان درس وتدریس کی عبقری شخصیت ، عمدۃ المدرسین ، سلطان الاساتذہ ، شیخ القرآن ،
حضرت علامہ **عبداللہ** خان عزیزی کی حیات وخدمات اور قلمی رشحات پر ایک وقیع دستاویز

بنام

مقالات شیخ القرآن

مولف

کمال احمد علیمی نظامی

دارالعلوم علیمیہ ، جمدا شاہی ، بستی ، یوپی

باھتمام

الحاج وصی الدین نورانی ، الحاج بشیر الدین نورانی ، الحاج شمس الدین برکاتی ، الحاج
شہنشاہ حسین برکاتی ، جمدا شاہی

❁**نام کتاب** : مقالات شیخ القرآن

❁**مولف** : کمال احمد علیمی، نظامی، دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی

❁**معاون مرتب**: مولانا غلام سید علی علیمی نظامی، استاذ دار العلوم مدینۃ العربیہ، دوست پور، سلطان پور، یوپی

❁**حسب فرمائش**: قمر العلما، حضرت علامہ محمد قمر عالم قادری اشرفی صاحب شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی، یوپی

❁**باہتمام** : الحاج وصی الدین، الحاج بشیر الدین، الحاج شمس الدین، الحاج شہنشاہ حسین صاحبان

❁**ناشر** : **دار البرکات للنشر والتوزیع**، لکھنؤ

❁**سن اشاعت** : ۲۰۲۱ء

❁**صفحات** : ۵۵۷

❁**کمپوزنگ** : مولانا الحاج محمد امیر قادری استاذ، دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، مولانا عبد الجبار علیمی نیپالی، مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر، جمدا شاہی

انتساب

امام اعظم

ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی

❁

غوث اعظم

سید محی الدین عبد القادر جیلانی

❁

مجدد اعظم

امام احمد رضا خان قادری بریلوی

❁

مبلغ اسلام

حضرت علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی

❁

قائد اہل سنت

شاہ احمد نورانی علیھم الرحمہ

❁

استاذ الاساتذہ، ادیبِ شہیر

حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی مدظلہ العالی

خراج عقیدت

اُن دو مقدس ہستیوں کی بارگاہ میں....

جن کے صدقے مجھے جامۂ وجود ملا....

میری ہر سانس جن کی مرہون منت ہے....

میں جو بھی ہوں بس انھیں سے ہوں....

میرا جو بھی ہے سب انھیں کا ہے....

جن کی دعاے صبح گاہی اور نالہ نیم شبی سے میں، میں ہوں....

جن کی خوشی، رب کی خوشی....

جن کی ذات رب کی نعمت....

جن کی مسکراہٹ زندگی کا حاصل....

جن کا دستِ شفقت سائبانِ رحمت....

اور جن کی رضا سرمایۂ آخرت ہے....

....یعنی....

میرے والدین کریمین

جو اس دنیا میں میرے لئے سب سے زیادہ اہم اور اکرم ہیں۔ رب رحیم ان کا سایۂ شفقت مجھ پر دراز فرمائے، میری عمر ان کو لگ جائے۔

کمال احمد علیمی نظامی

فہرست مضامین

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱	کلمات خیر (حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی)	9
۲	تقریظ جلیل (حضرت علامہ محمد قمر عالم قادری اشرفی)	11
۳	کلمات تحسین (حضرت علامہ ڈاکٹر انوار احمد خان بغدادی)	12
۴	نقش اوّل (مولف)	14

باب اول: حیات و خدمات

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۵	اسم گرامی	19
٦	القاب	19
۷	سلسلۂ نسب	20
۸	خاندانی حالات	20
۹	ولادت	22
۱۰	ابتدائی تعلیم	23
۱۱	عربی فارسی تعلیم	24
۱۲	مدرسہ انوار العلوم تلشی پور	25
۱۳	تعلیم سے بے رغبتی	26
۱۴	حافظ ملت سے پہلی ملاقات	29
۱۵	اساتذہ کی خدمت	31
١٦	عہد طالب علمی کے کچھ اہم واقعات	34
۱۷	تعلیمی سلسلے کا انقطاع	36

۱۸	اچھے طلبہ کے ساتھ حسن سلوک	37
۱۹	عہد طالب علمی میں ایک رسمی مناظرہ	39
۲۰	خارجی مطالعہ کا شوق	42
۲۱	معین المدرسین کی حیثیت سے	44
۲۲	جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں	44
۲۳	بیعت وارادت	45
۲۴	اوصاف وعادات	47
۲۵	احساسِ ذمہ داری	47
۲۶	خوردنوازی	47
۲۷	طلبہ پر شفقت	47
۲۸	غیرت ونزاکتِ احساس	48
۲۹	کتابوں سے غیر معمولی محبت	49
۳۰	درس تفسیر سے خصوصی لگاؤ	50
۳۱	تصنیفی خدمات	51
۳۲	دو عظیم کتابیں	53
۳۳	معارف التنزیل	54
۳۴	مسائل سود	57
۳۵	تدریسی خدمات	60
۳۶	مشہور تلامذہ	62
۳۷	شیخ القرآن اور دارالعلوم علیمیہ	63
۳۸	دارالعلوم علیمیہ میں ورودِ مسعود	63

۳۹	وفات	66
۴۰	ربط رکھنے والے چند افراد	68
۴۱	ارباب علم و دانش کی نظر میں	73

باب دوم: قلمی رشحات

۴۲	قرآن حکیم کی حیرت انگیز تاثیر	80
۴۳	مقدمہ شرح بخاری: ایک علمی شاہ کار	89
۴۴	تشریح حدیث	93
۴۵	انوار نبوت	108
۴۶	امام احمد رضا اور تعزیہ داری	157
۴۷	روزے کے فضائل و مسائل	162
۴۸	مسئلہ کفاءت کی واضح تصویر	169
۴۹	خواطر کے احکام	181
۵۰	سپریم کورٹ کی مداخلت کے خطرناک نتائج	188
۵۱	کسبِ حلال کے فضائل	206
۵۲	جسمانی معراج کا ثبوت	209
۵۳	اخوت اسلامی کا احترام	220
۵۴	اے میرے بھائی	228
۵۵	عالمِ خواب کی تفصیل	230
۵۶	کیا بندوں کا حق خدائے تعالیٰ پر ہے؟	240
۵۷	شعارِ اسلام	244
۵۸	حضرت مخدوم اشرف علیہ الرحمہ کی سلطنت کبریٰ	260

۵۹	حضرت اشرفی میاں علماے اسلام کی نظر میں	269
۶۰	حضور مبلغ اسلام اور ان کے تبلیغی کارنامے	284
۶۱	مرشد کامل کی عظیم شخصیت	305
۶۲	آہ! حافظ ملت علیہ الرحمہ	312
۶۳	حضرت صدر العلما کا علمی مقام	318
۶۴	حضرت صوفی نظام الدین	348
۶۵	قائد اہل سنت اپنے کردار و عمل کے آئینے میں	357
۶۶	قائد اہل سنت ایک اسلامی مفکر	374
۶۷	حسان الہند مفتی رجب علی رحمۃ اللہ علیہ	393
۶۸	حافظ ملت کا ایک نامور تلمیذ رشید	396
۶۹	حافظ ملت کے ایک جاں نثار تلمیذ رشید	416
۷۰	آہ! مولانا فاروق احمد صاحب	420
۷۱	سفر نامہ حجاز	432
۷۲	ایک یادگار انٹرویو	504
۷۳	خطبہ استقبالیہ	533
۷۴	خطبہ صدارت	538
۷۵	تقدیم	543
۷۶	دعائیہ کلمات	552
۷۷	منقبت	554
۷۸	حالات مولف	555

کلمات خیر

ادیب شہیر، حضرت علامہ فروغ احمد، اعظمی، مصباحی
سابق صدر المدرسین، دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی

استاذ محترم، شیخ القرآن، علامہ عبداللہ خاں عزیزی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے ایک بہترین طالب علم اور ایک بہترین استاذ تھے، ان کا طالب علمی اور تدریسی دونوں دور ایک طالب علم اور ایک استاذ دونوں کے لیے آئیڈیل ہیں۔

میں نے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک چار سال انھیں خوب اچھی طرح دیکھا، انھیں خوب غور سے پڑھا اور ان سے بہت کچھ پڑھا اور سیکھا بھی، جو بعد میں میرے بہت کام آیا، گویا میری شخصیت سازی میں ان چار سالوں نے بڑا موثر اور مفید کردار ادا کیا۔

اشرفیہ سے فراغت کے بعد ۱۵؍جولائی ۱۹۸۳ء کو بہ حیثیت استاذ میں دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی آیا، شیخ القرآن علامہ عبداللہ خاں عزیزی بھی اتفاق سے ۱۹۸۶ء میں صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بلکہ شیخ الکل بن کر دار العلوم علیمیہ ہی آ گئے اور پھر ۲۰۱۱ء تک (رونا ہی کے چند سال چھوڑ کر) تقریباً ڈیڑھ دہائی تک ساتھ رہا۔

۱۹۸۳ء میں علیمیہ میں خامسہ تک تعلیم تھی، پھر ۱۹۸۶ء سے پہلے سادسہ تک تعلیم پہونچی، ۱۹۸۶ء میں شیخ القرآن کی آمد کے دو سال بعد دورۂ حدیث تک تعلیم ہو گئی۔

شیخ القرآن نے کئی سمتوں میں بڑے اخلاص اور محنت سے کام کیا اور کرایا، انتہائی باصلاحیت اور محنتی اسٹاف کی مدد اور ارکان کے خصوصی تعاون سے علیمیہ کی ترقیاتی خاکے میں ایسا رنگ بھرا کہ محض تین چار سال کے اندر علیمیہ ہندوستانی مدارس عربیہ کی دنیا میں اتنا سر بلند اور قد آور ہو گیا کہ اس کی ترقی کے منارے جہاں کہیں سے دیکھو نظر آنے لگے۔

علیمیہ میں حضرت سے بہت قریب رہ کر مزید میں نے بہت کچھ تربیت پائی ، تدریس کے میدان میں بھی اور تعلیمی نظم ونسق کے میدان میں بھی اوران کی تعلیم وتربیت کے فیضان سے انہی کے خطوط پر علیمیہ کا علمی وتعلیمی ترقیاتی کارواں آگے بڑھ رہاہے، تعلیمی اُمور میں آپ مجھ پر بہت اعتماد فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً ہر مفید مشورہ بڑی خندہ پیشانی سے قبول فرماکر عملی جامہ پہنانے کا حکم دیتے تھے،اور میں اسے اپنی سعادت سمجھ کرانجام دیتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ اللہ کے کرم سے اور بزرگوں خصوصاً مبلغ اسلام علامہ عبدالعلیم میرٹھی علیہ الرحمہ اور قائد اہل سنت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ کی خصوصی دعا اور روحانی پشت پناہی سے آج دارالعلوم علیمیہ میں جو کچھ بھی ہے ، وہ سب شیخ القرآن کی محنتوں اور خدمتوں کا نتیجہ ہے، دارالعلوم کی در و دیوار آج بھی اپنی زبان حال سے گویا ہیں کہ:

اے آمدنت باعث آبادیٔ ما

اللہ تعالی ان کی خدمات کو قبول فرماکر آخرت میں شیخ القرآن کو اور ہمیں سرخ رو فرمائے ۔**آمین ثم آمین!**

الحاج وصی الدین برادران بڑے خوش نصیب ہیں ،جنھوں نے زندگی میں بھی حضرت کی کما حقہ خدمت اور قدردانی کی اور بعد وصال مزار شریف تعمیر کرکے اور یہ کتاب شائع کرکے حضرت سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

اس کے مرتب اسم با مسمّٰی ،محب محترم ،حضرت مولانا کمال احمد علیمی ، استاذ دارالعلوم علیمیہ نے محنت کرکے بکھری معلومات کو یکجا کردیا ہے، یہ ایک بہت اہم اور ضروری کام تھا، جو ان کی تقدیر میں تھا، اور ہوا بھی، اللہ نے چاہا تو اسی بیس پر حضرت کی سوانح نویسی کا کام آگے بڑھتا رہے گا،مولی تعالی یہ سب بھی قبول کرے۔

تقریظ جلیل

قمر العلما، حضرت علامہ محمد قمر عالم قادری اشرفی صاحب قبلہ
شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی

حضور شیخ القرآن ایک عہد ساز مدرس، علوم عقلیہ ونقلیہ میں ید طولی رکھنے والے جید عالم دین، اور قوم وملت کا سچا درد رکھنے والے عظیم انسان تھے۔

شیخ القرآن کی ذرہ نوازی تھی کہ میری بڑی تعریف کرتے، مجھ پر حد درجہ اعتماد فرماتے، اور اکثر معاملات میں مجھ سے رائے مشورہ فرماتے، یہ ان کی خورد نوازی تھی، ورنہ ''من آنم کہ من دانم''۔

شیخ القرآن کی اکثر علمی مجلسوں میں میری شرکت رہتی تھی، آپ کی ہر مجلس علم وعرفان کی محفل ہوتی تھی، ہمیشہ مذہب ومسلک کی ترویج واشاعت کے لیے فکر مند رہتے تھے، علیمیہ کی تعمیری وتعلیمی ترقی کے لیے سوچتے رہتے تھے، اور اس حوالے سے ہمیشہ کچھ نیا کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

آج میں جو کچھ بھی ہوں اس میں میرے اساتذہ کا کردار تو ہے ہی حضور شیخ القرآن کی خاص نگاہِ عنایت بھی ہے۔

زیر نظر کتاب آپ کی بارگاہ میں بہترین خراج عقیدت ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مولف اور اشاعت کنندگان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

کلماتِ تحسین

حضرت علامہ، ڈاکٹر انوار احمد بغدادی صاحب

صدر المدرسین دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی

حضور شیخ القرآن میرے شفیق استاد، مہربان مربی، اور عظیم راہنما تھے، میرے اوپر حد درجہ شفقت فرماتے تھے، ایک باپ کی طرح پیار کرتے تھے، اور میری تعلیم وتربیت کے لیے ہر دم کوشاں رہتے تھے، حضرت ہی نے مجھے جامعہ صدام للعلوم الاسلامیہ بغداد بھیجا، اور آج جو کچھ بھی ہوں حضرت کی نگاہ عنایت سے ہوں۔

شیخ القران حافظ ملت شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی کے جلیل القدر تلامذہ میں سے تھے، اور حافظ ملت ہی کی طرح تعمیری وتعلیمی فکر کے حامل بھی تھے، آپ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان میں دینی مدارس کے طلبہ کو باہر پڑھنے کے لیے بھیجنے کا آغاز کیا، اس کے بعد آپ ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آج پورے ہندوستان سے طلبہ کو باہر بھیجنے کا رواج عام ہوا۔

آپ کی اس فکر کے پیچھے ایک خاص واقعہ کارفرما ہے، ہوا یوں کہ ایک بار حضور شیخ القرآن بڑھنی بازار، سدھارتھ نگر میں ایک دکان پر گئے، وہاں سے واپس ہوئے تو دوکان والے نے جو کہ غیر مقلد تھا کہا کہ یہ بریلویوں کے بہت بڑے عالم ہیں مگر عربی میں چند جملے نہیں بول سکتے ہیں، حضرت کو شدید دھچکا لگا، اور ٹھان لیا کہ میں تو عربی میں بات نہیں کرسکتا لیکن ایک ایسی ٹیم ضرور تیار کروں گا جو عربی تحریر وتقریر میں ممتاز و بے نظیر ہوگی۔

چنانچہ اسی فکر کے ساتھ پہلی بار ۱۹۹۴ء میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب بغدادی اور حضرت مولانا احمد رضا بغدادی صاحب کو جامعہ صدام للعلوم الاسلامیہ بغداد میں بھیجا، اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں اس فقیر اور حضرت مولانا ابوساریہ بغدادی کو بھیجا، آج الحمدللہ

شیخ القرآن کا خواب سچ ثابت ہوا، اور آپ کی تیار کردہ یہ ٹیم عالمی سطح پر عربی زبان وادب کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

دارالعلوم علیمیہ کی تعمیر وترقی میں آپ کا کردار نا قابل فراموش ہے، آپ نے بلا مبالغہ علیمیہ کو اپنا خونِ جگر پلایا ہے، آج چمن علیمیہ کے ہر گل وغنچہ میں آپ کے مبارک لہو کی سرخی محسوس کی جاسکتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب کے مولف وناشر دونوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے حق میں دعا گو ہوں۔

نقشِ اوّل

❁❁

جہانِ درس وتدریس کی عبقری شخصیت، شیخ القرآن، حضرت علامہ **عبداللہ خان** عزیزی کی ذات ستودہ صفات محتاج تعارف نہیں ہے، درس وتدریس کی دنیا میں آپ ایک منفرد اُسلوب اور طرز تدریس کے مالک تھے، ایک بہترین مصنف ومحقق ہونے کے ساتھ آپ کی شناخت ایک ایسے مدرس کے طور پر ہوئی جو اپنی تدریس سے ہزاروں تشنگان علم کو سیرابی عطا کرنے والا تھا، اور جس کی جولانئ تدریس دیکھ کر طلبہ درس گاہوں میں نعرہ لگانے پر مجبور ہوجاتے تھے، جس کی درس گاہ میں علم وحکمت کے ہیرے اور جواہرات لٹائے جاتے تھے، اور جس کی تدریسی صلاحیت کا اعتراف وقت کے اکابرین واساطینِ ملت برملا کیا کرتے تھے۔

آپ کی پوری زندگی تدریسی مشاغل میں گزری، عمر کے آخری حصے میں جب آپ بیماری سے پریشان رہتے تھے، اُس وقت بھی تدریس کا ایسا شوق تھا کہ طلبہ کو سامنے بٹھا کر اس ذوق وشوق اور ولولے کے ساتھ پڑھاتے تھے کہ جسے دیکھ کر نوجوان اساتذہ کو بھی رشک آتا تھا، اس ضعیف العمری میں بھی آپ کے پڑھانے کا انداز بالکل جوانوں جیسا ہوتا تھا، اور طلبہ کو علم ومعرفت کا ایسا جام پلاتے کہ طبیعت جھوم جھوم اٹھتی تھی، میری کم نصیبی تھی کہ میں باضابطہ حضرت کی درس گاہ سے فیض یاب نہیں ہوسکا، مگر آپ کی درس گاہ کے قریب ہی میری درس گاہ تھی، حضرت مائک پر پڑھاتے تھے، بسا اوقات میں اپنی گھنٹیاں چھوڑ کر حضرت کی درسی تقریر سنتا تھا، ایک خاص قسم کا لطف آتا تھا اور احساس ہوتا تھا کہ جب عالم پیری کا یہ حال ہے تو عالم شباب میں حضرت کس طرح پڑھاتے رہے ہوں گے۔

حضور شیخ القرآن ایک عہد ساز مدرس تھے، نہ جانے آپ کے کتنے تلامذہ ہیں جو آج جہانِ تدریس کے بے تاج بادشاہ ہیں، ان کے شجرۂ علمی کو اٹھا کر دیکھیے تو شیخ القرآن کا نام ضرور ملے گا۔

آپ ایک بہترین مصنف و محقق بھی تھے، آپ کے بہت سارے تحقیقی مقالات اور گراں مایہ کتابیں اس دعویٰ کی دلیل ہیں۔

آپ ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے، درس گاہ میں تدریس کا انداز خطیبانہ ہی ہوتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدرس نہیں بلکہ ایک مقرر تقریر کررہا ہے، لفظوں کی تکرار، خطیبانہ نشیب و فراز کی رعایت، ذوق وشوق اور ولولے کی آمیزش، ساحرانہ طرز بیان، اشعار کا برمحل استعمال، لطائف اور خوش کن واقعات کا بیان یہ حضرت کی درسی تقریر کے اوصاف تھے، جلسہ وجلوس اور میلاد کی محفلوں میں تقریر کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرتے تھے، لیکن جب کرتے تھے تو جلسہ گاہ کو بھی درس گاہ بنا دیتے تھے، وہی انداز، وہی جوش، وہی قادر الکلامی، وہی نکات ولطائف کا ذکر، اور وہی ذوق وشوق، بس آدمی جھومتا جاتا تھا، اور حضرت کے بیان سے محظوظ ہوتا جاتا تھا۔

حضور شیخ القرآن کی سب سے بڑی خوبی شخصیت سازی ہے، آپ نے تعلیم کے ساتھ تربیتِ افراد کا بھرپور خیال رکھا، دارالعلوم علیمیہ میں میں نے تو حضرت کے ابتدائی ایام نہیں دیکھے ہیں، لیکن جنھوں نے دیکھا ہے وہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت صرف درس گاہ ہی میں نہیں بلکہ درس کے علاوہ خارجی اوقات میں بھی طلبہ کی تعلیم وتربیت فرمایا کرتے تھے، ان کی نگرانی فرماتے، انھیں نماز کی تاکید فرماتے، ان کی عادات واطوار کا گہرائی سے مشاہدہ فرماتے، اچھی عادتوں پر حوصلہ افزائی اور بری عادتوں پر تنبیہ وتاکید فرماتے تھے۔

آپ ایک اچھے منتظم بھی تھے، اللہ رب العزت نے آپ کو اعلی انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا، تدریسی نظام ہو یا تربیتی نظام، ہر شعبے میں آپ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، اور ہر میدان میں اپنی قائدانہ لیاقت سے سب کو متاثر کیا۔

زیر نظر کتاب میں آپ کی حیات وخدمات کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اولاً یہ کتاب ۷۲ صفحات پر مشتمل آپ کے سالانہ فاتحہ کے موقع پر شائع کی گئی تھی، پھر الحاج وصی الدین صاحب اوران کے برادران کی خواہش پر لگ بھگ ۵۵۷ رصفحات پر

مشتمل اس کتاب کی دوبارہ اشاعت ہورہی ہے،اس میں آپ کی گراں قدرتحریریں بھی شامل کر لی گئی ہیں، یہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے ،حضور شیخ القرآن کی ہمہ جہت شخصیت اورآپ کے احوال و آثار کا احاطہ بہت مشکل ہے ،مگر کوشش کی گئی ہے کہ آپ کی حیات وخدمات پر کافی حدتک روشنی ڈال دی جائے ،اس کتاب کی تیاری میں آپ کےاس انٹرویو سے کافی استفادہ کیا گیا ہے، جسے حضرت مولانا غلام نبی علیمی صاحب (سابق معاون ایڈیٹر ماہنام ''پیام حرم'') نے حضرت کی زبان فیض ترجمان سے سن کرقلم بند کیا تھا، یوں ہی حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین قادری استاذ و مفتی دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی کے مضمون **''شیخ القرآن حیات وخدمات''** سے کافی استفادہ کیا گیا ہے، جو ماہنامہ پیام حرم کے جولائی ،اگست ۲۰۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

علاوہ ازیں زبانی روایتوں پر بھی اعتماد کیا گیا ہے اور بہت سارے واقعات وحالات چشم دید بھی ہیں۔

اس کتاب میں حضرت کے معتقد خاص، مخیر ملت، الحاج وصی الدین صاحب کے مشورے پر حضرت کے گراں قدر مقالات ومضامین بھی شامل کر لیے گئے ہیں، مقالات کی فراہمی میں حضرت مولانا معراج الحق بغدادی صاحب اورعزیز القدر حضرت مولانا ارشاد احمد علیمی مصباحی (استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور) نے کافی نوازش فرمائی ،ہم دونوں حضرات کے بے حد شکر گزار ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت وطباعت ممکن نہیں ہوتی اگر استاذ مکرم، قمر العلما، حضرت علامہ محمد قمر عالم قادری اشرفی **دام ظله العالی** کی عنایت وشفقت حاصل نہ ہوتی ،آپ ہی کی تحریک پر اس کتاب کی اشاعت ہوئی، آپ ہی کے کہنے پر الحاج وصی الدین اوران کے برادران الحاج بشیر الدین ،الحاج شمس الدین، الحاج شہنشاہ حسین وغیرہ نے اس کتاب کی اشاعت کرا کے حضور شیخ القرآن کی خدمت میں اپنی سچی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔

ساتھ ہی اپنے محترم استاذ و مربی ،ادیب شہیر، حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی سابق

صدر المدرسین دارالعلوم علیمیہ جمد اشاہی ،بستی کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر کام کی طرح اس کام میں بھی میری حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنی دعاؤں سے نوازا۔

محب محترم حضرت مولانا مفتی محمد طیب علیمی استاذ دارالعلوم علیمیہ جمد اشاہی بستی کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے کتاب پر نظر ثانی فرما کر اس کی وقعت میں اضافہ فرما دیا، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر عزیز القدر حضرت مولانا محمد امیر قادری علیمی استاذ دارالعلوم علیمیہ جمد اشاہی اور حضرت مولانا عبدالجبار علیمی نیپالی مبلغ اسلام ریسرچ سینٹر جمد اشاہی کا شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے کتاب کی کمپوزنگ کا فریضہ انجام دیا اور شب وروز لگ کر مختصر سی مدت میں کتاب کو قابلِ اشاعت بنایا۔

اس موقع پر میں اپنے محب مکرم، حضرت مولانا غلام سید علی علیمی علیگ استاذ دارالعلوم مدینۃ العربیہ دوست پور سلطان پور کو کیسے بھول سکتا ہوں جن کے تعاون کے بغیر میرا کوئی بھی علمی کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا ہے، اللہ تعالی آپ کو سلامت رکھے اور مزید خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔

دعا کی امید کے ساتھ کتاب قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔

کمال احمد علیمی نظامی

خادم دارالعلوم علیمیہ ،جمد اشاہی ،بستی ،یو پی ،انڈیا

بابِ اوّل

حیات وخدمات

”بنام جہاں دار، جاں آفریں“

اسم گرامی:

آپ کا نام نامی ”عبداللہ“ ہے، نسباً آپ خان برادری کے تھے، اسی لیے اپنے نام کے ساتھ ”خان“ لکھا کرتے تھے، آپ حافظ ملت علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید اور مرید صادق تھے، اور آپ سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے، اسی لیے اپنے اسم گرامی کے ساتھ ”عزیزی“ ضرور لگاتے تھے۔

القاب:

اہل علم ودانش نے آپ کی صلاحیت و لیاقت ،تبحر علمی اور اسلام و سنیت کے لیے بیش بہا خدمات کو دیکھتے ہوئے آپ کو شیخ القرآن، سلطان الاساتذہ ،عمدۃ المدرسین، اوراس طرح کے متعدد القاب سے یاد کیا۔

اُستاذ گرامی حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی سابق صدرالمدرسین دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی، یوپی کی تجویز پر اہل علم نے آپ کو ”شیخ القرآن“ کے لقب سے ملقب فرمایا تھا، یہ لقب آپ کے اصل نام سے بھی زیادہ معروف ومشہور ہوا، اوراس لفظ کے اطلاق کے وقت ذہن کا تبادر آپ ہی کی طرف ہوتا ہے۔

معروف محقق ومصنف، پروفیسر غلام یحییٰ انجم صاحب صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی کے ایک سالانہ جلسے کے موقع پر فرمایا تھا کہ حضرت شیخ القرآن ہندوستان میں دنیاے سنیت کے واحد ”شیخ القرآن“ ہیں، بلا شبہہ آپ کو یہ لقب اہل علم نے آپ کی خدمت قرآن کو دیکھ کر دیا ہے۔

چوں کہ حضور شیخ القرآن کو سب سے زیادہ شغف علم تفسیر ہی سے تھا، اسی لیے علم تفسیر میں آپ کی تدریس کافی معروف تھی، مدارک التنزیل، بیضاوی شریف اور جلالین جیسی

معیاری کتابیں آپ کے زیر تدریس رہتی تھیں، ان کتابوں کی تدریس سے آپ کو خصوصی دلچسپی تھی، اسی لیے آپ کو شیخ القرآن کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

سلسلۂ نسب:

آپ کے والد گرامی کا نام الحاج محمد ابراہیم خان مرحوم، دادا کا نام الحاج تعلق دار خان مرحوم اور پردادا کا نام جناب جان محمد خان ہے، گویا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبداللہ خان ولد الحاج محمد ابراہیم خان ولد الحاج تعلق دار خان ولد جناب جان محمد خان مرحوم۔

حضرت شیخ القرآن کا تعلق ایک معزز گھرانے سے تھا، آپ کا خاندان علاقے کا ایک معزز خاندان مانا جاتا تھا، اس دور میں صاحب حیثیت لوگوں کو ''مہتو'' کہا جاتا تھا، لوگ آپ کے خاندان کو مہتو کہتے تھے، آپ کے والد بھی مہتو کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔

خاندانی حالات:

حضور شیخ القرآن علیہ الرحمہ کی ولادت جس خاندان میں ہوئی وہ زراعت پیشہ خاندان تھا، آپ کی ولادت جن ایام میں ہوئی ان دنوں ''بلرامپور'' (جو آج ضلع کی حیثیت سے جانا جاتا ہے) ایک ریاست کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، اسی ریاست کے حکمراں کے ماتحت پورا علاقہ ہوا کرتا تھا، حکومت اپنی ریاست کی آراضیوں کو ٹھیکیداروں کے سپرد کر دیتی تھی، جنھیں عام طور پر ''زمین دار'' کہا جاتا تھا، یہ ٹھیکیدار غریب کسانوں سے کاشت کاری کرواتے تھے، یہ کسان ''اسامی'' کہلاتے تھے، عموما محنت یہ غریب کسان کرتے، اور ٹھیکیداروں تک پیداوار کا وافر حصہ پہونچا دیتے تھے، یہ ٹھیکیدار ضابطے کے مطابق پیداوار کو ریاست کے حوالے کر دیتے تھے۔

حضور شیخ القرآن کے آبا و اجداد پہلے ٹھیکیدار ہوا کرتے تھے، لیکن بعد میں آپ کے پردادا ٹھیکیداری سے بے دخل کر دیے گئے، پھر آپ کے دادا الحاج تعلق دار ایک غریب

کسان کی حیثیت سے گزر بسر کرنے لگے،آپ کے پاس زراعت کے لیے بہت وسیع رقبے کی زمین تھی، لیکن ریاست بلرامپور کے انتظام کاروں کی جبری وصولیوں ، اور بے جا پابندیوں کے سبب اس ریاست کے غریب کسان بہت بدحالی کا شکار تھے،مفلوک الحال ہونے کے باعث نہ تو خوش حال زندگی گزار پاتے تھے،نہ ہی بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام ہو پاتا تھا،یہی وجہ تھی کہ اکثر کسان ان پڑھ تھے۔

آپ کے خاندان سے جب سے ٹھیکیداری چھینی گئی تب سے پڑھنے لکھنے کا انتظام نہیں ہو پایا،اسی وجہ سے آپ کے والد ناخواندہ تھے،آپ کے دادا الحاج تعلق دار ایک غریب مگر خود دار اور صاحب حیثیت کسان تھے،اسی لیے ریاست بلرامپور کی طرف سے آپ کو گاؤں کا پردھان (مکھیا) مقرر کیا گیا،جس پر وہ تاحیات فائز رہے۔

آپ کے دادا علاقے کے ایک بااثر فرد کی حیثیت سے متعارف تھے،گاؤں ہی نہیں بلکہ علاقے میں آپ کی عزت کی جاتی تھی ،بختِ خفتہ نے یاوری کی اور ۱۹۵۱ء میں اہلیہ کے ساتھ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

حضور شیخ القرآن کے والد ماجد کی ابتدائی زندگی بڑی غربت وافلاس میں گزری، اسی وجہ سے آپ غریبوں کا بڑا خیال فرماتے تھے،بڑے خوش اخلاق ،ملنسار ،اور وسیع الظرف تھے،بڑے صاف ستھرے دل کے مالک تھے،کسی کی بھی طرف سے اذیت رسانی پر صبر وضبط کا مظاہرہ فرماتے ،لوگوں سے اچھے تعلقات رکھتے ،غریب وامیر، مسلم غیر مسلم سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ،اسی وجہ سے آپ کی بڑی عزت ہوتی تھی،علاقے کے لوگ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔

نوعمری ہی سے کاشت کاری شروع کردی تھی،شیخ القرآن کے دادا الحاج تعلق دار کچھ بے نیاز قسم کے آدمی تھے اور آپ کے والد گھر میں سب سے بڑے تھے،اسی لیے الحاج تعلق دار کی موجودگی ہی میں آپ کے والد صاحب نے گھر کی کفالت کا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ لیا تھا،جب سے شعور سنبھالا جد وجہد شروع کردی،شروع میں کاشت کاری کا پیشہ اختیار کیا،بعد

میں کچھ حالات صحیح ہوئے تو آپ نے غلہ کی تجارت کا کاروبار شروع کیا، جس میں اللہ رب العزت نے بڑی برکت دی، اور اس طرح سے دھیرے دھیرے آپ کے گھر کی معاشی واقتصادی حالت سدھرتی گئی، حضور شیخ القرآن اس حوالے سے فرماتے ہیں:

''بڑی محنت و کاوش سے انھوں نے گھریلو حالات سدھارنے اور اقتصادی ومعاشی خوش حالی پیدا کرنے میں قدرے کامیابی حاصل کی، اس طرح مجموعی طور پر حالات میں سدھار پیدا ہوا، آہستہ آہستہ ان کی کوششوں سے خاندان کے لوگ تنگ دستی وافلاس کی زندگی سے باہر نکلنے میں کچھ کامیاب ہوئے۔'' **(انٹرویو از شیخ القرآن، ماہنامہ پیام حرم، جولائی، اگست ۲۰۰۹ء)۔**

والد ماجد نے بھی دادا کی طرح حج وزیارت کا شرف حاصل کیا، اس حوالے سے شیخ القرآن فرماتے ہیں:

''میرے والد محترم میرے عہد طالب علمی میں ۱۹۵۳ء میں اس سعادتِ عظمٰی سے بہرہ ور ہوئے تھے، اپنے والدین کے حج کے دوسال بعد یہ کہہ کر اکیلے حج کرنے چلے گئے کہ تمہاری والدہ تمہارے ساتھ حج کرنے کے لیے جائیں گی، لیکن کم نصیبی سے وہ محروم رہ گئیں'' **(انٹرویو)**

شیخ القرآن کے والد ماجد بڑے متواضع اور منکسرالمزاج تھے، غربت کو بہت قریب سے دیکھنے کی وجہ سے آپ کے اندر تکبر وتفوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

شیخ القرآن کی ولادت:

شیخ القرآن کی ولادت کب ہوئی، اس تعلق سے کوئی حتمی تاریخ نہیں بتائی جاسکتی ہے، ہاں سرکاری کاغذات میں آپ کی تاریخ پیدائش ۱۵/نومبر ۱۹۳۵ء مذکور ہے، شیخ القرآن اس بارے میں فرماتے ہیں:

''میرے خاندان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی ،خود میرے والدمکرم الحاج محمد ابراہیم خان صاحب ناخواندہ تھے،اس لیے میرے خاندان میں تاریخ کے اندراج کا کوئی رجسٹر نہیں تھا، بایں سبب دن،سن،مہینہ کی قید کے ساتھ میں اپنی تاریخ پیدائش نہیں بیان کرسکتا، البتہ سرکاری تاریخ پیدائش ۱۵ر نومبر ۱۹۳۵ء لکھی ہوئی ہے ، لیکن میرے والدمکرم مرحوم بتاتے تھے کہ ہمارے گاؤں کے بجانب شمال ومغرب جو باندھ بنا ہوا ہے ،جس سال یہ باندھ بنایا گیا اسی سال تمہاری پیدائش ہوئی ہے،اگر ریاست بلرامپور کے کاغذات کی چھان بین کی جائے تو اس سے ہمارے سن اور تاریخ پیدائش کا تعین یقینی طور سے ہوجائے گا،لیکن یہ مشکل ترین کام ہے،اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تاریخ پیدائش کا اندراج جو سرکاری کاغذات میں ہے اسی پر اِکتفا کیا جائے ،اس کے آگے تحقیق نہ ہو''۔(انٹرویو)

ابتدائی تعلیم:

شیخ القرآن نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جس میں پڑھنے پڑھانے کا رواج نہ کے برابر تھا، والد محترم ان پڑھ تھے،لیکن تعلیم وتعلم کی اہمیت وافادیت سے آشنا تھے،اسی وجہ سے شیخ القرآن کو اپنے ساتھ کھیتی باڑی کے کام میں لگانے کے بجائے تعلیم حاصل کرنے کے کام میں لگادیا،بچپن ہی سے آپ کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام ہوا،ابتدائی تعلیم ناظرہ اور اردو دینیات کی کتابیں گھر پر ہی رہ کر پڑھیں ، ایک ضعیف مولوی صاحب جن کا نام میاں عبدالرحیم تھا،ابتدا میں انھیں سے قرآن کریم کا ناظرہ اوراردو کی معمولی کتابیں پڑھیں، یہ مولوی صاحب شیخ القرآن کے گاؤں کے قریب ایک گاؤں ''بجوا'' کے رہنے والے تھے، مولوی صاحب کے لڑکے محمد ابراہیم صدیقی کافی پڑھے لکھے آدمی تھے، شیخ القرآن نے ان سے بھی کچھ تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد ایک میاں صاحب جن کا نام محمد اسماعیل تھا، جو موضع ''بڑھری'' کے رہنے والے تھے، شیخ القرآن کے دادا مرحوم نے ان کو گھر پر رکھ کر پڑھائی کا انتظام کرا دیا، یہ میاں صاحب بظاہر نیک سیرت اور پابند صوم وصلوٰۃ تھے، شیخ القرآن نے ان سے بہت ساری اردو اور دینی کتابیں پڑھیں، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ میاں صاحب کٹر دیوبندی تھے، اسی لیے بات بات پر شرک وبدعت کا فتویٰ لگاتے تھے، ایک دن دادا مرحوم نے میاں صاحب کی ان حرکتوں سے تنگ آ کر ان کو گھر سے باہر نکال دیا، اور اس طرح شیخ القرآن کا تعلیمی سلسلہ رک گیا۔

گاؤں میں تعلیم کا معقول انتظام نہ پا کر شیخ القرآن نے اپنے گاؤں سے دکھن طرف واقع ایک مشہور بازار وقصبہ ''پچپڑوا'' کے ایک پرائمری اسکول میں داخلہ لیا، درجۂ سوم تک اسی پرائمری اسکول میں آپ کی تعلیم ہوئی۔

عربی فارسی تعلیم:

شیخ القرآن اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحب (سابق صدر المدرسین دارالعلوم فضل رحمانیہ پچپڑوا بلرام پور) کے ساتھ پچپڑوا میں پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اسی دوران آپ کی زندگی کے ساتھ ایک انقلاب آفریں واقعہ پیش آیا، جس نے آپ کی زندگی کا رخ موڑ دیا، ہوا یہ کہ ۱۹۴۶ء میں آپ کے گاؤں کے جو ٹھیکیدار تھے، جو بشنپور ٹنٹنوا کے رہنے والے تھے، ان کا انتقال ہو گیا، ان کی اہلیہ محترمہ نے ان کے ایصال ثواب کے لیے میلاد شریف کی ایک محفل کا انعقاد کیا، جس میں انھوں نے ضلع بستی و گونڈہ کے اس وقت کے سب سے بڑے عالم دین، حضرت علامہ مولانا الحاج عتیق الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کو بحیثیت مقرر مدعو کیا، اس پروگرام میں آپ کے دادا اور آپ کے بڑے والد حاجی کرم حسین صاحب عرف چھیدی خان مرحوم بھی شریک ہوئے اور شیخ القرآن اور ان کے چچا زاد بھائی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کو بھی ساتھ لے گئے۔

اسی زمانے میں حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے مدرسہ انوار العلوم تلشی پور میں ابتدائی عربی فارسی مدرسے کا آغاز کیا تھا، چوں کہ مدرسہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا، طلبہ کی تعداد بہت کم تھی ،اسی لیے حضرت نے لوگوں کو مدرسے کی طرف راغب کرنے کے لیے علم دین کی فضیلت پر بڑی موثر اور جامع تقریر فرمائی ، اسی تقریر میں آپ نے فرمایا کہ اگر گھر خاندان میں کوئی ایک عالم دین ہوجاتا ہے، تو قیامت کے دن اپنے گھر کے بہت سارے افراد کی مغفرت کرائے گا ، یہ تقریر بڑی موثر تھی ،جس کا اثر یہ ہوا کہ شیخ القرآن کے دادا اور عم محترم نے آپ اور آپ کے چچیرے بھائی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبان کو حضرت مولانا عتیق الرحمٰن کی خدمت میں پیش کر کے عرض گزار ہوئے کہ ان دونوں بچوں کو اپنی خدمت میں قبول فرمائیں، حضرت نے منظوری دے دی۔

دوتین دن کے بعد عم محترم دونوں حضرات کو ساتھ لے کر تلشی پور پہنچے، ان دونوں حضرات کا داخلہ ہوگیا، اور یہیں سے گیارہ سال کی عمر میں آپ کی عربی فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔

مدرسہ انوار العلوم تلشی پور:

حضرت شیخ القرآن نے جس مدرسے میں پہلی بار دینی علوم کی تحصیل کا آغاز کیا، آج وہ کس حالت میں ہے اس سے کوئی مطلب نہیں تاہم جس وقت شیخ القرآن نے تعلیم شروع کی تھی یہ مدرسہ بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا ،اس وقت یہ مدرسہ حضرت علامہ عتیق الرحمٰن صاحب کی نگرانی اور تدریسی خدمات کے تحت چل رہا تھا ، مدرسے کے وسائل بہت محدود تھے، اسی لیے علامہ موصوف تن تنہا عربی فارسی کے تمام طلبہ کو پڑھاتے تھے ،فارسی زبان وقواعد پر اچھی دسترس حاصل تھی ،قواعد کا اجرا بھی کراتے تھے، اسی لیے اس مدرسے میں فارسی زبان کی تعلیم بہت مضبوط ہوتی تھی۔

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب مدرسے کے انتظامی معاملات بھی دیکھتے تھے، ردومناظرہ اور تقریر وخطابت کا کام بھی کرتے تھے، دن بدن مصروفیت بڑھتی گئی ،اور ایک

دن آیا کہ علامہ موصوف نے مدرسہ کے تدریسی معاملات سے خود کو الگ کرلیا، اور انتظامی اُمور دیکھنے کے ساتھ مذہب ومسلک کی ترویج واشاعت میں لگے رہے۔

آپ کی جگہ پُر کرنے کے لیے مفتیٔ آگرہ حضرت علامہ عبدالحفیظ علیہ الرحمہ کے برادر مکرم حضرت علامہ محمد علی صاحب کا تقرر ہوا، طلبہ کی تعداد آئے دن بڑھتی گئی، حضرت علامہ عتیق الرحمٰن صاحب نے طلبہ کی اتنی کثرت دیکھی تو حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سے ایک اور مدرس بھیجنے کی درخواست کی، حضور حافظ ملت نے اپنے خصوصی شاگرد حضرت علامہ محمد شفیع اعظمی علیہ الرحمہ کو بحیثیت استاذ مدرسہ انوار العلوم میں مقرر فرمایا۔

پھر انوار العلوم کی خوش قسمتی کہیے کہ حضور حافظ ملت نے اس ادارہ میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے کے لیے اپنے تلمیذ رشید بحر العلوم، حضرت علامہ، مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کو استاذ بنا کر بھیج دیا، حضرت بحر العلوم کی آمد مدرسہ کے لیے بہت بابرکت ثابت ہوئی، آپ کی علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیت کے ساتھ خوش اخلاقی اور طلبہ پر شفقت ومروت نے مدرسہ پر ایسا گہرا اثر ڈالا کہ مدرسہ میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا۔

تعلیم سے بے رغبتی اور ترک تعلیم:

شروع میں حضرت بحر العلوم کی آمد سے قبل حضور شیخ القرآن کے اندر حصول تعلیم کی وہ رغبت نہیں تھی جو بحر العلوم کی آمد کے بعد پیدا ہوئی، اس تعلق سے حضرت شیخ القرآن کا یہ دلچسپ واقعہ دیکھیے:

> ''میری ابتدائی تعلیم میرے اپنے خیال میں اوقات گزاری کے علاوہ کچھ نہیں تھی، عربی گرامر وقواعد پر مجھ کو عبور تو کجا معمولی مسائل وقواعد بھی ازبر نہیں تھے، ترکیب نحوی وتحلیل صرفی میں بالکل ناکام تھا، حتی کہ ترکیب نحوی کی مشہور کتاب ''شرح مائۃ عامل'' کو طوطے کی طرح ضرور رٹ لیا تھا، لیکن سمجھ کر ایسا نہیں پڑھا تھا کہ دوسری کتابوں میں مشق

جاری کر پاتا، اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ ترک تعلیم کا میں نے مکمل
ارادہ بھی کرلیا، چنانچہ تلشی پور سے گھر آکر تقریبا دو مہینے تک اپنے
والدین کریمین کی سرزنش وتہدید کے باوجود بے کار رہا۔'' (انٹرویو)

ادھر مدرسہ انوارالعلوم میں تعلیم وتعلم میں کافی حد تک بہتری آنے لگی تھی، مدرسہ دھیرے دھیرے تعلیمی وتعمیری میدان میں آگے بڑھ رہا تھا، حضرت علامہ عتیق الرحمٰن صاحب نے جب تعمیری کاموں سے کچھ فرصت پائی تو مدرسہ کی تعلیم میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لیے حضور حافظ ملت سے رابطہ کیا، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا حضور حافظ ملت نے حضرت بحرالعلوم کو اس مدرسے میں استاذ کی حیثیت سے مقرر فرمایا، حضرت بحرالعلوم کے آنے کے بعد مدرسہ کے تعلیمی معاملات اور شیخ القرآن کی تعلیمی زندگی میں کس طرح کی خوش گوار تبدیلی پیدا ہوئی، اس بارے میں حضرت شیخ القرآن فرماتے ہیں:

''آپ (حافظ ملت) نے مولانا مرحوم (علامہ عتیق الرحمٰن علیہ الرحمہ) کی درخواست پر ایک دوسرے استاذ، جید عالم دین، فاضل نحریر، عالم نبیل، حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب **مدظله العالی** کو اس ادارے کی خدمت کے لیے مامور ومتعین فرمایا، اپنے ہم سبق طلبہ سے ان کی تعریف وتوصیف سنی، یہ ان کے طریقۂ تفہیم، طرز تعلیم، حسن اخلاق، ان کے وعظ وتقریر کی تعریف میں رطب اللسان تھے، میرے دل میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا کہ جا کر انوارالعلوم میں تعلیم شروع کردوں، اور اپنی طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ انوار العلوم میں حاضر ہوا، داخلے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی، مولانا موصوف کے یہاں نحو کی مشہور کتاب ''ہدایۃ النحو'' پڑھی، زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میرے شعور واحساس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوا، واقعۃً استاذ گرامی مفتی عبدالمنان اعظمی صاحب کا طریقۂ تدریس بڑا نرالا تھا، اور

ان کی شفقت وعنایت طلبہ پر بے پایاں تھی، اس لیے ذوق علم بہت بیدار ہوا، اوراس کے علاوہ کتاب کے مصنف کا روحانی فیض کا اثر رہا کہ مسلسل میں اس کتاب کے پڑھنے اور قواعد نحویہ کے از بر کرنے میں مصروف رہتا تھا، اسی ایک کتاب کے ساتھ دلچسپی سے دوسرے علوم و فنون میں بھی رغبت کا اضافہ ہوا۔'' **(انٹرویو)**

حضرت بحرالعلوم سے شیخ القرآن نے کافی حد تک اکتساب فیض کیا، اور بہت ساری کتابیں آپ سے پڑھیں، سچائی یہ ہے کہ حضرت بحرالعلوم کی نگاہ فیض نے حضرت شیخ القرآن کو جہانِ درس وتدریس کا بے تاج بادشاہ بنا دیا، ہرفن میں آپ نے حضرت بحرالعلوم سے استفادہ کیا، چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:

''گوکہ مفتی عبدالمنان صاحب کے یہاں دو ہی کتابیں تھیں، لیکن منطق ابتدائی، علم صرف وادب کی کتابوں میں جہاں کہیں دشواری پیش آتی، یا جو کتاب سمجھ میں نہیں آتی تھی، بلا تامل میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا، ایک ہی سال کی مدت میں نحو وصرف کے مسائل، منطق ابتدائی کے قواعد، فارسی کی مشہور کتاب ''یوسف و زلیخا'' وغیرہ میں کامل دست گاہ تو حاصل نہ ہوئی، لیکن ان کتابوں کے پڑھنے لکھنے کا ایسا شوق بیدار ہوا کہ میں اپنے تمام اوقات کو فضول چیزوں میں ضائع نہیں کرتا تھا، بلکہ کچھ نہ کچھ یاد کرتا تھا، یا اپنے ساتھیوں سے بحث وتکرار میں لگا رہتا تھا، اس طرح خدائے پاک کا میرے اوپر احسان یہ ہوا کہ میری بد ذوقی کا ازالہ ہوگیا، نئے جوش وولولے کے ساتھ علم کے حصول میں پیش رفت جاری رہی، اب جن کتابوں کا سبق پڑھتا تھا، ان کی تکرار جب تک اپنے ساتھیوں سے نہیں کرلیتا تھا مجھ کو قرار وسکون حاصل نہیں ہوتا تھا، میری محنت

وجانفشانی کو دیکھ کر اس ادارے کے تمام اساتذہ میرے اوپر شفیق
ومہربان ثابت ہوئے اور میری ہدایت ورہبری میں کوئی کسر نہیں اٹھا
رکھی۔

حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب کی تشریف آوری
باعث رحمت ثابت ہوئی ، اور میں دھیرے دھیرے کامیابی کی منزل
طے کرنے لگا، اپنے اساتذہ کی تعظیم وتکریم میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کرتا
تھا، غالباً اسی وجہ سے سب کی نگاہ میں سعادت منداور اچھا طالب علم
ثابت ہوا۔'' (انٹرویو)

زمانۂ طالب علمی میں حافظ ملت سے پہلی ملاقات:

حضور شیخ القرآن کی شخصیت کونکھارنے میں جن اساطینِ ملت کا خاص کردار رہا ہے
ان میں جلالۃ العلم، حافظ ملت، علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی **علیہ الرحمہ** کا نام نامی
قابل ذکر ہے۔

حافظ ملت نے اپنی زندگی میں دو عظیم کارنامے انجام دیے، ایک تو جامعہ اشرفیہ
مبارک پور کی تاسیس دوسرے قابل فخر علما کی شخصیت سازی، یہ دونوں کارنامے حافظ ملت کی
سب سے بڑی کرامت ہیں، حضور صدرالشریعہ کے واسطے سے امام اہل سنت، سیدی سرکار
اعلیٰ حضرت، امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا جو علمی فیضان جاری ہوا، حافظ ملت نے اس کو خوب عام
کیا، اور جامعہ اشرفیہ کی شکل میں علمی فیوض وبرکات کا عظیم سرچشمہ قوم کے حوالے کیا۔

حضور شیخ القرآن علیہ الرحمہ نے آپ کا نام بہت پہلے سے سن رکھا تھا، ملاقات کا
شرف ایک خاص موقع پر حاصل ہوا، اس خاص واقعہ کا ذکر حضور شیخ القرآن کی زبان سے
سنئے:

''زمانۂ طالب علمی کی کامیابی کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے،

لیکن ایک ایسی کامیابی جس پر اس ذرۂ ناچیز کو اس صدی کے عظیم ترین بزرگ حضور حافظ ملت **نَوَّرَاللّٰهُ مَرْقَدَهٗ** نے خوب خوب سراہا تھا بلکہ بڑی حوصلہ افزائی فرمائی تھی، وہ یہ کہ علامہ جمال الدین ابن حاجب کی کتاب ''کافیہ'' (جو علم نحو میں ایک چیستان کی حیثیت رکھتی ہے) میں پڑھ رہا تھا، اور حضور حافظ ملت **علیہ الرحمہ والرضوان** امتحان کے لیے مدعو کیے گئے تھے، کافیہ کا امتحان حضرت ہی کے پاس رکھا گیا، میرے تمام شرکا میں میرا نام سرفہرست تھا، حضور حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** کے حکم پر عبارت خوانی کے بعد ترجمہ کیا، مرفوعات کی بحث میں پہلے مرفوع یعنی فاعل کی تعریف کے بعد مطلب بیان کیا، حضرت نے فرمایا کہ آپ کہہ رہے ہو کہ فاعل اُسے کہتے ہیں جس کی طرف فعل کی نسبت بطور قیام ہو، اور جس پر فعل کو مقدم کیا گیا ہو، یعنی فاعل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سے پہلے فعل ہو، اگر فعل بعد میں آجائے تو کیا خرابی پیدا ہوگی؟ ''**زیدٌ ضَرَبٌ**'' اور ''**ضرب زیدٌ**'' میں کیا فرق ہے؟ فقیر نے بلا جھجک فوراً عرض کیا کہ اگر اسم کے اوپر فعل کو مقدم نہ کیا جائے بلکہ اس سے مؤخر کر دیا جائے تو ایسی صورت میں فاعل اور مبتدا میں اِشتباہ پیدا ہو جائے گا، یہ متعین کرنا دشوار ہوگا کہ یہ فاعل ہے یا مبتدا، اس لیے فاعل اور مبتدا میں اشتباہ ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فاعل کی تعریف میں یہ قید لگائی جائے کہ فعل اسم پر مقدم ہو۔

اس برجستہ جواب سے حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** بہت خوش ہوئے، اور بہت بہت شاباشی دی اور اپنے تلمیذ رشید حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب کو ہدایت فرمائی کہ اس طالب علم کو خاص توجہ کے ساتھ پڑھایا جائے، جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں یہ کہہ سکتا

ہوں کہ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ یہ طالب علم **ان شاءاللہ العزیز** مستقبل میں علما کی صف میں ایک ممتاز مقام حاصل کرے گا۔

اس لیے میں اپنے علم وایقان کی روشنی میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ آج جو کچھ مجھ کو جانا پہچانا جاتا ہے یا میری قدر و منزلت کی جاتی ہے، یا علمی دنیا میں میری کچھ حیثیت متعین کی جاتی ہے، یہ سب کچھ میرے اساتذۂ کرام کی محنت وکاوش اوران کی شفقتوں کی وجہ سے تو ہے ہی لیکن اس میں ایک بزرگ ہستی کی پیشین گوئی کے بھی اثرات ہیں اوراس کی دعاؤں کا کرشمہ ہے''۔(انٹرویو)

اساتذہ کی خدمت واحترام:

استاذ انسان کا سب سے عظیم مربی ومحسن ہوتا ہے، اسی لیے اس کا مرتبہ ماں باپ سے کہیں زیادہ اونچا ہوتا ہے، ماں باپ عموماً جسم کی پرورش اور تربیت کرتے ہیں، لیکن استاذ روح وقلب کا مربی ہوتا ہے، استاذ ایک معمولی سے پتھر کو تراش کر قیمتی ہیرہ بناتا ہے، اور اپنا خون جگر پلا کر انسان کو کسی لائق بناتا ہے۔

استاذی وشاگردی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے فیض رسانی اتنی زیادہ ہوتی ہے، اسی لیے پہلے کے طلبہ کی تعلیمی زندگی دیکھئے تو ان کے اندر اساتذہ کا وہ ادب واحترام دیکھنے کو ملتا ہے جو آج کے دور کے طلبہ کے اندر بہت کم ہی پایا جاتا ہے، عصر حاضر میں طلبہ کے ذہن میں یہ مسموم خیال بیٹھ چکا ہے کہ اساتذہ تنخواہ لے کر پڑھاتے ہیں، ہم پر کوئی احسان تھوڑی کرتے ہیں، ظاہر ہے یہ ایک خطرناک فکر ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن طلبہ اور اساتذہ کے درمیان دوری بڑھتی جارہی ہے، اور فیض رسانی کا سلسلہ کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔

ہر کامیاب انسان کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی کامیابی کے پیچھے جہاں بہت سارے اسباب کارفرما ہوتے ہیں وہیں اساتذہ کا کردار بھی ناقابل فراموش ہوتا

ہے،زندگی کے ہر شعبے میں ایک رہنما اور استاذ کی ضرورت آج بھی مسلم ہے۔

شیخ القرآن علیہ الرحمہ کی کامیاب علمی وتدریسی زندگی بھی ان کے اساتذۂ کرام کی عنایتوں کا ثمرہ تھی، والدین واقارب کی دعاؤں کے ساتھ اساتذہ کی شفقتوں نے انھیں درس وتدریس کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا دیا تھا، اور معمولی سے گاؤں کے معمولی سے فرد کو ''شیخ القرآن'' کے معزز لقب سے مشہور کر دیا تھا۔

شیخ القرآن احسان فراموش اور ناشکرے نہیں تھے، زمانۂ طالب علمی سے اساتذہ کا حددرجہ ادب واحترام فرماتے تھے، ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ نورِ علم کا حصول بغیر استاذ سے مضبوط رشتہ پیدا کیے ممکن ہی نہیں ہے۔

شیخ القرآن کے دور میں طلبہ اپنے استاذ کا کس قدر احترام فرماتے تھے اس حوالے سے اپنے انٹرویو میں آپ فرماتے ہیں:

> ''بلاشبہہ اُس زمانے کے طالب علم اپنے اساتذۂ کرام کے بارے میں جو روش اختیار کرتے تھے اور اِس وقت کے طلبہ جو طریقہ اپنائے ہوئے ہیں دونوں میں نمایاں فرق محسوس کرتا ہوں، میرے عہد طالب علمی میں طلبہ اپنے اساتذہ کے ساتھ نہایت مودبانہ طریقہ اختیار کرتے تھے، ان کو ہر حالت میں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے، ان کی ناراضگی اپنے لیے باعث محرومی سمجھتے تھے، اور ایسی خدمت کرتے کہ جس کا خیال اس زمانے میں ذہن میں نہیں آتا ہے۔'' **(انٹرویو)**

شیخ القرآن کے دل میں اپنے اساتذہ کی کتنی توقیر تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیں کہ جب حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے حکم کے مطابق بحر العلوم، حضرت علامہ، مفتی عبد المنان صاحب علیہ الرحمہ تلشی پور مدرسہ انوار العلوم میں تشریف لائے، اس وقت آب وہوا کی تبدیلی کی وجہ سے آپ پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے، حالت اس وقت تشویش ناک ہو گئی جب منھ سے بلغم کے ساتھ تھوڑا بہت خون آنے لگا، حضرت بحر العلوم بہت پریشان

ہو گئے، جانچ وغیرہ کروانے کے بعد پتہ چلا کہ یہ سب پیٹ کی خرابی کے سبب تھا، اس کے بعد کافی حد تک آپ احتیاط فرمانے لگے، کھانے پینے اور رہنے سہنے میں۔

ایک بار حضرت نے فرمایا کہ مدرسے کے بغل میں جو کنواں ہے اس کا پانی صحت کے لیے بہت مضر ہے، اس لیے تم لوگ میرے پینے کے لیے اسٹیشن کی ٹنکی سے پانی لاؤ جو جراثیم اور مضر صحت کیڑوں سے پاک ہوتا ہے، اس وقت مدرسہ سے اسٹیشن کی دوری تقریباً چار فرلانگ تھی، ظاہر ہے اتنی دور تک جا کر گھڑے میں پانی لانا ایک مشکل کام تھا، اس کام کے لیے کسی مناسب فرد کی ضرورت تھی جو خوش دلی کے ساتھ یہ فریضہ انجام دے سکے، اس کام کو سعادت سمجھتے ہوئے شیخ القرآن نے اس کی ذمہ داری خود لے لی۔

ایک سال تک شیخ القرآن اس خدمت کو انجام دیتے رہے، آپ جب نہیں رہتے تھے تو آپ کے برادر مکرم، حضرت علامہ عبدالرحیم عزیزی اس خدمت کو انجام دیتے تھے، یا دوسرے طلبہ یہ کام انجام دیتے تھے، اس کام کو انجام دیتے ہوئے شیخ القرآن کے دل میں کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ میں اپنے استاذ پر کوئی احسان کر رہا ہوں یا یہ کام میرے لیے تکلیف کا باعث ہے، اس حوالے سے شیخ القرآن خود فرماتے ہیں:

> ''میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ روز روز کا یہ کام بہت اذیت رساں ہے، اس کام میں بڑا وقت ضائع ہوتا ہے، اس لیے طبیعت میں اُکتاہٹ کبھی پیدا نہ ہوئی، بلکہ نہایت خوش دلی اور سعادت مندی کے ساتھ اس بارگراں کو برداشت کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، اور طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی دوسرا طالب علم میرے اس اچھے کام اور خدمت میں شریک نہ ہو'' (انٹرویو)

راقم السطور نے خود بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ حضور شیخ القرآن اپنے اساتذہ کا کس حد تک احترام فرماتے تھے، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی میں جب کبھی آپ کے استاذ محترم، بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ تشریف لاتے تھے تو شیخ القرآن

بڑی نیازمندی کا مظاہرہ فرماتے اور ایک طالب علم کی طرح اپنے استاذ کے سامنے نشست و برخاست فرماتے تھے، حالانکہ اس وقت شیخ القرآن کی عظمت وسطوت کا ڈنکا ہر چہار سو بج رہا تھا، تلامذہ اور معتقدین کا جم غفیر رہتا تھا، مگر جب بھی حضرت بحر العلوم کو دیکھتے سروقد کھڑے ہو کر ان کا احترام بجالاتے، یوں ہی جب دوران گفتگو کبھی اساتذہ کا ذکر آتا تو بڑے ادب سے ان کا تذکرہ فرماتے۔

عہد طالب علمی کے کچھ اہم واقعات:

شیخ القرآن علیہ الرحمہ کے عہد طالب علمی کا دور سیاسی، مذہبی اور سماجی ہر اعتبار سے بڑا ہنگامہ خیز دور تھا، جس وقت آپ تلشی پور میں زیر تعلیم تھے، اسی وقت ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کا واقعہ پیش آیا، اس وقت مسلمانان ہند پر کیا بیتی یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے، انگریزوں کی چیرہ دستیاں عروج پر تھیں، مراٹھوں کے مظالم اس پر مستزاد تھے، مغلیہ حکومت ختم ہو چکی تھی، انگریزوں کی حکومت اور ہندوستانی عوام میں ایک طویل جنگ کے بعد آزادی کا سورج طلوع ہوا، مگر یہ آزادی اپنے ساتھ ملک کی تقسیم بھی لے کر آئی، اور ہندوستان سے کٹ کر پاکستان کا وجود ہوا، اس وقت کے حالات نہایت ناگفتہ بہ تھے، مسلمانوں کا ہر گھران حوادثات سے متاثر تھا، ظاہر ہے شیخ القرآن کا گھرانہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہا ہوگا، اس وقت آپ باشعور ہو چکے تھے، اخبارات کے مطالعہ کا شوق تھا، جب نئے حوادثات وواقعات پڑھتے تو دل ودماغ متاثر ہوتا تھا، مگر آپ نے ان واقعات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا، پوری دلجمعی اور جوش وخروش کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے، آپ اس مسافر کی طرح تھے جسے صرف اپنی منزل کی فکر ہوتی ہے، جسے راستے کے مصائب وآلام کی پرواہ نہیں رہتی ہے، جس کے سر میں صرف حصول منزل کا سودا سمایا رہتا ہے، اور جو شب وروز جانب منزل گامزن رہتا ہے، اس حقیقت کا اظہار شیخ القرآن نے اپنے انٹرویو میں بڑے کرب کے ساتھ فرمایا ہے۔

دوران طالب علمی میں شیخ القرآن کے ساتھ ایک تکلیف دہ حادثہ پیش آیا، جس کا افسوس آپ کو پوری زندگی رہا، ہوا یوں کہ مدرسہ انوارالعلوم کے قریب ایک دیوبندی رہتا تھا، جو مدرسہ کی تعلیمی وتعمیری ترقی سے بہت تکلیف میں رہتا تھا، اکثر اس ادارے کی زمینوں میں بے جا دخل اندازی کرتا رہتا تھا، مدرسہ کے اساتذہ اور انتظامیہ سے اس کا آئے دن جھگڑا ہوا کرتا تھا، ہزار صلح ومصالحت کے باوجود وہ شر پسند دیوبندی اپنی سازشوں سے باز نہیں آیا اور آئے دن مدرسہ اور اہل مدرسہ کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں اضافہ کرتا گیا، اس کی شر پسندی کا اثر طلبہ اور اساتذہ پر پڑ رہا تھا، ذہنی طور سے سب پریشان رہنے لگے۔

جب انتظامیہ اور اساتذہ اس معاملے کو نہ سلجھا سکے تو طلبہ نے اپنے تئیں اس دیوبندی کی خبر لینے کا پلان تیار کیا، اور اتفاق رائے سے یہ منصوبہ بنایا کہ کسی دن موقع دیکھ کر اس دیوبندی کے چھپر کے مکان میں آگ لگا دی جائے، ظاہر ہے یہ طلبہ کی ناعاقبت اندیشی تھی کہ آگ کو آگ سے بجھانے جا رہے تھے، اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا لیکن طلبہ کا گروہ جذباتی اور عجلت پسند ہوتا ہے، نتیجہ کی فکر کہاں ہوتی ہے۔

خیر ایک دن طلبہ نے رات کے وقت کوئلے کی آگ دہکائی اور ایک جری طالب علم نے اس آگ کو اس غریب دیوبندی کے چھپر پر ڈال دی، دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، جیسے تیسے کر کے آگ پر قابو پایا گیا، مگر تب تک اس دیوبندی کا سارا اثاثہ جل کر راکھ ہو چکا تھا، اللہ کا شکر تھا کہ کسی کو پتہ نہیں چل پایا، کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، ورنہ حالات قابو سے باہر ہو جاتے، اور مدرسے کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔

اس حادثے نے شیخ القرآن کے ذہن ودماغ پر بڑا گہرا اثر ڈالا، زندگی بھر آپ کو اس واقعہ پر پچھتاوا رہا، خود ہی بیان فرماتے ہیں:

> ''وہ (دیوبندی) چیختا چلاتا رہا، اور ہمارے مدرسے کے طلبہ اپنی اس غلطی پر فخر کر رہے تھے، لیکن اندر اندر سے میرا ضمیر مجھ کو سخت ملامت کر رہا تھا، اس لیے نہیں کہ میں اس کارستانی میں شریک تھا، بلکہ اس

لیے کہ میرے علم میں یہ نازیبا حرکت آگئی تھی، اور میں اپنی بزدلی کی بنا پر ان نالائقوں کو روکنے اور اس قسم کی حرکت سے منع کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کر سکا تھا، اس لیے کہ بیشتر شر کا اس عمل شر کو کارِ خیر تصور کر رہے تھے اور میری نگاہ میں یہ نہایت ناشائستہ حرکت تھی، جو طالبان علوم دینیہ کے شایانِ شان نہیں تھی، جو کچھ اختلاف و نزاع تھا ادارے کی انتظامیہ اور اس دیوبندی کے درمیان تھا، اولاً تو طلبہ کو اس معاملے میں الجھنا نہیں چاہیے تھا، ثانیاً اگر وہ اس میں پڑ گئے تھے تو ان کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا، جو چوروں، بدمعاشوں، اور شر پسندوں کا کام ہے، اور اسلامی اصول کے بالکل خلاف ہے، یہ ایسا واقعہ تھا کہ اکثریت کی مخالفت کے ڈر سے اس کے خلاف میں اپنی آواز بلند نہیں کر سکتا تھا، مگر میں اس سے بے حد متاثر ہوا، میرا ضمیر مجھ کو مسلسل جھنجھوڑتا رہا، میں قطعاً اس کو درست نہیں تصور کرتا تھا کہ کسی سے عقیدے کے اختلاف کی بنا پر اتنی زیادتی برتی جائے۔

ضابطے اور قانون کے مطابق حالات سے نپٹنے کے امکانات ہوں تو بھلا ایسی حرکت کیوں کر روا رکھی جا سکتی ہے، پھر میں یہ بھی سوچتا تھا، کہ ایک شرارت کا جواب اس سے بڑی شرارت یا ظلم و جبر سے نہیں ہونا چاہیے تھا''۔ (انٹرویو، جولائی و اگست پیام حرم ۲۰۰۹ء)

بیماری کے باعث تعلیمی سلسلے کا انقطاع:

عہد طالب علمی میں شیخ القرآن ایک بار سخت بیمار پڑ گئے، شدید بخار کے ساتھ نمونیا کی شکایت ہو گئی، ابتدائی علاج معالجہ سے کچھ افاقہ نہ ہوا، گھر والوں کو خبر گئی، آپ کے والد ماجد الحاج محمد ابراہیم صاحب مدرسہ پہنچے، ادھر آپ کے دادا بھی اپنے گاؤں سے ۲۵؍ کلومیٹر سے زیادہ مسافت پیدل طے کرتے ہوئے مدرسہ انوار العلوم میں پہنچ گئے، آپ کا پورا گھرانہ

پریشان ہوگیا، اساتذہ اور گھر والوں کے آپسی صلاح ومشورے کے بعد یہ طے پایا کہ شیخ القرآن کو پچپڑوا کے سرکاری اسپتال کے بڑے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا جائے، اس وقت ڈاکٹر عبدالغفار صاحب سرکاری اسپتال میں بڑے ڈاکٹر کے طور پر مشہور تھے، آپ کو پچپڑوا کے سرکاری اسپتال میں لایا گیا جہاں پر آپ کا علاج ہوا، گھر والوں اور احباب واقارب نے دعاؤں سے نوازا جس کی وجہ سے آپ مکمل صحت یاب ہوگئے، کمزوری بہت بڑھ گئی تھی، نقاہت کی وجہ سے تعلیم سے یکسر ناطہ ٹوٹ گیا تھا، اور تقریباً ایک مہینے تک آپ کی تعلیم منقطع رہی، جس کی وجہ سے آپ کافی بے چینی محسوس کرر ہے تھے، جیسے چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تعلیمی شوق نے مدرسہ جانے پر مجبور کر دیا، آپ مدرسہ پہنچے، طلبہ اور اساتذہ بہت خوش ہوئے، اساتذہ نے چھوٹے ہوئے اسباق کو پڑھا کر آپ کے نقصان کی تلافی کر دی، اس طرح سے ایک بار پھر آپ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئے۔

دوران تعلیم اچھے طلبہ کے ساتھ آپ کا حسن سلوک:

شیخ القرآن علیہ الرحمہ اپنے دُھن کے پکے تھے، انھیں بس حصولِ تعلیم سے مطلب رہتا تھا، طلبہ کے ساتھ آپ کم ہی اٹھتے بیٹھتے تھے، کھیل کود اور گپ شپ سے دور ہی رہتے تھے، وہ طلبہ جو ''نہ پڑھیں گے، نہ پڑھنے دیں گے'' کے اصول پر کار بند تھے ان سے تو شیخ القرآن کوسوں دور رہتے تھے، ان کے سایے سے بھی بچنے کی کوشش فرماتے، کیوں کہ آپ کو معلوم تھا کہ شیطان کے بعد سب سے زیادہ مضر ایک طالب علم کے لیے اس کا اپنا برا ساتھی ہوتا ہے، طالب علمی کے دور میں تین بڑے دشمن ہمیشہ ساتھ لگے رہتے ہیں، ایک تو شیطان، دوسرا نفس اور تیسرا برا ساتھی، اس لیے آپ حتی الامکان ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھیل کود اور ہنسی مذاق ہر ایک چیز سے اجتناب فرماتے، ایسے طلبہ سے آپ اختلاف ونزاع کے بجائے ان سے دوری ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔

کچھ طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی سبب سے پڑھنے میں کمزور ہوتے ہیں مگر پڑھائی کے دشمن نہیں ہوتے ہیں، ان کے اندر پڑھائی کا شوق ہوتا ہے، مگر کسی داخلی یا خارجی

رکاوٹ کی وجہ سے وہ پڑھائی سے عاجز ہوتے ہیں، ایسے طلبہ کے ساتھ شیخ القرآن کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، چنانچہ اس طرح کے طلبہ کے بارے میں شیخ القرآن فرماتے ہیں:

''میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو طلبہ طبیعت کے اعتبار سے اچھے ہیں ان کی مدد کی جائے، میں اپنے سے نیچی جماعت والے بچوں کو تکرار کرا کر یا مسائل سمجھا کر اونچے درجے کے لیے تیار کرتا تھا، میں اس وقت ان کا نام بتانے کے موڈ میں نہیں ہوں، جن کے ساتھ میں نے یہ حسن سلوک کیا، یا جن کو میں نے تعاون دیا، البتہ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میری جد و جہد سے کئی ایسی زندگیاں جو تباہی اور بربادی کی منزل تک پہنچنے کے قریب تھیں، میں نے ان کو بچایا، وہ بے چارے میرے احسان مند ثابت ہوئے''۔ **(انٹرویو)**

ایک اچھے طالب علم کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بہر حال ایک طالب علم کی روش ایسی ہونی چاہئے کہ وہ ناعاقبت اندیشوں سے الگ تھلگ رہے، اور جو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے کسی وجہ سے ناکام ہو رہے ہوں ان کو کامیاب بنانے کی اپنی فکری کاوش جاری رکھے، میرا طریقۂ کار یہی تھا، میں امید کرتا ہوں کہ ذہن و فکر والے طلبہ اس راہ پر گامزن رہیں گے''۔ **(انٹرویو)**

عہد طالب علمی میں ایک رسمی مناظرہ:

آپ کا عہد طالب علمی بڑا ہنگامہ خیز تھا، باطل فرقوں کا زور تھا، سرکار اعلیٰ حضرت، آپ کے فرزند ارجمند سرکار مفتی اعظم ہند شاہ مصطفیٰ رضا خان اور دیگر علمائے اہل سنت نے گمراہ و گمراہ گر فرقوں پر جو کاری ضرب لگائی تھی، اس کی ٹیسیں بد مذہب جماعتوں کو چین سے رہنے نہیں دیتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر وہ اپنے مذہب و مسلک کی ترویج اشاعت کرتے ہوئے بھولے بھالے سنی عوام کو ورغلانے کی کوشش کرتے، ان فتنہ پردازوں

کے مکروفریب کو چاک کرنے کے لیے علماے اہل سنت جلسہ جلوس میں تقریریں فرماتے، ان سے مناظرہ فرماتے اوران کے رد میں کتابیں تحریر فرماتے۔

شیخ القرآن کے عہد طالب علمی میں ان کے استاذ محترم حضرت علامہ محمد عتیق الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ اپنے وقت کے کامیاب مناظر مانے جاتے تھے، بھانبھر اور نیپال کی ترائی کا علاقہ ان کی مناظرانہ صلاحیتوں کا معترف تھا، آپ کی شبانہ روز خدمات ہی کے سبب سے آج بھی الحمدللہ وہ علاقہ کافی حد تک بد مذہبیت کے سایے سے محفوظ ہے۔

آپ کے اندر یہ جذبہ اس قدر راسخ تھا کہ اپنے مدرسے کے طلبہ کو بھی مناظرہ کی ٹریننگ دیتے تھے، اور لائق طلبہ کا انتخاب کر کے ان سے رسمی مناظرہ کراتے تھے، تاکہ طلبہ کی تربیت ہو جائے اور عوام کو یقین ہو جائے کہ بد مذہبیت کی بنیاد بہت کمزور ستونوں پر ہے جسے ہمارے طلبہ بھی بڑی آسانی سے مسمار کر سکتے ہیں۔

شیخ القرآن چوں کہ اپنے دور کے ایک ذہین، محنتی، اور لائق وفائق طالب علم تھے، اس لیے آپ کے اندر مناظرانہ صلاحیت ولیاقت کو مستحکم کرنے کے لیے حضرت علامہ عتیق الرحمٰن نور اللہ مرقدہ نے تلشی پور کے ایک عظیم جلسے میں آپ اور آپ کے ایک ساتھی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے درمیان مناظرہ کا پروگرام کروایا تھا، جس میں شیخ القرآن کو غیر مقلد اور آپ کے ساتھی کو سنی مناظر کا کردار دیا گیا تھا، سوال وجواب حضرت علامہ عتیق الرحمٰن نے خود ہی مرتب کیا تھا، جنھیں دونوں مناظر طلبہ نے ازبر کر لیا تھا، آگے کی روداد حضرت شیخ القرآن کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

> ''اسٹیج پر ایک طرف مولانا خلیل صاحب کھڑے ہوئے، اور دوسری جانب میں تھا، تقریباً آدھے گھنٹے تک نہایت زوردار مناظرہ ہوا، سامعین بہت محظوظ ہوئے تھے، اسٹیج پر موجود علماے کرام داد وتحسین کے ساتھ نواز رہے تھے، یہ تمام مباحث خالص علمی تھے، افسوس کہ میرے پاس اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے، بہر حال اس مناظرے

میں پہلے ہی سے فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ غیر مقلد کو شکست کھانی پڑے گی، چنانچہ مجھ کو برسرعام اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا اور مولانا خلیل صاحب اجلاس سے فاتح بن کر نکلے، ان کو چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر لیا، اور پھولوں کے ہار سے ان کو لاد دیا گیا، ان کو بڑی واہ واہی ملی، ایسے وقت میں مجھ کو سخت خجالت کا احساس ہوا، اور بار بار میرے ذہن میں یہ آرہا تھا کہ کاش میں نے غیر مقلدین کا پارٹ نہ ادا کیا ہوتا، کہ مجھ کو کسی طرف سے کوئی شخص داد و تحسین تو بڑی بات دل جوئی کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا، بلکہ سب لوگ میری شکست خوردگی پر خوش تھے کہ ایک غیر مقلد ہار گیا۔'' **(انٹرویو)**

اس مناظرے کی شکست نے شیخ القرآن کو بڑی اذیت پہنچائی اور اس واقعہ نے آپ کے دل پر بڑا گہرا اثر ڈالا، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

''اس مناظرہ کا قبیح پہلو یہ تھا کہ یہ کوئی حقیقی و واقعی مناظرہ نہ تھا، اس میں سنیوں کو سوال و جواب کے انداز میں یہ دکھانا تھا کہ غیر مقلدیت کی بنیاد نہایت کمزور ستونوں پر قائم ہے، اور احناف کی طرف سے آخر کار مضبوط دلائل کا مظاہرہ کرنا تھا، اس لیے اس میں نہ کوئی واقعی طور پر فاتح تھا نہ کوئی مفتوح، لیکن داد و تحسین کے علاوہ جب اِنعام واِکرام کی باری آئی تو مولانا خلیل صاحب کو خوب خوب نوازا گیا، اس سے مجھ کو بہت اذیت پہنچی اور اتنے بڑے مجمع میں کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ یک طرفہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے، حتی کہ میرے اساتذۂ کرام کے ذہن ثاقب میں بھی یہ بات نہ آئی کہ میرے دل و دماغ اس سے متاثر ہو رہے ہیں، میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم یہ کہہ کر میرے اوپر کچھ نوازش ہوتی کہ انھوں نے غیر مقلدین کی طرف سے بھرپور ترجمانی کی، اور

ان کے مذہب کے بیان کے سلسلے میں نہایت بے باکانہ روش اختیار کی،
لیکن وہ مذہب سرے سے کمزور بنیادوں پر قائم ہے، اس لیے ان کو
اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا، یہ بھی انعام کے مستحق ہیں، نہ یہ کہ ان
کومحروم قرار دے کر ان کی دل شکنی کی جائے، اور حوصلہ افزائی کے
بجائے ان کو پست ہمتی کے دل دل میں ڈھکیل دیا جائے، جس سے ان
کی حوصلہ شکنی ہو''۔(انٹرویو)

اس کے بعد اساتذہ کے لئے ایک نصیحت آموز بات کہتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں نے اس واقعہ کو تفصیلاً اس لئے ذکر کیا تا کہ اہل علم معلوم کر سکیں کہ
طالب علموں کے احساسات کی دنیا کتنی عجیب وغریب ہوتی ہے، اس
لیے ان کے نفسیات کا خیال رکھنا ضروری ہے، اور ایک ماہر استاذ کی
ذمہ داری ہے کہ ان کے کیفیات نفسی کا جائزہ لیتا رہے، اور ایسے عمل
وحرکت سے باز رہے جس سے طلبہ کے ذہنی الجھن میں اضافہ ہو اور ان
میں محرومی کا احساس پیدا ہو''۔(انٹرویو)

طالب علمی کے دور میں خارجی مطالعہ کا شوق:

شیخ القرآن کو رب کریم نے ذہن ثاقب عطا کیا تھا، آپ کا ذہن آفاقی تھا، آپ کے اندر تجسس اور تفتیش کا شوق شروع سے تھا، علم وفن کی نئی منزلوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے تھے، اور ہر لمحہ اس خیال میں رہتے کہ زیادہ سے زیادہ معلومات کا خزانہ اپنے ذہن ودماغ میں محفوظ کر لیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ آپ ہمیشہ دنیا کے احوال واخبار پر نظر رکھتے تھے، اس وقت آزادی حاصل کرنے کے لیے اہل ہند برسرِ پیکار تھے، ہندوستان کے حالات بڑے ہنگامہ خیز تھے، پل پل حالات بدل رہے تھے، ایسے ماحول میں شیخ القرآن کے اندر مذہبی وادبی کتابوں کے علاوہ اخبارات اور دیگر فنون کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، آپ کے مطالعہ کا انداز بھی

بڑا اثر الا تھا، چنانچہ اس حوالے سے اپنے انٹرویو میں آپ فرماتے ہیں:

''میرا عہد طالب علمی بڑا ہنگامہ خیز تھا، عہد غلامی آخری سانس لے رہا تھا، حریت کا سورج طلوع ہو گیا تھا، مسلم لیگ کے عروج کے بعد اس کا زوال ہو رہا تھا، ہر طرف لوگوں میں خوف و دہشت کا ماحول تھا، پہلے مجھ کو اخبارات پڑھنے کا شوق ہوا، اخبارات میں لرزہ خیز واقعات کا ذکر ہوتا تھا، جسے پڑھ کر دل دہل جاتا تھا، اور کامل معلومات کا ذخیرہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب ان خبروں کو پڑھا جائے، جن کو شہ سرخی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تو ان کے محل و مقام کے پس منظر کو دیکھا جائے، چنانچہ جب میں مثلاً ''ٹوکیو'' کی خبریں پڑھتا تھا تو نقشہ اتار کر اس کا محل وقوع بھی دیکھ لیتا تھا، اس کے نتیجے میں دنیا کے متعدد ممالک کی راجدھانیوں کا محل وقوع معلوم ہو گیا تھا، اور سیاسی خبروں سے گوناگوں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ نظری سیاست کے بجائے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہ لیا۔

پھر رفتہ رفتہ اردو ادبیات کا مطالعہ کیا، اردو ادب و شاعری میں میری دلچسپیوں کا زیادہ تر مرکز اقبالیات تھیں، چنانچہ بال جبریل، بانگ درا، شرح اسرار خودی و بے خودی، فلسفۂ اقبال، روح اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ وغیرہ بہت سے مصنفین وادبا کی کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں، ان کے مطالعہ سے میرے معلومات میں اضافہ ہوا، اور میری دلچسپیاں صرف درسیات کی حد تک محدود نہ رہیں بلکہ میں نے اردو زبان وادب میں علم الاقتصاد، معاشیات و سیاسیات کی بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالیں، حتی کہ ''ہیگل مارکس'' کے اشترا کی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی، یہ ساری معلومات تلشی پور کے عہد طالب علمی سے

شروع ہوکر اب تک کچھ نہ کچھ برقرار ہیں، اس لیے کہ علم کے سلسلے میں
میرا مخصوص نظریہ یہ ہے کہ ایک ہی دائرے میں محصور نہیں رہنا چاہیے،
گو کہ اصالۃً میرے مطالعہ کا بہترین موضوع دینیات و مذہبیات تھے،
اور اب بھی ہیں، لیکن اسی دائرے میں رہ کر میں اپنے آپ کو مقید رکھنا
نہیں چاہتا تھا بلکہ میری کاوش یہ رہتی تھی کہ خوب سے خوب تر معلومات
میرے ذہن وفکر کو مستنیر کرتی رہیں، گویا میں اس شعر کا مصداق تھا:

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوش تر ازاں می باید

کیوں کہ وسعت نظر وفکر کے لیے اس سے بہتر کوئی راہ نہیں"۔

(انٹرویو)

شیخ القرآن معین المدرسین کی حیثیت سے:

انوار العلوم تلشی پور میں تمام طلبہ میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، اسی لیے اساتذۂ کرام کی خاص نگاہ عنایت آپ پر رہتی تھی، عہد طالب علمی کے آخری ایام میں اساتذۂ کرام نے آپ کی علمی لیاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے اور آپ کی تدریسی صلاحیت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے آپ کو معین المدرسین کی حیثیت سے طلبہ کی تدریسی ذمہ داری سونپ دی، ابتدائی نحو وصرف کی کتابیں پڑھانی شروع کیں، خداداد تدریسی صلاحیت کے جوہر کھلنے لگے اور ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے آپ کی شہرت عام ہونے لگی، طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت ومروّت اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے تھے، اسی لیے طلبہ آپ سے بے حد محبت بھی کرتے تھے، آپ ایک متواضع اور منکسر المزاج طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بارعب مدرس بھی تھے، اسی لیے طلبہ آپ کے ساتھ بے حد ادب واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے، اور طالب علم ہونے کے باوجود آپ کی عزت ایک استاذ جیسی کرتے تھے۔

شیخ القرآن جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں:

دارالعلوم انوارالعلوم میں آپ نے تقریباً آٹھ سال تعلیم وتعلم میں گزارے، یہ دور آپ کی شخصیت کے نکھرنے کا بڑا اہم دور تھا، آپ کے اندر حصول علم کا جوشوق تھا اس کی تکمیل کے لیے آپ نے ۱۹۵۴ء میں جامعہ اشرفیہ، مبارک پور میں داخلہ لیا، اور ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک جامعہ اشرفیہ میں رہ کر متعدد اساتذۂ کبار اور اساطینِ اُمت سے اکتساب فیض کیا، یہ دور آپ کی تعلیمی زندگی کا بڑا زریں دور تھا، حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی نگاہ عنایت نے آپ کو ایک قیمتی ہیرہ بنا دیا، جامعہ اشرفیہ میں رہ کر آپ نے جن علماے کرام سے اکتساب فیض کیا ان میں مندرجہ ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:

☆ جلالۃ العلم، استاذ العلما، حضور حافظ ملت، مولانا، حافظ وقاری، شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ تعالی علیہ، محدث مرادآبادی، بانی الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور۔

☆ محقق جلیل، حضرت علامہ، مولانا، حافظ وقاری عبدالرؤف صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ، سابق نائب شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ، مبارک پور۔

☆ شیخ العلما، حضرت علامہ، مولانا غلام جیلانی اعظمی رحمۃ اللہ تعالی علیہ، سابق استاذ دارالعلوم اشرفیہ، مبارک پور۔

☆ بحرالعلوم، حضرت علامہ، مولانا مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ علیہ الرحمہ۔

☆ قاضی شریعت، حضرت علامہ، مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی علیہ الرحمہ، سابق استاذ وناظم اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور۔

یہ وہ حضرات ہیں جن کی درس گاہ فیض سے شیخ القرآن نے خصوصی طور سے اکتساب فیض کیا، آپ کی شخصیت سازی میں حضور حافظ ملت کا سب سے اہم کردار رہا ہے، اسی لیے شیخ القرآن حضور حافظ ملت سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے۔

بیعت وارادت:

حضور حافظ ملت سے آپ کے تعلقات کا آغاز دارالعلوم انوارالعلوم تلشی پور ہی

سے ہو چکا تھا، حافظ ملت کے جذبۂ اخلاص، ملت کے تئیں آپ کی تڑپ، آپ کی مومنانہ فراست، آپ کی علمی لیاقت، اور آپ کی شفقت ومحبت سے شیخ القرآن بے حد متاثر تھے، دارالعلوم انوارالعلوم ہی میں شیخ القرآن حضور حافظ ملت سے بیعت کا شرف حاصل کر چکے تھے، اور آپ ہی کی تحریک پر آپ کے والد گرامی، برادران اور خاندان کے بہت سارے افراد حضور حافظ ملت سے سعادت بیعت حاصل کر چکے تھے، ضلع بلرامپور میں آپ کے گاؤں کو سب سے پہلے حضور حافظ ملت سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔

حضور حافظ ملت سے شیخ القرآن کو بڑی گہری عقیدت تھی، جس کے کئی اسباب تھے، آپ حافظ ملت کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، ساتھ ہی ساتھ حافظ ملت کے جذبہ اخلاص اور مذہب وملت کی ترویج واشاعت کے مخلصانہ کاموں سے متاثر بھی۔

حضور حافظ ملت سے شیخ القرآن کی عقیدت ومحبت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ آپ اپنے اسم مبارک کے ساتھ ''عزیزی'' کا لفظ بالالتزام لکھتے اور بولتے تھے، آپ کو حضور حافظ ملت کی مومنانہ فراست پر ناز تھا، چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ میرے پیر ومرشد کو اللہ تعالیٰ نے مومنانہ فراست سے بہرہ ور کیا تھا، بسا اوقات آپ کے کاموں کی حکمتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، مگر بعد میں ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں ہر طرح سے خیر مستور کا پہلو کارفرما ہوا کرتا تھا، چنانچہ جس وقت جامعہ اشرفیہ کی تاسیس وتعمیر کے لیے اہل مبارک پور سے چندہ ہو رہا تھا اسی وقت کا یہ واقعہ ہے کہ ایک محلے میں امید سے کم چندہ ہوا، حضور حافظ ملت نے پر جلال انداز میں فرمایا کہ جلوس واپس لے چلو، کیا اسی طرح کی امداد سے یونیورسٹی کی تعمیر ہوگی۔

حضور شیخ القرآن حافظ ملت کے اس طرز عمل سے افسردہ خاطر تھے، ایک دن بحرالعلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی اس دلی کیفیت کا اظہار کیا، حضرت بحرالعلوم نے ارشاد فرمایا کہ بزرگوں کے ہر فعل میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے، حضور حافظ ملت کے اس عمل میں بھی کوئی حکمت ہی ہوگی، اور یہ حکمت تب سمجھ میں آئی جب مذکورہ محلے کے لوگوں نے آکر دوبارہ اس محلے میں جلوس لے چلنے کی

گزارش کی اور خاطر خواہ مالی تعاون کا یقین بھی دلایا۔ (ماہنامہ پیام حرم، جولائی، اگست ۲۰۱۱ء)

آپ حضور حافظ ملت کی فیض رسانی کے بڑے معترف تھے، چنانچہ شروع میں آپ کی زبان میں لکنت تھی، حضور حافظ ملت نے آپ کو ''رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّن لِّسَانِی یَفْقَھُوْا قَوْلِی'' کے ورد کا مشورہ دیا، اللہ کے فضل سے اس وظیفے سے آپ کی زبان کی لکنت ختم ہوگئی۔

❁❁

اوصاف وعادات

احساس ذمہ داری:

یہ شیخ القرآن کی سب سے نمایاں خوبی ہے، اپنے فرائض کے تیئں آپ بڑے حساس واقع ہوئے تھے، اس بارے میں آپ کسی بھی قسم کی سستی یالا پرواہی روا نہ رکھتے، ہر فریضے کی ادائیگی بروقت فرماتے، آخری عمر میں بھی راقم الحروف نے دیکھا کہ درس گاہ میں وقت پر جاتے، ذوق وشوق اور پورے جذبے کے ساتھ پڑھاتے تھے، وقت پر گھنٹی مکمل فرماتے، شدید بیماری کی حالت میں بھی گھنٹی ترک نہیں فرماتے، مدرسے کی میٹنگوں اور خصوصی پروگراموں میں شرکت فرماتے۔

خوردنوازی:

چھوٹوں پر حد درجہ شفقت فرماتے، میں حضرت کا باضابطہ شاگرد نہیں، مگر حضرت مجھ سے بڑی محبت فرماتے تھے، مجھے دیکھ کر اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

مرے کمال کو ہرگز کوئی زوال نہیں
کمال یہ ہے کہ اس میں کوئی کمال نہیں

ایک بار مجھ سے فرمایا کہ آپ گھر کیسے آتے جاتے ہیں، میں نے عرض کیا موٹر سائیکل سے، آپ نے فرمایا کہ اب موٹر سائیکل سے اتنا لمبا سفر نہیں کرنا، خدانہ خواستہ کوئی حادثہ ہوگیا تو کیا کروگے، یہ حضرت کی حد درجہ خوردنوازی اور چھوٹوں پر شفقت تھی۔

طلبہ پر شفقت:

تعلیمی معاملات میں آپ طلبہ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں فرماتے، نہایت سختی سے پیش آتے تھے، لیکن دیگر اوقات ومعاملات میں آپ ریشم کی طرح نرم تھے، طلبہ کو ٹوٹ کر چاہتے تھے، درس گاہ میں جس بارعب وجود اور پر جلال چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی اس کی

شفقت ومروت کا عالم یہ تھا کہ حضرت مولانا نورالہدیٰ مصباحی کے بیان کے مطابق آپ پوچھتے رہتے تھے کہ کسی طالب علم کا کھانا تو نہیں گھٹا ہے، بلکہ تعطیل کلاں کے موقع پر تمام طلبہ سے معافی مانگتے کہ جانے انجانے میں کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو معاف کرنا۔

بے پناہ علمی اِشتغال:

آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ رب قدیر نے آپ کو تعلیم و تعلُّم ہی کے لیے پیدا فرمایا تھا، عہد طالب علمی ہو یا زمانۂ تدریس آپ کے اندر ہمیشہ حصول علم اور اس کی ترویج کا جذبہ موجزن رہا، آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا احمد رضا نورانی بغدادی فرماتے ہیں:

> ’’ایسا لگتا ہے کہ گویا اپنی زندگی کے لمحات کو اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کر دیا ہے، اور اس خصوص میں اپنی صحت وتوانائی کا بھی کچھ خیال نہیں رکھتے ہیں، بیمار پڑتے ہیں، پھر دوا علاج سے جیسے ہی کچھ آرام ملا اپنے فرائض کی ادائیگی میں لگ جاتے ہیں، اور جوانوں سے زیادہ محنت وجانفشانی کے عادی نظر آتے ہیں‘‘ ۔(مسائل سود، ص: ۱۲)

غیرت ونزاکت احساس:

آپ بڑے خود دار اور حساس طبیعت کے مالک تھے، نہ تو شریعت وسنت کے خلاف کچھ برداشت کرتے نہ ہی اپنی طبیعت کے خلاف کچھ سننا گوارا کرتے، آپ جو موقف اختیار فرماتے بہت سوچ سمجھ کر، اور اس کے بعد اسی پر جمے رہتے، یہی وجہ ہے کہ بہت ساری اچھی جگہوں کو آپ نے خیر آباد کہہ دیا، وجہ صرف یہ تھی کہ وہاں آپ کی طبیعت وذوق کے مطابق تعلیمی معاملات نہیں چل سکے، لیکن ایک بڑی خوبی آپ کی یہ بھی ہے کہ کسی بھی ادارہ سے آپ مستعفی ضرور ہوئے مگر کبھی اس کی برائی نہیں فرمائی، بلکہ اس کی تعمیر وترقی کے لیے حتی الامکان کوشش فرماتے رہتے۔

کتابوں سے غیر معمولی محبت:

آپ کو کتابوں سے بڑی محبت تھی، اس حوالے سے حضرت مولانا احمد رضا بغدادی صاحب فرماتے ہیں:

''آپ کو کتابوں کے ذخائر جمع کرنے اور ان کو محفوظ رکھنے سے عشق و شیفتگی کی حد تک دلچسپی ہے، یہی سبب ہے کہ قلیل مدت میں آپ کی کوششوں اور حسنِ تدبیر سے ''علیمی لائبریری'' نے بڑی شہرت حاصل کی، اس میں نادر و نایاب کتابوں کے اکٹھا کرنے میں آپ نے جس حسن تدبیر کا ثبوت دیا، وہ سنہری حروف سے لکھنے کے لائق ہے، اپنے مقاصد حیات میں کتابوں کی فراہمی کو اپنی جماعت کے لئے اہمیت دیتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ جماعت کی علمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک عظیم لائبریری کی بنیاد ڈالی جائے، جہاں کہیں سفر میں جاتے ہیں کتابوں کی جستجو کی دُھن سوار رہتی ہے، ممبئی کا سفر متعدد بار ہوا اور جب وہاں سے واپس آئے، تو دارالعلوم کے لئے کتابوں کا تحفہ لے کر آئے، کبھی کبھی طالب علموں سے مخاطب ہو کر از راہِ مزاح فرماتے ہیں کہ ''افلاطون'' سے زیادہ لذیذ تحفہ میں تم لوگوں کے لیے لاتا ہوں اور اب بھی یہی خواہش و تمنا ہے کہ علیمی لائبریری میں اتنی کتابیں جمع ہو جائیں کہ طبقۂ علما میں سے جن حضرات کو کسی بھی عنوان یا موضوع پر تحقیق و ریسرچ کی ضرورت ہو تو وہ علیمی لائبریری کا رُخ کریں، کاش آپ کی یہ تمنا آپ کی حیات میں پوری ہو جاتی''۔

(مسائل سود، حالات مصنف)

درس تفسیر سے خصوصی لگاؤ:

حضرت شیخ القرآن کو قرآنی علوم سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، درس قرآن اور ترجمۂ قرآن میں آپ اپنی مثال آپ تھے، اہل علم نے آپ کی اسی غیر معمولی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے آپ کو ''شیخ القرآن'' کا لقب دیا۔

مگر اس مفسرانہ مہارت اور علوم قرآنیہ میں رسوخ وتبحر کے باوجود آپ کا یہ ارشاد آپ کے کسر نفسی اور شانِ تواضع کی بہت بڑی دلیل ہے، فرماتے ہیں:

> ''اس بحر ناپیدا کنار اور اتھاہ سمندر کا ایک قطرہ اگر اِس فقیر کو مل جاتا تو دنیا میں اس کا شمار اونچے درجے کے انسانوں میں ہوتا، ابھی تو مجھ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، اور اب کیا توقع کی جاسکتی ہے، کہ کچھ حاصل ہوگا، کیوں کہ حیات ناپائیدار کے آخری مرحلے میں منزل آخرت کی طرف سفر حیات جاری ہے، اس لیے خدائے قدوس اگر قرآن وحدیث کی کچھ خدمت لے لے، تو یہی اس کی بخشش کا ذریعہ بن سکتی ہے'' (مسائل سود، ص ۱۴)

تصنیفی خدمات

یوں تو حضور شیخ القرآن علیہ الرحمہ کا زیادہ تر رجحان درس وتدریس ہی کی طرف تھا، لیکن تصنیفی میدان میں بھی آپ نے طبع آزمائی فرمائی ہے، اور آپ کے زرنگار قلم سے بہت ساری معرکہ آرا تصنیفات وتالیفات اور مقالات وجود میں آئے ، آپ ایک صاحب طرز ادیب تھے، انداز تحریر اور اسلوب نگارش بالکل جداگانہ تھا، جملوں کی ترتیب وتنظیم، سجع بندی کی رعایت، خوبصورت اور برمحل الفاظ کا انتخاب، قدیم وجدید اردو ادب کے قواعد کی بھرپور رعایت، شگفتگی تحریر، قواعد املا کا مکمل لحاظ، خوبصورت پیراگرافنگ، سطحیت کے بجائے گہرائی وگیرائی والے مواد کی پیشکش ، اسلاف واخلاف ادبا کے طرز تحریر کی شیرینی یہ سب وہ اوصاف ہیں جو شیخ القرآن کی تحریروں کو امتیازی شان عطا کرتے ہیں۔

آپ کی بیشتر تحریروں میں تحقیقی رنگ جھلکتا ہے، دقیق سے دقیق معانی کو الفاظ کا پیرہن پہنا کر محسوس بنانے کا ہنر کوئی آپ سے سیکھے، مزاج تحقیقی تھا، اس لیے آپ کی تحریر وتقریر دونوں پر تحقیقی رنگ غالب رہتا تھا۔

شیخ القرآن کی تحریروں میں وسعت خیال اور تحقیق وجستجو کے بے شمار شواہد ملتے ہیں، آپ تحریر وتقریر میں اس تقلید جامد کے خلاف تھے جو انسان کی فکری صلاحیت کو بانجھ بنادے، اور تحقیق وتدقیق کی نئی منزلوں سے محروم کردے، معارف التنزیل شرح مدارک التنزیل میں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’میرا ذہن وفکر یہ ہے کہ تصنیف وتالیف ومطالعہ کتب کے بارے میں وسعت خیالی ہونا چاہئے ، اس میں ایسی تقلید جامد جو تحقیق وجستجو کی راہ میں حائل ہو اس سے کنارہ کش رہنا چاہئے ، اس لیے اپنی جماعت کے اہل علم ’’معارف التنزیل‘‘ میں جابجا میری فکری کاوش کو ملاحظہ فرمائیں گے ، کہیں کہیں اپنی ناقص رائے کا دخل نظر آئے گا ، بعض جگہوں میں

علامہ ابوالبرکات نسفی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف رائے کی جرأت وہمت بھی کی ہے۔(مقدمہ معارف التنزیل صفحہ ۳۲)

مگر شیخ القرآن اس اعلیٰ علمی وقلمی لیاقت کے باوجود اپنی ممکنہ تحقیقی خطاؤں کے امکان کا اعتراف بھی کرتے ہیں،اور انسانی فطرت کے تقاضے کے تحت سہو ونسیان سے انکار بھی نہیں کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے اس انداز کی فکری کاوش میں ذہن کو ٹھوکر بھی لگتی ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ کہیں کہیں مجھ سے لغزشیں بھی ہوگئی ہوں ، لیکن انصاف ودیانت کے ساتھ ہوائے نفس میں مبتلا ہوئے بغیر جو کچھ مجھ سے ہوسکا اپنی جماعت کے اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں''۔**(مقدمہ معارف التنزیل صفحہ ۳۲)**

شیخ القرآن کی زیادہ تر مصروفیت تدریس میں رہی ،اس لیے آپ کے رشحات قلم سے اہل علم کما حقہ مستفید نہیں ہوسکے ،مگر یہ بھی حکمت الٰہیہ کے تحت تھا،شروع میں تصنیفی شوق بیدار ہوا تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی نعتوں اور منقبتوں کے مجموعہ ''حدائق بخشش'' کی شرح کا کام شروع فرمایا ،مگر آپ کے استاذ محترم ،حضرت شیخ العلما، علامہ غلام جیلانی اعظمی علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا کہ '' آپ ایک اعلیٰ درجے کے مدرس ہیں، اگر آپ نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا تو تدریس کے کام میں خلل واقع ہوگا،، استاذ محترم کے اس خیر خواہانہ مشورے پر آپ نے عمل کیا، اور اپنی پوری صلاحیت ولیاقت تدریس میں صرف فرمادی ،جس کا خوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی درس گاہ فیض سے ایک سے بڑھ کر ایک محقق ومصنف پیدا ہوئے ، جن کی تصنیفات وتالیفات سے ایک عالم مستفیض ومستنیر ہوا، یقیناً شیخ القرآن مصنف ہی نہیں بلکہ مصنف گر تھے۔

شیخ القرآن کی وہ تصنیفات ومقالات جو میرے محدود علم میں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

☆ معارف التنزیل شرح مدارک التنزیل ☆ مسائل سود☆ سفرنامہ حجاز ☆ جسمانی معراج کا شرعی ثبوت ☆ خواطر قلبی کے احکام☆ اسلام میں عقل انسانی کا احترام☆ قاری طیب کے تسامحات (متعدد قسطوں میں)☆ مسئلہ کفاءت کی واضح تصویر☆ عالم خواب کی تفسیر☆ مرشد برحق کی عظیم شخصیت ☆ حافظ ملت قدس سرہ کا نظریۂ تعلیم ☆ قاضی شریعت اسلام کے بے لوث خادم ☆ بحرالعلوم کی بارگاہ میں خراج عقیدت ☆ مولانا عبدالرؤف کی حیات وخدمات ☆ قائداہل سنت اپنے کردار وعمل کے آئینے میں☆ اخوت اسلامی کا احترام۔

اول الذکر دو کتابیں مطبوع ہوکر مقبول انام ہوچکی ہیں، جب کہ تیسری کتاب در حقیقت مقالہ ہے جو ''ماہنامہ پیام حرم'' میں کئی قسطوں میں شائع ہوا ہے، ان کے علاوہ باقی سب مقالات ہیں جو ملک کے موقر جرائد ورسائل کی زینت ہیں، **الحمد للہ** مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ حضرت کے بیشتر مقالات کو یک جا کر کے نذر قارئین کررہا ہوں۔

ان میں سے بیشتر مقالات اپنی ضخامت کے لحاظ سے پوری کتاب کا درجہ رکھتے ہیں ،کاش کوئی مرد قلندر ان مقالات کو چھوٹے چھوٹے رسائل اور کتابچوں کی شکل میں اشاعت کرانے کی کمر کس لے،تو یہ شیخ القرآن کی خدمت میں بہترین خراج عقیدت ہوگا۔

ان کتابوں اور مقالات پر وہ تاثرات وتقریظات مستزاد ہیں جو حضرت نے دوسری کتابوں اورتحریروں پر رقم فرمائے ہیں۔

دو عظیم کتابیں:

اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر حضرت کی دو عظیم کتابیں ہیں، ایک تو ''مسائل سود'' دوسری ''معارف التنزیل'' ان دونوں کتابوں کا ایک اجمالی تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں ، اس تجزیاتی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ القرآن کا متجسس اور تحقیقی مزاج ہر شاخ پر گل کھلانے کا عادی تھا،تفسیر کے ساتھ دیگر علوم وفنون میں بھی آپ کا تبحر علمی مسلم تھا، یوں تو آپ ایک عظیم مفسر کی حیثیت سے معروف تھے،لیکن ''مسائل

سود'' کے مطالعہ کے بعد قارئین اس حقیقت کے اعتراف میں دیر نہیں کریں گے کہ آپ ایک عظیم مفتی اور فقیہ بھی تھے، رموز فقہ وافتا سے آشنا اور فقہی بصیرت کے حامل تھے، ذیل میں سب سے پہلے ''معارف التنزیل'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش خدمت ہے۔

معارف التنزیل شرح مدارک التنزیل:

زیر نظر کتاب ۷۱۲ صفحات پر مشتمل ایک عظیم تحقیقی شاہ کار ہے، یہ حضور شیخ القرآن کی سب سے عظیم تحقیقی یادگار ہے، جو فن تفسیر کی نہایت ہی مقبول و مستند کتاب ''مدارک التنزیل'' کی اردو شرح ہے۔

اس کتاب کی وجہ تالیف یہ ہے کہ حضور شیخ القرآن کو ''مدارک التنزیل'' پڑھانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی، جامعہ اشرفیہ میں مدارک التنزیل پڑھاتے تھے، اس کتاب سے غیر معمولی دلچسپی اور آپ کی تفسیری لیاقت واہلیت دیکھتے ہوئے بعض احباب نے آپ سے مدارک کی شرح کے لیے گزارش کی، آپ نے تدریسی مصروفیات کی بنا پر اس کام سے معذوری ظاہر فرمائی، مگر جب کوئی کام ہونا رہتا ہے تو غیب سے اس کے اسباب بھی پیدا ہوجاتے ہیں، اور کوئی نہ کوئی ذریعہ نکل ہی آتا ہے، حضرت شیخ القرآن کے محترم و مکرم استاذ، بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ کے ارشاد و خواہش نے حضرت کو ''معارف التنزیل'' لکھنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں:

> ''تاہم اپنے استاذ کریم، بحرالعلوم، یادگار سلف، مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ (علیہ الرحمہ) کے تعمیل ارشاد اور دوسرے اہل علم کے مطالبہ پر کمر ہمت کس لی، اور طرح طرح کے موانع کے باوجود الجامعۃ الاسلامیہ روناہی میں اس عظیم خدمت کے لیے آمادہ ہوگیا''۔
>
> (مقدمہ معارف التنزیل)

یہ شرح اردو زبان میں ہے، زبان و بیان نہایت شان دار، دلچسپ، فصاحت و بلاغت سے معمور، اور سادہ و عام فہم ہے، اختصار کے ساتھ جامعیت اس کتاب کا طرۂ

امتیاز ہے، وجہ اختصار یہ ہے کہ عصر حاضر میں لوگ ’’مختصر‘‘ سے گھبرا جاتے ہیں تو مطول کہاں پڑھتے ،خود ہی حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

’’گونا گوں اسباب کی بنا پر اس شرح کی تالیف میں مجھ کو اختصار سے کام لینا پڑا، بہت سے مقامات پر میں محسوس کر رہا تھا کہ مباحث میں وسعت و پھیلاؤ ہونا چاہئے ،لیکن قصداً صرفِ نظر کیا، ایجاز و اقتصار سے کام لیا، کیوں کہ اپنی جماعت کے اہل علم جب اپنا ذہن کبھی ’’مختصر‘‘ کی طرف مائل نہیں کرتے تو ’’مطول‘‘ کے مطالعہ کے لیے کہاں سے وقت نکال پاتے‘‘۔(مقدمہ صفحہ ۳۳)

کتاب میں بہت ساری خصوصیات ہیں، چنانچہ سراج الفقہا، حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین صاحب قبلہ مصباحی اس کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’معارف التنزیل‘‘ اردو زبان میں ’’مدارک التنزیل‘‘ کی پہلی شرح ہے، جو علوم و معارف کا خزینہ اور اردو ادب کا شاہکار ہے، اس کے قاری کو حسب ذیل خوبیوں کا احساس نمایاں طور پر ہوگا:

☆ اس میں مشکل الفاظ کے معانی پوری تحقیق کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

☆ ترجمہ بہت سلیس، عام فہم زبان میں کیا گیا ہے، اور ترجمۂ قرآن میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے ترجمہ ’’کنزالایمان‘‘ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

☆ تشریح ایسے بہتر اسلوب میں کی گئی ہے کہ کتاب کے مضامین بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتے ہیں، ان خوبیوں کی وجہ سے یہ شرح اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔

☆ تفسیر میں جہاں کہیں انبیاے کرام **علیہم السلام** ، بالخصوص

سیدالانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اجمالی اشارے کیے گئے ہیں ان کی تفصیل شرح میں بیان کردی گئی ہے۔

☆ کہیں کہیں مفسر قرآن حضرت علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے سے اختلاف کیا گیا ہے، اوراس کے دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔

☆ آیات کریمہ کی تفسیر میں جہاں کہیں مفسرین کے اختلافات ہیں ان کو بیان کر کے لائق ترجیح قول کوترجیح دی گئی ہے۔

☆ متعدد مقامات پر اردو مترجمین کا علمی محاسبہ بھی کیا گیا ہے۔

☆ مدارک التنزیل کی بعض وہ عبارتیں جن کی اصلاح کی گئی ان کو معارف التنزیل کے مطالعہ سے جانا جاسکتا ہے۔

کتاب کا اسلوب کچھ یوں ہے کہ اولاً جس سورت کی تفسیر کی جانی تھی پہلے اس کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا گیا ہے، اس تعارف میں سورت کا نام ،زمانۂ نزول اور موضوع و مضامین کے تعلق سے عالمانہ تحقیقات پیش کی گئی ہیں، اس کے بعد سورت کی چند آیات سے شرح کا آغاز کیا گیا ہے، شرح میں سب سے پہلے حل لغات پر توجہ دی گئی ہے، اس کے بعد ترجمہ پھر شرح و بیان کا آغاز ہوتا ہے، اس شرح و بیان میں چند اُمور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

☆ زیر تفسیر آیات سے پیدا ہونے والے اشکالات واوہام کے عقلی و نقلی جوابات دیے گئے ہیں۔

☆ آیات میں وارد اَعلام کی تحقیق کتب تفسیر اور دیگر تاریخی ولغوی کتابوں کی مدد سے کی گئی ہے۔

☆ تاریخی مقامات پر جغرافیہ کی مدد سے بھر پور روشنی ڈالی گئی ہے۔

☆ آیات میں موجود وجوہِ بلاغت کی نشان دہی کی گئی ہے۔

☆اہم نکات وفوائد بیان کیے گئے ہیں۔

☆اسلوب قرآنی کی امتیازی شان اور انفرادیت بیان کی گئی ہے۔

بہر حال یہ شرح اپنی نوعیت کی منفرد وممتاز شرح ہے، اس کتاب کی افادیت کی شہادت حضرت بحر العلوم علیہ الرحمہ نے ان الفاظ میں دی ہے:

''ان شاءاللہ اس سے بہت سے پڑھنے والوں بلکہ پڑھانے والوں کا بھی بھلا ہوگا''۔(تقریظ جلیل بر معارف التنزیل صفحہ ۲۰)

مسائل سود:

زیر نظر تالیف شیخ القرآن علیہ الرحمہ کے فقہی تبحر کی عظیم نشانی ہے، اس کتاب کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شیخ القرآن ایک عظیم مفسر اور بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ لائق وفائق مفتی اور متبحر فقیہ بھی تھے، اپنے دور میں پیدا شدہ نو پید مسائل کا حل جس طرح سے آپ نے پیش فرمایا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک محتاط اور بالغ نظر مفتی اور مسائل جدیدہ کے محقق تھے۔

''رِبا''، جس کی حرمت وقباحت شریعت اسلامیہ میں مسلم ہے، اسی سے متعلق قدیم وجدید مسائل پر شیخ القرآن نے اس کتاب میں نایاب تحقیقات پیش فرمائی ہیں، کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول:

میں حرمت سود کے ادوار پیش کیے گئے ہیں، اور سود کی شناعت وقباحت پر عقل ونقل سے استدلال کرتے ہوئے معلومات کا ایک خزانہ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم:

میں مصنف نے سود کی حرمت وقباحت پر متعدد احادیث وواقعات سے استدلال پیش کرتے ہوئے ثابت فرمایا ہے کہ سود ہلاکت خیز ہے، اور سودی کاروبار نہ تو کرنا جائز ہے

،اور نہ ہی اس کاروبار میں کسی طرح کی معاونت جائز ہے۔

باب سوم:

میں رِبا کی لغوی وشرعی تحقیق پیش کی گئی ہے، رِبا کی مختلف صورتوں کا حکم، اور اس بارے میں ائمہ کرام کے اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب چہارم:

میں بہت سارے نو پید مسائل زیر بحث آئے ہیں، مثلاً بینک اور اس کے انٹرسٹ کا مسئلہ، جیون بیمہ، اور اس طرح کی اسکیموں سے نفع اندوزی کا مسئلہ، یہ سارے مسائل شیخ القرآن نے بڑے حسن وخوبی کے ساتھ حل فرمائے ہیں، اس بارے میں شیخ القرآن نے فتویٰ کے ساتھ تقوی کا دامن بھی نہیں چھوڑا ہے، امام احمد رضا قدس سرہ کے فتاویٰ سے استناد بھی کیا ہے، اور اعلی حضرت کے فتاویٰ کے نکات بھی بیان فرمائے ہیں۔

باب پنجم:

میں بیوع فاسدہ کا بیان ہے، اس باب کے تحت خون کی خرید وفروخت، لاٹری کی حرمت، اور مضاربت وشرکت سے متعلق بہت سارے تحقیق طلب مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

باب ششم:

میں سود اور صدقہ میں فرق، مال جمع کرنے کی سزا، مصارف زکوۃ، زکوۃ کی حکمت بالغہ، صدقہ کا مفہوم، اور بہت سارے مسائل زکوۃ کا بیان ہے، بلاشبہہ یہ باب اس کتاب کا خلاصہ ہے۔

کتاب کا انتساب حضور حافظ ملت، علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی **علیه الرحمه** کی طرف ہے، اور اس پر تقریظ جلیل بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی **علیه الرحمه** کی ہے، صاحب کتاب کے حالات زندگی پر ایک وقیع تحریر حضرت علامہ احمد رضا بغدادی کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اور تقدیم خود شیخ القرآن نے لکھی ہے۔

کتاب لکھنے کی تحریک الحاج احمد عمر ڈوسا صاحب ممبئی نے دی، اور اس کتاب کی

طباعت واشاعت کے اخراجات بھی آپ ہی نے برداشت کیے۔

بہر حال یہ کتاب شیخ القرآن کی بہت ہی عظیم تحقیقی علمی یادگار ہے، ہر طالب علم اور متلاشی حق کو اس کا مطالعہ سودمند رہے گا۔

تدریسی خدمات

حضور شیخ القرآن کو اللہ رب العزت نے بہت ساری صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپ ایک مصنف بھی تھے، ایک مقرر بھی تھے، اور ایک اچھے منتظم بھی تھے، مگر ان ساری خوبیوں میں آپ کی تدریسی صلاحیت بے نظیر تھی۔

۵۵ رسالوں پر محیط آپ کی تدریسی زندگی قابلِ رشک تھی، ہندوستان کے مرکزی مدارس کی درس گاہوں کی آپ زینت بنے، جامعہ اشرفیہ، دارالعلوم علیمیہ، جامعہ اسلامیہ روناہی، تنویرالاسلام امرڈوبھا، فیض الرسول براؤں شریف، جیسے عظیم دینی اداروں میں ایک لائق فائق استاذ، ایک بہترین صدرمدرس، اور قابل شیخ الحدیث بن کر علم کے پیاسوں کو سیراب کرتے رہے۔

آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز عہد طالب علمی ہی سے ہو چکا تھا، دارالعلوم انوارالعلوم تلشی پور میں معین المدرسین کی حیثیت سے آپ کو تعلیمی تجربہ حاصل ہو چکا تھا، باضابطہ تدریسی دور کا آغاز جامعہ اشرفیہ سے فراغت کے بعد ہوا۔

حضور شیخ القرآن کی شہرت اہل علم میں کئی جہتوں سے تھی، مگر آپ کو شہرتِ دوام ایک مدرس ہی کی حیثیت سے حاصل ہوئی، آپ کی تدریس مثالی تھی، عینی شاہدین آج بھی بتاتے ہیں کہ آپ کی تدریس میں ایسی روانی، اور خطیبانہ ولولہ رہتا تھا کہ طلبہ درس ہی میں نعرہ لگانے پر مجبور ہو جاتے تھے، دوراخیر میں جب ۲۰۰۸ء میں حضور شیخ القرآن جامعہ اسلامیہ روناہی سے دوبارہ علیمیہ جمدا شاہی تشریف لائے تو اس وقت حضرت ہی کی درس گاہ کے قریب میری بھی درس گاہ ہوا کرتی تھی، حضرت مائک سے پڑھاتے تھے، اس ضعیف العمری میں بھی ایسے پر جوش انداز میں پڑھاتے تھے، کہ ہم نو جوانوں کو رشک آتا تھا، بسا اوقات دارالاقامہ طلبہ کے نعروں سے گونج اٹھتا تھا، یہ نعرے شیخ القرآن کے جوش تدریس میں مزید اضافہ کرتے اور طبیعت کی ناسازی کو درکنار کر کے حضرت شیخ القرآن مزید ولولے اور روانی کے ساتھ پڑھانے لگتے۔

ظاہر ہے اس کبرسنی میں جب تدریس کا یہ حال تھا تو دور شباب میں تدریس کیا حال رہا ہوگا۔

آپ کی کامیاب تدریس کے بہت سارے اسباب تھے، ایک تو یہ کہ آپ جو بھی پڑھاتے دل سے پڑھاتے، تدریس میں ڈوب جاتے، اور پڑھانے کے وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر صرف تدریس ہی کو پیش نظر رکھتے، دوسرا یہ کہ آپ تدریس سے متعلق مضمون کی بھرپور تیاری فرماتے، اس سے متعلق ہر معاون کتاب کا مطالعہ فرماتے، لیکن غیر معیاری شروحات کو ہاتھ نہ لگاتے، ہمیشہ اعلی معیار کی کتابیں ہی زیر مطالعہ رہتیں، تیسرا سبب یہ ہے کہ آپ طلبہ پر ایسی شفقت وعنایت فرماتے کہ طلبہ ہمہ تن گوش ہو کر آپ کی باتیں سنتے تھے، معمولی سی معمولی باتوں پر طلبہ کی حوصلہ افزائی فرماتے، وہ طلبہ جو فطرتاً نیک اور محنت کش ہوتے ان کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دیتے۔

شیخ القرآن کو یوں تو ہر فن کی تدریس میں یدطولیٰ حاصل تھا، مگر تفسیر سے آپ کو خصوصی شغف تھا۔

شیخ القرآن کو علم حدیث سے بھی خصوصی شغف تھا، چنانچہ کچھ عرصے تک حضور حافظ ملت کے حکم پر آپ نے تنویر الاسلام امرڈوبھا میں شیخ الحدیث کے منصب پر رہ کر اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف کی تدریس کا شرف حاصل کیا۔

فراغت کے بعد سب سے پہلے جامعہ حمیدیہ بنارس، پھر شاہ جہاں پور کے مدرسہ فیض عام میں تدریسی فرائض انجام دیئے، اس کے بعد دارالعلوم ربانیہ باندہ، فیض الرسول براؤں شریف، تنویر الاسلام امرڈوبھا، جامعہ اسلامیہ روناہی، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، اور جامعہ اشرفیہ مبارک پور جیسے اداروں میں تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔

شیخ القرآن کے چند مشہور تلامذہ:

شیخ القرآن کی درس گاہ سے ایک عالم فیض یاب ہوا، چند مشہور تلامذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

☆ مفتی شعبان علی حبابی نعیمی، ممبئی ☆ قاری ظہور احمد صاحب، سابق استاذ دارالعلوم تنویر الاسلام، امر ڈوبھا، کبیر نگر ☆ حضرت علامہ، مفتی حفیظ اللہ نعیمی، بانی و مہتمم جامعہ عائشہ، پچپڑوا، بلرام پور ☆ پیر طریقت، رہبر شریعت، حضرت علامہ غلام عبدالقادر علوی صاحب، ناظم اعلیٰ فیض الرسول، براؤں شریف ☆ حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی، صدرالمدرسین دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی ☆ حضرت علامہ محمد قمر عالم قادری صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی ☆ حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین قادری صاحب، نائب صدرالمدرسین دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی ☆ حضرت علامہ محمد شفیق الرحمٰن صاحب، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت علامہ مفتی حبیب اللہ نعیمی، استاذ دارالعلوم فضل رحمانیہ، پچپڑوا، بلرام پور ☆ حضرت علامہ، مفتی عبدالسلام صاحب، دارالعلوم انوارالعلوم، تلشی پور، بلرام پور ☆ حضرت علامہ مسیح احمد صاحب، صدرالمدرسین جامعہ انوارالقرآن، بلرام پور ☆ حضرت علامہ، مفتی، محمد نظام الدین رضوی، صدر شعبۂ افتا الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور ☆ حضرت علامہ محمد شمس الہدیٰ مصباحی، برطانیہ ☆ حضرت علامہ محمد مسعود احمد برکاتی، امریکہ ☆ حضرت علامہ معین الحق علیمی، جمدا شاہی، بستی ☆ حضرت علامہ محمد شفیق الرحمٰن عزیزی، کنو یز ورلڈ اسلامک مشن و مفتی اعظم ہالینڈ ☆ حضرت علامہ مفتی محمد اختر حسین قادری، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت علامہ امید علی صدیقی صاحب، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت مولانا، ڈاکٹر محمد معراج الحق نورانی بغدادی، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت علامہ ڈاکٹر انوار احمد خان بغدادی صاحب پرنسپل علیمیہ جمدا شاہی ☆ حضرت علامہ محمد احمد رضا نورانی، بغدادی دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت مولانا، صوفی عبدالمطلب علیمی، ڈائرکٹر فقہ اسلامی ریسرچ سینٹر، رائے پور، چھتیس گڑھ

☆ حضرت علامہ محمد سعید نورانی صاحب، استاذ دارالعلوم مدینۃ العربیہ، قصبہ دوست پور، ضلع سلطان پور، یوپی ☆ حضرت علامہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب، بانی ومہتمم جامعہ حضرت صوفی نظام الدین، لہرولی بازار، کبیر نگر، یوپی ☆ حضرت مولانا محمد طیب صاحب، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت مولانا کلام احمد علیمی، اشرفی، سدھارتھ نگر ☆ حضرت مولانا سید جامی اشرف علیمی، کچھوچھہ شریف، امبیڈکر نگر، یوپی ☆ حضرت مولانا قاری محمد ہاشم صاحب، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی ☆ حضرت مولانا مفتی احمد شفیق صاحب استاذ دارالعلوم اہل سنت فضل رحمانیہ، پچپڑوا، بلرامپور ☆ حضرت مولانا محمد شمیم صاحب استاذ جامعہ فاطمۃ الزہراء ☆ مولانا ارشاد احمد علیگ جمداوی ☆ مولانا محمد شاہد علیگ جمداوی ☆ حضرت مولانا الحاج محمد امیر قادری علیمی، دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی۔ ☆ مولانا مظہر حسین علیمی، ایڈیٹر ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی۔ وغیرہ

شیخ القرآن اور دارالعلوم علیمیہ :

شیخ القرآن علیہ الرحمہ کی سب سے بڑی کرامت دارالعلوم علیمیہ کی نشاۃ ثانیہ ہے، یوں تو اس ادارے کی بنیاد 1952ء میں پڑ چکی تھی، لیکن اس کا دور زریں تب آیا جب حضور شیخ القرآن نے اس ادارے کو اپنی تدریسی وانتظامی خدمات سے سرفراز کیا، آج جو کچھ بھی علیمیہ میں ہے وہ شیخ القرآن کی دعاؤں اور کوششوں کی بدولت ہے، دارالعلوم کا تعلیمی معیار، نصاب تعلیم، نظام تدریس، تعمیری ترقی، شان دار لائبریری، یہ سب چیزیں حضور شیخ القرآن کی نگاہ فیض کا کرشمہ ہیں، میرے اس نظریے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ دوسرے بزرگوں اور بڑوں کا علیمیہ کی تعمیر وترقی میں کوئی کردار نہیں، یقیناً ہے، مگر ان سب میں شیخ القرآن کا کردار نمایاں ہے، اور ان کی مساعی جمیلہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

دارالعلوم علیمیہ میں شیخ القرآن کا ورود مسعود:

۱۹۸۶ء میں دارالعلوم علیمیہ کے ارباب حل وعقد نے یہ فیصلہ کیا کہ دارالعلوم علیمیہ کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے اس ادارے کے لیے شیخ القرآن کی خدمات حاصل کی

جائیں، چنانچہ قائد ملت، علامہ محمد حنیف قادری کی قیادت میں حضرت علامہ معین الحق علیمی صاحب ، عالی جناب محمد رضا مرحوم، سابق منیجر دارالعلوم علیمیہ ، مولانا محمد ایوب قادری صاحب، جمد اشاہی، یہ سب حضرات جامعہ اشرفیہ حاضر ہوئے اور شیخ القرآن کی خدمت میں عریضہ پیش کیا کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لے چلیں ، اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے ادارہ کو ترقی عطا فرمائیں، اس وقت شیخ القرآن کے لیے فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا، ایک طرف جامعہ اشرفیہ جیسا عالم گیر، شہرت یافتہ مدرسہ تھا، دوسری طرف علیمیہ جیسا گمنام ادارہ ، اس کشمکش کی گھڑی میں فیصلہ من جانب اللہ ہوا، اور شیخ القرآن کے دل میں یہ بات آئی کہ:

چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں
زہے وہ پھول جو گلشن بنائے صحرا کو

اور پھر یہ مرد قلندر اسی صحرا کو لالہ زار بنانے کے لیے کمر بستہ ہو گیا، اشرفیہ کو چھوڑ کر شیخ القرآن علیمیہ میں تشریف لائے ، ایک عجیب انقلاب برپا ہوا، تعلیم و تعمیر دونوں شعبوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ، لائق وفائق اساتذہ کی تقرری عمل میں آئی ، علیمی لائبریری کو کتابوں سے مالا مال کیا گیا، تعلیم کے ساتھ باضابطہ تربیت کا نظم کیا گیا، اور اس طرح آپ کی آمد علیمیہ کے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔

اس تعلیمی وتربیتی انقلاب کے لیے زرِ کثیر کی ضرورت تھی ، اللہ رب العزت کروٹ کروٹ سکون نصیب فرمائے سیٹھ غلام مصطفےٰ مرحوم اور محسن ملت، معین العلما، حضرت علامہ معین الحق علیمی صاحب علیہ الرحمہ کو، یہ دونوں حضرات دامے، درمے، قدمے ، سخنے شیخ القرآن کے ارشاد پر علیمیہ کی امداد فرماتے رہے، اور اس طرح شیخ القرآن نے چند سالوں میں دارالعلوم علیمیہ کو وہ شہرت ورفتار عطا کی کہ ایک خالص دیہاتی خطہ کا یہ ادارہ عالم گیر شہرت کا حامل بن گیا۔

شیخ القرآن کی آمد کے بعد ادارہ میں فضیلت تک کی تعلیم کا آغاز ہوا، تعلیم میں بہتری اور مضبوطی پیدا کرنے کے لیے نظام امتحان کو صاف وشفاف بنایا، طلبہ میں شوق تعلیم کو

جلا بخشنے کی غرض سے ہر جماعت میں اول، دوئم پوزیشن والے طلبہ کو ماہانہ وظیفہ جاری فرمایا، ہفتہ واری بزم ادب کا آغاز کیا، جدار یے اور وال میگزین کی اشاعت کروائی، اور اس طرح آپ کی ان مدبرانہ کوششوں سے چند ہی سالوں میں علیمیہ تشنگان علم کا مرکز توجہ بن گیا۔

شیخ القرآن کی سوچ آفاقی تھی، آپ کچھ نیا کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، اسی فکر کے تحت پہلی بار آپ نے اپنے یہاں کے چند طلبہ کا جامعہ صدام للعلوم الاسلامیہ، بغداد میں داخلہ کروایا، اور قائد اہل سنت شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ کے تعاون سے ان کو وہاں تعلیم دلوائی۔

۳۰ رجون ۱۹۹۶ء کو علیمیہ میں آپ کی سرکاری ملازمت کی مدت پوری ہوگئی، اور الجامعۃ الاسلامیہ رونا ہی کے ارباب بست وکشاد کے اصرار پر آپ رونا ہی تشریف لے گئے، وہاں آپ کا تشریف لے جانا اُمت مسلمہ کے حق میں بہت مفید رہا، آپ نے وہاں پر رہ کر مدارک التنزیل کی شرح ''معارف التنزیل'' تحریر فرمائی، بلاشبہہ یہ اردو زبان میں مدارک کی لاجواب شرح ہے۔

شیخ القرآن بھلے ہی علیمیہ سے مکانی اعتبار سے دور تھے، مگر قلبی اعتبار سے آپ ہمیشہ علیمیہ ہی میں رہے، آپ کا دل ودماغ ہمیشہ علیمیہ ہی میں لگا رہتا تھا، ایک بار راقم الحروف حضرت علامہ معین الحق علیمی صاحب علیہ الرحمہ کے ساتھ رونا ہی گیا، حضرت سے ملاقات ہوئی، سب سے پہلے علیمیہ ہی کے بارے میں پوچھا، یقیناً یہ علیمیہ کے ساتھ آپ کے دلی لگاؤ اور گہرے ربط کی دلیل ہے۔

شیخ القرآن کی عدم موجودگی میں انھیں کے تربیت یافتہ شاگرد رشید، حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی صاحب قبلہ کی صدر مدرسی میں یہ ادارہ روز افزوں ترقی کرتا رہا، علم کی نئی منزلیں طے کرتا رہا، تعلیم وترقی کے میدان میں آگے بڑھتا رہا، شیخ القرآن حضرت علامہ اعظمی کی کارکردگی سنتے تو دل سے دعا دیتے، اور علیمیہ کی ترقی پر بے حد خوش ہوتے۔

۲۰۰۸ء میں شیخ القرآن دوبارہ علیمیہ کی زینت بنے، یہ آپ کی تدریسی زندگی کا آخری دور تھا، ضعف ونقاہت اور متعدد بیماریاں آپ کو تدریس کی اجازت نہیں دے رہی

تھیں، مگر تدریس شیخ القرآن کی روحانی غذا تھی، بھلا وہ اسے کیسے چھوڑ دیتے، آواز پست ہوگئی تھی، اس لیے مائک سے تدریس کا انتظام ہوا، اس ضعیفی کے دور میں بھی آپ کی تدریس قابل رشک تھی۔

یہاں آنے کے بعد آپ کی طبیعت میں کافی بہتری آئی، حضرت علامہ معین الحق صاحب اپنے اس محسن کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے تھے، بیماریوں کا علاج کرواتے، ہمیشہ مزاج پرسی فرماتے، کبھی آپ کو اجنبیت یا تنہائی کا احساس نہ ہونے دیا، بالکل ایک بیٹے کی طرح خدمت کی، شیخ القرآن آپ سے بے حد خوش رہتے تھے، اسی طرح جمد اشاہی کے ایک معزز اور صاحب خیر فرد الحاج وصی الدین اور ان کے برادران الحاج شہنشاہ حسین، الحاج شمس الدین وغیرہ نے بھی حضرت کی خدمت میں کوئی کمی نہیں کی، اور حتی الامکان آپ کو آرام وسہولت پہنچانے کے لئے کوشاں رہے۔

وفات :

علم وفضل کا یہ آفتاب عرصۂ دراز تک آسمانِ علم پر چمکتا دمکتا رہا، لیکن قانون قدرت سے کسے چارۂ کار ہے، آخر کار ایک دن یہ آفتاب روپوش ہوگیا، ایک طویل عرصے سے شیخ القرآن بلڈ پریشر، شوگر، تنفس اور دیگر امراض میں مبتلا تھے، آپ کبھی بھی علاج میں لاپرواہی نہیں فرماتے تھے، ۷ جولائی کو تنفس میں پریشانی کا احساس ہوا تو آپ علاج کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے، وہاں پر حضرت قاری محمد احمد بقائی، حضرت قاری ذاکر علی، ڈاکٹر محمد ضرار، حضرت مولانا محمد حسیب صاحب جامعہ حنفیہ ضیاء القرآن لکھنؤ نے آپسی صلاح ومشورے کے بعد حضرت کو لکھنؤ ہاسپٹل، ڈالی گنج میں ایڈمٹ کرادیا، علاج ہوا، نمونیا کی تشخیص ہوئی، اللہ کا کرم کہ کافی حد تک افاقہ بھی ہوا، جمد اشاہی واپسی کے لئے ٹکٹ بھی ریز رو کرالیا گیا، مگر اللہ کی مرضی کہ اچانک طبیعت بگڑی اور ۱۴ر شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۲۰۱۱ء کو آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے آبائی وطن ''ناؤڈیہہ'' والوں کی خواہش تھی کہ آپ کی تدفین وہیں پر ہو،

مگر آپ کے وصیت نامے کو دیکھ کر سب نے اس پر اتفاق کیا کہ جمد اشاہی ہی میں حضرت کی آخری آرام گاہ بنائی جائے، چنانچہ لکھنؤ سے اعزہ واقربا کو زیارت کروانے کے لیے ناؤ ڈیہہ آپ کا جسد خاکی لے جایا گیا، اور پھر وہاں سے جمد اشاہی لاکر آپ کی تدفین کی تیاری ہونے لگی۔

ان دنوں مدارس میں چھٹی ہو چکی تھی، مگر یہ خبر عام ہوتے ہی، دارالعلوم علیمیہ میں آپ کے تلامذہ اور معتقدین جوق در جوق آنے لگے، حضرت علامہ محمد قمر عالم صاحب، شیخ الحدیث ادارہ ہذا، حضرت علامہ محمد ایوب صاحب قادری، حضرت مولانا وقار احمد اور حافظ عین الحق صاحب نے حضرت کو غسل دیا، اور آپ کے کرم فرما استاذ و مربی، حضرت بحرالعلوم، علامہ، مفتی عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

۱۸/ جولائی ۲۰۱۱ء دو بجے دن کو آپ کی نماز جنازہ ہوئی اور اسی دن جمد اشاہی کی عید گاہ سے متصل ایک باغ میں آپ کی تدفین عمل میں آئی، یہ حضرت شیخ القرآن کی علیمیہ اور جمد اشاہی سے محبت کی آخری منزل تھی کہ اپنے جسد خاکی کو بھی سرزمین جمد اشاہی میں ضم کر دیا۔

جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، فیض الرسول، براؤں شریف، جامعہ اسلامیہ، روناہی، فضل رحمانیہ، پچپڑوا، انوار ملت، چھتر پارہ، صدرالعلوم، گونڈہ، جامعہ حنفیہ، بستی، جامعہ حنفیہ لکھنؤ، مدرسۃ الامام ابی حنیفۃ النعمان، سیتامڑھی بہار، معراج العلوم، دھرم سنگھوا، تدریس الاسلام، بسڈیلہ، غریب نواز، بیدولہ، اشرف العلوم ڈیوہاری، غوثیہ رضویہ، اگیا چھاتا، اور بہت سارے دینی مدارس کے طلبہ واساتذہ نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

اس طرح سے علم وفضل کا یہ آفتاب روپوش ہو گیا، بلاشبہہ آپ چلے گئے مگر آپ کی تدریسی خدمات، تصنیفی کارنامے اور تعمیری کوششیں ہمیشہ آپ کو زندہ رکھیں گی، اور جب تک دارالعلوم علیمیہ سلامت رہے گا شیخ القرآن کی عظمتوں کے پھریرے لہراتے رہیں۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہرباری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

حضور شیخ القرآن سے ربط رکھنے والے چند مخصوص افراد

حضرت علامہ فروغ احمد اعظمی مصباحی:

آپ دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی کے سابق سینئر استاذ، پرنسپل، جید عالم دین، علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر، تجربہ کار مدرس، بہترین قلم کار، اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

حضور شیخ القرآن نے دارالعلوم علیمیہ کی تعمیر وترقی کے لیے جس متحرک وفعال ٹیم کا سہارا لیا ان میں آپ سرفہرست تھے، شیخ القرآن کو ''شیخ القرآن'' کا لقب آپ ہی کی تجویز و تحریک پر دیا گیا۔

حضرت علامہ امید علی صدیقی صاحب:

آپ دارالعلوم علیمیہ کے نہایت سینئر، متحرک، اور قابل قدر استاذ ہیں، علیمی لائبریری کے جنرل سکریٹری ہیں، دینی مدارس کی تنظیم ''ٹیچرس ایسوسی ایشن آف مدارس عربیہ اتر پردیش ضلع بستی'' کے جنرل سکریٹری ہیں۔

حضور شیخ القرآن آپ پر بہت اعتماد فرماتے تھے، اکثر معاملات میں آپ سے رائے مشورہ فرماتے، عموما دوا علاج کے لیے حضرت ہی کو ساتھ لے جاتے۔

حضرت علامہ ڈاکٹر انوار احمد بغدادی صاحب:

آپ دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی کے صدر المدرسین اور موقر استاذ ہیں، دینی وعصری دونوں طرح کے علوم کے جامع، بہترین محقق، قابل قدر مصنف، اور مذہب وملت کے داعی ہیں، حضور شیخ القرآن کو اپنے جن تلامذہ پر ناز تھا، ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔

حضرت علامہ مفتی محمد اختر حسین قادری صاحب:

آپ دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی کے موقر استاذ و مفتی، ضلع سنت کبیر نگر کے قاضئ

شریعت اور متحرک وفعال عالم دین ہیں۔

شیخ القرآن نے آپ کو تفسیر کی بہت سی کتابیں پڑھائی ہیں، آپ پر حد درجہ شفقت وعنایت فرماتے تھے۔

حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین قادری صاحب:

آپ دارالعلوم علیمیہ کے نہایت محنتی، ذہین، اور متبحر مدرس و مفتی ہیں۔

شیخ القرآن آپ سے بے حد محبت فرماتے اور آپ کے رسوخ فی العلم کے معترف ومداح تھے۔

حضرت علامہ محمد معین الحق علیمی صاحب علیہ الرحمہ، دارالعلوم علیمیہ، جمد اشاہی:

حضرت علامہ معین الحق صاحب علیمی **علیه الرحمه** عہد طالب علمی ہی سے حضرت سے قریب اوران کے گہرے عقیدت مندر ہے ہیں، اور حضرت کے مثالی طرز تدریس کے بڑے مداح تھے، آپ نے حضور شیخ القرآن کی وہ مثالی خدمت کی ہے کہ متعدد مجالس میں خود شیخ القرآن نے بیان فرمایا کہ اگر کوئی میرا نسبی فرزند ہوتا تو شاید اتنی خدمت نہ کر پاتا۔

طویل عہد علاج میں آپ مالی ایثار کے ساتھ ممبئی میں رہائش اور ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانے اور خبر گیری اور دیگر انتظام میں پیش پیش رہتے تھے۔

ان کے ایک بیان کے مطابق تقریباً ۲۵ رسال سے شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو جس میں خط وکتابت یا فون کے ذریعہ انھوں نے حضرت کی خبر گیری نہ فرمائی ہو، انتقال کی خبر سن کر ممبئی سے بذریعہ ہوائی جہاز جنازے میں شریک ہوئے۔

پیر طریقت حضرت علامہ الحاج سید کمیل اشرف صاحب علیہ الرحمہ:

آپ حضور شیخ القرآن کے رفیق درس اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے چہیتے شاگرد تھے، آپ کی شخصیت علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، حلقۂ درس کی رفاقت کا آپ نے

اتنا پاس ولحاظ فرمایا کہ جس کی نظیر مشکل سے دستیاب ہوگی۔

ممبئی میں دوران علاج آپ ہی کے فلیٹ میں حضرت قیام فرماتے تھے اور دوران قیام حضرت اور ان کے خدام کی ضیافت پیر طریقت اپنے ذمۂ کرم پر رکھتے تھے۔

حضرت علامہ محمد شفیق الرحمٰن عزیزی، کنوینر ورلڈ اسلامک مشن و مفتی اعظم ہالینڈ:

حضرت علامہ موصوف عرصۂ دراز سے ہندوستان سے باہر اسلام وسنیت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، فی الحال علیمیہ کے سر براہ اعلی اور ہالینڈ کے مفتی اعظم ہیں، یہ بھی حضرت کی خبر گیری فرماتے رہتے تھے، ان کے ایک بیان کے مطابق شیخ القرآن صاحب کے سیکڑوں خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں، اس سے ان دونوں کے درمیان گہرے روابط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت علامہ محمد قمر عالم قادری، شیخ الحدیث دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی:

حضرت شیخ القرآن صاحب کی اِیما وتحریک پر حضرت علامہ موصوف دارالعلوم علیمیہ میں تشریف لائے، فی الحال آپ علیمیہ کے شیخ الحدیث اور قابل فخر استاذ ہیں، یہ حضرت کے گہرے عقیدت مند شاگرد ہیں، جن پر خود حضرت کو بڑا فخر تھا۔

حضرت علامہ ڈاکٹر محمد معراج الحق صاحب بغدادی، استاذ دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی:

حضرت مولانا معراج الحق صاحب دور طالب علمی میں حضرت کے خادم خاص تھے، اور ان کی خدمت سے متاثر ہوکر حضرت شیخ القرآن نے انھیں متبنّٰی ہونے کا شرف بخشا تھا۔

بغداد شریف میں دورانِ تعلیم حضرت ان کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کی تدابیر فرماتے رہتے تھے، بعد میں بھی حضرت کی نوازشات سے وہ حصہ پاتے رہے اور انھوں نے

بھی اپنی بساط کے مطابق اخیر تک حضرت کی خدمت کی۔

حضرت مولانا صوفی عبدالمطلب صاحب علیمی

(مہتمم فقہ اسلامی ریسرچ سنٹر، رائے پور، چھتیس گڑھ)

انھوں نے ایک طویل عرصہ تک حضرت کی خدمت کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی برابر رابطہ برقرار رکھا اور اپنی حیثیت کے مطابق علاج ومعالجہ میں تعاون پیش کرتے۔

حضرت کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے رائے پور چھتیس گڑھ سے جمدا شاہی آئے اور الہ آباد سے اس لیے گاڑی ریزرو کر کے آئے تاکہ جنازے میں شرکت سے محرومی نہ ہو، حالانکہ مالی اعتبار سے وہ اس کے متحمل نہ تھے، افسوس کہ جنازے میں شرکت نہ کر سکے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

عبداللہ امجدی (سابق متعلم دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی):

مسلسل تین سالوں تک متعلم عبداللہ امجدی نے حضرت شیخ القرآن کی بڑی مثالی خدمت کی ہے، سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہ کر مقررہ وقت پر دوا وغیرہ دینا اور دیگر انتظامات سرانجام دینے کی سعادت اس طالب علم کو حاصل ہے، اس طالب علم کی خدمت سے حضرت بہت مسرور رہا کرتے تھے۔

عالی جناب الحاج سیٹھ وصی الدین خان، جمدا شاہی:

اللہ جل شانہ نے الحاج سیٹھ موصوف کو دولت وسرمایہ سے نوازا ہے، ان کے والد گرامی عالی جناب الحاج معین الدین خان صاحب حضرت کے بڑے عقیدت کیش تھے، اپنے والد کی روش پر چلتے ہوئے آپ اور آپ کے برادران نے حضرت کی حتی المقدر خدمت کی ہے۔

حضرت کو جمدا شاہی دوبارہ لانے میں ان کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، اپنی تمام تر کاروباری مصروفیتوں کے باوجود ممبئی سے بذریعہ ہوائی جہاز سفر کر کے جنازہ میں شرکت کی،

اور آخری ایام میں زیر علاج رہنے سے حضور شیخ القرآن علیہ الرحمہ کے ذمہ جس معالج ڈاکٹر کے واجبات تھے جو ایک خطیر رقم تھی، انھوں نے بڑی سعادت مندی اور خندہ پیشانی سے ادا کرنے کا ذمہ اٹھایا۔ زیر نظر کتاب آپ ہی کی خواہش اور غیر معمولی دلچسپی سے معرض وجود میں آئی ہے، اس کی تیاری میں آپ کے بہت سارے مفید مشورے بھی شامل ہیں، اس کی اشاعت وطباعت کے جملہ اخراجات آپ ہی نے برداشت کیے ہیں، اللہ تعالی آپ کو سلامت رکھے، حضور شیخ القرآن کے فیوض وبرکات سے مالا مال فرمائے اور اخلاص کے ساتھ مزید خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ (ماخوذ از مقالہ "شیخ القرآن حیات وخدمات" ماہنامہ پیام حرم جولائی واگست ۲۰۰۹ء)

شیخ القرآن اربابِ علم ودانش کی نظر میں

قائدِ اہل سنت، حضرت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ:

گرامی قدر، محترم، جناب حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوں گے، گرامی نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، یورپ کے تبلیغی دورے کی وجہ سے نومبر میں انڈیا کا پروگرام نہ بن سکا، ان شاءاللہ !اولین فرصت میں آنے کی سعی کروں گا۔

جامعہ علیمیہ کے لیے آپ کی کاوشیں وخدمات نا قابلِ فراموش اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور دارین میں اس کا اجر عطا فرمائے، آمین! **بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم**۔

جامعہ کے طلبہ کو بغداد بھیجنے میں آپ نے جو کچھ کیا ہے، وہ صدقۂ جاریہ ہے۔ **ان شاء اللہ**، آپ اس کے اجر سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔ جو طلبہ بغداد شریف میں زیر تعلیم ہیں، ان کے انتظامات کے سلسلے میں بات چیت ہو چکی ہے، آپ فکر نہ فرمائیں، **ان شاءاللہ** وہ تعلیم جاری رکھیں گے۔

مولانا معراج الحق سلمہٗ چار سالہ کورس پورا کرنے کے بعد واپس آئیں تو آپ ان سے ان کے علمی استعداد کے مطابق کام لیں۔

میری رائے ہے کہ مولانا احمد رضا سلمہٗ کو اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے، انتظامات کے بارے میں آپ فکر مند نہ ہوں۔

احباب و پرسانِ حال کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام عرض ہے، آپ مجھ فقیر کو دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ **والسلام**۔

فقیر شاہ احمد نورانی، صدیقی **غفرلہ**

کراچی، ۲۶ شعبان ۱۴۱۸ھ/ ۲ دسمبر ۱۹۹۷

شیخ الاسلام والمسلمین، حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں الاشرفی الجیلانی

دامت برکاتھم القدسیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی:

فاضل جلیل الشان، شیخ القرآن، علامہ عبداللہ خان **علیہ الرحمۃ والرضوان** کے سانحۂ ارتحال کی خبر نے بے حد افسردہ کیا، زبان پر کلمۂ استرجاع جاری ہوگیا، علامہ موصوف **علیہ الرحمہ** کو میں ان کے عہد طالب علمی ہی سے جانتا ہوں، دارالعلوم اشرفیہ میں میں مبتدی متعلمین میں سے تھا، اور اس وقت آپ منتہی طلبہ میں تھے، اور صلاحیت ولیاقت میں اس عہد کے طلبہ میں سب سے ممتاز تھے، فراغت کے بعد انھوں نے جو علمی اور تدریسی خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، علامہ موصوف کی گراں قدر تصنیفات آپ کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی، مزید برآں سیکڑوں لائق وفائق تلامذہ آپ کی علمی یادگار ہیں، اور خاص کر کے دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی آپ کے مساعی جمیلہ کی شان دار نشانی ہے، حافظ ملت **علیہ الرحمہ** کی نسبت سے آپ اپنے کو ''عزیزی'' کہتے رہے، اور اسی عزیزیت کے ناطے آپ اشرفی بھی تھے، اور آپ کو اپنی اشرفیت کا کامل احساس بھی تھا، اسی لیے آپ خورد وکلاں اور اپنے پرائے کے لیے ہر دل عزیز تھے، تو دوسری طرف اپنے معاصر علما میں اشرف بھی تھے، بے شک آپ عزیزی تھے، عزیز القدر تھے، صاحب اعزاز تھے، عزت آپ کے دامن سے وابستہ ہوئی، اور ہمیشہ وابستہ رہی اور آج بھی **بفضلہ تعالی** ہم رشتہ ہے، دعا گو ہوں کہ مولیٰ تعالی آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور آپ کے لافانی فیوض وبرکات کو جاری وساری رکھے، اور سارے وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔**آمین یامجیب السائلین، بحق طه ویٰس و بحرمة سیدالمرسلین وصلی اللہ تعالی علیه وآله وصحبه وسلم۔**

رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری صاحب علیہ الرحمہ

’’ان ہی ایام میں جب آپ رحمت وانوار کی بارش میں نہار رہے ہوں گے میں بھی پانی میں بھیگتا آپ کی جلوہ گاہ علم وفضل میں پہنچا، آپ نے ایک وادی بے گیاہ کو جس حسن اخلاق وتدبیر سے گلہائے رنگا رنگ کا لالہ زار بنادیا ہے، اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا، اشرفیہ میں تو ایک باکمال مدرس کی حیثیت سے آپ البتہ جانے پہچانے جاتے تھے، لیکن یہاں پہنچ کر ایک بہترین منتظم کا پیکر آپ کو کہاں سے مل گیا، یہ ہنر آپ نے کس کونے میں چھپا رکھا تھا، خدائے قدیر آپ کے اَمثال ہماری جماعت میں پیدا فرمائے، سچ یہ ہے کہ علمی لیاقت اور انتظامی صلاحیت دونوں کا اقتران بہت مشکل ہوتا ہے اور جہاں ہوجاتا ہے اسے ہزاروں اور لاکھوں میں ایک کہتے ہیں، خدائے غافر وقدیر آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ بہت دنوں تک ہمارے درمیان زندہ رکھے اور آپ کے فیوض وبرکات کا بادل ہماری امیدوں کی کھیتیوں پر برستا رہے۔ آمین!‘‘

بحر العلوم، حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی صاحب علیہ الرحمہ

’’ہمارے مکرم ومحترم، حضرت مولانائے ذی جاہ، محمد عبداللہ خاں صاحب عزیزی، گونڈوی، شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، ہر طرح اس کے اہل اور مستحق ہیں کہ ان امور میں اہل اسلام کی رہنمائی فرمائیں کہ قرآن عظیم آپ کی ذاتی دلچسپی کا خصوصی مضمون ہے، حدیث وفقہ آپ نے زندگی بھر پڑھائی ہے، قانون اسلام پر مبصرانہ نگاہ ہے، اور موجودہ معاشی مسائل سے بھی آپ غافل نہیں، ہندوستان میں موجودہ علمائے اہل سنت میں آپ کی شخصیت امتیازی شان رکھتی ہے‘‘۔

حضرت علامہ غلام عبد القادر علوی، ناظم اعلیٰ دار العلوم فیض الرسول، براؤں شریف۔

مجھے حضرت شیخ القرآن صاحب علیہ الرحمہ سے شرفِ تلمذ پر فخر ہے، اور یہ بات بھی

میرے لیے قابل فخر ہے کہ حضرت اخیر عمر تک میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے، مجھے یاد آتا ہے کہ دور طالب علمی میں حضور والا ہم لوگوں کی معمولی کامیابی پر اپنی مسرتوں کا اظہار فرماتے تھے، اگر آج میرے اندر کچھ فضل وکمال ہے تو اس میں میرے اساتذۂ کرام کی شفقتوں اور حوصلہ افزائیوں کا بڑا دخل ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرسکا، لیکن تدفین کے بعد ہی سہی ان کی آستاں بوسی میرے لئے باعث سعادت ہے، رب کریم ان کی تربت انور پر رحمت ونور کی بارش فرمائے آمین!

حضرت علامہ غلام محی الدین سبحانی صاحب قدس سرہ، بانی دارالعلوم اہل سنت اعجاز مصطفیٰ، قدم رسول شریف، قصبہ گوراچوکی، گونڈہ، یوپی

حضرت استاذ العلما، سندالمدرسین، شیخ القرآن، علامہ عبداللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ اپنے دور کے ممتاز استاذ تھے، عالم شباب میں ملک وبیرون ملک کی عظیم دینی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور کے بہت اچھے استاذ رہ چکے تھے، جلالۃ العلم، حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید تھے، بابائے قوم وملت محافظ سنیت علامہ مفتی عتیق الرحمٰن علیہ الرحمہ کے بھی شاگرد تھے۔

آپ کے وصال پر ملال سے صرف دارالعلوم علیمیہ ہی کو غم نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو غم ہے، اللہ رب العزت اپنے حبیب پاک **علیہ السلام** کے صدقے میں آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کی قبر پر رحمت ونور کی بارش فرمائے، **آمین !بجاہ حبیبہ الکریم**۔

حضرت علامہ مفتی عبدالسلام صاحب قبلہ، تلشی پور:

حضرت شیخ القرآن صاحب قبلہ **نوراللہ مرقدہ** علم کے وہ کوہ گراں تھے، جس کے انوار وتجلیات ہر چہار جانب پھیلے ہوئے ہیں، معقولات ومنقولات بالخصوص فن تفسیر میں آپ

کو ید طولیٰ حاصل تھا، اسی فن تفسیر میں انفرادیت کی وجہ سے آپ کو شیخ القرآن کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ القرآن صاحب **نوراللہ مرقدہ** کا خصوصی کرم مجھ پر تھا، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں جس وقت میں طالب علم تھا، حضرت خاص کرم فرماتے اور حضرت نے دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی میں اپنے زیر سایۂ کرم تدریس کا موقع کامل طور پر عطا فرمایا، یہ حضرت کی خوردنوازی ہے، یہ خوبی حضرت شیخ القرآن صاحب کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھی، حضرت شیخ القرآن صاحب **نوراللہ مرقدہ** نے جمدا شاہی میں قدم رکھتے ہی اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے دارالعلوم علیمیہ کو ترقی کی راہ پر کامل طور پر گامزن فرمادیا، تعلیم، خاص طور پر لائبریری کے فروغ وارتقا کی طرف کامل طور پر توجہ فرمایا اور اس کو اوج ثریا پر پہنچادیا، بہر کیف دارالعلوم علیمیہ کا کامل باغ و بہار، یہ حضرت شیخ القرآن صاحب قبلہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

خداوند قدوس حضرت کا فیض جاری وساری فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔آمین!

دعاجو: عبدالسلام قادری عفی عنہ

حضرت علامہ محمد سعید نورانی صاحب، ہنومان گنج

حضور شیخ القرآن **قدس سرہ** کو تمام علوم مروجہ پر درک حاصل تھا، لیکن علم تفسیر اور علم کلام میں اپنی مثال آپ تھے، علوم قرآن وتفسیر کے نکات کے بیانات سے متاثر ہوکر دارالعلوم علیمیہ کے سابق پرنسپل، فضیلۃ الاستاذ، الحاج علامہ فروغ احمد صاحب اعظمی نے انھیں ''شیخ القرآن'' کے لقب سے ملقب کرنے کا مشورہ اساتذۂ دارالعلوم کی خدمت میں پیش کیا، اور سبھی اساتذۂ کرام نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اتفاق رائے سے قبول کیا، پھر کیا تھا کہ گویا وہ لقب آپ کے نام کے ساتھ ایسا مشہور ہوا کہ فی زمانہ شیخ القرآن جہاں کہیں بھی بولا جاتا ہے حضور والا ہی کی جانب لوگوں کا ذہن ودماغ جاتا ہے۔

دعا ہے کہ رب قدیر ہم سب غم زدہ عقیدت مندوں کو صبر جمیل عطا فرما کر ان کا نعم البدل نصیب فرمائے اور ان کی تربت پر رحمت وانوار کی بارش فرمائے۔**آمین! بجاہ النبی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ اجمعین۔**

۲۰/شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۲/جولائی ۲۰۱۱ء

حضرت مولانا نور الہدی مصباحی نور اللہ مرقدہ، دھرم سنگھوا

ہمارے تمام اساتذہ الحمدللہ مشفق واقع ہوئے ہیں، جس دن حضرت اشرفیہ سے تشریف لائے اسی دن میں داخلہ کی غرض سے علیمیہ گیا تھا، حضرت نے مجھے ثانیہ کے لائق قرار دیا، بعد میں حضرت علامہ شفیق الرحمٰن صاحب نے بھی مجھے اسی جماعت کے لائق قرار دیا۔

حضرت تعلیم کے معاملے میں بہت سخت تھے، بغیر مطالعہ نہ سبق پڑھاتے نہ کسی کو پڑھانے دیتے، میں اکثر حضرت کی خدمت کرتا، دوران خدمت حضرت مجھ سے کسی فن یا کتاب کے بارے میں سوال فرماتے، اوراس طرح میرا سبق پختہ ہوجاتا۔

طلبہ پر بڑے رحم دل تھے، تعطیل کلاں میں جب گھر جاتے تو تمام طلبہ کو اکٹھا کر کے ان سے معافی مانگتے، طلبہ کا کھانا گھٹ جاتا تو فکر مند ہوجاتے۔علیمیہ کی تعمیر وترقی کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔

باب دوم

قلمی رشحات

قرآن حکیم کی حیرت انگیز تاثیر کے تاریخی شواہد

قرآن عزیز وہ مقدس کتاب مبین ہے جو انسانی قلوب کو مسخر کرتی ہے، ان کے دلوں سے شکوک واوہام کی تاریکیوں کو دور کر کے ان کو روشن ومنور کرتی ہے، اس کے انقلاب آفریں تصورات، عقائدو مبادیات، اصول اولاد آدم کے اندر بڑی دوررس تبدیلی پیدا کرتے ہیں، اور حیات انسانی کے ہر گوشے کے متعلق راہ عمل متعین کرتے ہیں، اس کا حسن و جمال اور خوبی وکمال لازوال ہے، ہر قرن، ہر زمانے کے انسانوں کے لئے خدائے برتر وتوانا کی جانب سے ایک ابدی پیغام ہدایت ہے، اس لئے ان کو امن وسلامتی، طمانیت وسکون قلب میسر ہوتا ہے۔

لیکن امت مسلمہ کی سب سے بڑی شقاوت و بدبختی یہ ہے کہ حیات بخش کتاب مقدس سے مستفید ہونے اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کے بجائے اس سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے، وہ اپنے معجزانہ اسلوب بیان سے ہمہ دم، ہمہ وقت اپنی طرف ملتفت ہونے کی ترغیب دیتی ہے، مگر ہم اس کو سنتے ضرور ہیں اور عمل نہیں کرتے، تلاوت ضرور کرتے ہیں لیکن ہمارے اندر کوئی تاثر نہیں پیدا ہوتا، نہ ہمارے اندر جوش عمل ہوتا ہے اور نہ سوز و گداز، حالاں کہ یہ وہ پر تاثیر کتاب الٰہی ہے کہ اگر اس کے معاندین کے کانوں میں اس کی صدائے حق پہنچ گئی (اور اس کی فطرت اس قدر مسخ نہ ہوئی تھی کہ اس میں اثر پذیری کی صلاحیت نہ رہ گئی ہو) تو ان کے دلوں میں بھی حیرت انگیز غیر معمولی اثر پیدا ہوا، خود قرآن حکیم نے اپنی تاثیری قوت کا بیان اس طرح فرمایا:

﴿مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ. لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ وَ أَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَ أَنْتُمْ تُبْصِرُونَ﴾ (الانبیاء:۔۲۔۳)

جب ان کے رب کے پاس سے انہیں کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو اسے نہیں سنتے ہیں مگر کھیلتے ہوئے، ان کے دل کھیل میں پڑے ہیں اور ظالموں نے آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ یہ کون ہے ایک تم ہی جیسے آدمی تو ہیں، کیا جادو کے پاس جاتے ہو دیکھ بھال کر۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ آپ کے مخالف و معاند آپ کے لائے ہوئے کلام الٰہی کی تاثیر سے انکار نہ کر سکے لیکن چوں کہ اعتراف حقیقت کے لئے تیار نہیں تھے اس لیے کہتے تھے کہ یہ جادو ہے، اس کے قریب نہیں جانا چاہیے، جہاں اس کے قریب گئے اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، گویا وہ اپنی کج فہمی کی وجہ سے اس کی تاثیر کی توجیہ جادو سے کرتے تھے۔

ایک دوسری آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کے قول کو نقل کیا ہے کہ:

﴿وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (سورۃ الاحقاف:۷)

جب ان کافروں پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ سچائی کے آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ذہن وشعور پر اس کا اثر مرتب ہوتا ہے، یہ اثر آفرینی خدائے پاک کے کلام ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک کھلے ہوئے جادو کا کرشمہ ہے۔

انسان اگر کسی شے کے اثر و نتیجے کو دیکھ رہا ہو، یا محسوس کر رہا ہو اور اپنی نادانی کی بنا پر اس کی عقل توجیہ سے درماندہ و عاجز رہ جائے تو ایسی حالت میں اس قسم کی بے بنیاد باتوں سے اپنے لئے سامان تسکین فراہم کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی معاندین اسلام میں سے وہ لوگ جو قرآن حکیم کی اثر آفرینی کو محسوس کر رہے تھے مگر یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ اس کے اثرات کیا مرتب ہو رہے ہیں، یہ دلوں میں سوز و گداز کیوں پیدا کر رہا ہے یہ ذہن انسانی کو براہ راست کیسے اپیل کر رہا ہے، یہ

انسانی ضمیر کو کیسے جھنجھوڑ رہا ہے، یہ مردہ دلوں کے اندر زندگی وحیات کی حرارت کیسے پیدا کر رہا ہے، وہ اپنی حیرت واستعجاب کے عالم میں یہ کہہ کر اپنے کو فریب میں مبتلا رکھتے تھے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

اس لیے ہم اپنے ناظرین کرام کے سامنے قرآن حکیم کی حیرت انگیز تاثیر کے تاریخی شواہد پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ طبع سلیم کے سوز و گداز، جذب وشوق کے لیے یہ مقدس کتاب کیسا نسخۂ کیمیا ہے۔

(۱) یہ تذکرہ اس وقت کا ہے جب اسلام کے سرفروشوں و جانبازوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی تھی، کفار ومشرکین اس وقت عجیب حیرت کے عالم میں تھے، اسلام کا مشہور معاند اور قریش کا سردار عتبہ بن ربیعہ قریش کے مجلس میں آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے، بلند آواز سے پکار کر کہا اے معشر قریش کیا میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر گفتگو نہ کروں اور ان کے سامنے چند اُمور پیش نہ کروں، ممکن ہے ان امور میں سے بعض کو وہ قبول کرلے اور اس کے بدلے میں جو چاہے ہم اس کو دے دیں، اس طرح اس اذیت ناک حالت سے ہم کو رہائی مل جائے گی، سرداران قریش نے ایک آواز ہو کر کہا ان کے پاس جا کر گفتگو کرو، ہم کو تمہارے اوپر مکمل اعتماد ہے، عتبہ بن ربیعہ سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ کے قریب بیٹھ کر کہا: اے بھتیجے! ہمارے یہاں تجھ کو جو عزت حاصل تھی تم خود جانتے ہو اور نسب میں بھی تم ایک شریف گھرانے کے فرد ہو، تم نے اپنی قوم کو ایک بلائے عظیم میں گرفتار کر رکھا ہے، تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے، قوم کے صائب الرائے لوگوں کو بے وقوفی کی طرف منسوب کیا ہے، ان کے دین اور معبودوں کی برائی کی ہے، جو باپ دادا مر چکے ہیں ان کو کافر گمراہ بتایا ہے، تم میری باتوں کو غور سے سنو، شاید تم کو کوئی بات قابل قبول ہو، سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے ارشاد فرمایا: اے ابوالولید (عتبہ بن ربیعہ) جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو بے جھجک کہو، اس نے کہا: اے بھتیجے! اگر ان باتوں سے جن سے قوم میں اختلاف رونما ہوگیا ہے دنیا کی دولت جمع کرنا

چاہتے ہوتوتم کوسب سے زیادہ مال دار بنا سکتے ہیں، اگر سرداری کا سوداذہن میں ہوتو ہم سب تم کواپنا سردارتسلیم کرتے ہیں، اگرتم بادشاہت چاہتے ہوتو ہم نے تم کواپنا بادشاہ مان لیا، اگرتم کوکوئی بیماری ہوگئی ہے جس کی وجہ سے تم کوواقعی سوتے جاگتے میں کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم سب مل کر بہترین طبیبوں سے تمہارا علاج کروادیتے ہیں، یہ اپنی پرجوش تقریر کررہا تھا اور حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سنتے رہے، جب وہ اپنی باتیں ختم کرچکا تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی باتیں کرچکے یااور کچھ رہ گیا ہے، اس نے کہا میں نے اپنی باتیں پوری کرلی ہیں، آپ نے فرمایا: اب مجھ سے سنو، اور "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**"۔"**حٰمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم کتٰب فصلت اٰیٰته قرآناً عربیاًلقوم یعلمون**" پڑھا، اس کے بعد دیر تک مسلسل آپ سورۂ "**حٰمٓ، السجدہ**" کی تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ بن ربیعہ پیچھے زمین پر ہاتھ لگا کرغور سے سنتا رہا، آپ نے سجدہ کی آیت پر پہنچ کر سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر عتبہ سے فرمایا کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔

عتبہ بن ربیعہ سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کے پاس سے اٹھ کرسرداران قریش کے پاس پلٹا تو لوگوں نے دور ہی سے آتا دیکھ کر کہا: خدا کی قسم ابوالولید کا چہرہ متغیر ہے، یہ وہ صورت نہیں ہے جس کو لے کر گیا تھا، اس کے پہنچتے ہی لوگوں نے سوال کیا: کہو ابوالولید کیا کر کے آئے؟ اس نے کہا خدا کی قسم آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے نہیں سنا تھا، خدا کی قسم نہ تو وہ شعر ہے نہ وہ سحر وجادوگری ہے، نہ کہانت ہے، اے معشر قریش! میری بات مان لو اور ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو، میں نے ان کی جو باتیں سنیں ہے بالآخر وہ رنگ لاکر رہیں گی، اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو جو کام تم کرنا چاہتے تھے اس کو دوسروں نے تمہاری طرف سے پورا کردیا، تم پر اس کے خون ناحق کی ذمہ داری نہ ہوگی اور اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی وجہ سے تمہاری عزت ہوگی، اس کی بادشاہت تمہاری بادشاہت ہوگی، اور اس کے سبب تم لوگوں میں کامیاب تر رہو گے، لوگوں نے کہا: خدا کی قسم! ابوالولید پر اس نے اپنی زبان سے جادو کردیا، عتبہ بن ربیعہ نے کہا: یہ میری رائے ہے، آگے تم جانو تمہارا کام۔(سیرت ابن ہشام، ج اول، ص: ۲۹۴)۔

اس تاریخی واقعے کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے کہ عتبہ بن ربیعہ کے اس قول کو کہ خدا کی قسم نہ تو وہ شعر ہے، نہ وہ سحر وجادوگری ہے، نہ کہانت ہے، بظاہر ایک معاند کا کلام کہا جاسکتا ہے، حالاں کہ ایک مشہور دشمن اسلام کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں، کس چیز نے اس کو اس درجہ متاثر کردیا تھا کہ اس نے سرکار دوعالم **صلی اللہ علیہ وسلم** کی زبان سے قرآن حکیم کی چند آیتیں سن لیں تو اس کے وجدان نے یہ شہادت دی کہ قرآن حکیم کے جس پیغام کو پیغمبر اسلام ﷺ لوگوں کے پاس پہنچانا چاہتے ہیں اور جس کو ماننے کے لیے آج دنیائے عرب کسی طرح تیار نہیں ہے، بالآخر اپنا رنگ دکھلا کر رہے گا، اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اس کا پیغام حق سارے عرب میں پھیل کر رہے گا۔

قرآن حکیم کی تاثیر کی قوت تھی جو اس کے دل کو دہلا رہی تھی جس سے اس کے مردہ ضمیر سے صداقت کی آواز بلند ہورہی تھی۔

(۲) دعوتِ اسلام کے زور پکڑنے پر سرداران قریش سخت حیرانی میں گرفتار تھے، انھیں پریشانی یہ تھی کہ جتنا ہی اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اتنا ہی اس کی اشاعت روز بروز بڑھ رہی ہے، پھر جو باتیں سرکار **علیہ الصلوٰۃ والتسلیم** کے خلاف گڑھ گڑھ کر بیان کرتے تھے ان پر خود ان کے دلوں کا جماؤ نہیں تھا، کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ شخص جادوگر ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ کلام اس نے خود گڑھ لیا ہے اور کہتا ہے خدا کا کلام ہے، کبھی سرکار کے ارشاداتِ عالیہ کو دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات سے تعبیر کیا جاتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے یہ شاعرانہ تخیلات اور تک بندیاں ہیں، جن کا نام اس نے کلام الٰہی رکھا ہے۔

ان کے انھی اقوال کو قرآن حکیم نے ان کی تردید کے لیے نقل کیا ہے:

﴿بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ (سورۃ الانبیا:۵)

بلکہ بولے کہ پریشان خواب ہیں، بلکہ ان کی گڑھت ہے، بلکہ یہ شاعر ہیں، تو ہمارے پاس کوئی نشانی لائیں جیسے اگلے بھیجے گئے تھے۔

سچی بات یا وحی الٰہی کو غلط تعبیرات کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے روکنا چاہتے تھے، لیکن اس قسم کی مہم بازی سے ان کا کام چلتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا، اس لیے وہ اپنی بعض محفلوں میں اسلام کے خلاف تدبیروں میں بھی سچائی کی آواز کبھی بلند کردیا کرتے تھے، چنانچہ نضر ابن حارث نے جو اسلام اور مسلمانوں سے بڑھ کر سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کا دشمن تھا، اپنی ایک تقریر میں سردارانِ قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے معشر قریش! خدا کی قسم! اپنی پریشانیوں کے دفاع کے لیے اب تک تم نے جو تدبیر اختیار کی ہیں وہ کامیاب ہوتی نظر نہیں آرہی ہیں، تم لوگ محمد کا جس طرح مقابلہ کررہے ہو اس سے کام نہیں چل سکتا، بلاشبہہ وہ ہمارے درمیان جوان تھا، وہ سب سے زیادہ تمھارے اندر پسندیدہ اور نیک کردار تھا، تم میں سب سے زیادہ سچا تھا، سب سے بڑھ کر امین تصور کیا جاتا تھا، اب کہ تم اس کے رخسار پر بڑھاپے کے آثار دیکھ رہے ہو اور اس کے بال سفید ہونے کو آئے ہیں، تو تمھارے پاس جو باتیں وہ پیش کرتا ہے تم کہتے ہو وہ جادوگر ہے، خدا کی قسم! وہ جادوگر نہیں ہے، میں نے جادوگروں کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھا ہے، اور ان کے جھاڑ پھونک کو دیکھا ہے، تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، میں نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں، وہ گول مول باتیں کرتے ہیں، ان کو بھی جانتا ہوں، اور ان کی بناوٹی باتوں سے بھی واقف ہوں، تم کہتے ہو وہ شاعر ہے، بخدا! وہ شاعر بھی نہیں ہے، میں شعر کے تمام اصناف سے واقف ہوں، اس کا کلام اس کے کسی صنف میں نہیں آتا، تم کہتے ہو کہ وہ مجنون ہے، بخدا! وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جیسی حالت ہوتی ہے، اور جیسی بے تکی بڑ ہانکتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں، سردارانِ قریش! کچھ اور سوچو تمہیں جو معاملہ درپیش ہے وہ اس سے زیادہ بڑا ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اس کو شکست دے سکو۔

نضر بن حارث اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتنا بڑا دشمن تھا کہ اس نے اسلام کے خلاف مہم بازی کے لیے عجم سے اسفند یار اور رستم کے قصے لاکر عرب میں پھیلانے کی تجویز سردارانِ قریش کے سامنے پیش کی تھی بلکہ اس پر عمل بھی کیا تھا، مگر اس کی یہ ترکیب

قرآن حکیم کی تاثیری قوت کے مقابلے میں ٹک نہ سکی، اس کے الفاظ غور سے پڑھئے: تم کہتے ہو وہ جادوگر ہے، بخدا وہ جادوگر نہیں ہے، میں نے جادوگروں کو دیکھا ہے، اور ان کے جھاڑ پھونک سے واقف ہوں، تم کہتے ہو وہ کاہن ہے، بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں، اور جیسی وہ گول مول باتیں کرتے ہیں ان کا بھی علم ہے۔

کفار اور مشرکین کی جیسی تردید اس دشمن اسلام نے کی ہے وہ ان الفاظ سے بالکل عیاں ہے، وہی لوگ طرح طرح کے الزامات اور عجیب وغریب باتیں پیغمبر اسلام **صلی اللہ علیہ وسلم** اور ان کے لائے ہوئے پیغام کے متعلق کہتے تھے، انھیں کا ایک فرد پھر ان کی تردید کرتا ہے، صداقت کی روشنی سے منہ نہیں موڑا جاسکتا، سچائی کا عکس اس کے ذہن کے پردوں پر پڑ رہا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی ہزاروں دشمنی کے باوجود اس کو چھپا نہیں سکا۔

اس مقام پر سوچنا پڑتا ہے کہ کیسے ایک کافر معاند خود اپنے ہی لوگوں کی تردید کر رہا ہے، بات درحقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کا اُسلوبِ بیان پھر اس کے لانے والے کی جاذب نظر شخصیت اور قرآن حکیم کے اثر آفرینی کی قوت تھی جو اس کو تمام دوسری چیزوں سے ممتاز کر رہی تھی، اس لیے وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ شاعری کیسے ہوسکتی ہے، کہانت کیسے ہوسکتی ہے، یہ جادوگری کیسے ہوسکتی ہے، لیکن ضد اور معاندت کی وجہ سے اس کا ذہن عاجز وقاصر تھا کہ اس کو صحیح راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرے، اس لیے اس نے حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی کی، لیکن خود وہ اس کی راہ پر چل نہ سکا، یہ تھی قرآن عزیز کی تاثیر کی قوت جس سے متاثر ہوئے بغیر ایک معاند بھی نہ رہ سکا۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی مکہ معظّمہ میں اپنی کسی ضرورت سے تشریف لائے، وہ عقل مند اور شریف انسان تھے، ساتھ ہی ان کو شاعری کا بھی ملکہ تھا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** کی دعوت وتبلیغ کا اثر پھیل رہا تھا، صنادید قریش آپ کے مقابلے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، سرداران قریش نے ان سے مل کر اپنی لایعنی باتوں سے حضرت طفیل بن عمرو دوسی کو سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** سے بدظن کرنے

کی کوشش اس طرح کی کہ ہمارے شہر میں ایک ایسا آدمی ظاہر ہوا ہے جس نے ہم سب کو پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے، ہماری جماعت میں تفریق پیدا ہوگئی ہے، ہم سب انتشار اور بدامنی سے حیران ہیں، اس کا کلام جادو کا اثر رکھتا ہے، باپ، بیٹے، میاں، بیوی میں جدائی ڈال دی ہے، ہم کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس مصیبت میں ہم لوگ گرفتار ہیں وہی بلا تمھاری قوم پر نہ مسلط ہوجائے، اس لیے اس سے بات چیت نہ کرنا، اور نہ ہی اس کی باتیں سننا، حضرت شاعر اسلام طفیل بن عمرو دوسی کو اس قسم کی باتوں سے سخت بدظن کر دیا تھا۔

ان کا بیان ہے کہ میں نے عزم مصمم کرلیا تھا کہ محمد صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے نہ کلام کروں گا اور نہ ان کی باتیں سنوں گا، احتیاط کے پیش نظر انھوں نے اپنے کانوں میں روئی ڈال لی تھی، وہ کہتے ہیں کہ صبح کے وقت میں مسجد حرام میں گیا، رسول اللہ **صلی اللہ علیہ وسلم** کعبہ کے نزدیک کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے قریب کھڑا ہوگیا، کسی طرح ان کی باتیں ہمارے کانوں میں پڑگئیں، ان کے کلام سے میں بہت محظوظ ہوا، یہ تو بہت اچھا کلام ہے، آپ نے دل میں سوچا کہ خدا کی قسم! میں اچھے برے میں تمیز کرنے والا ایک شاعر ہوں، کیوں نہ اس کا کلام سنوں اور اگر ان کی باتیں اچھی ہوں تو ان کو قبول کر لوں، ورنہ ان سے دور رہوں گا، میں تھوڑی دیر تک ان کے پاس کھڑا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر کی طرف واپس ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے چلا، جب وہ گھر میں داخل ہو گئے تو میں بھی ان کے ساتھ داخل ہوگیا، اور کہا اے محمد! **صلی اللہ علیہ وسلم** آپ کے متعلق آپ کی قوم نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں، جن سے متاثر ہوکر میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی، آپ کا کلام نہایت عمدہ کلام تھا، میں نے اس کو سن لیا، اب آپ اپنی باتیں میرے اوپر پیش فرمائیں۔

سرکار دو عالم **صلی اللہ علیہ وسلم** نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن حکیم کی آیت کریمہ تلاوت فرمائی فوراً انھوں نے بے خودی کے عالم میں کہا: خدا کی قسم! اس سے بہتر کلام میں نے کبھی نہیں سنا تھا، اور کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے، پھر واپس جا کر اپنے

قبیلے میں اسلام کی تبلیغ شروع کی، مسلسل اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام کرتے رہے، یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے زمانے تک ان کے قبیلے کے ستر گھرانے اسلام لے آئے۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی ایک بلند پایہ شاعر تھے، ان کو شاعرانہ کلام کا خوب خوب تجربہ تھا، وہ اپنے فہم وفراست سے اچھے برے میں امتیاز کرنے والے انسان تھے، قرآن حکیم کی آیت کریمہ کو سن کر اور سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کی شخصیت سے متاثر ہو کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے ،کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ قرآن حکیم کا معجزانہ اُسلوب بیان دلوں کے اندر انقلاب پیدا کرنے کے لیے کافی ہے، یہ وحی الٰہی کی پرتاثیر کیفیت تھی جس نے ہزاروں پروپگنڈوں کے اثرات آنِ واحد میں ظاہر کر دیے، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ذوق سلیم اور طبع مستقیم کے لیے قرآن حکیم کی آیت کریمہ حیرت انگیز تاثیر رکھتی ہے، پس مسلمانوں کو چاہیے کہ ادبی ،لسانی کتابوں کے پڑھنے کے بجائے قرآن حکیم کی تلاوت سے اپنے ذہن ودماغ کو روشن ومنور کریں ،لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ عصر حاضر کی کج رویوں اور گمراہیوں نے مسلمانوں کے ذوق کو اس قدر پست کر دیا ہے کہ وہ ناول پڑھ سکتے ہیں، افسانے میں اپنا عزیز وقت ضائع کر سکتے ہیں ،اخباری خبروں کے لیے بے تاب رہتے ہیں ،اگر نہیں کر سکتے ہیں تو یہ کہ قرآن حکیم کی تلاوت کے لیے اپنا وقت نکال کر اپنی روح کو سرمدی سرور سے محظوظ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کی تلاوت کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

مقدمہ شرح بخاری ایک علمی شاہکار

حضرت علامہ ومولانا مفتی شریف الحق صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** سنی جماعت کے قائدانہ صلاحیت رکھنے والے ایک ایسے عالم دین تھے، جو اپنے ساٹھ سالہ دینی وعلمی خدمات سے ملت اسلامیہ کے ذہن وفکر پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں، انھوں نے کئی ہزار فتاوے اپنے متروکات میں چھوڑے ہیں، جن میں سے بعض مہمات مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، اور وہ ایک درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ،تدریسی اور تقریری کارناموں سے ہندوستان بھر میں معروف ومشہور ہیں ،لیکن انھوں نے اپنی سترہ سالہ محنت وکاوش سے علم حدیث کے بحر ذخار سے جو آبدار موتی برآمد کیے ہیں، ان کے تمام کارناموں پر بھاری ہیں، نہایت تحقیق وجستجو کے ساتھ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری کی ایک شرح لکھی وہ ان کی تابندہ علمی یادگار ہے ،اگر اس کتاب مقدس کی اس شرح ضخیم کو اسلامیان ہند کی وراثت علمی شمار کیا جائے ،تو کوئی بے جا جسارت نہ ہوگی۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عشق رسول کے بادۂ مستانہ سے سرشار ہوکر بخاری شریف کی تشریح وتوضیح میں اپنی جودتِ فکر، اصابتِ رائے کا نہ صرف مظاہرہ کیا ہے بلکہ اس عظیم المرتبت کتاب اور فن حدیث پر مقدمہ شرح بخاری کے عنوان سے ایک وسیع وعریض مقدمہ لکھا، جس سے ان کے وسعت نظر اور مطالعہ کی گہرائی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، وہ اردو زبان میں ایک نادر ونایاب شی کا اضافہ ہے، اب تک جتنے شروح پائے جارہے ہیں ان پر ان کی گہری نظر ہے، سب کو انھوں نے اپنے پیش نظر رکھا، اور بعض پر گراں قدر تبصرہ بھی لکھا، اور اس تبصرہ میں بڑی فراخ دلی اور دریا دلی سے بخاری شریف کی شرحوں پر فاضلانہ نظر ڈالی اور ان کی تحسین میں کوئی کوتاہی نہیں کی، کسی شرح پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی، بلکہ صرف ان کی علمی حیثیت کے اجاگر کرنے میں اپنے قلم کی روانی وجولانی دکھلائی، پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ

انھوں نے ''تسامحاتِ بخاری'' کا ایک الگ عنوان قائم کر کے امام بخاری جیسے عظیم المرتبت بلند پایہ محدث کے علمی کارناموں کے اجاگر کرنے کے بعد ان کی لغزشوں اور تسامحات پر کیوں روشنی ڈالی، وہ خود فرماتے ہیں کہ: ''انسان بہر حال انسان ہے، غلطی ولغزش ہو ہی جاتی ہے، اس قانون فطرت کے مطابق امام بخاری سے لغزشیں ہو گئیں الخ''۔

یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی فی الواقع صداقت پر مبنی ہے، تاہم دوسرے مصنفین اور شُراحِ حدیث کی لغزشوں سے جب مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صرف نظر کیا تھا، تو بظاہر ان کی شایان شان یہی بات تھی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق و محدث کی ذات مقدسہ سے بھی غض بصر کرتے، ان کے قلم حقیقت رقم کے لیے دوسرے بہت سارے مباحث تھے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ انھوں نے امام بخاری پر تنقیدی نگاہ ڈالی، جب کہ ان کے ساتھ بڑی عقیدت کا اظہار جا بجا کیا ہے، اس کی وجہ میری نگاہ میں یہ ہے کہ ہر مصنف خواہ وہ شرح حدیث لکھ رہا ہو یا قرآن کریم کی تفسیر میں اپنے مطالعہ کی گہرائی پیش کر رہا ہو، اس کی شخصیت کے آئینہ دار اس کے قلمی افکار ہوتے ہیں، جن میں ان کے خیالات وجذبات اور احساسات کا پرتو جمال نظر آتا ہے، اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک متصلب سنی ہی نہیں تھے بلکہ بہت اعلیٰ درجہ کے حنفی بھی تھے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مستطاب میں مسلک احناف کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ امام بخاری خواہ شافعی المسلک رہے ہوں یا حنبلی مسلک کے نمائندہ، انھوں نے حنفیوں پر کافی وار کیا ہے اور حنفی مسلک کو محدثین کے مسلک کے خلاف ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اگر چہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت وسطوت، ان کی دین داری و پرہیزگاری، ان کے علمی کمالات و کارنامے اور تحقیق وجستجو نیز ان کی کاوش فکر کے اعتراف میں کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے، انھوں نے جہاں مقدمہ میں امام بخاری کی حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے وہیں اپنی عقیدت و نیاز کی پیشانی ان کی بارگاہ میں جھکائے ہوئے نظر آتے ہیں، تاہم ایک حنفی ہونے کی وجہ سے ان کا جو اہم فریضہ تھا اس کی بجا آوری وانجام

دہی میں کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے استدلال جو حقائق کی روشنی میں درست نہیں قرار دیے جاسکتے ان کے بیان کرنے میں اپنے علمی کمال و دیانت کی بنا پر یہ ضروری تصور کیا کہ تسامحات کا عنوان قائم کر کے اس پر بھی اپنے قلم کو تیز گام کریں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر کوئی داغ دھبہ برقرار رکھنا نہیں چاہتے بلکہ جو لوگ اہل حدیث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ فی الواقع غیر مقلد ہیں اور بار بار امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی ورد زبان بنا کر اپنے غلط استدلال کو صحت کا رنگ روپ دینا چاہتے تھے، درحقیقت مفتی صاحب نے ان کی تردید میں اپنے کمالِ علمی کا مظاہرہ کیا، صحیح بات تو یہ ہے کہ شرح بخاری سے پہلے انھوں نے مقدمۂ شرح بخاری تالیف فرما کر غیر مقلدوں کے منہ میں لگام لگایا ہے، بلکہ اپنی جماعت پر احسان عظیم کیا ہے، اب تک اردو زبان میں جتنے شروح وحواشی پائے جارہے ہیں ان میں سے کسی میں ایسا مبسوط مقدمہ جس میں ہر پہلو و ہر جہت سے بحث کی گئی ہو مجھ کو نظر نہیں آیا۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی مبسوط کتابوں کا مطالعہ کیا، اردو، فارسی، عربی زبان پر ان کو کافی عبور تھا، اس لیے اپنے کاروانِ شوق کو ہر منزل کی طرف گامزن کیا، ہر جگہ گامزن کیا، ان کی نگاہ کی گہرائی کا یہ عالم ہے کہ جو بحث بھی اٹھاتے ہیں اس کو آخری حد تک پہنچا کر دم لیتے ہیں، مقدمہ کے جتنے عنوانات ومباحث ہیں سب پر سرسری نگاہ ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، وہ فن حدیث کے بحر بے کراں میں غوطہ زن ہوئے اور اس بحر ذخار سے موتی لاکر برآمد کیا، انھوں نے اصول حدیث اور شرح بخاری کی کتب مبسوطہ پر بڑی دل سوزی وجگر کاوی سے عبور حاصل کیا، اس لیے میرے نزدیک شرح بخاری کی خوبیاں اور اس کے خصائص محمودہ کیا کیا ہیں، ان پر دسترس حاصل کرنا تو میرے بس کی بات نہیں ہے لیکن میں نے اس کے مقدمات کو اپنے زیر مطالعہ رکھا اور بار بار میں نے اس کو گہری نظر سے پڑھا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ مقدمہ ان

کاعظیم الشان کارنامہ ہے، اور نہ یہ کہ صرف ان کے جملہ تصانیف پر بھاری ہے بلکہ یہ ایک ایسا علمی شاہ کار ہے جس کے پڑھنے سے اہل علم مصنف علام کی نگاہ کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، اور مصنف سے اپنی عقیدت کے اظہار میں اپنے وسعت قلبی کا مظاہرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے، کیوں کہ علمی دنیا کا یہ مقدمہ عظیم المرتبت کارنامہ ہے جس کی تہ تک پہنچنے کے لیے دانشوروں کو کافی گہرائی میں اترنا ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کی جامعات اور دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ اس علمی شاہکار کو اِستحسان کی نگاہ سے دیکھیں گے، دعا ہے کہ مولائے کریم مصنف علام رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا اجر جزیل وجمیل مرحمت فرمائے۔ آمین۔

تشریح حدیث

واللہ ماادری وانارسول اللہ مایفعل بی

شاہ معین الدین صاحب ندوی ،صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''کہ حضرت ام العلا انصاریہ (جن کے گھر میں انھوں نے وفات پائی)فرماتی ہیں کہ تجہیز وتکفین کے بعد جب جنازہ تیار ہوا توآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ،میں نے کہا کہ ابوسائب تم پر خدا کی رحمت ہو،میں گواہی دیتی ہوں کہ خدا نے تجھ کومعزز کیا،ارشاد ہوا کہ تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ خدا نے معزز کیا،میں نے عرض کیا کہ میرا باپ آپ پر فدا ہو پھر کس کومعزز کرے گا ،فرمایا:''کہ عثمان کو درجۂ یقین حاصل تھا''اوراس کی بہتری کی امید رکھتا ہوں،لیکن خدا کی قسم میں رسول خدا ہوکر بھی نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہوگا۔{مہاجرین ،ص۳۶۱تا۳۶۲،حصہ اوّل}

عبارت بالا میں بخاری شریف کتاب الجنائز جلد اول صفحہ۱۶۹ کی حدیث کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے،لیکن اولِ نظر میں خط کشیدہ الفاظ قابل غور ہیں:

(۱) یہ جملہ ''فرمایا کہ عثمان کو درجۂ یقین حاصل تھا''،''**فقال اماھو فقد جاءہ الیقین**'' کا مفہوم بتایا گیا، یہاں یقین کا لفظ ازالۂ شک کے معنی میں لیا گیا ہے،حالاں کہ ایسانہیں، چنانچہ آگے چل کر ہم ثابت کریں گے کہ یہ لفظ اس حدیث میں موت کے معنی میں لیا گیا ہے۔

(۲) لیکن ''خدا کی قسم میں رسول خدا ہوکر بھی نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہوگا'' یہ مفہوم حدیث کے جن الفاظ سے لیا گیا ہے وہ الفاظ یہ ہیں:''**واللہ ماادری و انارسول**

اللّٰہ مایفعل بی'' بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے مؤلف کے نزدیک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے انجام کا علم نہیں تھا، ورنہ ان الفاظ کی وضاحت ضرور کردی جاتی، یا حاشیہ میں بتادیا جاتا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا صحیح مطلب شارحین کے نزدیک کچھ اور ہے یہ ظاہری معنی مراد نہیں۔

میں اپنے اس مضمون میں واضح کروں گا کہ یہ بات قطعاً غلط ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاذ اللہ اپنے حسن انجام کے بارے میں تردد تھا، لیکن ان دونوں امروں پر بحث کرنے سے قبل مناسب خیال کرتا ہوں کہ ام العلا کی مکمل حدیث ناظرین کے سامنے آجائے، یہ حدیث پاک بخاری شریف کی کتاب الجنائز، کتاب الشہادات، کتاب التعبیر میں ذکر کی گئی ہے، لیکن یہ حدیث مختلف بابوں میں کچھ تغیر وتبدل کے ساتھ مروی ہے، اور شاہ معین الدین صاحب ندوی نے کتاب الجنائز کی حدیث پاک کا حوالہ دیا ہے، اس لیے مکمل بحث کے لیے ضروری قرار پایا کہ کتاب الجنائز کی پوری حدیث پاک ذکر کی جائے اور بقیہ ابواب کی احادیث کے ان الفاظ کو لیا جائے جن سے بحث مقصود ہے، کیوں کہ یہ الفاظ کچھ فرق کے ساتھ مروی ہیں۔

کتاب الجنائز کی حدیث یہ ہے:

(۱)عن ام العلاء ،وهى امراءةمن الانصاربايعت النبى صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، قالت:طارلنا عثمان بن مظعون حين اقترعت الانصار على سكنى المهاجرين، فانزلناه فى ابياتنا، فوجع وجعه الذى توفى فيه، فلما توفى وغسل وكفن فى اثوابه، فدخل رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فقلت رحمة الله عليك ابا السائب، فشهادتى عليك، لقد اكرمك الله، فقال النبى صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ومايدريك ان الله اكرمه، فقلت : بابى انت يارسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فمن يكرمه الله، فقال: اماهو فقد جاءه القين ،والله انى لارجو له الخير ،والله مادرى وانارسول الله مايفعل بى''۔الخ {بخارى شريف جلداول، ص:۱۶۶ }

ابن شہاب سے مروی ہے کہ حضرت ام العلا انصاریہ رضی اللہ عنہا جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی تھی، خارجہ بن زید کو بتایا کہ مہاجرین کے لیے قرعہ اندازی کی گئی، عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہمارے حصے میں آئے، چنانچہ انھیں اپنے گھر لائے، پھر وہ بیمار ہوگئے، اور اسی بیماری میں وفات پا گئے، تجہیز و تکفین ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، میں نے کہا کہ ابوسائب تم پر خدا کی رحمت ہو، تمہارے لیے گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں معزز کیا، ارشاد ہوا کہ تمھیں کیسے اندازہ ہوا، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معزز کیا؟ میں نے کہا: میرا باپ آپ پر فدا ہو، پھر کس کو اللہ تعالیٰ معزز فرمائے گا، آپ نے فرمایا بلاشبہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، اور بخدا میں ان کے لیے خیر کی توقع رکھتا ہوں، خدا کی قسم میں رسول خدا ہو کر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

کتاب الشہادات کی روایت یہ ہے:

(۲) فقال رسول اللہ ﷺ اما عثمان فقد جاءه واللہ الیقین وانی لارجوله الخیر واللہ مادری وانا رسول اللہ مایفعل به۔ {کتاب الشهادات، جلد 1، صفحه، ۳۶۹}

پس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان کو خدا کی قسم موت ہوگئی اور میں ان کے لیے بھلائی کی امید رکھتا ہوں، خدا کی قسم میں رسولِ خدا ہو کر بھی نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

کتاب التعبیر باب رویا النساء کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

(۳) فقال رسول اللہ ﷺ اما هو فواللہ لقد جاءه الیقین واللہ انی لارجوله الخیر واللہ مادری وانا رسول اللہ مایفعل بی۔ {ج ۲، ص ۱۰۳۷}

آپ نے ارشاد فرمایا کہ بخدا ان کو موت آ گئی اور خدا کی قسم میں ان کے لیے بھلائی کی امید رکھتا ہوں، اور خدا کی قسم میں رسول خدا ہو کر بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

(۴)حدثنا ابوالیمان، اخبرنا شعیب عن الزهری بهذا وقال ومادری مایفعل به۔ {بخاری شریف،جلد ثانی،صفحہ:۱۰۳۷}

ابوالیمان نے بیان کیا کہ ہم کو شعیب نے خبر دی وہ زہری سے اسی حدیث کو روایت کرتے ہیں اور زہری نے کہا: "**ومادری مایفعل به**" یعنی میں نہیں جانتا کہ عثمان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

کتاب التعبیر باب العین الجاریة فی المنام کے الفاظ یہ ہیں:

(۵)قال اماھو فقد جاءہ الیقین انی لارجولہ الخیر من اللہ واللہ ما ادری وانارسول اللہ مایفعل بی ولا بکم۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عثمان کو موت آ گئی، بلاشبہہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے بھلائی کی امید رکھتا ہوں، اور خدا کی قسم میں رسول خدا ہوکر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نے تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

ام العلا انصاریہ کی بخاری شریف میں مذکورہ پانچوں روایتوں کے زیر بحث الفاظ آپ کے سامنے ہیں، دو روایتوں کے الفاظ میں "**مایفعل به**" آیا ہے، اور تین روایتوں کے الفاظ میں "**مایفعل بی**" آیا ہے۔

ام العلا انصاریہ **رضی اللہ عنہا** کی حدیث کے سلسلے میں شاہ معین الدین صاحب ندوی سے دو لغزشیں ہوگئی ہیں۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد عالی: "**اماھو فقد جاءہ الیقین**" کا مفہوم شاہ ندوی صاحب نے یہ بتایا کہ عثمان کو درجۂ یقین حاصل تھا۔

جہاں تک تلاش وجستجو کا تعلق ہے کہیں بھی کسی شارح حدیث سے منقول یہ مفہوم نظر نہیں آیا بلکہ شراح احادیث اس یقین کا معنی موت بتاتے ہیں، اور لغت کی کتابوں میں بھی یقین کا معنی موت بتایا گیا ہے، چنانچہ قاموس جلد چہارم صفحہ ۲۱۳ میں ہے: "**والیقین ازاحة الشک کالیقین والموت**" قرآن عزیز کی آیت کریمہ: "**واعبد ربک حتیٰ یاتیک**

الیقین'' کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یقین کا معنی موت بتاتے ہیں۔

تفسیر کبیر جلد خامس صفحہ ۲۸۴، تفسیر ابوالسعود جو تفسیر کبیر کے حاشیہ پر ہے، اس میں بھی ''**حتیٰ یاتیک الیقین**'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''**ای الموت فانه متیقن اللحوق لکل حی مخلوق**'' یعنی یقین کے معنی موت کے ہیں کیوں کہ یہ متیقن ہے کہ موت ہر زندہ مخلوق کو لاحق ہونی ہے۔ {حاشیہ تفسیر کبیر، جلد ۶، صفحہ ۲۹۵}

مجمع بحارالانوار میں ہے کہ: ''**یاتیک الیقین ای الموت وحتیٰ یاتیک الیقین ای الموت**'' {جلد دوم، ص: ۵۰۳}

ان تمام وضاحتوں کے بعد بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب نے غور وفکر کے بغیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی: ''**اماھو فقد جاءہ الیقین**'' کا مطلب یہ بیان کیا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو درجۂ یقین حاصل تھا، اس طرح کے مفہوم ومعنیٰ کا بیان میرے نزدیک متکلم کے کلام کی تحریف معنوی ہے، جو اگر آیت کریمہ اور احادیث میں ہو تو گناہ عظیم کا درجہ رکھتی ہے، بشرطے کہ سہواً نہ ہوئی ہو۔

(۲) ''**واللہ ما ادری وانا رسول اللہ مایفعل بی**'' کا مطلب ندوی صاحب یہ لکھتے ہیں کہ خدا کی قسم میں رسول خدا ہو کر نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہوگا، اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات تک یعنی ۲ر ہجری تک سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے انجام کا علم نہیں تھا، یعنی اپنے بخشائش کے بارے میں تردد میں مبتلا تھے۔

عام طور سے ندوی حضرات کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں معمولی معمولی باتوں پر حاشیہ آرائی فرماتے ہیں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی پر مفہوم کی ادائیگی کے بعد حاشیۂ ذیلی میں ایک لفظ نہیں لکھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گویا ان کے نزدیک یہ عبارت بالکل بے غبار تھی، نہ اس مفہوم کے بیان کرنے سے شان نبوت پر کوئی حرف آتا اور نہ مسلمانوں کے عقیدہ پر کوئی اثر پڑتا، حالاں کہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے، لہٰذا ضروری

ہے کہ اس سلسلے کی ساری بحثیں جو شارحین حدیث نے بیان کی ہیں سامنے لائی جائیں تا کہ ندوی صاحب کی اس عبارت اور حدیث پاک کے ظاہری الفاظ سے جو غلط تاثر پیدا ہوتا ہے دور ہو جائے، اور صحیح بات منقح ہو کر سامنے آجائے۔

اس بحث میں پہلے اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا لفظ "**مایفعل بی**" صحیح ہے، یا "**مایفعل به**" پھر یہ غور کرنا ہے کہ اگر "**مایفعل بی**" ہی صحیح ہے تو اس کا مطلب شارحین حدیث نے کیا بیان کیا ہے، فتح الباری، عینی، تیسیر القاری سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح روایت "**مایفعل به**" ہے، چنانچہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کتاب الجنائز والی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

"**قال الداؤدی مایفعل بی وھمٌ والصواب مایفعل به ای بعثمان لانه لا یعلم من ذالک الا مایوحیٰ الیه**"۔ {عینی، جلد چہارم، صفحہ:۱۸}

داؤدی نے کہا ہے کہ: "**مایفعل بی**" وہم ہے، اور درست روایت "**مایفعل به**" ہے، یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا کیا جائے گا، کیوں کہ یہ ایسی بات ہے جو صرف وحی الٰہی سے جانی جاسکتی ہے۔

بلکہ امام بخاری بھی "**مایفعل بی**" کی روایت سے متفق نظر نہیں آتے، اسی لیے بخاری کتاب الجنائز، صفحہ ۱۶۶ پر لیث کی پوری حدیث روایت کرنے کے بعد معاً بطریق عقیل اس حدیث کا صرف یہی لفظ روایت کیا کہ عقیل کی روایت میں "**مایفعل به**" ہے، پھر عقیل کی تائید میں متابعات بھی ذکر کر دیں، چنانچہ فتح الباری شرح بخاری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رقم طراز ہیں کہ:

"**وفی روایة الکشمیھنی "به" وھو غلط منه، فان المحفوظ فی روایة اللیث ھذا، ولذالک عقب المصنف بروایة نافع بن یزید عن عقیل اللتی لفظھا مایفعل به، علق منھا ھذا القدر فقط اشارةً الی ان باقی الحدیث لم یختلف**"۔ {فتح الباری، ج ۳، ص ۹۳}

کشمیہنی کی روایت میں "بہٖ" ہے، وہ ان کی غلطی ہے، اس لیے کہ لیث کی محفوظ

روایت میں ''**مایفعل بی**'' ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے نافع بن یزید عن عقیل کی روایت کو بعد میں ذکر کیا، جس کے الفاظ ''**مایفعل به**'' ہیں، صرف اتنے الفاظ کو بطور تعلیق ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ باقی الفاظ حدیث میں اختلاف نہیں۔

تیسیر القاری میں علامہ نور الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ بالا مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''درصحت ایں روایت از لیث سخن کردہ است، اگر بصحت نہ پیوندد، چنانچہ مؤلف اشارہ کردہ است، بروایت نافع بن یزید کہ لفظ او ''**مایفعل به**'' ومتابعت شعیب وعمرو ابن دینار ومعمر تقویت کردہ از تکلفات توجیہات ایں روایت خلاصہ می کند''۔

لیث سے اس روایت کی صحت کے بارے میں کلام کیا ہے، اگر یہ روایت درست نہ قرار پائے جیسا کہ مؤلف نے نافع بن یزید کی روایت سے اشارہ کیا ہے، جن کے الفاظ ''**مایفعل به**'' ہیں اور شعیب وعمرو بن دینار ومعمر کی متابعت سے اس کی تقویت کی ہے، تو یہ روایت توجیہات کے تکلفات سے امام بخاری کے نزدیک بے غبار ہو جاتی ہے۔

ان تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا رسول اللہ **صلی اللہ علیہ وسلم** یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ام العلا تم حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے حسن انجام کی خبر دیتی ہو اور خدا کی قسم میں اُمید رکھتا ہوں کہ ان کے لیے بھلائی ہوگی، لیکن رسول ہوتے ہوئے میں قیاس وتخمین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، یہ بات صرف وحی الٰہی کے ذریعہ یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ اس حدیث کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انجام سے مطلقاً نہیں ہے، اگر ام العلا کی حدیث میں ''**مایفعل بہٖ**'' کے بجائے ''**مایفعل بی**'' صحیح ہو، یا ''**بہٖ**'' کا مرجع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلیم کر لیا جائے اور بخاری شریف کی ایک روایت جس میں ''**مایفعل بی**'' آیا ہے اور قرآن حکیم کی سورۂ احقاف کی موافقت کا لحاظ رکھا جائے تو اس وقت ضرور سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے انجام سے لاعلم رہے، اسلامی معتقدات کا

جسے معمولی علم بھی ہو وہ بتا سکتا ہے کہ انبیاے کرام کے مدارج اعزاز کیا ہیں، ان کے حسن انجام سے ایک معمولی مسلمان بھی واقف ہے، پھر سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے کیوں کر ناواقف رہ سکتے ہیں، اس لیے روایت کی توجیہ ضروری ہے۔

علامہ ملا علی قاری ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"قال التورپشی: لا یجوز حمل هذا الحدیث وما ورد فی معناه علی ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان مترددا فی عاقبة امره غیر متیقن بحاله عنداللّٰه من الحسنیٰ لما ورد عنه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الاحادیث الصحاح التی ینقطع العذر دونها بخلاف ذالک وانیٰ یحمل علی ذالک وهو المخبر من اللّٰه تعالیٰ انه یبلغه المقام المحمود وانه اکرم الخلائق علی اللّٰه تعالیٰ وانه اوّل شافع واوّل مشفع الی غیر ذالک"۔ {مرقاۃ، جلد خامس، ص:۱۰۷}

تورپشی نے کہا کہ یہ حدیث پاک اور اس کے ہم معنی احادیث کا اس بات پر حمل کرنا جائز نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے حسن انجام کے بارے میں تردد تھا، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن انجام کے بارے میں اتنی صحیح حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس خلاف عذر کی کوئی گنجائش نہیں، اور کیسے یہ معنی مراد لیا جائے، جب کہ خود آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا، اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام خلائق میں معزز تر ہیں، نیز سب سے پہلے شفاعت کرنے والے اور شفاعت قبول کئے جانے والے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

عاشق رسول، محقق علی الاطلاق، شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ عاقبت مبہم ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ آخر میں کیا ہوگا، اور کیا کرے گا، مگر یہ بات انبیاے کرام **علیهم السلام** خصوصاً سیدالمرسلین **علیه الصلوٰة والتسلیم** کے بارے میں ان دلائل قطعیہ سے منفی ہے جو انبیاے کرام **علیهم السلام** کے حسن انجام کے جزم ویقین پر دلالت کرتے ہیں۔

پھر جناب شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شانِ ورود بیان کرتے ہوئے اس کی توجیہ فرماتے ہیں کہ:

''یہ حدیث عثمان بن مظعون **رضی اللہ عنہ** کے بارے میں وارد ہوئی ہے، جو پہلے مہاجر صحابی ہیں کہ ہجرت کے بعد وفات پائی، حضور ﷺ نے ان کو یہ اعزاز بخشا کہ ان کی موت کے بعد ان کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور آنسو بہائے اور اپنے سامنے بقیع کے اندر دفن فرمایا، ایک عورت وہاں موجود تھی، اس نے کہا: اے عثمان تم کو مبارک باد ہو، تمہارے واسطے جنت ہے اور تمہاری عاقبت بخیر ہے'' تو حضور ﷺ نے بطور توبیخ یہ حدیث ارشاد فرمائی۔

درحقیقت اس حدیث کا مضمون ان کی جرأت پر اور غیب کے (بے دلیل) خبر پر بطور مبالغہ زجر و منع ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث پاک از روے ادب علم غیب کی عدم تصریح سے کنایہ ہے، اور حقیقت کلام مراد نہیں ہے، یا انجام کے احوال کا عدم علم تفصیلی مراد ہے، خواہ دنیا میں ہو خواہ آخرت میں، تفصیل کے ساتھ سواے پروردگار کے کسی کو نہیں ہے، اگرچہ مجملاً معلوم ہے کہ انبیاے کرام **علیہم السلام** کی عاقبت بخیر ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض شراح حدیث کی بیان کردہ توجیہات نقل فرمائی ہیں کہ انھوں نے حدیث مذکور کی توجیہ حسب ذیل کی ہے:

یہاں مراد امور دنیا کا عدم علم ہے یا یہ مراد ہے کہ موت سے مروں گا یا قتل سے مجھ کو یہ نہیں معلوم یا میں یہ نہیں جانتا کہ تمہارے اوپر امم سابقہ کی طرح عذاب آئے گا، یا نہیں؟ یا حضور ﷺ کو فتح مکہ اور اس کے وقت کے بارے میں تردد تھا۔

جناب شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''ایں معانی ناموافق سوق حدیث است'' یعنی یہ توجیہات حدیث کے سیاق و سباق کے موافق نہیں ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بخاری'' **باب الدخول علی المیت** '' کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

''**فطار لنا عثمان بن مظعون**'' کا یہ مطلب ہے کہ وہ ام العلا انصاریہ کے

حصہ میں آئے، اور حدیث کے الفاظ ''**واللہ ما ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی**'' کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حدیث پاک ''**لیغفر لک اللہ**'' کے نزول کے پہلے ارشاد فرمائی گئی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ میں یقین سے نہیں جانتا ہوں کہ جنت کے مرتبوں میں سے کس مرتبہ میں رہوں گا۔ {**شرح تراجم ابواب البخاری من شاہ ولی اللہ المحدث الدھلوی**}

مجمع بحار الانوار صفحہ ۴۰۸ پر حدیث کے زیر بحث الفاظ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

''**وما ادری وانا رسول اللہ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' سے مراد درایۂ تفصیلیہ کی نفی ہے، ورنہ معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ما تقدم وما تاخر بخش دیے گئے ہیں، اور آپ کو وہ مقاماتِ علیا حاصل ہیں، جن کی کوئی حد نہیں''۔

یا مورد حدیث سے قطع نظر دنیاوی امور مراد ہیں، یا آیت کریمہ ''**لیغفر لک اللہ**'' سے منسوخ ہے، یا عثمان بن مظعون کے بارے میں ''**ھنیأً لک الجنۃ**'' کہنے والی عورت کو جھڑکی دینا ہے، کیوں کہ اس نے اپنے طور سے غیب کا حکم کیا تھا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی ام العلا کی حدیث کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ:

عبد الرزاق کے الفاظ یہ ہیں ''**فواللہ ما ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم**'' یہ سورہ احقاف کی آیت مبارکہ ''**قل ماکنت بدعاً من الرسل وما ادری ما یفعل بی ولا بکم**'' کے موافق ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سورہ فتح کی آیت مبارکہ ''**لیغفر لک اللہ**'' سے پہلے کا ہے، اس لیے کہ سورۂ احقاف مکی ہے، اور سورۂ فتح مدنی ہے، اس کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور بلاشبہہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گا، اور اس کے ہم معنیٰ بہت سی احادیثِ صریحہ ہیں، اس لئے احتمال ہے کہ ان احادیث پاک کو علم اجمالی کے اثبات پر حمل کیا جائے، اور ام العلا کی حدیث کی نفی ''**من حیث التفصیل**'' احاطے پر حمل کی جائے۔

ام العلا انصاریہ کی حدیث میں علامہ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ تیسیر القاری شرح بخاری جلد اول صفحہ ۴۱۶ میں فرماتے ہیں کہ:

”والله ما ادري وانا رسول الله مايفعل بی“

خدا کی قسم میں پیغمبر خدا ہوکر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

سوگند با خدا نمی دانم من وحالاں کہ من پیغمبر خدا ام چیزے کردہ خواہد شد بمن، یا چہ کردہ خواہد شد بمن، بداں کہ ایں حرف صادر شد از مقام محض ادب عبودیت وبملاحظہ لا ابالیت خدائے عزوجل، وتنبیہ دیگراں است کہ از خود چنیں فضولے نہ کنند، وگرنہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باایں ہمہ وحی متلو کہ در تشریف وعلوشان ومنزلت اوصادر شدہ کہ بیقین می دانست کہ معزز ترین انبیا است وددر روز قیامت اواست شافع مشفع۔

تم کو جاننا چاہیے کہ یہ کلام محض ادب بندگی کے مقام اور خداوند قدوس کے استغنا کو لحاظ رکھتے ہوئے صادر ہوا ہے کہ اپنی طرف سے اس قسم کی غیر مناسب باتیں نہ کیا کریں، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرف و بزرگی اور آپ کی سربلندی، علوشان کے بارے میں اتنی زیادہ وحی الٰہی نازل ہوئی کہ آپ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ گروہ انبیا میں معزز ترین ہیں، اور قیامت کے دن شفاعت کرنے والے اور شفاعت قبول کیے جانے والے ہیں۔

اس حدیث پاک کی توجیہ میں بعض شارحین کے اقوال کو نقل کر کے علامہ مرحوم تنقید فرماتے ہیں، شارحین کے اقوال حسب ذیل ہیں۔

شارحین حدیث نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول سورۂ فتح کی آیت مبارکہ ”**لیغفر لک اللّٰہ**“ الخ، کے نزول سے پہلے کا ہے، اس آیت مبارکہ سے پہلے جب کہ آپ کے حسنِ عاقبت کا اعلان نہیں کیا گیا تھا، آپ اپنی عاقبت سے بے خبر تھے، یہاں تک کہ آپ عشرۂ مبشرہ کے حسن عاقبت کا یقین کامل رکھتے تھے، اور اپنی مغفرت اور عدم مغفرت کے بارے میں متردد تھے۔

علامہ نور الحق کی تنقید کا تیور ملاحظہ فرمایئے، نہایت پرشکوہ الفاظ میں شارحین حدیث پر تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”پوشیدہ نماند کہ ایں توجیہ بردل عقیدت مند ایمانیاں جانمی کند کہ آنحضرت

ﷺ تا نزول ایں آیت کریمہ کہ بعد از صلح حدیبیہ درآخر زمان رسالت است برحالیکہ اورا نزد خدا بودہ آگاہی نیافتہ ، وبایں اکرام روز افزوں وتشریعات بے نہایت در عاقبت خود متردد باشد، تاکدام ظن ناپسند باشد کہ ایں توجیہ پسندیدہ اوافتد‘‘۔

یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ عقیدت مند ایمان داروں کے دل میں یہ بات نہیں سما سکتی کہ حضور ﷺ نے سورہ فتح کی اس آیت کریمہ کے نزول تک جو صلح حدیبیہ کے بعد آخری زمان رسالت میں ہوا اس حالت پر آگاہی نہ پائی جو خدائے قدوس کی بارگاہ میں ان کو حاصل تھی ، باوجود روز افزوں اکرام اور بے انتہا بزرگیوں کے اپنی عاقبت کے بارے میں متردد رہے، کون ایسا بدظن ہوگا جس کو یہ توجیہ پسند آئے گی۔

اس ہیچ مداں نے تیسیر القاری شرح بخاری، فتح الباری، مرقات شرح مشکوٰۃ، اشعۃ اللمعات، مجمع بحار الانوار، شرح تراجم ابواب البخاری سے ثابت کیا کہ کوئی شارح حدیث حضور ﷺ کے ارشاد گرامی ’’**واللّٰہ ما ادری وانا رسول اللّٰہ مایفعل بی**‘‘ سے یہ نہیں مراد لیا کہ حضور کو اپنے انجام کا علم نہیں تھا، بلکہ تمام شراح حدیث یا تو اس حدیث پاک کو اس کے ظاہری معنی سے الگ کر کے دوسرے معنی پر محمول کرتے ہیں یا اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جس سے ایمان وعقیدہ میں بگاڑ نہ پیدا ہو، اور حضور ﷺ کی ذات گرامی پر کوئی حرف نہ آئے۔

اگر اس حدیث کے ان الفاظ کو شاہ معین الدین ندوی صاحب کی طرح ظاہری معنی پر محمول کیا جائے تو ایک مسلمان کے عقیدے کا ایک جزیہ بھی ہوگا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنے خاتمے کا علم نہیں تھا، اور اپنے مغفور اور عدم مغفور ہونے کے بارے میں تردد میں مبتلا رہے، یہ ایسی بات ہے جو ایک مسلمان کو دائرۂ ایمان سے نکال کر کفر کی سرحد تک پہنچا دیتی ہے، لہٰذا یہ عذر بھی قابل قبول نہیں کہ شاہ صاحب کا کام ایک مورخ کی حیثیت سے ایک تاریخی واقعہ کا ذکر تھا، ان کو اس سے بحث نہیں تھی کہ اس سے ایمان وعقیدے پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ایک غیر مسلم مورخ تو یہ عذر پیش کر کے ملت اسلامیہ کے افراد کو ان کے رسول کے

بارے میں شکوک میں مبتلا کرنے کی ناکام کوشش کرسکتا ہے، اس لیے کہ اس کا جذبہ ''اسلام دشمنی'' اس تلاش میں رہتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کوئی نقص یا عیب بزعم خویش ڈھونڈ نکالے تو وہ رائی کو پہاڑ بنالے، لیکن ایک مدعی اسلام چاہے مورخ ہو یا محدث، فقیہ ہو یا متکلم، ماہر علم طبقات الارض ہو یا ماہر علم نباتات، اس پر لازم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرح کے ارشاد کو ایسے انداز میں پیش کرے جس سے آپ کی ذات گرامی پر کوئی حرف نہ آئے، اور نہ ہی ایمان وعقیدے میں خلل واقع ہو، یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ایک مسلمان اس عبارت کو پڑھ کر یہ تاثر اپنے اندر پیدا کرے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی عاقبت کی خبر نہ تھی، بھلا اس قسم کی بات کوئی عقلمند جس کے ہوش وحواس درست ہوں کرسکتا ہے کہ ایسی ذات گرامی جو بنی نوع انسان کو صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی صورت میں حسن انجام کی بشارتیں سناتی رہی اس کو خود اپنے انجام کے بارے میں تردد رہا، کون سی عقل و منطق گوارہ کرسکتی ہے کہ رہبر صادق کو منزل مقصود تک پہنچنے کا پتہ نہیں تھا، دوسروں کو فوز و فلاح کے پیغامات تو دیتا رہا لیکن اس کو اپنی کامیابی کا علم نہ ہوا، اس لئے فرقہ وہابیہ کے بدحواسوں کو فاضل بریلوی **رضی اللہ عنه بالرضاء السرمدی** اپنی شہرۂ آفاق کتاب **''الدولة المکية بالمادة الغيبية''** میں نہایت پرجلال انداز میں خدائے تعالیٰ کا حکم سناتے ہیں:

''فاستبان کالشمس والامس ان الذي ينفي مطلق العلم بالمغيبات عن النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ولولعطاء الله سبحانه و تعالی کماصرحت به وهابية ديارنا حتی قالوا: انه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا يعلم حال خاتمته ولا خاتمة امته کما ورد الی سوال عن حکم هذا الضلال في شهر ربيع الاول 1318ھ من بلدة دلهی وکتبت في جوابه ''انباء المصطفیٰ بحال سرواخفیٰ'' واقمت عليهم الطامة الکبریٰ، فهو ناف لما اثبته الله تعالیٰ في قرآنه، وقوله مناف لا يمانه، کاف وواف لخسرانه، فهو کافر ومرتد بکفرانه، وقوله: انه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا يعلم حال خاتمته ولا خاتمة امته کفر آخر لانکاره کثيرا من الآيات الغرر''۔

پس آفتاب اور گزشتہ کل کی طرح روشن ہوگیا کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غیوب کے

مطلق علم کی نفی کرتا ہے، اگرچہ وہ علم اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہو جیسا کہ ہمارے ملک کے وہابی صاف کہہ رہے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے نبی ﷺ کے متعلق کہا کہ آپ نہ اپنے خاتمے کا حال جانتے تھے اور نہ اپنی امت کے خاتمہ کا حال جانتے تھے۔

چنانچہ اس گمراہی کی نسبت دہلی سے میرے پاس ۱۳۱۸ھ میں سوال آیا تھا، اس کے جواب میں میں نے "**انباء المصطفیٰ بحال سرّ و اخفیٰ**" لکھا اور وہابیہ پر قیامت کبریٰ قائم کی تو ایسا شخص اس چیز کی نفی کر رہا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ثابت فرمایا، اور اس کا قول اس کے ایمان کی نفی کرتا ہے، نیز اس کے زیاں کار ہونے کے لیے کافی ووافی ہے، وہ اپنے کفران کے سبب کافر و مرتد ہے، اور اس کا یہ قول کہ نبی ﷺ اپنے خاتمہ اور اپنی امت کے خاتمہ کا حال نہیں جانتے تھے دوسرا کفر ہے، کیوں کہ اس قول سے بہت سی روشن آیتوں کا انکار ہے۔

اس مضمون کے آخر میں ہم شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "**مدارج النبوۃ**" سے اپنے ناظرین کے سامنے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس کو اگر مسلمان ذہن میں رکھے، تو اس قسم کے اشکال جو قرآن عزیز کی آیات اور احادیث کریمہ کی ظاہری عبارتوں سے پیدا ہوتے ہیں نجات ملتی رہے گی، جناب شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"بداں کہ این جا ادبے وقاعدہ ایں کہ بعض از اصفیا و اہل تحقیق ذکر کردہ اندو شناخت آں و رعایت آں موجب حل اشکال وسبب سلامت حال است کہ اگر از جناب ربوبیت جل وتعالیٰ خطابے وعتابے وسطوتے وسلطنتے واستغنائے واستعلائے واقع شود"۔

تم جان لو کہ اس مقام پر ایک ادب وقاعدہ ہے، جس کو بعض اصفیا و محققین نے ذکر کیا ہے، جس کا علم ولحاظ اشکال کے حل کا موجب وسلامتی حال کا سبب ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر خدائے برتر کی بارگاہ سے کوئی خطاب وعتاب و دبدبہ و بے نیازی وسربلندی واقع ہو۔

"**مثل انک لاتهدی ،ولیحبطن عملک ،ولیس لک من الامر شئ، وترید زینة الحیٰوة الدنیا** وامثال آں"

مثلاً **انک لاتھدی، ولیحبطن عملک، ولیس لک من الامر شئ، وترید زینۃ الحیوٰۃ الدنیا**، وغیرہ وغیرہ

''یا از جناب نبوت عبودتے وانکسارے وافتقارے وعجزے ومسکنتے بوجود آمد''۔

یا بارگاہ نبوت سے بندگی، کسر نفسی ومحتاجی، بے کسی وبے بسی وجود میں آئے۔

''**مثلاً انما انا بشر مثلکم، اغضب کما یغضب العبد، ولا اعلم وراء ھذا الجدار، ومادری مایفعل بی ولا بکم**''۔ومانند آں مارا نباید کہ درآں دخل کنیم واشتراک جوئیم وانبساط نمائیم برحد ادب سکوت نمائیم۔

''مثلاً **انما انا بشر مثلکم، اغضب کما یغضب العبد، ولا اعلم وراء ھذا الجدار، ومادری مایفعل بی ولا بکم**'' اوراس کے مثل تو ہمارے لیے زیبا نہیں کہ اس میں دخل دیں اوراشتراک تلاش کریں، خوشی دکھائیں بلکہ بطور ادب خاموشی اختیار کریں۔

''خواجہ را رسد کہ بہ بندۂ خود ہر چہ خواہد کند، و ہر چہ خواہد گوید وبکند، استیلا واستعلا نماید، وبندہ نیز با خواجہ بندگی وفروتنی کند ودیگرے راچہ مجال ویارائے آں کہ دریں مقام درآید ودخل کند واز حد ادب بیروں رود، وایں مقام جائے لغزش بسیارے از ضعفا وجہلا وضرر ایشاں است''۔{مدارج النبوۃ، ج ۱، ص ۸۳}

خواجہ کو حق پہونچتا ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے کہے، غلبہ اورسر بلندی دکھائے ،اور بندہ بھی خواجہ کے ساتھ بندگی وعاجزی کرے، دوسرے کو کیا مجال کہ وہ اس مقام میں دخل دے، اور حد ادب سے باہر آئے ، یہ مقام بہت سے جہلا وضعفا کی لغزش کا مقام ہے اوران کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

انوارنبوت

دنیا کے عظیم انسانوں کی باتوں سے افرادانسانی کو دینی اور دنیوی معاملات میں عمل کے لیے راستہ ملتا ہے، بڑے لوگوں کی بڑی باتوں سے جذبۂ عمل بیدار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کو ان لوگوں کے اقوال وارشادات بہت عزیز ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں اولادآدم کے صرف مادی اور سیاسی پہلوؤں پر زور دیا اور اس میں ان کو کسی حدتک کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کی ہر ہر ادا اور ان کے ہر عمل کو انسانوں نے اپنے لیے باعث برکت وسعادت تصور کیا، حالاں کہ یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو انسانوں کو ان کے صرف مادّی ومعاشی پہلوؤں کی طرف مائل کرنے میں اپنی جدوجہد محدود رکھتے ہیں، ان کی اخلاقی قدروں، روحانی سعادتوں، ان کی زندگی کے بعد آنے والی حیات کے متعلق عقائد و خیالات سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

لیکن دنیا کے وہ عظیم انسان جو انسانوں کی ہدایت ورہبری کے عظیم کام پر مامور ہوتے ہیں، اور جن کی زندگی کا مشن دعوت حق کو فروغ دینا ہوتا ہے، وہ صرف معاشی پہلوؤں پر زور نہیں دیتے بلکہ بنی نوع انسان کی عام صلاح وفلاح ، نیکی و بھلائی ان کی روحانی سعادتوں پر اپنی تمام تر قوت وتوانائی کو صرف کرتے ہیں، یہ انسانوں کا مقدس گروہ بڑا ہی پر خلوص، دردمند اور انسانیت کی خیر خواہی کے جذبے سے لبریز ہوتا ہے، اس لئے ان کی اچھی باتوں سے بھولے بھٹکے انسان ہمیشہ ہدایت پاتے رہتے ہیں، بالخصوص پیغمبر اسلام **صلی اللہ علیہ وسلم** کے ارشادات عالیہ نے قوموں وجماعتوں میں روحانی انقلاب برپا کیا، اس لئے تمام افرادانسانی پر لازم ہے کہ ان کی باتوں کو پڑھ کر عمل کرنے کی جدوجہد کریں۔

اس سلسلے میں ہم نے ارادہ کیا ہے کہ قسط وار سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کے ارشادات طیبہ کو اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کریں، کیوں کہ یہ کام بھی بڑے اجر وثواب کا کام ہے۔

{۱}عن ابي الدرداء، قال: سئل رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ماحد العلم الّذي اذا بلغه رجل كان فقيها؟ فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وسلم :من حفظ على امتي اربعين حديثا في امر دينها بعثه اللّٰه فقيها وكنت له يوم القيامة شافعًا وّشهيداً"(مشکوۃ۔کتاب العلم۔۳۶)

حضرت ابودردا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ آدمی کتنا علم حاصل کرلے تو وہ فقیہ ہوجائے ؟ آپ نے جواب میں ارشادفرمایا: جو شخص میری اُمت کی نفع رسانی کے لیے دین کے معاملے کی چالیس حدیثیں یاد کرلے تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن فقیہ اٹھائے گا، اور میں اس کے لئے گواہ اور شفاعت کرنے والا ہوں گا۔

فائدہ:

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو شخص دعوت وتبلیغ کے لیے چالیس حدیثیں یاد کرلے گا وہ قیامت کے دن فقیہ یعنی عالم کی شان وبان کے ساتھ اٹھایا جائے گا، مطلب یہ ہے کہ جو قدر ومنزلت علما کی ہوگی اور جس اجر وثواب کے مستحق فقہاے کرام ہوں گے وہ بھی ان کا مستحق ہوگا، اگرچہ فرق مراتب رہے گا، اور سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** اس کی فرو گذاشتوں، ولغزشوں اور اس کے گناہوں کی معافی کے لئے بارگاہ خداوندی میں شفاعت فرمائیں گے اور اس کے حق میں نیکی کی گواہی دیں گے، مگر اس شفاعت وگواہی کے لیے ضروری ہے کہ چالیس حدیثیں یاد کرنے والا خود باعمل اور صحیح عقیدے کے ساتھ ایک دین دار مسلمان ہو، اس لئے جو لوگ سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کی حدیثوں کو مسلمانوں میں افتراق وانتشار اور سیاسی حربہ ومادی منفعت کے لیے استعمال کرتے ہیں یا خود حدیث پاک کے انکار کے لیے سرکار کی حدیثوں سے دلیل پیش کرتے ہیں وہ اس اجر وثواب اور بلند مرتبے کے سزاوار نہیں ہوں گے بلکہ وہ مستحق نار ہوں گے۔

{۲}عن المقدام بن معد یکرب قال: قال رسول اللّٰه ﷺ :الا انی اوتیت القرآن ومثله معه، الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول: علیکم بهذا القرآن، فما وجدتم فیه من حلال فاحلوهُ وما وجد تم فیه من حرام فحرموه وان ماحرم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کماحرم اللّٰه الا! لا یحل لکم الحمار الا اهلي ولا کل ذي ناب من السّباع، ولالقطة معاهد الا ان یستغني عنها صاحبها ومن نزل فعلیهم ان یقروه فان لم یقروه فله ان یعقبهم بمثل قراه"(مشکوۃ ص: ۲۹)

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** نے ارشادفرمایا: آگاہ ہوجاؤ کہ میں قرآن اورقرآن کے ساتھ اسی کے مثل (یعنی حدیث) دیا گیا ہوں، خبردار ہوجاؤ زمانۂ قریب میں ایک آسودہ حال آدمی اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ قرآن حکیم کولازم سمجھو، جو چیزتم اس میں حلال پاؤاسے حلال جانو اور جو چیزتم اس میں حرام پاؤاسے حرام قراردو، حالاں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کوحرام کیا وہ اسی طرح سے ہے جیسے اللہ نے حرام کیا، خبردار ہوجاؤ کہ گدھا تمہارے لئے حلال نہیں ہےاور نہ ہی دانت سے پھاڑ کر کھانے والے درندے اور نہ ہی ذمی کی گری ہوئی چیزجس سے معاہدہ ہو چکا ہو، اِلا یہ کہ اس کواس کی کوئی ضرورت نہ رہے، اور جوشخص کسی قوم کے پاس مہمان ہوتوان کواس کی مہمان نوازی کرنا چاہیے، پس اگروہ اس کی مہمان نوازی نہ کریں تواس کو یہ حق پہنچتاہے کہ اپنی ضیافت کے مثل ان سے لے لے۔

فوائد:

اس حدیث پاک سے حسب ذیل اُمورثابت ہوتے ہیں:

{۱} یہ گمان فاسدہے کہ صرف قرآن مقدس پرعمل کیا جائے گا، اورسرکار کے ارشاداتِ عالیہ یعنی احادیث کریمہ پرعمل نہیں ہوگا، جیسا کہ اس زمانے کے منکرین حدیث

کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ ذخیرہ قابل عمل نہیں، سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کا کام قرآن مقدس کو پہنچا دینا ہے اوراس میں جو چیزیں حلال وحرام ہیں وہی چیزیں حلال وحرام رہیں گی، رہ گئیں احادیث کریمہ ان سے حلت وحرمت کا ثبوت نہیں ہوگا۔

نگاہ نبوت دیکھ رہی تھی کہ مستقبل میں کچھ ایسے صاحب ثروت، آسودہ حال اسلام کے دعوے دار پیدا ہوں گے جن کی تحریک یہ ہوگی کہ احادیث کریمہ کی شرعی حیثیت کو مجروح کردیا جائے، اوراس کے لیے طرح طرح کے حیلہ وحجت تلاش کریں گے، اس لئے آپ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسے گمراہوں کی باتوں کی طرف مسلمانوں کو دھیان نہیں دینا چاہیے، کیوں کہ یہ لوگ ایسے بدباطن ہوں گے کہ اپنے خبث باطنی کے لیے قرآن حکیم کی آیت کریمہ کو بطور سند اور دلیل پیش کریں گے، اور یہ لوگ اس حقیقت سے نا آشنا ہوں گے کہ مقام نبوت کیا ہے۔

نبی کی شان صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں تک قرآن حکیم کو پہنچا دیں اوراس میں جو حلال وحرام ہیں بس اسی کو حرام وحلال قرار دیں بلکہ ان کے پاس دوقسم کی وحی نازل ہوتی ہے، ایک وحی وہ ہے جس کو ہم قرآن کی شکل میں دیکھ رہے ہیں، دوسری وحی وہ ہے جو حدیث کی صورت میں پائی جارہی ہے، یعنی ایک وحی واضح اور جلی ہے جو تلاوت کی جاتی ہے، اور دوسری وحی وہ ہے جس کی تلاوت نہیں ہوتی ہے، ان دونوں سے شریعت کے احکام ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ آپ نے قدرے تفصیل کے ساتھ ایسی حلال وحرام چیزوں کو بیان فرمایا جن کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے، ان کی حلت وحرمت کا انکار سخت گمراہی وبدباطنی کی دلیل ہے، وہ بھی محض اس لیے انکار ہو کہ ان کا ثبوت قرآن حکیم سے نہیں ہے اور حدیث قابل عمل نہیں ہے، تو ایسی گمراہی کفروانکار کی حدوں میں داخل ہوجاتی ہے، لہٰذا حضور نبی کریم **فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم** نے سخت تنبیہ وہدایت فرمائی کہ ایسے لوگوں کی باتوں کی طرف میری امت کو توجہ نہیں دینا چاہیے، آپ نے فرمایا: ”**وان ماحرم رسول اللہ ﷺ کما حرم اللہ جل جلالہ**“ بلاشبہہ جن چیزوں کو اللہ کے رسول نے یعنی میں نے

بذریعہ وحی غیر متلو حرام کر دیا ہے وہ اسی طرح حرام ہیں جیسا کہ اللہ نے حرام کیا یعنی وحیٔ جلی اور قرآن مقدس کے ذریعہ ان کو حرام کیا گیا تھا۔

{ب} ائمہ کرام نے جملہ منکرین اسلام کو شرعی احکام کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ کافر جو مسلمانوں سے برسر پیکار یا اسلامی حکومت سے حرب و جنگ کی حالت میں رہے، ایسے کافر کا مال بطور غنیمت مسلمانوں کو لینا جائز ہے، دوسرے وہ کافر جو اسلامی ریاست سے امن حاصل کرلیں، ایسے امن یافتہ کو کسی طرح کی کوئی اذیت نہیں پہنچائی جاسکتی، اس کی جان و مال اور عزت وآبرو کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی، تیسرے وہ کافر جو اسلامی حکومت کو تسلیم کرے اور حاکم اسلام سے اس کا معاہدہ ہو جائے کہ وہ اسلامی حکومت میں بحیثیت رعیت رہے گا اور اپنی حفاظت جان و مال، عزت وآبرو کے عوض میں اپنے حسب حال ٹیکس ادا کرتا رہے گا، اس کو ذمی کہا جاتا ہے جس کی حفاظت وصیانت اسٹیٹ پر لازم ہے، ایسے شخص کی اگر کوئی چیز گم ہو جائے اور کسی مسلمان کو مل جائے تو اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس کو واپس کرے یہ سمجھ کر کے کہ کسی دوسرے مذہب والے کی چیز ہے اس کو اپنے پاس رکھنا اور اس کو استعمال میں لانا قطعی طور پر ناجائز وحرام ہے، اسی کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے **"لقطة معاهد"** کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کی حرمت پر تنبیہ فرمائی ہے۔

حدیث کے اس حصے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ سرکار دو عالم **صلی اللہ علیہ وسلم** اپنی امت میں کتنے اعلیٰ درجہ کی امانت ودیانت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

{ج} حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو مکارم اخلاق کی تعلیم دی ہے، انسان کے اندر بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کے گھر پر کوئی مہمان آجائے تو اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، اس کی ہر طرح سے دلجوئی کرے، اپنی بات چیت اور اپنی شیریں کلامی سے اس کو اس طرح متاثر کرے کہ وہ اپنے کو بیگانہ تصور نہ کرے، انسان کی فطری کمزوری یہ ہے کہ اپنی کمائی کو دوسروں پر صرف کرنے سے خود کو کبھی آمادہ کرنے میں مجبور محض ہو جاتا ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ میں نے اپنی محنت اور کوشش سے جو کچھ اپنے لیے حاصل کیا ہے اس کو دوسروں

کے اوپر خرچ کر کے اپنی منفعت کو کیسے ضائع کردوں، لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ جس کو وہ دوسرا قرار دے رہا ہے اگر وہ انشرح صدر کے ساتھ سوچے تو وہ دوسرا نہیں ہے بلکہ وہ اپنا ہی ہے کیوں کہ اسلامی معاشرے کا ایک فرد دوسرا نہیں ہوسکتا، اسی لئے آپ نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی کے گھر میں مہمان بن کر آئے تو اہل خانہ کے لئے مستحب ہے کہ اس کی مہمان نوازی کریں، حدیث کے ان الفاظ پر غور کیجیے "**فعليهم ان يقروه**" اس قسم کے الفاظ جب عربی زبان میں استعمال کیے جاتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں کام فلاں کے ذمہ لازم ہے، پس اگر چہ ضیافت ومہمان نوازی شرعاً واجب نہیں ہے، لیکن پیغمبر اسلام **صلی اللّٰہ علیہ و سلم** نے وجوب ولزوم کے لفظ کو استعمال کر کے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، بلکہ بعض شراح حدیث کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ابتداے اسلام میں مسلمانوں کے درمیان اخوت ومحبت کے جذبے کو ابھارنے کے لیے حضور **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** نے مہمان نوازی کو لازم کیا تھا، لیکن جب ایسا اسلامی معاشرہ پیدا ہو گیا جس میں اخلاقی خوبیوں سے سماج کے افراد آراستہ ہو گئے تو آپ نے مہمان نوازی کے وجوب کو ساقط فرمادیا، مگر مہمان نوازی کو قیامت تک تمام امت کے لیے نہایت مستحسن امر آپ نے قرار دیا۔

{۳}عن جابر قال: جاءت ملائكة الى النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم وهو نائم فقالوا: انّ لصاحبكم هذا مثلاً، فاضربوا له مثلاً، قال بعضهم انه نائم، وقال بعضهم انّ العين نائمة وّالقلب يقظان، فقالوا مثله كمثل رجل بنىٰ دارًاوّ جعل فيها مادبة وبعث داعيا فمن اجاب الدّاعي دخل الدار، واكل من المادبة ومن لم يجب الداعي لم يدخل الدار ولم ياكل من المادبة فقالوا:اولوها له يفقهها، قال بعضهم :انه نائم وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان،فقالوا: الدار الجنة والدعي محمد فمن اطاع محمدا فقد اطاع الله، ومن عصى محمداً فقد عصى الله ومحمد فرق بين الناس"(مشكوةص۲۷،باب الاعتصام بالكتاب والسنة)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں فرشتے آئے، اور آپ سوئے تھے، انھوں نے کہا کہ تمہارے اس صاحب کی ایک مثال ہے، تو اس کی مثال کو بیان کرو، ان میں سے بعض فرشتوں نے کہا کہ وہ تو سوئے ہوئے ہیں (یعنی جب وہ سوئے ہوئے ہیں تو مثال بیان کرنے سے کیا حاصل) اس کے جواب میں بعض نے کہا کہ ان کی آنکھ سوئی ہوئی ہے لیکن دل بیدار ہے، پھر انہوں نے مثال بیان کی کہ ان کی مثال ایسے شخص کی طرح ہے جس نے ایک عمارت تعمیر کی اور اس میں کھانے کا اہتمام کیا اور ایک بلانے والے کو لوگوں کے پاس بھیجا کہ ان کو کھانے کی دعوت دے تو جس نے داعی کی دعوت کو قبول کیا تو وہ گھر میں داخل ہوا اور تیار شدہ کھانے کو کھایا، لیکن جس شخص نے داعی کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو وہ نہ گھر میں داخل ہوا نہ تیار شدہ کھانے کو کھایا، پھر آپس میں فرشتوں نے کہا کہ اس مثال کی تشریح کرو کہ وہ سمجھ جائیں، تو بعض نے کہا کہ بے شک آنکھیں سوئی ہوئی ہیں اور دل بیدار ہے، پھر فرشتوں نے یہ تشریح کی کہ گھر سے مراد جنت ہے اور بلانے والے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں تو جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق و باطل، کفر و ایمان کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔

اس حدیث پاک کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے فرستادہ فرشتے آپ کی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے کہ آپ سوئے ہوئے تھے، انہوں نے باہمی گفتگو سے یہ واضح کیا کہ اگرچہ آپ سوئے ہوئے ہیں مگر آپ پر ایسی بے خبری اور غفلت کی نیند نہیں طاری ہوئی کہ بات کرنے والوں کی باتوں کو آپ محسوس نہ کر سکیں۔

آپ کی آنکھوں کو دیکھ کر یہی کہا جائے گا کہ سوئے ہوئے ہیں لیکن آپ کا قلب اس طرح بیدار رہتا ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہوتا ہے اس کو آپ جانتے ہیں، پھر فرشتوں نے یہ مثال بیان کی کہ ایک ایسا شخص ہے جس نے ایک عظیم الشان عمارت تیار کی اور اس میں کھانے کا اہتمام کیا پھر اس کھانے کے لیے ایک بلانے والے کے ذریعہ لوگوں کو دعوت دی

گئی، کچھ لوگوں نے دعوت کو قبول کیا اور کچھ لوگوں نے قبول نہیں کیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جنت اور جنت کی نعمتوں کو پیدا فرمایا اور اس کی طرف دعوت دینے کے لیے سرکار کو مبعوث فرمایا، کچھ لوگ سرکار کی دعوت کو قبول کر کے اس بات کے مستحق ہوئے کہ وہ جنت میں داخل ہوں اور اس کی نعمتوں سے سرفراز ہوں اور کچھ لوگ نافرمانی کر کے اس کی نعمتوں سے محروم ہوئے۔

فوائد:

اس حدیث سے امور ذیل پر روشنی پڑتی ہے:

{الف} حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** کی حالت عام انسانوں جیسی نہیں ہے، عام لوگ جب سو جاتے ہیں تو اس مادی دنیا کے واقعات وحوادث سے بے خبر ہو جاتے ہیں لیکن سرکار دوعالم **صلی اللہ علیہ وسلم** ایسی بے خبری کی نیند نہیں سوتے جس سے ہونے والے واقعے کی ان کو خبر نہ ہو بلکہ آپ کی ہمیشہ یہ حالت تھی کہ انتہائی گہری نیند کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے قلب مبارک کی آنکھوں سے اس مادی دنیا کی چیزوں کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیند بظاہر ایک ایسی مشترک حالت ہے جس میں انبیاے کرام اور دوسرے بندگان خدا شریک ہوتے ہیں مگر دونوں میں کھلا ہوا فرق ہے، ہم سو جائیں تو بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں، علم واحساس کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** سو جائیں تو ان کے لیے علم وادراک کے دوسرے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

وہ جاگیں تو خدا سے ہم کلامی ☆ وہ سو جائیں تو معراج منامی

اس سے ثابت ہوا کہ محض اشتراک ظاہری سے نبی اور غیر نبی کی حالت کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، یہی وہ دقیق فرق ہے جس کو مسلمان کہلانے والے گمراہ فرقوں نے نہیں سمجھا اور سرکار کو عام انسانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

{ب}اس حدیث پاک میں فرشتوں نے یہ کہا کہ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

ظاہر ہے کہ فرشتے اللہ **جل جلالہ** کے حکم سے حاضر ہوئے تھے، اور جو کچھ انہوں نے کہا اس میں حکم خداوندی کی بجا آوری تھی، اس لیے اس سے ثابت ہوا کہ یہ حکم الٰہی ہے کہ جو شخص سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کے ارشادات عالیہ اور آپ کے دیئے ہوئے احکام پر عمل پیرا نہ ہوا یا اس کا منکر محض اس لئے ہوا کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں صراحتاً نہیں مل رہا ہے، تو بلا شبہ وہ گمراہ اور بے دین ہے۔

{ج}سرکار دو عالم **صلی اللہ علیہ وسلم** فرشتوں کی زبان میں "**فرق بین الناس**" یعنی آپ کی ذات والا صفات حق و باطل، ہدایت و ضلالت اور اسلام و کفر کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرنے والی ہے، صداقت و راستی، اور گمراہی و ضلالت کا معیار اگر متعین کرنا ہو تو پیغمبر اسلام **صلی اللہ علیہ وسلم** کی ذات مبارکہ کو دیکھنا ہوگا، جو آپ کے لائے ہوئے عقائد پر ایمان لائے گا وہ ایمان کی روشنی سے تابناک ہوگا، جو آپ کا منکر ہو گا کفر و گمراہی کی ظلمت میں گرفتار الم ہوگا۔

مشہور محدث ابن جوزی نے اپنی کتاب "**الوفاء باخبار المصطفیٰ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" میں ابن قتیبہ کی روایت کے حوالے سے آپ کی صفت "**فرق بین الناس**" کی وضاحت خوب خوب کی ہے، حضرت محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی **رحمۃ اللہ علیہ** نے شرح مشکوٰۃ میں اس کا ترجمہ فارسی زبان میں نقل فرمایا ہے، رقم طراز ہیں:

"ابن قتیبہ روایت کردہ است کہ حضرت مسیح **علیہ الصلوٰۃ والسلام** مرحواریین را گفت کہ می روم و بعد از من "فارقلیط" می آید کہ روح حق است کہ تکلم نمی کند از نزد نفس خود، و نمی گوید مگر آنچہ گفتہ می شود باوے، و وے شہادت می دہد بر صدق من، و ہر آنچہ آمادہ گردانیدہ است خداوند تعالیٰ برائے شما خبر می دہد شمارا بداں"

(اشعۃ اللمعات۔ ج:۱، ص:۱۲۷)۔

ابن قتیبہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت مسیح **علیه الصلوٰۃ والسلام** نے اپنے حواریین سے جوان کے مخصوص صحابی تھے فرمایا کہ میں جارہا ہوں میرے بعد ''فارقلیط'' آ رہاہے جوروح حق ہے، وہ اپنی طرف سے گفتگونہیں کرے گا، وہ وہی کہے گا جواس سے کہلوایا جائے گا، میری صداقت کی گواہی دے گا، جو کچھ اللہ کی جانب سے تمہارے لئے ہونے والا ہے،اس کی اطلاع وہ تم کودے گا۔

آگے چل کر حضرت شیخ فرماتے ہیں:

''ودر حکایت ''یوحنا'' کہ یکے از حواریین است آمدہ کہ مسیح گفت فارقلیط نمی آید شمارا تا آں کہ نمی روم من، وچوں می آید تو بیخ می کند عالم را بر گناہان ونمی گوید سخن از پیش خود وسیاست می کند شمارا بہ حق وخبر می دہد شمارا بہ حوادث غیوب کہ می آید شمارا بہ اسرار، وبیان میکند شمارا ہر چیز را، وگواہی می دہد برائے من چنانکہ گواہی مید ہم من برائے او، ومی آرم من برائے شمامثلہا را، ومی دار دوے تاویل وتفسیر آں را'' (ایضا)۔

''یوحنا'' جو کہ حضرت مسیح کے مخصوص صحابی تھے، ان کے واقعے میں آیا ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا'' فارقلیط'' تمہارے پاس نہیں آئے گا مگر یہ کہ میں تم سے رخصت ہو جاؤں گا، جب وہ آئے گا تو اس شان کے ساتھ آئے گا کہ تمام عالم کو گناہوں پر جھنجھوڑ ڈالے گا، اور وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہے گا، اور وہ تم کو حق کی تنبیہ کرے گا، اور آنے والے واقعات اور غیب کی باتیں اور اسرار کو تم سے بیان کرے گا، اور میری صداقت و راستی کی گواہی دے گا جیسے کہ میں اس کی سچائی کی گواہی دے رہا ہوں، میں نے تمہارے واسطے تمثیلات پیش کیے ہیں، وہ آئے گا تو ان کی توضیح وتشریح کرے گا۔

کاش! مسیحی دنیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر تسلیم کرتے ہوئے ان کو'' **ابن اللہ**'' کہتی ہے، حضرت مسیح **علیه الصلوٰۃ والسلام** کی ان بشارتوں سے فیض حاصل کرتی تو یقین وایمان کی دولت سے مالا مال ہوتی۔

{۴} حضرت انس **رضی اللہ عنه** نے بیان کیا ہے کہ تین شخص اصحاب کرام میں

سے سرکار **علیه السلام** کی ازواج مطہرات کے پاس آئے، اورآپ کی عبادت کا حال اور اس کی کیفیت ومقدار پوچھا، جب ان کوآپ کی عبادت کی تفصیل بتائی گئی تو گویا انہوں نے اس کو کم سمجھا اور اپنے خیال کے مطابق انہوں نے کہا کہ ہم کہاں اور سرکار کہاں، ان کے رتبے تو بہت بلند ہیں، یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا اگلا اور پچھلا سب کچھ بخش دیا ہے، "**وقد غفر اللّٰہ له ماتقدم من ذنبه وماتاخر**"۔

پھران میں سے ایک شخص نے کہا، میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا، اور دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھتا رہوں گا اور کبھی روزہ ترک نہ کروں گا، اور تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ تھلگ رہنے کا ارادہ کرتا ہوں تو کبھی شادی نہ کروں گا، اسی اثنا میں سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا:

"انتم الذي قلتم كذا وكذا، اما واللّٰه انى لا خشكم للّٰه واتقاكم له ولكنّي اصوم وافطر واصلي وارقد واتزوج النّسآء، فمن رغب عن سنتي فليس مني"۔

کیا تمہیں لوگ یہاں ایسی ایسی باتیں کررہے تھے؟ غور سے سنو، خدا کی قسم میں تم سب میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا، تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں، اور کبھی روزہ ترک کردیتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور شادی بھی کرتا ہوں، جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

فوائد:

اس حدیث پاک سے امور ذیل پر روشنی پڑتی ہے:

{الف} سرکار **علیه الصلوٰۃ والسلام** کے صحابہ کرام **رضی اللّٰه تعالیٰ عنهم اجمعین** قرب الٰہی اور اپنی نجات کے لئے ہمیشہ نیک کاموں میں مصروف رہنے کا جذبہ رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے امہات المومنین کی خدمت میں حاضر

ہوکر سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عبادت و ذکر الٰہی کی تفصیل دریافت کی اور جب ازواج مطہرات نے آپ کے معمولات کی تفصیل بیان کی تو ذوق عبادت کی وجہ سے انہوں نے سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عبادت کو تھوڑا تصور کیا اور اپنی نجات کے لیے اس کو کافی نہیں جانا، لیکن اس کمی کو آپ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے صراحتاً آپ کی ذات اقدس کی طرف منسوب نہیں کیا (یہ صحابۂ کرام کا غایت درجہ کا ادب واحترام ہے) بلکہ یہ خیال ظاہر کیا کہ سرکار کا مرتبہ تو بہت بلند ہے، اور آپ کے دامن عصمت پر گناہوں کی آلودگی کا دھبہ نہیں آ سکتا، اس لئے کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو معصوم پیدا کیا، لیکن ہم لوگوں سے خدا جانے کتنی فروگزاشتیں ہوتی رہتی ہیں اس لئے گناہوں سے آلودگی کا امکان ہے، پس ہماری بخشش و نجات کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ عبادت کریں، بلکہ پوری زندگی خوشنودئ رب میں صرف کریں، اسی وجہ سے کسی نے کہا کہ ہم رات بھر نماز پڑھتے رہیں گے، کسی نے کہا کہ ہم ہمیشہ روزہ رکھتے رہیں گے، کسی نے ازدواجی زندگی سے الگ تھلگ رہنے میں اپنی کامیابی تصور کیا۔

آپ غور فرمائیں کہ خدائے پاک کے یہ نیک بندے کتنے حسن نیت کے ساتھ اپنی اخروی فلاح کے لیے شوق عبادت ظاہر کر رہے ہیں، لیکن چونکہ اسلام کی تعلیم ہر کام حتیٰ کہ عبادت میں بھی میانہ روی واعتدال کی تعلیم ہے، اس لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس قول "انتم الذی قلتم کذاوکذا" کیا تمہیں لوگ ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے، سخت برہمی کا اظہار فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ کوئی خواہ کتنے ہی حسن نیت کے ساتھ عبادت الٰہی میں حد سے تجاوز کرے جس سے حقوق انسانی کی ادائیگی میں کوتاہی ہو اسلام کے نزدیک سخت ناپسندیدہ امر ہے۔

{ب} بعض نافہموں نے "قد غفراللّٰہ لہ ماتقدم من ذنبہ وماتاخر" کے اردو ترجمے میں یہ لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیئے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاذ اللہ گناہ کی نسبت آپ کی طرف بھی ہو سکتی ہے، حالاں کہ اردو زبان و

ادب میں لفظ ''گناہ''، ''قابل مواخذہ جرم'' کو بولا جاتا ہے، اس لیے اس کا اطلاق سرکاردوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں ہوسکتا۔

درحقیقت ان الفاظ پر زیادہ غوروفکر سے کام نہیں لیا گیا ورنہ یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی تھی کہ جملہ ''**قد غفراللّٰہ لہ ماتقدم من ذنبہ وماتاخر** ''سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کے اعزاز وتکریم کے لیے ہے، چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی **رحمۃ اللّٰہ علیہ** شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ:

''درتوجیہ غفران ذنوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ قرآن مجید بداں ناطق است اقوال است، بہترین اقوال آں است کہ ایں کلمہ تشریف است از جانب مولیٰ تعالیٰ بے آنکہ ذنب وجود داشتہ باشد، چنانکہ صاحب مربندۂ خودرا بگوید کہ گناہان ترابخشیدیم تو فارغ البال باش وہیچ اندیشہ مکن وتوجیہہ مشہورآں ست **حسنٰت الابرار سیئات المقربین**'۔

حضور **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** کے غفران ذنوب میں جس کی شہادت قرآن حکیم دے رہا ہے چند اقوال ہیں، بہترین قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعزاز وتکریم کا کلمہ ہے، حالاں کہ سرکار کی جانب سے گناہ کا وجود نہیں ہوسکتا، جیسے کوئی مالک اپنے غلام خاص کو کہے کہ ہم نے تمہارے گناہوں، لغزشوں وغلطیوں کو معاف کردیا، حالاں کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، تم مطمئن رہو اور کسی چیز کی فکر نہ کرو اور مشہور تو یہ ہے کہ نیک لوگوں کے اچھے کام مقربین بارگاہ ایزدی کے حق میں قابل مواخذہ ہوجاتے ہیں۔

{ج} اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فطری طریقہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے لوازم سے راہ فرار اختیار نہ کرے اور اپنی جائز خواہشات کے پورا کرنے میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل پیرا ہوجائے، رضائے الٰہی اور خدارسیدگی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ انسان تجرد کی زندگی اختیار کرکے رہبانیت کے راستے پر گامزن ہوجائے، اس لئے جوگیوں جیسی زندگی گزارنا اور ترک دنیا کرنا یہ صرف غیر فطری طریقۂ زندگی ہے، بلکہ پیغمبر اسلام **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** کے طریقۂ زندگی سے بہت دور چلا جانا ہے جو نامرادی اور خسران کا باعث ہوگا۔

اس لیے راہبانہ زندگی اختیار کر کے اس خیال میں مگن رہنا (جب کہ اس سے حقوق العباد کی ادائیگی میں خلل واقع ہوتا ہو) کہ ہم خدا تک پہنچ جائیں گے فریب نفس اور وسوسۂ شیطانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اسلام ہم کو سکھاتا ہے کہ ہم بندوں اور خدا کے حقوق ادا کرتے ہوئے کارگاہ حیات میں اپنی جدوجہد جاری رکھیں، اسی لیے سرکار دوعالم **صلی اللہ علیہ وسلم** نے ارشاد فرمایا کہ میں روزہ رکھتا ہوں اور کبھی روزہ ترک کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور ازدواجی زندگی گزارتا ہوں، میرے طریقۂ زندگی پر سب کو عمل پیرا ہونا چاہیے، اس سے روگردانی مجھ سے بےتعلقی اور محرومی کا باعث ہوگی، اس لئے وہ تمام متصوفین جو بہت سارے قیود کے ساتھ خدا رسیدگی کے لیے یہ ضروری بتاتے ہیں کہ ترک علائق ہونا چاہیے اور تجرد کی زندگی گزارنا چاہیے، درحقیقت ایسے لوگ پیغمبر اسلام **صلی اللہ علیہ وسلم** کے جادۂ مستقیم سے ہٹے ہوئے لوگ ہیں، قرآن عزیز نے اس کی سخت تردید فرمائی ہے۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ **{المائدة:۸۷}**

اے ایمان والو! وہ ستھری چیزیں حرام نہ ٹھہراؤ جن کو اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا، اور حد سے نہ بڑھو بیشک حد سے بڑھنے والے اللہ کو ناپسند ہیں۔

مفسرین کرام اس آیت کی شان نزول میں بیان کرتے ہیں کہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت رسول کریم **صلی اللہ علیہ وسلم** کا وعظ سن کر ایک روز حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالی عنہ کے یہاں جمع ہوئی، اور انہوں نے باہم ترک دنیا کا عہد کیا اور اس پر اتفاق کیا کہ وہ ٹاٹ پہنیں گے، ہمیشہ دن میں روزہ رکھیں گے، پوری رات عبادت الٰہی میں بیدار رہ کر گزاریں گے، بستر پر نہ لیٹیں گے، گوشت اور چکنائی نہ کھائیں گے، اور خوشبو نہ لگائیں گے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کے اس عہد و پیمان کا علم ہوا، تو آپ نے ان پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ کو اس بات کی اطلاع ملی ہے کہ آپ لوگوں نے ترک

دنیا کا عہد کیا ہے، صحابۂ کرام نے عرض کی کہ ہم نے اس سے نیکی و بھلائی کا ارادہ کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پر جلال الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

"اني لم اومر بذلك ،ثم قال :ان لا نفسكم عليكم حقا فصومو اوا فطروا وقوموا وناموا فاني اقوم و اصوم وافطروآكل اللحمة والدسم وآتى النّساءومن رغب عن سنتي فليس مني"۔

میں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا ہوں ، بے شک تمہارے نفوس کے لیے تم پر حق ہے، تم روزہ رکھو اور روزہ کو چھوڑ دو، خدا کی عبادت بھی کرو اور سوؤ بھی ، کیوں کہ میں خدا کی عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ رکھتا ہوں اور ترک کر دیتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں اور چکنی چیز بھی ،اور عورتوں سے تعلقات بھی رکھتا ہوں، تو جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تنبیہ و ہدایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحابۂ کرام کو جمع فرما کر ایک عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا کہ:

"ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطيب والنوم وشهوات الدنيا اني لست آمركم ان تكونوا قسيسين ورهبانا فانه ليس في دينى ترك اللحم والنساء ولا اتخاذ الصوامة وان سياحة امتي الصوم ورهبا نيتها الجهادوا عبدوا اللّه ولا تشركوا به شيأً وّحجوا واعتمروا واقيموا الصلاة وآتوا الزكاة وصوموا رمضان واستقيموايستقسم لكم فانّماهلك من كان قبلكم بالتشديد، شددوا على انفسهم فشدد الله عليهم"(مرقاةالمفاتيح،ج ا ص:۱۸۲۔۱۸۳)۔

ان لوگوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے اوپر عورتوں کو حرام کرنے کا ارادہ کیا ہے، خوشبو، نیند، کھانے، پینے کے ترک کا عزم کیا ہے، اور دنیا کی خواہشات سے بے تعلقی کا، میں تم کو حکم نہیں دیتا ہوں کہ راہب اور تارک الدنیا بن جاؤ، میرے دین میں ترک لحم اور عورتوں

سے انقطاع تعلق نہیں ہے، نہ یہ کہ کٹیا بنائی جائے، میری امت کی سیر وتفریح روزہ ہے اور ان کی رہبانیت جہاد ہے، تم لوگ اللہ کی پرستش کرو اور اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج وعمرہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان مقدس کا روزہ رکھو اور تم اعتدال و استقامت اختیار کرو، تمہارا دین درست رہے گا، تم سے پہلی قومیں اپنے نفوس پر سختی کے باعث برباد ہوگئیں، انہوں نے اپنے نفوس کے اوپر سختی کی تو اللہ تعالی نے ان پر سختی فرمائی۔

گویا نگاہ نبوت دیکھ رہی تھی کہ دین اور عبادت کے معاملے میں اگر ان کو میانہ روی کی تلقین نہ کی گئی تو حدّ اعتدال سے تجاوز کر جائیں گے، اس لیے آپ نے مختلف طریقے سے تجرد اور رہبانیت کی زندگی سے منع فرمایا، کیوں کہ یہ غیر فطری طریقۂ زندگی ہے، جس سے فساد پیدا ہوسکتا ہے، اور اخروی زندگی بھی تباہ ہوسکتی ہے۔

(۵)"عن ابي موسى قال :قال رسول الله ﷺ :مثل ما بعثني الله به من الهدى والعلم كمثل الغيث الكثير اصاب ارضا فكانت منها طائفة طيبة قبلت الماء فانبتت الكلاء والعشب الكثير وكانت منهاا جادب امسكت الماء فنفع الله بها الناس فشربوا وسقوا، وزرعوا واصاب منها طائفة اخرى انما هي قيعان لا تمسك ماء ولا تنبت كلاء فذالك مثل من فقه في دين الله ونفعه ما بعثني الله به فعلم وعلم و مثل من لم يرفع بذالك راسا ولم يقبل هدى الله الذي ارسلت به"۔(صحیح البخاری، حدیث نمبر ۷۹)

حضرت ابوموسی اشعری **رضی اللّٰہ عنہ** کہتے ہیں کہ سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے فرمایا: مجھے اللہ تعالی نے جس ہدایت اور علم کو دے کر بھیجا ہے اس کی مثال موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمینوں پر برسے، زمین کے ایک اچھے اور زرخیز ٹکڑے نے اس پانی کو اپنے اندر جذب کیا پھر ان سے خشک وتر گھاسیں اگائیں، جس سے وہ سرسبز و شاداب ہوگئیں، اور زمین کا ایک حصہ جس نے پانی کو اپنے اوپر روک لیا تھا اللہ تعالی نے اس پانی سے لوگوں کو نفع پہنچایا، انہوں نے پیا اور جانوروں کو پلایا، اور اپنے کھیتوں کی آب پاشی

کی اور زمین کے ایک ایسے حصے کو بارش پہنچی جو بالکل چٹیل میدان تھا جس میں سبزہ اگانے کی صلاحیت نہیں تھی، بالکل بنجر تھا جو نہ پانی کو روک سکتا ہے اور نہ گھاس کو اگا سکتا ہے، پس یہ مثال اس شخص کی ہے جس نے دین کی سمجھ بوجھ حاصل کی اور میرے لائے ہوئے پیغام و ہدایت وعلم سے فائدہ پہنچایا تو اس نے علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے اس کی طرف سر نہ اٹھایا اور نہ اس ہدایت کو قبول کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

تشریح حدیث:

اس حدیث پاک میں اس علم کو جو وحی الٰہی کے فیضان سے حاصل ہو باران رحمت سے تشبیہ دی گئی ہے، اور حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** کو مخلوق کی طرف فیضان وحی کا واسطہ بنا کر سحاب رحمت کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، اور قلوب انسانی کو زمین کے مطابق بتایا گیا، یہ تشبیہ اتنی لطیف اور فطری ہے کہ روح انسانی میں اگر اس کی لطافت کا صحیح ادراک پیدا ہو جائے تو اس سے وہ وجد میں آ سکتی ہے۔

فضا میں بادل چھا جاتے ہیں، قدرت الٰہی کے ایک اشارے سے رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، لیکن قبول وصلاحیت کے لحاظ سے سب زمین یکساں نہیں ہوتیں، وہ زمین جس میں قوت نشو ونما ہوتی ہے یعنی زرخیزی کی صلاحیت اس کے اندر بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، وہ اپنے سینے کے اندر بارش کے قطروں کو جذب کر کے سبزے اگا دیتی ہے، چاروں طرف بہار ہی بہار نظر آتی ہے، گویا زمین پر سبزے کا فرش بچھا دیا جاتا ہے، مردہ زمین میں زندگی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں، لیکن ایک دوسری زمین ہوتی ہے جس میں جذب وقبول کی صلاحیت نہیں پائی جاتی، باران رحمت کا نزول اس پر بھی ہوتا ہے، فقدان صلاحیت سے اس میں زندگی کے آثار نمایاں نہیں ہوتے، بارش کے قطروں سے اس کے ظاہر پر نمی وتراوٹ پائی جاتی ہے لیکن اندر کا حصہ پہلے کی طرح خوشک رہتا ہے، اس ظاہری تراوٹ کو دیکھ کر بعض

اوقات اس کے سبزہ اگنے کی امید کی جاتی ہے مگر یہ فریب نظر ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ جس کی فطرت میں خشکی پائی جائے وہ بھی اس طرح کہ ایک قطرۂ آب اپنے اندر جذب نہ کر سکے اس سے نشوونما کی امید رکھنا عبث ہے۔

بعض زمین ایسی ہوتی ہیں کہ بارش کے بعد اس پر ایک قطرہ آب بھی رک نہیں پاتا اس لیے اس سے روئیدگی اور سرسبزی کی امید نہیں کی جاسکتی وہ پہلے کی طرح بے آب وگیاہ رہتی ہے، اس پر باران رحمت کا اثر مرتب نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس کی فطرت میں روئیدگی کی صلاحیت نہیں پائی جاتی، اس کو خداے تعالیٰ نے اپنے کلام میں بتایا کہ:

﴿وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۗ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۗ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ، وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۗ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ﴾ (الاعراف:۵۷۔۵۸)

اور وہی ہے کہ ہوائیں بھیجتا ہے اس کی رحمت کے آگے مژدہ سناتی، یہاں تک کہ جب جب اٹھا لائیں بھاری بادل ہم نے اسے مردہ شہر کی طرف چلایا، پھر اس سے پانی اتارا، پھر اس سے طرح طرح کے پھل نکالے، اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے، کہیں تم نصیحت مانو اور جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے نکلتا ہے، اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل، ہم یوں ہی طرح طرح سے آیتیں بیان کرتے ہیں ان کے لیے جو احسان مانیں۔

پس تم ٹھیک انھیں زمینوں کی طرح قلوب انسانی کی زمینوں کو تصور کرو، انوار نبوت کا فیضان تمام قلوب انسانی پر ہوتا ہے، لیکن بعض شخص وہ ہوتے ہیں جو علوم نبوت سے خود مستفیض ہوتے ہیں اور دوسروں تک ان کا فائدہ پہنچاتے ہیں، گویا وہ ایسی زمین ہیں جس کی زرخیزی وشادابی سے دوسروں کو مستفیض ہونے کا موقع ملتا ہے، اور بعض انسان ایسے ہوتے

ہیں کہ ان کے ظاہر پر ہدایت وعلم کی تھوڑی بہت روشنی پائی جاتی ہے، مگران کا باطن علم ویقین سے بالکل محروم ہوتا ہے، اس کے ظاہر سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ خود محروم ہوتا ہے، تیسری قسم کے انسان وہ ہیں کہ ہدایت کے سحاب رحمت کی کتنی ہی بارشیں ہوں ان کا ظاہر و باطن کسی طرح متاثر نہیں ہوتا۔

گویا سرکار دو عالم **صلی اللہ علیہ وسلم** نے اپنی اس تشبیہ بلیغ کے اندر فیضان نبوت کی عمومی حیثیت کو واضح فرمایا ہے، اور ردّ وقبول کے لحاظ سے اصناف انسانی کی حیثیت کو متعین کیا ہے، اس لیے جیسے بارش سے ہر مردہ زمین میں روئیدگی اور سرسبزی نہیں پائی جاسکتی حالاں کہ اس کا فیضان عام ہے اسی طرح وحی الٰہی کا فیضان سب پر ہوتا ہے تاہم ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص رشد و ہدایت کی منزل کو پالے، بہت سی محروم روحیں ایسی ہیں کہ ہدایت کی بارشوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، اس لیے وہ گمراہی کے دلدل میں گرفتار رہیں گی۔

(6)"عن ابی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: مثلی کمثل رجل استوقد ناراً، فلمااضاءت ماحولها جعل الفراش وهٰذهٖ الدّوابّ الّتی تقع فی النار يقعن فيها وجعل يحجزهن ويغلبنه فيتقحمن فيها قال: فذالک مثلی و مثلكم اناآخذ بحجزكم عن النار ،هلم عن النار، هلم عن النار، فتغلبونی تقحمون فيها"۔ (مسلم شریف۔ج:2۔ص:148۔باب شفقته صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے: حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے آگ جلائی، جب اس کے ارد گرد روشنی پھیل گئی تو پروانے اور وہ کیڑے مکوڑے جو آگ میں گرتے ہیں اس میں گرنے لگے، حالاں کہ وہ شخص آگ میں گرنے سے روکتا ہے، لیکن وہ سب اس پر غالب آجاتے ہیں اور آگ میں بے تحاشہ کود ہی پڑتے ہیں، یہ میری اور تمہاری مثال ہے، میں تمہیں آگ سے بچانے کے لیے تمہاری کمر کو پکڑتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میری طرف آؤ، آگ سے بچو، آگ سے بچو، مگر تم میرے اوپر غالب آجاتے ہو، تم آگ میں کود ہی پڑتے ہو۔

شرح حدیث:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت پر اپنی شفقت ورافت واضح کرنے کے لیے اس حدیث پاک میں ایک تمثیل بیان فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات اقدس کوایک آگ روشن کرنے والے شخص کے مشابہ بتایا، اوراپنی امت کو پروانوں کے مانندفرمایا جوہجوم خواہشات میں جلتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جل کرخاکستر ہوجاتے ہیں، دنیا کی آگ کو جوآخرت کا ایک معمولی حصہ ہے آخرت کے آگ کے مثل قرار دیا، ان امور سے حسب ذیل نکات پرروشنی پڑتی ہے:

{الف} اپنی ذات اقدس کوایک آگ جلانے والے آدمی کے مثل بتانے سے آپ کی اعلیٰ وارفع ذات نبوت ورسالت کی بلندسطح سے نیچی سطح پرآکر عام انسانوں جیسی ہےلیکن آپ نبوت کے اتنے اونچے مقام پر فائز ہیں کہ اس پر قدسیوں کا گروہ (ملائکہ مقربین) بھی نہیں پہونچ سکتے، چنانچہ حضرت علامہ ابوبکرابن عربی رحمۃ اللہ علیہ شرح ترمذی میں اس حدیث کے ذیل میں اس حقیقت کوواضح کرتے ہیں کہ اس تمثیل سے سرکار کی ذات مقدسہ نیچی سطح پرنہیں آتی، وہ فرماتے ہیں کہ خدائے قدوس نے قرآن عزیز کے متعدد مقامات میں اپنی ذات کی مثال ''آدمی'' سے بیان فرمائی ہے حالاں کہ ذات باری حدوث کی صفتوں اورنقص کی علامتوں سے منزہ ہےاوراس کی ذات پاک ہے کہ ناپسندیدہ اموراس میں پائے جائیں، تمام وہ چیزیں جوانسانیت کے لائق ہیں خدا کی ذات اس سے بلند وبرتر ہے۔(شرح ترمذی)

یعنی جب اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی مثال کسی اہم حقیقت کےواضح کرنے کے لیے آدمی سے پیش کی جاسکتی ہے،توسرکاردوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال آدمی سے کیوں نہیں پیش کی جاسکتی ،آپ سب سےاعلیٰ وارفع ہیں، اورآپ کے رتبے کی بلندی تک کسی مخلوق کا پہنچنا محال ہے۔

پھرعلامہ ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ قرآن حکیم کی آیت کریمہ سے جوتمثیلات الٰہیہ میں سے ایک اہم تمثیل ہے اپنے دعوے پرسند پیش کرتے ہیں:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا﴾ (الزمر: ۲۹)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے ایک غلام میں کئی بدخو آقا شریک، اور ایک نرے ایک مولیٰ کا، کیا ان دونوں کا حال ایک سا ہے؟

اس آیت کریمہ میں مشرک و مومن کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے، خدائے پاک ارشاد فرماتا ہے کہ ایک غلام ایسا ہے جس کے بہت سے آقا ہیں، ان سب کی خواہش ہوتی ہے کہ غلام صرف اس کی خدمت گزاری میں اپنا وقت صرف کرے، اور غلام اس فکر میں رہتا ہے کہ سب کی خدمت بجالائے، سب اپنی طرف کھینچتے ہیں، ایسی حالت میں وہ کشاکش ذہنی میں مبتلا رہتا ہے، وہ عالم حیرانی میں سوچتا ہے کہ کس کی خدمت کرے کس کی نہ کرے، کس کو خوش رکھے کس کو ناخوش، اپنی ضرورتوں میں کس پر اعتماد کرے، اور اپنے رزق کا طالب کس سے ہو، عجیب و غریب کش مکش کی حالت میں اس کی زندگی گزرتی ہے، وہ قلبی راحت و سکون نہیں حاصل کر پاتا، ہمیشہ اس اضطراب و بے چینی کی زندگی گزارتا ہے، اس کے برعکس ایک دوسرا غلام ہے، جو ایک شخص کی آقائی میں رہتا ہے، اور یکسو ہو کر اسی ایک کی خدمت گزاری میں اپنا وقت صرف کرتا ہے، اسی سے اپنی روزی کا طلب گار ہوتا ہے، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں اسی سے مدد کا طالب اور اسی کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے، بڑے اطمینان و سکون کی زندگی گزارتا ہے، وہ ذہنی اضطراب و انتشار میں مبتلا نہیں ہوتا، قرآن کہتا ہے: میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان کی حالت یکساں ہے، تم کو ان دونوں کی زندگی میں کوئی تفاوت نظر نہیں آتا؟ یقیناً تم یہی جواب دو گے کہ دونوں غلاموں کی زندگیوں و حالتوں میں بڑا فرق ہے، ایک ایسا ہے جو ایک ذات کی خدمت کر کے بڑے چین کی زندگی گزار رہا ہے، دوسرا وہ ہے جو بہت سے آقاؤں کی خدمت گزاری میں اپنی راحت و سکون سب کچھ کھو بیٹھا ہے۔

بس تم اسی طرح ایک مشرک اور ایک موحد کو سمجھو، مشرک اوہام طلسم میں گرفتار ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے، خدا پرست مومن ایک خدا کی عبادت کر کے سکون قلب حاصل کرتا ہے۔

اس قرآنی مثال میں غور کرو، وہ بندہ جو مخلوق ہے، جس کے اندر حدوث کی علامتیں پائی جاتی ہیں، جس کے تمام کمال میں زوال کا راز مضمر ہے، جس کی پوری زندگی تغیر پذیر ہے، جو رفتہ رفتہ فنا کی منزل سے قریب ہوتا ہے، یعنی ایک حادث مخلوق، فانی بندہ کی حیثیت، ذات خالق قدیم (جو عیبوں سے پاک، حدوث کی علامتوں سے منزہ ہے) کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے، شان بندگی اور شان الوہیت میں کیا نسبت؟ ذرے کی حیثیت آفتاب کے مقابلے میں ہوتی ہے، لیکن بندے کی حیثیت ذات باری کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، کہاں ایک عاجز ولاچار کہاں رب السماوات والارض، مالک ومختار، تاہم اس ذات بے ہمتا نے اس آیت کریمہ میں اپنی تمثیل ایک آدمی کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ انسان کے ساتھ اگر کوئی مثال پیش کی جائے تو یہ شان الوہیت کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ انسان کا ذہن ناقص مفاہیم عالیہ کا ادراک مثال کے ذریعہ آسانی کے ساتھ کر لیتا ہے، اسی طرح حدیث پاک میں سرکار دوعالم **صلی اللہ علیہ وسلم** کی ذات ایک آگ جلانے والے انسان کے مثل قرار دیا گیا، تو اس سے شان رسالت کی تنقیص نہیں ہوتی نہ ہی آپ نبوت کے بلند مقام سے انسانیت کی عام سطح پر آجاتے ہیں، پس اگر کوئی شخص محض اس وجہ سے کہ سرکار نے اپنے کو ایک آدمی کے مشابہ بتایا اور اسی قسم کی تمثیل قرآن حکیم میں منافق کی حالت کی وضاحت کے لیے مذکور ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ﴾ (البقرة:١٧)

ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا، اللہ ان کا نور لے گیا، اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا۔

اس حدیث سے انکار کا بہانہ یوں تلاش کرے کہ اس سے شان رسالت کی تنقیص ہوتی ہے، تو میرے نزدیک یہ نہ صرف جہالت و بے علمی پر مبنی ہے بلکہ اپنی کج روی کے لیے اپنے اختراع ذہنی سے ایک بہانہ تلاش کیا گیا ہے، کیوں کہ ان قرآنی اور نبوی تمثیلوں میں

الفاظ کے اشتراک سے یہ استدلال سرتا سر غلط ہے، ارباب دانش جانتے ہیں کہ جب دونوں تمثیلوں میں وجوہ تشبیہ الگ الگ ہیں تو دونوں کو یکساں کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، قرآن حکیم میں منافق کو ایسے آگ جلانے والے لوگوں کے مشابہ بتایا گیا جن کے چاروں طرف روشنی پھیل گئی لیکن ان کی حرماں نصیبی کے باعث خدائے قدوس نے ان روشنیوں کو بجھا کر ان کو تاریکیوں میں پہنچا دیا، یہ جب روشنی کے بعد تاریکی میں پہنچ گئے تو روشنی کی ایک کرن سے بھی محروم ہو کر ایسی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سرگشتہ و حیران ہوئے، ایسے ہی منافق کا حال ہوتا ہے، اور تمثیل نبوی میں سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں اس شخص کی طرح ہوں جس نے آگ روشن کی سارا ماحول تابناک ہو گیا، روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو پروانے اپنے جذبات کے ہجوم میں آگ میں کودنے لگے، وہ شخص پروانوں پر بڑا شفیق و مہربان ہے، آگ میں جل کر خاکستر ہو جانے اور نیست و نابود ہونے سے ان کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، پروانے آگ میں کود کر اپنے کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

اسی طرح تم آگ میں کودنا چاہتے ہو، ہوائے نفسانی میں گرفتار ہو کر آتش دوزخ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنا چاہتے ہو، اور میں تمہاری کمر پکڑ کر بچانا چاہتا ہوں۔

اس تمثیل نبوی ﷺ اور قرآنی تمثیل میں واضح طور پر فرق محسوس کیا جا سکتا ہے، قرآن حکیم میں منافق کی حیرت و سرگشتگی کو واضح کیا گیا ہے، اور حدیث شریف میں سرکار دو عالم ﷺ کی شفقت و رأفت کو بیان کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ آپ انسانیت کے کتنے ہمدرد اور اس کے اوپر شفیق و مہربان ہیں۔

لہٰذا قرآن حکیم اور حدیث پاک کے بعض الفاظ کی یکسانیت سے شان رسالت کی تنقیص تلاش کرنا پھر ان کو حدیث کے ساقط الاعتبار ہونے کی دلیل میں پیش کرنا کج فہمی کا ثبوت اور جہالت کی دلیل ہے۔

{ب} انسان پروانوں کے مانند ہوتا ہے، اسی کی طرح شہوات نفسانی میں گرفتار ہوتا ہے، اور کبھی بھلائی یا برائی میں امتیاز نہیں کر پاتا، اور جذبات کے ہجوم میں بربادی کے

اسباب کو اپنے لیے بہتر تصور کرتا ہے، اس طرح منکرات وفواحش کی ہلاکت خیزیاں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور بدی کے برے نتائج اس کے اخروی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

{ج} پروانہ اپنی نادانی و جہالت کے باعث آتش سوزاں کی حقیقت سے نا آشنا ہوتا ہے، انسان پر بھی ایسی غفلت طاری ہوتی ہے کہ وہ گناہوں و معصیت کاریوں کے مفاسد سے لاعلم ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ جو شخص اس کو اس کی غفلت سے آگاہ کرتا ہے اور برائیوں سے بچانے کی فکر کرتا ہے وہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتا، کوئی کیسی ہی خیر خواہی کے ساتھ شہوات کی آگ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنے میں اس کو روکنے کی کوشش کرے مگر وہ اس طرح بے تابانہ آگے بڑھتا جاتا ہے کہ ایسا خیر خواہ وشفیق بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔

{د} پروانے کی نفسیات کا جائزہ پیش کرنے والوں نے یہ بتایا ہے کہ وہ تاریکی میں رہتا ہے، پھر جب جلتی ہوئی آگ اور اس کے شعلوں و کرنوں کو دیکھتا ہے تو اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی روشندان ہے، جس سے کرنیں نکل رہی ہیں، اس کی طرف تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے جلتی ہوئی آگ میں کود کر خاکستر ہو جاتا ہے، اسی طرح جب انسان پر برے عقائد اور شہوات نفسانی کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کی عقل پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ اپنی مضرت رساں چیزوں یعنی مناکر و مناہی کو اپنی بھلائی کی چیز تصور کرتا ہے، ان سے احتراز کے بجائے انہیں میں کود پڑتا ہے، اس طرح اپنی ذات کو ہلاکتوں کی آگ میں جھونک دیتا ہے، حالاں کہ وہ عقائد و نظریات نہایت فاسد خیالات ہوتے ہیں جو اس کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ **تبارک و تعالیٰ** ارشاد فرماتا ہے:

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ (الانعام:۱۰۸)

یوں ہی ہم نے ہر امت کی نگاہ میں اس کے عمل بھلے کر دیے ہیں، پھر انہیں اپنے رب کی طرف پھرنا ہے۔

اور ایک دوسری آیت کریمہ میں آخرت کے منکرین کی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ﴾ (النمل:۴)

جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں بھلے کر دیے ہیں تو وہ بھٹک رہے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمثیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ انسان کے نفسیات کو کتنی گہری نگاہ سے دیکھتے تھے، اور پھر اس کی ہدایت وتنبیہ میں کتنا شفیق ومہربان تھے، ان الفاظ سے کہ انسان تیزی کے ساتھ پروانہ وار آگ میں کودنا چاہتا ہے، اور میں اس کی کمر مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر آگ میں ہلاک ہونے سے بچانا چاہتا ہوں، سرکار کی شفقت ورحمت کا ادراک یک گونہ کیا جا سکتا ہے۔

(۷) ”وعن ابي موسى قال: قال رسول اللّٰه صلى الله تعالى عليه وسلم: انما مثلي ومثل ما بعثني اللّٰه به كمثل رجل اتىٰ قوماً فقال يا قوم اني رأيت الجيش بعينيّ واني انا النذير العريان فالنجاء، النجاء، فاطاعه طائفةٌ من قومه فاد لجو فانطلقوا علىٰ مهلهم فنجوا،وكذبت طائفةٌ منهم، فاصبحوا امكانهم،فصبحهم الجيش ،فاهلكهم واجتاحهم، فذالك مثل من اطاعني ،فاتّبع ماجئت ومثل من عصاني وكذّب ماجئت به من الحق“(متفق عليه، صحيح البخارى، حديث: ۷۲۸۳)

حضرت ابوموسیٰ اشعری **رضی اللّٰہ عنہ** کا بیان ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فی الحقیقت میری اور اس چیز کی جس کو دے کر مجھ کو اللہ نے بھیجا ہے، اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہا کہ اے قوم میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے، اور میں صحیح واقعے سے خبردار کرنے والا ہوں، تم جلد اپنی حفاظت

کرو، اس قوم میں سے کچھ لوگوں نے اس کی بات مان لی، اور بہ عجلت تمام رات کی تاریکی میں نکل گئے تو وہ نجات پا گئے، اور کچھ لوگ اس کو جھوٹا قرار دے کر صبح تک اپنی جگہ میں موجود رہے، لشکر نے صبح کے وقت ان کو پالیا تو ان کو ہلاک، تباہ و برباد کر دیا، یہ مثال اس شخص کی ہے جس نے میری اطاعت کی اور میرے لائے ہوئے احکام کی پیروی کی، اور اس شخص کی ہے جس نے میری نافرمانی کی اور میرے لائے ہوئے احکام کو جھٹلایا جو بالیقین حق ہے۔

شرح حدیث:

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص کسی دشمن کی فوج کو دیکھتا تو اپنے کپڑے اتار کر سر پر رکھ لیتا اور چلتا ہوا آ کر اپنی قوم کو خبر دار کرتا، وہی برہنہ ڈرانے والا "**النذیر العریان**" تھا پھر اس لفظ کا اطلاق ہر ایسے شخص پر کیا گیا جو دشمن کے حملہ آور فوج سے اپنی قوم کو آگاہ کرے چاہے فی الواقع وہ برہنہ نہ ہو، حضور اکرم **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** نے اس حدیث پاک میں اپنی ذات کو ایسے شخص سے تشبیہ دے کر انسان کو اس کی بداعمالیوں کے برے نتائج سے اپنے کو ڈرانے والا بتایا، گویا کوئی ایسی فوج ہے جو انسانیت پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے، آپ اس سے اولاد آدم کو خبر دار کرنا چاہتے ہیں۔

سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے اپنے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو اپنی قوم کو دشمن کے حملہ آور لشکر سے بچانے کی فکر میں رہتا ہے، وہ شخص بڑا ہی مخلص اور اپنی قوم کا ہمدرد ہوتا ہے، لیکن اس کی قوم اس کی صداقت کا یقین نہیں کرتی۔

نہ ہی دشمن کی حملہ آور فوج کی خبر پا کر اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے مکمل طور سے تیاری کرتی، ہاں کچھ لوگ ضرور ہوتے ہیں جو اس کی باتوں پر یقین کر کے اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتے ہیں، اور دشمن کی ہلاکت خیزیوں سے بچ جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے، الٹے اس کو ہی جھوٹا بتلاتے ہیں، بالآخر ناگہانی طور پر حملہ آور لشکر اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے، بنی نوع انسان کے کون سے ایسے ہلاکت برپا کرنے والے دشمن ہیں جن سے نجات کی تدبیر کے لیے سرکار نے اپنے

کو''**نذیرعریان**'' کے مشابہ بتایا، پورے عالم انسانیت پر مختلف قسم کے دشمنوں کا دھاوا ہے، ایک ایسی بدی کی قوت ہے جس کو مذہب کی زبان میں ''شیطان'' کہا جاتا ہے، اور جس کا وجود خارجی دنیا میں پایا جاتا ہے، اور انسانوں پر اس کے برے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے رگ وریشے میں وہ دوران خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے، اس کے برے اثرات، وسواس، خیالات باطلہ، اوہام کی صورت میں انسان کے اندر پائے جاتے ہیں، سب سے بڑا حملہ آور دشمن یہی شیطان اور اس کی ذریات ہیں، یہی وہ ہے جو انسان کو برائیوں کی ترغیب دیتا ہے، بدی کو نیکی اور نیکی کو بدی کی شکل میں پیش کرتا ہے، اس کی کارستانی ہے کہ وہ برائی کو ایسا آراستہ کرتا ہے کہ انسان اس کے اوپر فریفتہ ہوکر اپنی ہلاکت کا سامان تیار کرتا ہے۔

دوسرا انسان کا بڑا دشمن خود اس کی ذات میں موجود ہے، وہ اس کا نفس امّارہ ہے جو خواہشات وجذبات کی آگ میں اس کو جھونکنا چاہتا ہے۔

تیسرا دشمن خود انسان کے بعض افراد ہوتے ہیں، اس پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے، وہ اس مادّی اور محسوس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ان کو دنیا کی زندگی کا بڑا اعتبار ہوتا ہے، وہ اپنی نفس پرستی کے لئے اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر ظلم وتعدی کا بازار گرم رکھتے ہیں، ان کی نگاہوں سے نیکی اور بدی کا فرق وامتیاز اس طرح اوجھل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی برائیوں اور بدکاریوں سے اولاد آدم کو تباہ وبرباد کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں، وہ خونخوار درندوں کے مانند ہوتے ہیں، جو انسان کا خون چوس کر اپنے نفس کی بھوک وپیاس کی آگ بجھاتے ہیں، وہ نہ خود صحیح راستے پر چلتے ہیں نہ دوسروں کو سیدھے راستے پر چلنے دیتے ہیں، وہ اس دار فانی کی زندگی کے بعد آنے والی اخروی زندگی کا یقین نہیں رکھتے، اس لیے ان کو اپنے بداعمالیوں کی فکر نہیں ہوتی۔

یہی وہ سب ''اعدائے انسان'' ہیں جو اولاد آدم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں، ان کی دنیاوی زندگی میں تباہی وبربادی کے آلات حرب وجنگ پیدا کرتے ہیں، اور آنے والی آخرت کی زندگی کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔

سرکار **علیہ الصلاۃ والسلام** انہیں دشمنان انسانیت سے نجات کے لئے احکام وشرائع کا نسخۂ کیمیا لائے، جو شخص آپ کی اطاعت وفرماں برداری میں کمربستہ ہوگیا اور آپ کی صداقت کا اس کو یقین کامل ہوگیا تو وہ ایسے ہلاکت خیز تباہی مچانے والے تمام دشمنوں سے رہائی حاصل کرکے دارین کی سعادتوں سے مالا مال ہوگیا، دنیا کی زندگی میں ناکام و نامراد نہ ہوا اور آنے والی ابدی زندگی میں بھی کامیاب وبامراد رہے گا۔

لیکن جس نے رحمت عالم **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** کے لائے ہوئے دین و شریعت کی پیروی نہیں کی بلکہ آپ کی سچائی کا یقین نہ کرکے نافرمانی کے جرم کا مرتکب ہوا، اس پر ان تمام دشمنان انسانیت کا حملہ بڑا شدید ہوتا ہے، وہ بظاہر دنیا کی زندگی میں کتنا ہی آسودہ حال وخوشحال نظر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہلاکت اس کا مقدر بن چکی ہے۔

انہیں سب معارف کو حضور اکرم **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** نے اپنی تمثیل سے خوب خوب واضح کیا، آپ کی اس تمثیل کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جب تک انسان میری اطاعت و فرماں برداری کی راہ پر نہیں چلے گا اس کو ہمیشہ ان دشمنوں سے خطرہ لگا رہے گا، اگر انسان تحفظ وسلامتی چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ میں جن برے امور اور و بداعمالیوں کے نتائج سے ڈراتا ہوں ان تمام سے اپنی ذات کو محفوظ بنالیں۔

{۸} "عن معاذ بن جبل قال اوصاني رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالى عليه وسلم بعشر كلماتٍ و قال: لا تشرك بالله شيئًا وان قتلت وحرّقت، ولا تعقنّ والديك وان امراك ان تخرج من اهلك ومالك ولا تتركنّ صلاةً مّكتوبةً متعمّداً ،فان من ترك صلاة مكتوبة متعمداً فقد برئت منه ذمّة اللّٰه، ولا تشربنّ خمراً فانّه رأس كل فاحشة، وّاياك والمعصية ،فانّ بالمعصية حل سخط اللّٰه وايّاك والفرار من الزحف وان هلك النّاس ،واذا اصاب النّاس موتٌ وانت فيهم فاثبت، وانفق علىٰ عيالك من طولك ولا ترفع عنهم عصاك ادبًاوّ اخفهم في اللّٰه (رواهُ احمدُ)" (بحواله مشكوة المصابيح، ج ۱ ،حديث: ۵۶)

حضرت معاذ بن جبل **رضی اللہ عنہ** کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں پر عمل پیرا رہنے کی تاکید فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اگر چہ تم قتل کر دیے جاؤ اور آگ میں جلا دیے جاؤ، ہرگز ہرگز والدین کی نافرمانی نہ کرنا اگر چہ وہ تم کو بال بچوں اور گھر بار چھوڑ کر نکل جانے کا حکم دیں، جان بوجھ کر نماز فرض ترک نہ کرنا، بلاشبہ جس نے قصداً نماز چھوڑ دی تو وہ اللہ کے حفظ و امان سے بری ہو گیا، اور کبھی بھی شراب مت پینا کیوں کہ وہ تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے، اور گناہ سے بچتے رہنا کیوں کہ گناہ سے عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے، جہاد میں بھاگنے سے اپنے کو بچائے رکھنا اگر چہ لوگ ہلاک ہو جائیں، اور جب لوگوں میں کوئی وبائی بیماری پھیل جائے اور تم موجود ہو تو ثابت قدم رہو، اپنے بال بچوں پر اپنے حسب استطاعت خرچ کرو، اور ادب سکھانے کے لئے مارنے کی ضرورت پیش آئے تو مارو، اور اللہ کے بارے میں ان کو ڈراؤ۔

یہ وہ دس احکام ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کی تاکید سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے اپنے ایک جانثار صحابی کو فرمائی، گو کہ روئے سخن ایک ذات کی طرف ہے لیکن مراد تمام آپ کے امتی ہیں، اگر ان احکام پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے، پھر اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ ان احکام میں سے بیشتر پر قرآن حکیم نے اپنے معجزانہ اسلوب بیان سے جا بجا مناسب موقعے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، اگر ان سب کا احصا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، اس لیے ان ''**عشر کلمات**'' کی وضاحت بطور اختصار مناسب ہوگا۔

(۱) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اگر چہ تم قتل کر دیے جاؤ اور آگ میں جلا دیے جاؤ۔

توحید الٰہی اسلام کے بنیادی عقائد میں سے سب سے مقدم عقیدہ ہے جس پر قرآنِ حکیم کے اندر مختلف پیرایۂ بیان میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے، دلائل آفاق و انفس کے ذریعہ نہایت دل نشین انداز میں خدا پرستی اور توحید پرستی کو ثابت کیا گیا ہے، شرک

اس کے بالکل ضد اور اس کے خلاف عمل عقیدہ ہے، اس لیے اس کے ردو ابطال سے پورا قرآن بھرا ہوا نظر آتا ہے۔

چنانچہ سورہ بقرہ کی وہ پہلی آیت جس میں عبادت الٰہی وخدا پرستی اور توحید ایزدی کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے:

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ"۔ (البقرہ: آیت ۲۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا، اور ان سب کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تا کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ، جس نے تمہارے لیے زمین فرش کی طرح بچھا دی اور آسمان کو عمارت بنا دیا، اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل تمہارے رزق کے لیے نکالا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ پس اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ توحید پرستی وعبادت الٰہی کے کس قدر منافی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک کیا جائے، اگر کوئی شخص خدا کی عبادت بھی کرے اور اس کے ساتھ شرک کی آلودگیوں میں بھی ملوث رہے تو یہ عبادت بالکل رائیگاں ہو جاتی ہے، قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (الانعام: ۸۸)

یہ اللہ کی ہدایت ہے کہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ان کا کیا کرایا اکارت ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور شرک دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ،شرک کے بعد سارا کیا کرایا اکارت ہو جاتا ہے، یہ وہ ظلم عظیم ہے کہ خداے برتر وتوانا اپنی عظمت وجلال کے خلاف پا کر اس کو کسی صورت میں معاف نہیں کرسکتا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيمًا﴾(النساء:۴۸)۔

بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر وشرک کیا جائے ،اور کفر وشرک کے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہتا ہے معاف فرما دیتا ہے۔

اسی وجہ سے سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ جیسے صاحب عزیمت صحابی سے ارشاد فرمایا کہ تمہیں آگ میں جلا کر ہلاک کرنے کی دھمکی دی جائے تو بھی تم شرک نہ کرنا ورنہ حالت اکراہ میں اگر زبان سے کلمات کفر وشرک محض تحفظ جان کے لیے بول دے تو جائز ہے، بشرطیکہ طمانیت قلب زائل نہ ہو۔

قرآن حکیم میں توحید کے اثبات ،اور شرک کے ردّ وابطال پر جس قدر زور دیا گیا ہے،اور مختلف پیرایۂ بیان سے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے،اس سے بعض نادان اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ معمولی معمولی باتوں پر شرک ہونے کا فتویٰ دے ڈالا۔

دوسری طرف بعض وہ اُمور جو صرف ذات باری کے لیے زیبا ہیں، بزرگوں کی بارگاہ میں ان کو اپنی نیازمندی اور عقیدت کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا گیا، مثلاً غیر اللہ کا سجدۂ تعظیمی کرنا بعض لوگوں نے جائز قرار دے دیا، اس کی حرمت پر دلیل قطعی موجود ہے،خود سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعدد حدیثوں میں غیر اللہ کے سجدے کو تاکیدی حکم کے ساتھ ممنوع وحرام قرار دیا، یہ دونوں گروہ اعتدال کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

(۲) سرکار نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز ہرگز والدین کی نافرمانی نہ کرنا، اگرچہ وہ تم کو بال بچوں اور گھر بار چھوڑ کر نکل جانے کا حکم دیں۔

آپ کے اس تاکیدی حکم سے صاف ظاہر ہے کہ والدین کی نافرمانی اور ان کی حکم

عدولی کتنا بڑا گناہ ہے، اس گناہ کبیرہ کا احساس اس وقت زیادہ نمایاں ہوگا جب ہم قرآن حکیم کی متعدد اُن آیات کا مطالعہ کریں جن میں والدین کے ادب و احترام، ان کی تعظیم و تکریم، ان کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کے تاکیدی حکم دیے گئے ہیں، اور اس بات پر بھی نظر رہے کہ توحید الٰہی اور خدا پرستی کے بعد قرآن حکیم کے اندر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ {سورة البقرة: ٨٣}

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا، اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾

{النساء: ٣٦}

اور اللہ کی بندگی کرو، اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔

اہل کتاب کو مخاطب فرما کر کے ارشاد فرمایا گیا:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (الانعام: ١٥١)

آپ فرمایئے: آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں جو کچھ تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کر دیا ہے، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کو شب معراج میں جو احکام الٰہیہ عطا ہوئے تھے، ان کی تفصیل سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہے ارشاد فرمایا گیا:

"وقضیٰ ربُّك الاّ تعبدوٓا اِلاّ ایّاہُ وبالوالدین احساناً اِمّا یبلغن عندك الکبر احدھماو کلاھما فلا تقل لّھما اُفٍ وّلا تنھرھما وقُل لّھما قولاً

كريما وَ اخْفِضْ لهما جناح الذُّل مِنَ الرَّحْمَةِ وقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كمارَبَّيٰنِیْ صغيراً"(بنی اسرائیل:24)۔

اور تمہارے رب نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اگر تیرے سامنے ان میں کا ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے ''کلمۂ اذیت'' اُف نہ کہو اور نہ انھیں جھڑکی دو، اور ان سے تعظیم کی بات کہو، ان کے لئے نرم دلی سے عاجزی کا بازو بچھاؤ اور عرض کرواے میرے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا (یعنی شفقت ومحبت کے ساتھ میری تربیت کی)۔

اس آیت کریمہ میں ماں باپ کے بارے میں پانچ حکم دیے گئے ہیں: پہلا یہ کہ ہر حالت میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ ہونا چاہئے، دوسرا یہ کہ جب وہ بڑھاپے کی اس منزل کو پہنچ جائیں جس میں ان کو خدمت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور ان کی طرف سے کچھ ایسی باتوں کا ظہور ہوسکتا ہے جو طبیعت پر گراں گزرے، تو ایسے وقت میں ان کے ساتھ سخت کلامی اور ایذا رسانی نہیں ہونی چاہیے، تیسرا یہ کہ ہر حالت میں ماں باپ کے ساتھ ادب واحترام کے دائرے سے باہر نہیں ہونا چاہیے بلکہ جب ان سے بات کی جائے تو ان میں نرمی ومتانت ملحوظ رہے، چوتھا یہ کہ ان کے ساتھ ہمیشہ شفقت ورحمت کے جذبے کا مظاہرہ ہونا چاہیے، کبھی بھی ان کے ساتھ تندخوئی اور سخت مزاجی سے پیش نہیں آنا چاہیے، پانچواں یہ کہ ان کے لئے خدائے قدوس کی بارگاہ میں رحم وکرم کی دعا کرنی چاہئے، ان تمام آیات میں غور کرو کہ خدائے قدوس نے عبادت الٰہی وتوحید پرستی کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم کتنی تاکید کے ساتھ دیا ہے، اس سے واضح ہوا کہ حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد میں سب سے اہم حقوق والدین کے ہیں، اسی لیے سورہ لقمان کے اندر حضرت لقمان نے اپنے صاحبزادے کو جو نصیحت فرمائی تھی وہ تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے، اس میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وان جاهداك عَلىٓ اَنْ تُشْرِكَ بِي ماليس لك به علمٌ فلا تطعهما﴾

اگروہ دونوں تجھ سے کوشش کریں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں ہے،تو ان کی باتیں نہ ماننا۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث میں جن دس تاکیدی احکام کو بیان کیا گیا ہے ان میں سے دو پر قرآن حکیم کی آیت کریمہ سے روشنی ڈالی گئی، تیسرا حکم نماز کے متعلق ہے،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

(۳) ہرگز ہرگز جان بوجھ کر نماز کو ترک نہ کرنا، بلاشبہ جس نے قصداً نماز چھوڑ دی وہ اللہ کی حفظ وامان سے دور ہو گیا۔

حضرت شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پاک کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

''ظاہر حدیث وجوب قتل تارک صلاۃ است وہمیں ست مذہب شافعی وبعض ائمہ دیگر، ودر مذہب حنفیہ و مالکیہ اورا باید زدو بند وزنداں فرمود، وگفتہ اند صحابہ ہیچ گناہے را متسم بکفر نمی داشتند مگر ترک صلاۃ را''(اشعۃ اللمعات ج 1 ص 78)

ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تارک نماز کو قتل کرنا واجب ہے، اور یہی امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ کرام کا مذہب ہے، اور حنفی، مالکی مذہب میں اس کو مارا جائے گا، صحابہ کرام کسی گناہ کو علامت کفر نہیں تصور فرماتے تھے، مگر ترک صلاۃ کو کفر کی علامت تصور فرماتے تھے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس شرح و بیان سے نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے، نماز عبادت الٰہی میں وہ اہم ترین عبادت ہے کہ ائمہ کرام میں سے بعض جلیل القدر امام تارک صلاۃ کے لیے آخری سزا یعنی قتل کا حکم صادر فرماتے ہیں، چنانچہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک، امام نخعی کا مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو کر قتل کا سزاوار ہو جاتا ہے، اور اس کے اوپر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، نہ ہی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

تکمیل ایمان نماز سے ہے :

عہد رسالت میں صحابہ کرام میں سے بعض جلیل القدر صحابہ کسی عمل کے ترک کو کفر نہیں قرار دیتے تھے، مگر تارک صلاۃ کو دائرہ اسلام سے خارج تصور فرماتے تھے، حضرت فاروق اعظم، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ، ابودردا **رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین** ایسے مقدس صحابہ کرام ہیں جو تارک صلوٰۃ کو اسلام سے خارج قرار دیتے تھے، سلف صالحین کے عہد مبارک میں ایک مسلمان کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جان بوجھ کر وہ نماز کو چھوڑ دے گا، درحقیقت ارکان اسلام میں سے نماز وہ عظیم الشان رکن ہے جس کے بغیر ایک مومن کامل کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ایمان کی تکمیل نماز کے بغیر نہیں ہوسکتی، بندہ اپنے خالق عزوجل سے قلبی رابطہ رکھتا ہے، وہ یہ کہ اس کے اوپر ایمان لاتا ہے، اس کی ذات وصفات کو تسلیم کرتا ہے، ضروریات دین کو مانتا ہے، لیکن اس کے ایمان واذعان میں یاد الٰہی سے غفلت کی بنا پر ضعف و ناتوانی پیدا ہوسکتی ہے، اس عقیدے کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اعضا و جوارح سے ایسے اعمال وحرکات کا ظہور ہو جو براہ راست ذات خداوندی سے رابطۂ قلبی میں مضبوطی پیدا کرتے ہوں، اوران اعمال صالحہ میں نماز اولین عبادت ہے، جودن میں پانچ مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں عجز و نیاز کی پیشانی کو جھکا کر بندہ اپنے معبود حقیقی کو یاد رکھتا ہے، اس طرح وہ اپنے ایمان کامل کا مظاہرہ عملی طور پر کرتا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص نماز کو ترک کرتا رہے اور اپنی زبان سے اپنے متعلق مومن کامل ہونے کا دعویٰ کرے، تو اس کا یہ دعویٰ غلط بایں طور ہو جاتا ہے کہ اس پر جو دلیل تھی یعنی نماز اس کا فقدان ہے، اسی لئے قرآن مقدس کے اندر منافقین کی صفات میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ بظاہر نماز پڑھتے ہیں مگر مارے باندھے، اور تساہلی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، گویا شان ایمان یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی نہایت خوش دلی اور ذوق و شوق کے ساتھ ہونی چاہیے، اور اگر بدذوقی اور سستی کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو یہ ایمان کامل کی علامت نہیں ہے، بلکہ نفاق کی صفات میں سے ہے، گوکہ ہم ایسے شخص کو اس زمانے

میں منافق نہیں کہہ سکتے ہیں تاہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اندر نفاق کی صفتوں میں سے ایک صفت پائی جاتی ہے۔

منافق کی نماز:

قرآن حکیم میں منافقین کے حالات کا تذکرہ اور ان کے حرکات کا بیان تفصیلا ہوا ہے، ان میں وضاحت کی گئی کہ وہ سستی و کاہلی کے ساتھ مارے باندھے نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كُسَالٰىۙ يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَلَا يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴾(النساء:۱۴۲)

اور جب منافقین نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، محض لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں، اور اللہ کو بہت ہی کم یاد کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ایسے لوگوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو مادّی منفعت کے حصول کے لئے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ نہایت سستی و کاہلی کے ساتھ بڑی بے دلی سے نماز پڑھنے کو کھڑے ہوتے ہیں۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ دور حاضر میں جو مسلمان پائے جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر کی بھی حالت یہی ہے کہ ذوق وشوق کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے، بلکہ نماز کے چھوڑنے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کرتے، گویا اس دور کے مسلمان کی حالت نماز کے بارے میں عہد رسالت کے منافقین کی حالت سے بدرجہا بدتر ہے، **نعوذ باللہ من ذالک**، حالاں کہ صفت نفاق ایسی بدترین صفت ہے کہ کسی منافق کی کوئی عبادت بدنی یا مالی قبول نہ کی جائے گی، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:

﴿وَمَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوۡلِهٖ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمۡ كُسَالٰى وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ

كٰرِهُوْنَ﴾ (التوبة:۵۴)

اور منافقین کی خیرات کے قبول نہ ہونے کی سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہیں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے انکار کر دیا ہے، اور وہ نماز کو آتے ہیں تو محض سستی سے آتے ہیں، اور وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں محض ناگواری سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ منافق کی تمام عبادتیں رائیگاں ہو جاتی ہیں، اور ان کا کوئی اجر وصلہ دنیا وآخرت میں اس کو نہیں مل سکتا، ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھتا ہے تو نہایت بدذوقی اور کاہلی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کاہلی اور سستی کے ساتھ نماز پڑھنا شان مومن کے خلاف ہے۔

مومن کی نماز:

اس کی حالت یہ ہونی چاہیے کہ جب وہ نماز ادا کرے تو ذوق وشوق، عجز ونیاز اور خشوع وخضوع کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہو کر نماز ادا کرے، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ (المومنون: ۱۔۲)

بے شک ایمان والے مراد کو پہنچے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں کامیاب وبامراد مومن کی یہ حالت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، خشوع کے معنی اگرچہ لغت میں کسی کے آگے جھک جانا، دب جانا اور اظہار عجز وانکسار کرنا ہے، لیکن عام مفسرین کے نزدیک اس میں وہ تمام افعال وحرکات شامل ہیں جن سے بارگاہ خداوند قدوس میں عجز وانکسار ظاہر ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب نماز بے دلی اور کاہلی وسستی کے ساتھ پڑھی جائے گی اور اس کے لیے حلاوت ایمانی نہیں پائی جائے گی تو اس میں خشوع وخضوع کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حلاوت ایمانی کے بغیر نماز پڑھی جائے گی یا بلفظ دیگر وہ بندے جو فروتنی وعاجزی کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں نماز نہیں ادا کرنا چاہتے، ان کی طبیعت

کے اوپر یہ عبادت الٰہی بڑی بھاری گزرے گی۔

﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾(البقرۃ:۴۵۔۴۶)

اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے، مگران پر نہیں جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے، اوراسی کی طرف پھرنا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جب بندہ خدا کی بارگاہ میں خشوع وخضوع اختیار نہیں کرتا تو اس کے اوپر نماز جیسی عظیم الشان عبادت جو قرب الٰہی کا ذریعہ ہے بھاری ہوتی ہے، لیکن اگر اطاعت الٰہی، رضاے خداوندی کا جذبہ بیدار ہوجائے اور اللہ کی بارگاہ میں حاضری کا یقین کامل حاصل ہوجائے تو اس کے اندر خشوع وخضوع کے ساتھ ذوق عبادت پیدا ہوجاتا ہے، اورانسان کی یہ فطرت ہے کہ جب کسی چیز کا ذوق اس کے اندر بیدار ہوجائے تو اس سے ایسا تعلق اور لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے کہ اگراس کے بارے میں مشکلات پیش آئیں تو ان کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیتا ہے، اس لیے نماز جیسی عظیم الشان عبادت اس کی طبیعت پر گراں نہیں گزرے گی۔

نماز کی اہمیت وعظمت کے متعلق غور وفکر کرنے میں حسب ذیل نکات ملحوظ رکھنا چاہیے۔

تمام انبیاے کرام پر نماز فرض تھی:

{الف} نماز ایک ایسی عبادت الٰہی ہے جو جملہ انبیاے کرام **علیھم السلام** پر فرض کی گئی تھی، یعنی تمام ادیان الٰہیہ میں فرض کی گئی تھی، سورۂ مریم میں انبیاے کرام کا قدرے تفصیلاً ذکر ہوا ہے، ان کی خدا پرستی وتوحید پرستی کو خوب واضح کیا گیا ہے، ان کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ جب خداے قدوس کی آیات ان کے اوپر تلاوت کی جاتی تھیں تو وہ اس کے بارگاہ میں والہانہ انداز سے سجدہ ریز ہوجاتے تھے، اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا کہ:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا﴾(مریم:۵۹)

پھران کے بعد ایسے بد اطوار لوگ ان کے جانشین ہوئے، جنہوں نے نماز کو ضائع کیا، اور خواہشات نفس کی پیروی کی، تو عنقریب وہ عذاب سخت وشدید پائیں گے۔

یعنی جن لوگوں نے نماز کو ضائع کر دیا وہ لوگ ایک ہی پیغمبر کے ماننے والے نہیں تھے، بلکہ ایسے لوگ بہت سارے انبیاے کرام کے امّتی تھے جنہوں نے نماز فرض کو چھوڑ دیا، اور خواہشات نفس کی پیروی میں لگے رہے، جس کا انجام یہ ہوا کہ ان کو جہنم کے عذاب میں گرفتار ہونے کی تہدید فرمائی گئی۔

حضرت اسماعیل علیہ الصلاۃ والسلام کا وصف خصوصی قرآن کریم کے اندر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے وعدے کے وہ سچے تھے، ساتھ ہی ان کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ:

"وكان يامر اهله بالصلاة والزكاة"(مریم:۵۵)۔

وہ اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔

قرآن حکیم نے اس بات کی طرف لطیف اشارہ فرمایا کہ ہر نیکوکار و صالح بندے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس کنبہ وخاندان کا وہ رکن ہے ان میں نیکی کو پھیلائے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی اپنے اہل خانہ سے کروائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لے کر ان کی والدہ مکرمہ اپنی قوم کی طرف آئیں، قوم کا مطالبہ یہ تھا کہ اپنے متعلق وہ بتائیں کہ یہ بچہ کیسے وجود میں آ گیا، انہوں نے بچے کی طرف اشارہ کیا، قوم پکار اٹھی کہ ہم ایسے بچے سے کیسے گفتگو کر سکتے ہیں، جو ابھی گہوارے میں ہے، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بلند آواز سے پکار کر کہا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھ کو کتاب عطا فرمائی ہے، اور مجھ کو نبوت عطا کی ہے، اور میں جہاں کہیں رہوں بابرکت رہوں گا، یعنی اپنی عبدیت و پیغمبری کے اعلان کے ساتھ ساتھ آپ

نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا﴾ (مریم:۳۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھ کو تاکیداً نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جب تک میں زندہ رہوں۔

حضرت موسیٰ **علیہ الصلاۃ والسلام** مدین سے واپسی میں اپنے بال بچوں کے ساتھ ایک تاریک رات میں ایسے مقام پر پہنچے جہاں وہ مصر کا راستہ بھول گئے، پھر وہ آگ کی تلاش میں نکلے اور وادیٔ مقدس طویٰ پہنچ گئے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں خطاب کر کے فرمایا کہ تم کو نبوت وپیغمبری کے لیے میں نے برگزیدہ کیا، تمہاری طرف وحی کی جارہی ہے، غور سے سنو:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ:۱۴)

بے شک میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، (تم میری توحید کے قائل ہو جاؤ) اور نماز میری یاد کے لئے قائم کرو۔

حضرت موسیٰ **علیہ الصلاۃ والسلام** کو جو پہلی وحی کی گئی اس میں خدا پرستی وتوحید پرستی کا درس دیا گیا، اور یاد الٰہی کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا۔

سورۂ انبیا میں حضرت ابراہیم واسحاق ویعقوب **علیہم السلام** کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا کہ:

وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ (الانبیاء:۷۳)

اور ہم نے ان کو امام بنایا تھا، ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے ان کی طرف نیکی کا کام بجالانے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی تھی، اور وہ سب ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔

انبیاے کرام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسرے اُمورِ خیر کے بجالانے کے ساتھ

ساتھ اقامتِ صلاۃ کا حکم دیا تھا۔

حضرت شعیب **علیہ الصلاۃ و السلام** اپنی قوم کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، قوم بجائے اس کے کہ وہ راہ راست پر آئے، ان کے ساتھ بدسلوکی پر آمادہ ہو جاتی ہے، اور کہتی ہے کہ:

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوٰلِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ {سورۃ ھود:۸۷}

اے شعیب کیا تمھاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے خداؤں کو چھوڑ دیں، یا اپنے مال میں جو چاہیں نہ کریں۔

ان آیات کریمہ کو ان کے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انبیاے کرام **علیھم الصلوٰۃ والتسلیم** کو جو مختلف قرن اور مختلف اقوام میں تشریف لائے اقامتِ صلاۃ کا حکم دیا گیا، اس سے یہ واضح ہو گیا کہ خداے قدوس کے نزدیک نماز ایسی پیاری عبادت ہے کہ اپنے کسی نیک بندے یا پیغمبر کو اس سے محروم نہیں رکھا، یعنی تمام قوموں کو اس کی سعادتوں و برکتوں سے نوازا، وہ ایسی عبادت ہے جس کو صفحہ ہستی کے تمام نیک و پارسا بندے جو انسانوں کی رہبری وہدایت کے کام پر مامور ہوئے بجالانے کے پابند تھے، پس ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر کیا حکمت ہے کہ سب پر اس کو فرض کیا گیا، بظاہر اس کی کیا حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ تقرب الٰہی و رضاے حق کے جتنے طریقے اس دنیا میں پائے جاسکتے ہیں، ان میں یہ سب سے بہتر طریقہ ہے، یہاں صرف دل و دماغ ہی نہیں حق کی طرف مائل ہوتے بلکہ جسم کے سارے اعضا خدا کی بندگی و طاعت میں جھکے نظر آتے ہیں، زبان دعا و مناجات میں مصروف رہتی ہے، ہاتھ ایک مخصوص ہیئت کے ساتھ تعظیم الٰہی کا مظہر ہوتا ہے، کان اللہ کی عظمت و بڑائی کے الفاظ سنتے ہیں، گو یا پورے جسم کا ہر حصہ یاد الٰہی وتضرع وزاری میں لگا ہوا نظر آتا ہے، پیشانی کی خاک آلودگی اس کی انتہائی فروتنی پر دلالت کرتی ہے، یہاں صرف ''دھیان'' ومراقبہ ہی نہیں ہوتا بلکہ بندہ خودسپردگی اور تسلیم و رضا کی

ایک مجسم تصویر ایسی حالت میں نظر آتا ہے، اس لیے اس سے بڑھ کر خدا کے قرب کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔

نماز برائیوں سے روکتی ہے:

نماز انسان کے دل میں ایسی طہارت و پاکیزگی پیدا کرتی ہے کہ وہ تمام برائیوں وبدکاریوں سے بچنے کے لیے خود بخود مائل ہوجاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (سورۃ عنکبوت:۴۵)۔

اے محبوب! جو آپ کی طرف کتاب وحی کی جارہی ہے، اس کی تلاوت فرمایئے، اور نماز کو قائم کیجیے، بلاشبہہ نماز فحش اور ہر برے کاموں سے روکتی ہے۔

یعنی نماز کی یہ خاصیت ہے کہ بدی کی چیزوں سے وہ روکتی ہے، اگر کوئی بندہ اس کے فرائض وواجبات، سنن وآداب کی پابندی کے ساتھ اس کو ادا کرے تو یقیناً وہ برے کاموں سے باز رہے گا، کیوں کہ جب کوئی بندہ دن رات کے چوبیس گھنٹے میں پانچ مرتبہ خشوع وخضوع، فروتنی وعاجزی کا پیکر مجسم بن کر ذکر الٰہی میں مصروف رہے گا تو بلاشبہہ اس میں طہارتِ نفس، تقویٰ، خشیتِ الٰہی پیدا ہوجائے گی، اور اس میں اپنے نفس سے محاسبہ کا جذبہ ابھرے گا، انسان بدی کی طرف اس طرح مائل ہوتا ہے کہ نفس انسانی میں شیطان اپنے وسوسے سے برائی کو اچھائی کی شکل میں پیش کرتا رہتا ہے، اور پیہم اس کی ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہے، اور محاسبۂ عمل کا جذبہ مفلوج ہوکر رہ جاتا ہے، لیکن جب وہ بارگاہ خداوندی میں بار بار حاضر ہوکر اس کے ساتھ مناجات کرتا ہے، تو اس کے ضمیر کی آواز دبنے نہیں پاتی ہے، بلکہ شیطانی وسوسے خود بخود دفنا ہونے لگتے ہیں، کیوں کہ خشیت ربانی اس پر طاری ہوگی تو اس کی ملکوتی قوت میں شدت پیدا ہوجائے گی، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہو، اور برائیوں کا بھی مرتکب ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس عبادت سے اس میں طہارتِ نفس نہیں پیدا ہوئی، نہ ہی یہ عبادت کامل طور پر ادا ہوئی۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"من لم تنهه صلاته عن الفحشآء والمنکر فلا صلاۃ له"۔

(السلسلۃ الضعیفۃ، حدیث: ۹۸۵)

جسے اس کی نماز نے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا، اس کی نماز نہیں ہے۔ (مکمل نہیں ہوئی)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

"لا صلاۃ لمن لم یطع الصلاۃ وطاعۃ الصّلاۃ ان تنھی عن الفحشآء والمنکر"۔ (تفسیر طبری)

اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی، اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فحشا ومنکر سے رک جائے۔

اور امام جعفر صادق **رضی اللہ تعالیٰ عنہ** فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی یا نہیں اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحش اور منکر سے کہاں تک باز رکھا، اگر نماز کے روکنے سے برائیاں کرنے سے رک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی، اس سے ثابت ہوا کہ نماز برائیوں سے روکنے کا ایک بہت ہی کارآمد ہتھیار ہے، اس سے مسلح ہو کر بدی کی قوت سے جنگ جیتی جا سکتی ہے، اور اس فتح مبین کے بعد آخرت کی زندگی میں کامیاب و بامراد ہو کر عیش و دوام حاصل ہوگا، اور خدا کی لازوال نعمت اسی وقت مل سکتی ہے، جب انسان برائی کے برے اثرات سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے، کیوں کہ اس مادی دنیا میں کبھی برائیوں کی سزا نہیں ملتی ہے، اس سے اس میں بے خوفی پیدا ہو جاتی ہے اور بدی کی عقوبت سے وہ محفوظ رہ جاتا ہے، لیکن فحش و منکر ایک ایسا زہر ہلاہل ہے کہ اس کے تباہ کن و ہلاکت خیز نتائج ظاہر ہو کے رہیں گے، اس لئے لازم ہے کہ اقامت صلاۃ سے غفلت کسی صورت میں نہیں ہونی چاہیے، نماز کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جتنے احکام و شرائع نازل کئے گئے سب کے سب اس زمین کے

اوپر نازل فرمائے گئے، لیکن جب اس پر نماز فرض کرنا ہوا تو حضور اکرم **صلی اللّٰہ علیه وسلم** کو عرش عظیم پر بلا کر فرض کیا گیا، اور شبِ اسریٰ میں یہ تحفہ خیر امت کو دیا گیا۔

شراب نوشی کی مذمت:

حضرت معاذ بن جبل **رضی اللّٰہ تعالی عنه** والی حدیث میں حضور اکرم **صلی اللّٰہ علیه وسلم** نے دس احکام بیان فرمائے ہیں، ان میں سے تین پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی، چوتھا حکم شراب کے بارے میں ہے، آپ نے فرمایا:

"لا تشربنّ خمراً فإنّه راس کلّ فاحشة"۔ (مشکوٰۃ، حدیث: ۵۶)

ہرگز شراب نہ پینا کیوں کہ وہ ہر بے حیائی کے کام کی اصل ہے۔

عہد جاہلیت میں شراب نوشی کا دور دورہ تھا، قبائل عرب کے سنجیدہ و متین لوگ بھی اس بری علت میں گرفتار تھے، جو طبعاً نیکی کی طرف میلان رکھتے تھے ان میں سے بھی کچھ لوگ مے نوشی سے احتراز نہیں کرتے تھے، یہ عربوں کی گھٹی میں رچی بسی تھی، اس لیے اس کا اِنسداد یک بیک ممکن نہ تھا، بلکہ نہایت حکیمانہ اُسلوبِ بیان سے اس کے خلاف ذہنوں کو تیار کرنے کی ضرورت تھی، پہلی آیت کریمہ جو شراب کے بارے میں نازل ہوئی، اس میں بلیغ انداز میں اس کی معصیت و مضرت کو بیان کیا گیا۔

﴿**يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا**﴾ **(البقرة: ۲۱۹)**

تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں، تم فرما دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے دنیاوی فائدے بھی، اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔

اس آیت پاک میں شراب اور جوئے کی مضرّت بیان کی گئی، اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس میں کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن اس کی مضرت اور گناہ کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں ان میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہوتے ہیں، ایسا مکمل خیر جس میں ذرہ برابر شر کا پہلو نہ ہو یا اس میں کوئی اذیت و

مضرت نہ ہو پائی جاتی ہونا ممکن ہے، اسی طرح کوئی ایسی چیز جو مکمل شر ہو جس میں فائدہ کا ادنیٰ شائبہ نہ پایا جاتا ہو عقلاً سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، اس لیے قرآنِ عزیز نے حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ اور ان کے اندر بڑی قباحت پائی جاتی ہے، یعنی انسانی زندگی کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے، اور معاشرے اور سماج میں اس سے برائیاں پھیلتی ہیں، اور آخرت میں اس گناہ کے سبب سے عذاب کا مستحق ہوسکتا ہے، لیکن لوگوں کے لئے اس میں کچھ منافع بھی ہیں، تو اس سے حیرت و اِستعجاب میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے، ایک صحابیِ رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے حرمت شراب کے بعد کہا تھا:

"وعن دیلم الحمیری قال: قلت لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالی علیه وسلم: یارسول الله إنّا بأرض باردةٍ وّنُعالِجُ فیها عملاً شدیداً وّانا نتّخذ شرابا مِّن هذا الْقمحِ نتقوّیٰ علی أعمالناوعلي برد بلادنا ،قال: هل یسکر؟ قلت :نعم، قال: فاجتنبوهُ، قلت :إنّ النّاس غیر تارکیه ،قال: إن لّم یترکوه قاتلوهم"۔(ابوداؤد، حدیث: ۳۶۸۳)

دیلم حمیری نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہم ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے، اور ہم وہاں سخت محنت کا کام کرتے ہیں، ہم لوگ گیہوں سے ایک مشروب بناتے ہیں، جس سے تھکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ نشہ پیدا کرتی ہے؟ میں نے کہا: ہاں، تو رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس سے پرہیز کرو، میں نے عرض کیا: مگر ہمارے علاقے کے لوگ اس کو ترک نہیں کریں گے، فرمایا: اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جنگ کرو۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شراب میں کچھ فائدے ضرور ہیں، یعنی اس سے تکان دور ہوتی ہے، اور سخت سردی کے موسم میں اس کے پینے سے سردی کا احساس گھٹ جاتا ہے، عصر حاضر میں بھی بادہ پرست لوگ شراب کے کچھ فوائد بیان کرسکتے ہیں، مثلاً یہ کہ وہ نشاط انگیز ہے، تھوڑی دیر کے لئے انسان اپنے تمام غم واندوہ سے رہائی حاصل کرسکتا ہے،

لیکن سرکار دو عالم **صلی اللہ علیہ وسلم** کے ارشادات کی روشنی میں بزور قوت اس کا خاتمہ ضروری ہے، کیوں کہ اس کے مضر اثرات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے مقابل میں یہ کچھ فائدے لائقِ اعتنا نہیں ہیں۔

شراب کی قباحت پر تمام عقلا کا اتفاق ہو چکا ہے، حکومتیں اس کی تباہ کاریوں سے لوگوں کو بچانے کے لئے کچھ اسکیمیں بھی تیار کرتی ہیں، مگر اس جمہوری دور میں اپنی مصلحتوں کی بنا پر اس پر قانوناً پابندی عائد نہیں کر پاتی ہیں، طب جدید نے ثابت کر دیا ہے کہ اس سے انسان کے اعصاب بہت متاثر ہوتے ہیں، اور آدمی ذہنی وقلبی امراض کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن یہ تاریخ انسانی کا المیہ ہے کہ انسان کی صحت وتوانائی میں خلل ڈالنے والی اور اس کو مختلف امراض میں مبتلا کرنے والی، زندگی کو تباہ وبرباد کرنے والی اور اس کو مفلس وقلاش بنانے والی ایسی بری شی پر اب تک مکمل پابندی کا قانون نافذ کرنے سے حکومتیں کتراتی ہیں۔

قرآن حکیم نے ذہن انسانی کو اپیل کرتے ہوئے قانوناً اس کو ممنوع قرار دے دیا، لیکن اس کی حرمت کے قانون کا اعلان بتدریج کیا گیا تھا، پہلے اس کی شناعت وقباحت کو واضح کیا گیا، پھر شراب سے مست ہو کر نماز پڑھنے کو ممنوع قرار دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (النساء:۴۳)

اے ایمان والو! ایسا نہ ہو کہ تم نشہ میں ہو، اور نماز پڑھو، نماز اس وقت پڑھو جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

اس کے بعد سورہ مائدہ کی آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں شراب کی حرمت کا اعلان دلائل کے ساتھ کیا گیا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ

الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾(المائدة:۹۰۔۹۱)

اے مسلمانو! شراب وجوا، پانسے، بت شیطانی کاموں کی گندگی ہے، تم اس سے اجتناب کرو، تاکہ تم کامیاب ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت وکینہ ڈال دے، اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے باز رکھے، تو کیا تم باز رہنے والے ہو؟

وہ دلائل یہ ہیں:

(۱) شراب ایک ناپاک شے ہے اور ہر ناپاک شے حرام ہے، اس سے ثابت ہوا کہ شراب حرام ہے۔

(۲) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا کہ وہ شیطانی کام ہے، اور ہر شیطانی کام حرام ہے، لہٰذا شراب حرام ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شراب سے بچو، اور جس چیز سے بچنے کا حکم اللہ تبارک وتعالیٰ دے وہ چیز حرام ہوا کرتی ہے، پس شراب حرام ہے۔

(۴) ارشاد ربانی ہے "**لعلکم تفلحون**" یعنی تم فلاح کی امید شراب سے اجتناب کے بعد ہی کر سکتے ہو، اور جس چیز سے بچنے کے ساتھ فلاح کی امید کو معلق کیا جائے اس کا عمل میں لانا قطعاً حرام ہوتا ہے۔

(۵) اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان تمھارے درمیان شراب وجوئے کے ذریعہ عداوت اور کینہ ڈالنا چاہتا ہے اور جو چیز مسلمانوں کے درمیان بغض وعناد کا سبب بنے وہ حرام ہے۔

(۶) شراب ذکر الٰہی اور نماز سے روکتی ہے، اور جو چیز یاد الٰہی اور نماز سے روکتی ہو اس کے حرام ہونے میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے بطور زجر وتہدید فرمایا کیا تم باز آئے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شراب نوشی سے جلد باز آجاؤ، ورنہ سخت سزا کے مستحق ہو گے، اور ہر ایسی چیز جس سے اللہ

تعالیٰ اپنے بندوں کو باز آنے کا حکم اس انداز سے دے وہ قطعاً حرام ہے،سورہ مائدہ کی ان دونوں آیتوں کو بار بار غور سے پڑھیے،ان میں مختلف اُسلوب بیان سے شراب کی حرمت کا اعلان کیا گیا ہے، اس کو ناپاک شے،شیطانی کام بتا کر بندۂ مومن کو اس سے اِجتناب کا حکم دیا گیا، یہ بھی واضح کیا گیا کہ:

یہ مسلمانوں کے درمیان بغض وعناد کا سبب بنتی ہے، ذکرالٰہی اور نماز سے غافل کرنے والی ہے، پھرز جرو توبیخ کے ساتھ فرمایا گیا کہ خیریت اسی میں ہے کہ جلد باز آجاؤ، شراب کی حرمت کے سلسلے میں قرآن حکیم کے اندر جو تہدید و تشدید پائی جاتی ہے غالباً اسی کے پیش نظر اس کی حرمت کے بعد حضور اکرم **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** نے اس کے پینے اور نہانے کے برتنوں کو حرام قرار دیا تھا تا کہ شراب نوشی کی مذموم عادت بالکلیہ ختم ہو جائے، اور کوئی شخص اس اُم الخبائث کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاداتِ عالیہ سے اس کے متعلق مختلف احکام بیان فرمائے ہیں،آپ نے فرمایا:

"لعن اللّٰہ الخمر وشاربھا وساقیھا وبائعھاومشتریھاوعاصرھا وحاملھاوالمحمولة إلیه"۔(ارواءالغلیل،حدیث:۲۳۸۵)

شراب وشراب کے پینے والے و پلانے والے، اوراس کی خرید وفروخت کرنے والے، اوراس کو تیار کرنے والے، اس کو اٹھا کر لے جانے والے،اور جس کی طرف اٹھا کر لے جایا جائے،سب پر خدا کی لعنت ہے۔

اس حدیث سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ شراب کی حرمت کا دائرہ کتنا وسیع ہے، نہ تو اس کے کارخانے قائم کیے جاسکتے ہیں، نہ ہی اس کا لین دین ہوسکتا ہے، ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف اس کو منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا، یعنی اسلامی سماج میں کسی طرح اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

افسوس و ماتم کا مقام یہ ہے کہ جس کوسر کار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت ساری برائیوں کا

منبع قرار دیا تھا اور قرآن حکیم نے جس کی حرمت کا اعلان اتنی تہدید کے ساتھ کیا تھا، اسلامی معاشرے میں ایسی گندگی وگھناؤنی شے اب بھی پائی جارہی ہے، حالاں کہ ایک مسلمان کو شراب نوشی تو بڑی بات ہے اس کے تصور سے کانپ جانا چاہیے تھا، اس کے مختلف وجوہ و اسباب ہو سکتے ہیں، لیکن اسلامی تاریخ کا ایک المیہ یہ ہے کہ ہماری فارسی وار دو کی شاعری نے اسلامی سماج پر بہت برا اثر ڈالا، قرآن عزیز اور حدیث پاک کے علی الرغم شراب کی حرمت کے احساس کو ختم کرنے میں بڑا نازیبا و ناروا کام کیا، اور ایسی شاعری کے متعلق علمائے اسلام نے اپنی آوازیں ضرور بلند کیں، مگر بادہ پرستوں نے اپنی بادہ پرستی کے لیے ایک الگ ہی راگ الاپ دیا، اور یہ کہہ دیا گیا کہ شراب سے مراد ایک دوسری چیز ہے جس کو اہل دل یا اہل تصوف ہی سمجھ سکتے ہیں، نقد وتبصرہ کرنے والے کو اشارہ وکنایہ کی زبان سمجھنے کی صلاحیت رکھنی چاہیے۔

واقعی خدا پرست اور بہت سے نیک بندے اس منحوس وناپاک شے سے احتراز کر کے ایک دوسری شراب کے مفہوم میں اپنی شاعرانہ کلام کے اندر وہ مست نظر آئے، اس کو مے محبت الٰہی یا بادۂ حب نبی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ بادہ پرست شعرا نے جس شراب کا ذکر کیا ہے گو وہ بادۂ محبت ہی مراد لیتے رہے ہوں، مگر اس منحوس شے سے وہ اپنے کو بچا نہ سکے، آپ اس کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اردو کے بڑے اچھے شاعر جام و مینا سے لیس رہا کرتے تھے، جس کا اثر ان کے کلام کے پڑھنے والوں پر پڑنا لازمی تھا۔

سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے تو ارشاد فرمایا تھا کہ جس دسترخوان پر شراب ہو، اس پر کھانا کھانا یا کھلانا منع ہے، اور ان شعرا کا کھانا بغیر شراب کے ہوتا ہی نہ تھا۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھے۔ آمین

❁❁

امام احمد رضا اور تعزیہ داری

اہلِ سنت و جماعت کے علما وخواص اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر اس دور تجدد ودہریت میں اسلام کی شمع جلائے ہوئے ہیں، ان میں تجدد پسندوں اور دہریت نوازوں سے یگانگت وہم آہنگی کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا نہ ہی یہ قرآن عزیز وحدیث کریم کی ایسی تفسیر وتاویل کے قائل ہیں جو عصر حاضر کے عقل پرستوں سے مرعوبیت اوران کی سخن سازی وصنعت گری کی بنا پر دوسرے مکتب فکر کے مدعیان علم کرتے ہیں، وہ اسلام کے سیدھے راستہ پر چلنے ہی کو اپنی سعادت وکامرانی تصور کرتے ہیں لیکن اس جماعت کی جاہل عوام میں کچھ ایسے وہمی رسم ورواج سرایت کر گئے ہیں جو نہ صرف قرآن وسنت کے خلاف ہیں بلکہ اسلام کی حقیقی صورت کے مسخ کر دینے کے ہم معنیٰ ومترادف ہیں، دور نہ جائیے، ماہ محرم الحرام میں جو "عمل خیر" مذہب کے نام پر کیے جاتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے دامن پر سیاہ دھبہ ہیں، ایسے رسم ورواج جن کا تعلق دین حنیف سے دور کا نہیں اور نہ ہی علماے حق نے ان کو اِستحسان کی نگاہ سے دیکھا ہے ان کی بجا آوری کو بڑے اجر وثواب کا ذریعہ تصور کرلیا گیا ہے۔

تعزیہ داری کے نام پر حضرت امام حسین **رضی اللہ عنہ** سے حصولِ فیوض وبرکات کے حسن نیت سے جو رسوم بڑے خلوص وعقیدت کے ساتھ انجام دیے جاتے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی حرمت وعدم جواز میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا، اور کچھ تو ایسے ہیں جن پر شرک کا فتوی اگرچہ نہیں دیا جا سکتا لیکن ان کا ڈانڈا شرک سے بلاشبہہ ملتا ہے اوران کے ایسی بدعت کے ہونے میں کلام نہیں جو عذاب الٰہی کا سزاوار بنا دیں۔

مجدد اسلام امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے متعلق مخالف جماعتوں کے سرکردہ افراد کی جانب سے جو مسلسل اور گمراہ کن پروپیگنڈے "دیانت علمی" کے اظہار کے لیے کیے جاتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے بدعتوں کے فروغ میں بڑی سرگرمی دکھائی، حالاں کہ کی اپنی خداداد مجددانہ بصیرت سے بڑے اعتدال وتوازن کے ساتھ حق وباطل،

راستی و ناراستی اور کھرے کھوٹے میں امتیاز وتفریق کی،شریعت کی رو سے جو چیزیں ناجائز وحرام تھیں ان کے عدم جواز و بیان قباحت میں انھوں نے اپنا پورا زور قلم صرف فرمایا، ہاں جائز و مباح کے بارے میں غلو وتشدد کی راہ اختیار کرکے شرک کا فتوی نہیں دیا، جیسا کہ دوسرے فرقہ کے ''ماحی شرک و بدعت'' دیتے رہتے ہیں، انھوں نے تعزیہ داری کے مسئلے پر جب قلم اٹھایا تو اس میں جتنا حصہ خیروخوبی کا تھا واضح کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، باقی جو حصہ لائق مذمت یا جس میں حدود شرع سے تجاوز و بے اعتدالی پائی جاتی تھی اس کے عدم جواز کا فتویٰ صادر کرنے کے ساتھ اس کے متعلق اپنی سخت ناراضگی اور برہمی کا اظہار فرمایا وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''تعزیہ کی اصل اس قدر تھی کہ روضۂ پرنور حضور شہزادۂ گلگوں قبا حسین شہید ظلم و جفا **صلوٰۃ اللہ تعالیٰ وسلامہ علی جدہ الکریم و علیہ** کی صحیح نقل بنا کر بہ نیت تبرک مکان میں رکھنا، اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں تھا کہ تصویر مکانات وغیرہ ہر غیر جاندار کی بنانا، رکھنا، سب جائز، اور ایسی چیزیں کہ معظمان دین کی طرف منسوب ہوکر عظمت پیدا کریں ان کی تمثال بہ نیت تبرک پاس رکھنا قطعاً جائز، مگر جہال بے خرد نے اس اصل جائز کو بالکل نیست و نابود کر کے صدہا خرافات وہ تراشیں کہ شریعت مطہرہ سے الامان الامان کی صدائیں آئیں''۔

اول تو نقش تعزیہ میں روضۂ مبارک کی نقل ملحوظ نہ رہی، ہر جگہ نئی تراش، نئی گڑھت جسے اس نقل سے کچھ علاقہ نہ نسبت، پھر کسی میں پریاں، کسی میں براق، کسی میں اور بیہودہ طمطراق، پھر کوچہ بہ کوچہ و دشت بدشت، اشاعت کے لیے ان کا گشت، اور ان کے گرد سینہ زنی، اور ماتم سازی کی شورافگنی، کوئی ان تصویروں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے، کوئی مشغول طواف، کوئی سجدے میں گرا ہے، کوئی ان مایۂ بدعات کو معاذ اللہ جلوہ گاہ حضرت امام **علیٰ جدہ و علیہ السلام** سمجھ کر اس ابرک پنّی سے مرادیں مانگتا، منتیں مانتا ہے، حاجت روا جانتا ہے، پھر باقی تماشے، باجے تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل، اور طرح طرح کے بیہودہ کھیل، ان سب پر طرہ ہیں۔

غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعت پاک تک نہایت بابرکت و

محل عبادت ٹھہرا ہوا تھا، ان بیہودہ رسوم نے جاہلانہ وفاسقانہ میلوں کا زمانہ کر دیا۔

اب بہارعشرہ کے پھول کھلے، تاشے باجے بجتے چلے، طرح طرح کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا ہر طرف ہجوم، شہوانی میلوں کی پوری رسوم، جشن یہ کچھ، اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ، کہ گویا یہ ساختہ تصویریں بعینہٖ حضرات شہدا **رضوان اللّٰہ تعالیٰ علیہم** کے جنازے ہیں، کچھ نوچ اتار، باقی توڑ تاڑ کر دفن کر دیے، یہ ہر سال اضاعتِ مال کے جرم ووبال جداگانہ ہیں۔

اب کہ تعزیہ داری اس طریقہ نامرضیہ کا نام ہے، قطعاً بدعت و ناجائز حرام ہے، ہاں اگر اہل اسلام جائز طور پر حضرات شہدائے کرام **علیہم الرضوان** کی ارواح طیبہ کو ایصال ثواب کی سعادت پر اقتصار کرتے تو کس قدر خوب ومحبوب تھا، اور اگر نظر شوق ومحبت میں نقل روضۂ انور کی بھی حاجت تھی تو اسی قدر جائز پر قناعت کرتے کہ صحیح نقل بغرض تبرک وزیارت اپنے مکانوں میں رکھتے اور اشاعت غم وتصنع والم ونوحہ زنی وماتم کنی ودیگر اُمور شنیعہ وبدعات قطعیہ سے بچتے، اس قدر میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنہ** نقل صحیح کے ساتھ تعزیہ کو جائز قرار دینے کے بعد آگاہ فرماتے ہیں کہ:

''اب اس نقل میں بھی اہل بدعت سے ایک مشابہت اور تعزیہ داری کی تہمت کا خدشہ، اور آئندہ اپنی اولاد یا اہل اعتقاد کے لیے اِبتلائے بدعت کا اندیشہ ہے، لہٰذا روضۂ اقدس حضور سید الشہدا کی ایسی تصویر نہ بنائیں بلکہ صرف کاغذ کے صحیح نقشے پر قناعت کریں، اور اسے بقصد تبرک بے آمیزش منہیات اپنے پاس رکھیں''۔

ذکر شہادت امام حسین **رضی اللّٰہ تعالی عنہ** کے عنوان سے جو کچھ پڑھا یا بیان کیا جاتا ہے ان میں بیشتر رطب ویابس روایتیں، موضوع وبے سروپا حکایتیں، محض رونق محفل وداستان آرائی کے لیے پڑھی اور بیان کی جاتی ہیں، ایک استفسار کے جواب میں ان پر سخت تنقید کرتے ہوئے امام احمد رضا **رضی اللّٰہ تعالی عنہ** تحریر فرماتے ہیں کہ:

''شہادت نامے، نثر یا نظم جو آج کل عوام میں رائج ہیں اکثر روایات باطلہ و بے سروپا سے مملو اور اکاذیب موضوعہ پر مشتمل ہیں، ایسے بیان کا پڑھنا، سننا وہ شہادت ہو خواہ کچھ اور مجلس میلاد مبارک میں ہو خواہ کہیں اور مطلقاً ناجائز وحرام ہیں''۔

البتہ وہ مجلس جو عشرۂ محرم یا اس کے بعد منعقد کی جاتی ہیں جن میں شہدائے کربلا اور امام عالی مقام **رضی اللہ عنہم اجمعین** کے صحیح روایتوں سے ثابت شدہ فضائل ومناقب بیان کیے جائیں اور ان میں اجر وثواب کی نیت کی جائے یا خیر و برکت کا ذریعہ تصور کیا جائے تو ان کے جواز میں شبہ نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے تذکرۂ جمیل سے رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے، چنانچہ فاضل بریلوی **علیہ الرحمۃ والرضوان** ارشاد فرماتے ہیں:

''جو مجلس ذکر شریف حضرت سیدنا امام حسین اہل بیت کرام **علیہم الرضوان** کی ہو جس میں روایات صحیحہ ومعتبرہ سے ان کے فضائل ومقامات بیان کیے جاتے ہیں، ماتم و تجدید غم وغیرہ امور مخالفہ شرع سے یکسر پاک ہو فی نفسہ حسن ومحمود ہے خواہ اس میں نثر پڑھیں یا نظم''۔

ہمارے قارئین کرام اس عبارت کو غور سے پڑھیں، سرسری نگاہ ڈال کر نہ گزر جائیں کیوں کہ مجالس محرم کے حسن محمود ہونے کے لیے ضروری قرار دیا جارہا ہے کہ ماتم سرائی ،تجدید غم نہیں ہونا چاہیے، تصنع سے رونے اور رلانے کی نیت سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔

یہ ہیں اس فقیہ فقید المثال کے فتاوے وارشادات جس کے متعلق بڑے زور وشور سے یہ پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ بدعت پرستوں کو ان کی ذات سے بڑا بڑھاوا ملا ہے، اور نیکی و بھلائی کے فروغ میں ان کی جانب سے کوئی سرگرمی نہیں نظر آئی ہے، منکرات ومناہی سے صرف نظر کر کے اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کی جدوجہد میں لگے رہے، حالاں کہ اس ذات ستودہ صفات نے زندگی کے کسی شعبہ میں جب مسلمانوں میں بے اعتدالی و بے راہ روی پائی تو اپنے قلم حقیقت رقم کو حرکت میں لائی۔ اور حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دینے میں

کوئی رواداری نہیں برتی، وہ اس صدی کا وہ عظیم انسان ہے جس نے اپنی تجدیدی کارناموں سے کروڑوں انسانوں کے قلوب کو مسخر کیا، لیکن اس کا ''عملِ تسخیر'' ان لوگوں کو متاثر نہ کر سکا جو دنیا پر دین کو غالب کرنے کے بجائے دین کو دنیا کے تابع رکھنے کے متمنی تھے، اس لئے جہاں کہیں جاہل عوام میں غلو یا بے راہ روی پائی علمائے حق کو عموماً اور فاضل بریلوی **رضی اللّٰه عنه** کو خصوصاً بدنام کرنے کے لئے اس کی ذمہ داری انھیں پاک بازوں کے سر ڈال دی، یہ ہے صحافیوں و قلم کاروں کی علمی دیانت جس پر ان کو بڑا ناز ہے، اللہ تعالیٰ ایسے اِفترا پردازوں سے مسلمانوں کو بچائے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

روزے کے فضائل ومسائل

فضائل:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزے کے متعلق احادیث کریمہ میں جو تفصیلی بیان اپنی زبان نبوت سے ارشاد فرمایا اور ائمہ کرام نے ان کی روشنی میں جو مسائل مستنبط کیے ان کو پڑھ کر ایک مومن کی روح وجد میں آجاتی ہے، آپ کے ارشادات ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں:

"عن سهل بن سعد قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الجنة ثمانية ابواب، منها باب يسمى الريا ن لايدخله الاالصائمون "(مشکوۃ شریف، ص:۱۷۳)۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد نے بیان کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، ان میں سے ایک کا نام ''ریان'' ہے، اس میں صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے۔

''**ریان**'' کا لفظی معنیٰ سیراب وسرسبز کے ہیں، چوں کہ روزہ دار اپنی دنیا کی زندگی میں بھوک وپیاس سے مرجھا چکا ہوتا ہے اور اس نے اپنے نفس کے تقاضوں کو خوشنودئ خدا کے لیے پورا نہیں کیا جس سے یک گونہ اس کے جسم میں گویا تازگی نہیں پائی جاتی رہی اس لیے اس کے اعزاز وتکریم کے لیے جنت میں داخل ہونے کا جو دروازہ مقرر کیا گیا اس کا نام ''ریان'' رکھا گیا، اس سے اشارہ ملا کہ اب جنت میں داخل ہورہے ہو تو کبھی بھی بھوک وپیاس کی بے تابی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا بلکہ ہمیشہ خوشحالی وآسودگی کی زندگی گزاروگے۔

(۲) عن ابی هريرة رضی الله عنه، قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :كل عمل بن آدم يضاعف الحسنة بعشر امثالها الیٰ سبع مأته ضعف ، قال الله

تعالیٰ: الاالصوم ،فانه لی وانا اجزی به ،یدع شهوته وطعامه من اجلی، للصائم فرحتان: فرحة عند فطره وفرحة عندلقاء ربه، ولخلوف فم الصائم اطیب عنداللّٰہ من ریح المسک ”(مشکوۃ،ص:۱۶۷)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کی ہر نیکی کا بدلہ دس سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزے کا بدلہ اس سے الگ ہے، اس کا بدلہ میں خود دیتا ہوں، کیوں کہ وہ میرے ہی لیے ہے، میری ہی وجہ سے میرا بندہ اپنی نفسانی خواہش اور کھانے سے رکا رہتا ہے، روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک تو (دنیا میں) افطار کے وقت، دوسری (آخرت میں) اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اس حدیث پاک سے حسب ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:

{الف} انسانی عمل کے درجے مختلف ہوتے ہیں اور اس نیک عمل کا اجر وثواب اللہ کے خزانۂ رحمت سے ملتا ہے، مگر اس اجر وثواب میں اللہ تعالی اپنے بے پایاں رحمت سے اضافہ فرماتا ہے، اس کے یہاں ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے، بلکہ اس میں زیادہ فرما کر سات سو گنا تک اس کا ثواب عطا فرماتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص قرآن حکیم کی ایک آیت کریمہ تلاوت کرے تو اس کو سات سو آیتوں کا اجر مل سکتا ہے۔

لیکن روزے کے متعلق اللہ تبارک و تعالی ارشاد فرماتا ہے کہ وہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کا بدلہ عطا کروں گا۔

آپ کے مزدور کارخانوں یا کھیتوں میں کام کرتے ہوں اور ان کے لیے آپ نے مزدوری مقرر کر رکھی ہو، اسی کے مطابق آپ کے کاموں کا ذمہ داران کو مزدوری دیتا رہتا ہو تو اس پر کسی مزدور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ زیادتی کا مطالبہ کرے، کیوں کہ اس کو اس کا پورا حق مل رہا ہے، لیکن ایک مزدور ایسا ہو جس کے بارے میں آپ کی یہ ہدایت ہو کہ میرے سوا کوئی دوسرا اس کی مزدوری نہیں دے گا، وہ میرا ایک مخصوص آدمی ہے، بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ متعلقہ اُمور انجام دیتا ہے تو ایسا اجیر کتنا بڑا خوش قسمت ہوگا اور اس کو اپنی قسمت پر

کتنا ناز ہوگا اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔

میں نے یہ مثال اس حدیث پاک کی تفہیم کے لیے پیش کی ہے،اس کی روشنی میں اس حدیث پاک کے اس حصے کو آپ سمجھ سکتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''روزہ کا بدلہ میں خود دیتا ہوں، یعنی دوسری نیکیوں کا بدلہ تو فرشتوں کے ذریعہ دلایا جائے گا، لیکن اس کا بدلہ خدائے پاک خود عطا فرمائے گا''۔

آپ غور کر سکتے ہیں کہ وہ خدائے پاک جس کے خزانہ رحمت میں کمی کا سوال نہیں آ سکتا جب وہ دے گا تو کتنا دے گا کیا کوئی انسان اس کا تصور کر سکتا ہے۔

{ب}اس حدیث پاک میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے: بندہ اپنی خواہشات اور کھانا پینا میری وجہ سے چھوڑ دیتا ہے، یعنی خدائے پاک کی خوشنودی کے لیے اپنی بنیادی واصلی ضرورتوں کو رضائے الٰہی کے لیے روزے کے مخصوص اوقات میں چھوڑ دیتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل ترک کر دیتا ہے، کیوں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم چھوڑتے کچھ بھی نہیں بلکہ رمضان کے مہینے میں اوسط اخراجات دوسرے مہینوں کے بہ نسبت بڑھ جاتے ہیں، یہ اللہ تبارک وتعالی کا بے پایاں فضل واحسان ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں تاخیر کو''چھوڑنا'' قرار دے کر اپنے روزہ دار بندے کو بہت بڑے انعام کا مستحق بتایا۔

{ج}اس حدیث پاک میں ارشاد فرمایا گیا کہ روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں: ایک تو دنیا میں جب وہ روزہ کھولتا ہے، یہ خوشی ایسی ہوتی ہے جس کو ہر شخص جان سکتا ہے، انسان کی فطرت ہے کہ اگر اس کو کھانے کے لئے غذا میسر نہ آئے یا اس میں تاخیر ہو جائے اور پیاس کی شدت سے بے تاب ہو جائے ایسے عالم میں کھانے کے لیے سوکھی روٹی اور پینے کے لیے پانی مل جائے تو طبعاً وہ خوش ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہو گئی ہیں۔

اور دوسری خوشی قیامت کے دن حاصل ہوگی جب اس کو دیدار الٰہی کا شرف حاصل

ہوگا، یہ ایسی نعمت ہوگی جس کا ادراک کامل سالکین الی اللہ، اولیاے کرام، خدا کے بزرگ ترین بندے ہی کر سکتے ہیں، اس کے مقابلے میں جنت کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں، تجلیات ربانی کے ایک پرتو سے عقل انسانی ششدر وحیران ہوسکتی ہے، اور آخرت میں عین ذات کا مشاہدہ ہوگا، صفات کے جلوؤں سے بندہ بے تاب ہوسکتا ہے، لیکن یہ قدرت الٰہی کی کرم فرمائی ہوگی کہ روزہ دار کو عین ذات کا مشاہدہ ہوگا، اور وہ وہاں مسرور وشاداں ہوگا۔

{د} ''اس حدیث پاک میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تبارک وتعالی کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے''۔

خداے پاک تمام چیزوں سے بے نیاز ہے، انسان کی نگاہ میں جو چیزیں پسندیدہ ہوتی ہیں تو وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ اس کی طبیعت کے موافق یا اس کے لئے سودمند ہوتی ہیں، لیکن خداے پاک کی بارگاہ میں بندوں کے متعلق چیزوں کی قدر وقیمت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ چیزیں خدا کی رضا وخوشنودی کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں، چونکہ روزہ دار اپنے روزے کے ذریعہ اللہ کی رضا چاہتا ہے اس لیے ایسی حقیر چیز جس سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہوسکتی ہے یا اس سے طبعی تکدر حاصل ہوسکتا ہے وہی چیز اللہ کی نظر میں وہ مقام حاصل کر لیتی ہے جو انسانوں کے نزدیک دنیا کی تمام خوشبوؤں کے مقابلے میں مشک کا ہے۔

آپ غور فرمائیے یہ بلند درجہ کس کو مل رہا ہے، کسی کی نیکی کو نہیں مل رہا ہے بلکہ ایسی چیز کو مل رہا ہے کہ جس کے خیال سے آپ کی طبیعت کے اندر انقباض پیدا ہوسکتا ہے، یہاں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک حقیر شی جس کا تعلق بندے سے ہے اور وہ اللہ کی رضا کی راہ پر چل رہا ہے وہ بھی خدا کی نگاہ میں پسندیدہ ہے۔

''عن عبد الله بن عمر وأنّ رسول الله ﷺ قال: الصيام والقرآن يشفعان للعبد، يقول الصيام: اي رب اني منعته الطعام والشهوات بالنهار، فشفعني فيه۔ ويقول القرآن: منعته النوم بالليل فشفعني فيه فيشفعان''(مشكوة، ص: 173)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ روزہ اور قرآن مجید بندے کی شفاعت کریں گے، روزہ کہے گا: اے پروردگار! میں نے دن کے وقت اس کو کھانے پینے اور نفسانی خواہشات کے پورا کرنے سے روک رکھا تھا تو اب اس کے حق میں تو میری شفاعت کو قبول فرما، قرآن کہے گا: میں نے اس کو رات کے وقت نیند سے روک رکھا تھا اس لیے اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما، تو ان دونوں کی شفاعت قبول کر لی جائے گی۔

اس حدیث پاک میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن روزہ دار کے حق میں روزہ اور قرآن مجید کی شفاعت اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرمائے گا، قیامت کا دن ایسا دن ہوگا کہ خدائے پاک کے مقرب بندے اس کے قہر و جلال سے لرزاں و ترساں ہوں گے، انبیائے کرام اور اولیائے عظام بھی ایسی ہولناک گھڑی میں نفسی نفسی پکارتے ہوں گے اور خدائے پاک کی عظمت و جلال سے سہمے ہوں گے، عام انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے عجیب خوف و دہشت کے عالم میں ہوں گے، یہ سورج جس کی تپش آج اتنی دور سے پریشان کیے دیتی ہے، اس دن بالکل سر پر کھڑا بھیجا کھولا رہا ہوگا، ایسے نازک وقت میں قرآن حکیم اور روزہ دونوں اس کی شفاعت کریں گے، اور روزہ دار کو اس کی لغزشوں اور گناہوں سے بخشوائیں گے۔

چند ضروری مسائل:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مریض و مسافر کو رخصت دی ہے کہ اگر اس کو رمضان المبارک میں روزہ رکھنے سے مرض کی زیادتی یا ہلاکت کا اندیشہ ہو یا سفر میں شدت و تکلیف ہو تو وہ مریض سفر کے ایام میں افطار کرے اور بجائے اس کے ایام منہیہ کے سوا اور دنوں میں اس کی قضا کرے، ایام منہیہ پانچ دن ہیں جن میں روزہ رکھنا جائز نہیں، دونوں عیدین اور ذی الحجہ کی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں تاریخیں۔

مسئلہ:

{۱} مریض کو محض وہم پر روزے کا افطار جائز نہیں جب تک دلیل، یا تجربہ، یا غیر ظاہر الفسق طبیب کی خبر سے اس کا غلبۂ ظن حاصل نہ ہو کہ روزہ مرض کے طول یا زیادتی کا سبب ہوگا۔

{۲} جو بالفعل بیمار نہ ہو لیکن مسلمان طبیب یہ کہے کہ وہ روزہ رکھنے سے بیمار ہو جائے گا وہ بھی مریض کے حکم میں ہے۔

▪ {۳} حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اگر روزہ رکھنے سے اپنی یا بچے کی جان کا یا اس کے بیمار ہوجانے کا اندیشہ ہو تو اس کو بھی افطار جائز ہے۔

{۴} جس مسافر نے طلوع فجر سے قبل سفر شروع کیا اس کو تو روزے کا افطار جائز ہے لیکن جس نے بعد طلوع سفر کیا اس کو اس دن کا افطار جائز نہیں۔

{۵} جس بوڑھے مرد یا عورت کو پیرانہ سالی کے ضعف سے روزہ رکھنے کی قدرت نہ رہے اور آئندہ قوت حاصل ہونے کی امید بھی نہ ہو اس کو شیخ فانی کہتے ہیں، اس کے لئے جائز ہے کہ افطار کرے اور ہر روزے کے بدلے نصف صاع یعنی ۲ رکلو ۴۵ رگرام گیہوں، یا گیہوں کا آٹا یا اس کے دونے جو یا اس کی قیمت بطور فدیہ دے۔

{۶} اگر فدیہ دینے کے بعد روزہ رکھنے کی قوت آ گئی تو روزہ واجب ہوگا۔

{۷} اگر شیخ فانی نادار ہو اور فدیہ دینے کی قدرت نہ رکھے تو اللہ تبارک وتعالی سے استغفار کرے اور اپنے عفو تقصیر کی دعا کرتے رہے۔

{۸} مسافر اور مریض کو اگرچہ افطار کی اجازت ہے لیکن زیادہ بہتر وافضل روزہ رکھنا ہی ہے۔

{۹} جنابت روزے کے منافی نہیں، جس شخص کو بحالت جنابت صبح ہوئی تو غسل کر لے اس کا روزہ جائز ہے۔

{۱۰} بحالت روزہ خوردونوش، مجامعت میں سے ہر ایک کے ارتکاب سے کفارہ لازم ہوجاتا ہے۔

{۱۱} رمضان کی راتوں میں روزہ دار کے لیے جماع حلال ہے جب کہ وہ معتکف نہ ہو۔

{۱۲} اعتکاف میں عورتوں سے قربت اور بوس وکنار حرام ہے۔

{۱۳} مردوں کے اعتکاف کے لیے مسجد ضروری ہے۔

{۱۴} عورتوں کا اعتکاف ان کے گھروں میں جائز ہے۔

{۱۵} اعتکاف ہر ایسی مسجد میں جائز ہے جس میں جماعت قائم ہو۔

{۱۶} اعتکاف میں روزہ شرط ہے۔

{۱۷} تحقیق یہ ہے کہ افطاری کی دعا روزہ کھولنے کے بعد پڑھیں، دعا کے بعد روزہ کھولنا خود الفاظ دعا کے خلاف ہے۔

دعاے افطار یہ ہے:

اللهم لك صمت وبك آمنت وعليك توكلت وعلى رزقك افطرت، فاغفرلي ماقدمت واخرت۔

مسئلہ کفاءت کی واضح تصویر

جنوبی ہند کے ہریجن طبقہ کے کچھ افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے، تو اس پر ایک ہنگامہ محشر بپا ہو گیا، خبر رساں اداروں سے لے کر اخبار و جرائد تک کے ذرائع ابلاغ نے اس کو اس طرح ہندوستانی عوام کے سامنے پیش کیا کہ گویا ہندوستان پر کسی بیرونی دشمن نے ہلہ بول دیا ہو، اور اپنے جارحانہ حملے سے تباہ کاریوں کا ایک طوفان لانے والا ہو، حالاں کہ ملکی قوانین کے اعتبار سے ہر شخص کو تبدیلی مذہب کا حق حاصل ہے، پارلیمنٹ میں اس کا ذکر آیا، بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہوا، کسی نے اس ہولناک آفت ناگہانی کی وجہ حکومت ہند کی غفلت شعاری قرار دیا، تو کسی نے اس کا سبب ہندوؤں کی سماجی زندگی اور چھوت چھات کی لعنت میں تلاش کیا، کسی نے یہ راگ الاپ دیا کہ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو عرب ممالک سے کثیر رقم فراہم کی جاتی ہے جس کو وہ ہریجنوں پر خرچ کر کے ان کو مسلمان بناتے ہیں۔

غرض اس بارے میں جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں، بعض جرائد نے نومسلموں کو وحشت میں ڈالنے کے لیے یہ شگوفہ چھوڑا کہ ہریجن اونچی ذات کے ہندوؤں کے جبر وظلم سے تنگ آکر سماجی ناانصافیوں کی بنا پر مسلمان تو ہوئے ہیں لیکن ان کو تبدیل مذہب سے کوئی خاص فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے، بلکہ ان کو جو مراعات پہلے حاصل تھیں وہ اب ختم ہو جائیں گی، اس طرح الٹے خسارہ میں رہیں گے، اور مسلمانوں کے درمیان بھی ان کو عزت و احترام کا مقام حاصل نہیں ہوگا، بلکہ پہلی جیسی ذلت وخواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے، کیوں کہ خود اسلام میں بعض ایسے قوانین پائے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں وہ اسلامی معاشرہ میں اعلیٰ درجہ کے انسان نہیں شمار کیے جاسکتے، ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ تو نہیں ہوگا، مگر اسلام میں مسئلہ کفائت ایک ایسا مسئلہ ہے جو مسلمان کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیتا ہے، جس سے اونچ نیچ بڑے چھوٹے کے امتیاز میں مسلمان بٹ جاتا ہے، اور شادی بیاہ میں اس مسئلہ کی بنا پر کامل آزادی اور مکمل مساوات کا تصور ناممکن ہے، اس سے یہ نومسلم اپنے بچے اور بچیوں کے رشتہ کی تلاش میں انتہائی مشکلات کا سامنا کریں گے، یہ اپنے جیسے نومسلموں

میں مناکحت تو قائم کرلیں گے ،باقی مسلمانوں کے اورطبقوں خصوصاً اونچے طبقے کے مسلمانوں میں ان کوکوئی رشتہ نہیں مل پائے گا، جیسے برہمن اوراونچی ذات کے ہندوؤں نے ذلیل وحقیر جان کرمنہ نہیں لگایا ایسے ہی سلوک مسلمان بھی روارکھیں گے۔

اس قسم کی اختراعی اورمن گھڑت باتوں نے ان بیچارے نومسلموں کوذہنی خلجان میں مبتلا کرکے ان کواسلام سے برگشتگی کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت گل افشانی کی جارہی تھی، یہ اسلام کا دامن تھامنے سے وقارواحترام کی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے توان کو یہ تائثر دیا گیا کہ جس طرح اونچے طبقہ کے ہندوؤں نے ان کے ساتھ انسانیت سوز بہیمانہ سلوک روارکھا تھا،اسی طرح مسلمان بھی ان کوپسماندگی کی زندگی کے لئے مجبورکر دیں گے،اوراسلامی سماج میں بھی وہ اچھوت کے اچھوت رہیں گے،اس کے لیے بہانہ مسئلہ کفائت سے تلاش کیا۔

اس لیے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے، تاکہ اس کی واضح شکل سامنے آجائے ،جس سے عقلی طور پر یہ فیصلہ کرنے میں سہولت ہوکہ کیا واقعی مسئلہ کی نوعیت ایسی ہی ہے، جیسا کہ پروپیگنڈا کیا گیاہے، یا حقیقت کچھ اور ہے، اورعیارانہ طور پراس کومسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ،کیا یہ درست ہے کہ مسئلہ کفائت نے مسلمانوں کومختلف طبقات میں بانٹ دیاہے، یا راستی وصداقت اس کے خلاف ہے، اورمسئلہ کی غلط تصویر پیش کرکے لوگوں کوگمراہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، کیااس کے ہوتے نومسلم اسلامی معاشرہ میں اونچا مقام نہیں حاصل کرسکتے ، یااس کومحض تنگ نظری اوراورغلط بیانی سے ایک حربہ کے طور پرنو مسلموں کوآزردہ خاطرکرنے اوران کواضطراب میں ڈالنے کے لیے استعمال کیا گیاہے۔

اس مختصر مضمون میں ان تمام سوالوں کا جواب دینا مقصود ہے، تاکہ سچائی وصداقت کے رخ زیبا کے دیدار سے انصاف پسند عقل کونوروسرور حاصل ہو، اور بہت ساری بے سروپا باتوں کی بیخ کنی ہوجائے۔

پیغمبر اسلام **صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم** نے ارشادفرمایا:

”ولایزوجن الامن الاکفاء“(نصب الرایة للذیلعی،کتاب النکاح، ص:۱۶۲) عورت کا نکاح اس کے ہم پایہ مرد سے ہونا چاہیے۔

اسلامی قوانین کے عظیم ماہر علامہ برہان الدین اپنی شہرۂ آفاق کتاب ”ہدایہ“ میں لکھتے ہیں:

”میاں بیوی کے مابین خوشگوار تعلق کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ہم پایہ ہوں، کیوں کہ اعلیٰ خاندان کی عورت پست مرتبہ کے مرد سے ازدواجی زندگی بسر کرنے میں عار و شرم محسوس کرے گی، یعنی اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کا شوہر اس سے کم درجہ کا نہ ہو“۔

اس سے معلوم ہوا کہ مرد چاہے کتنے اونچے خاندان کا ہو اور سماج میں کتنی ہی عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو وہ اگر ایسی عورت سے عقد کرے جو فروتر درجہ کی شمار کی جاتی ہو تو اس نکاح کے مشروع ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا، نہ کسی کو حق تنسیخ یا حق اعتراض حاصل ہوگا، کہ اس نکاح کو کالعدم قرار دے دے کہ عورت فروتر درجہ کی ہے۔

مسئلہ کفائت میں بڑا مغالطہ یہی دیا جاتا ہے کہ پیشہ اور خاندان کے لحاظ سے جو غیر حقیقی تفوق حاصل ہو جاتا ہے وہ مرد اور عورت کے درمیان رشتہ ازدواج قائم کرنے کی راہ میں حائل خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین مکمل مساوات اور رشتۂ اخوت کی بنا پر قائم نہیں ہیں، حالاں کہ بات صرف اتنی سی ہے کہ صنف نازک کو اس کے شایان شان رفیق حیات ملنا چاہیے تاکہ بے میل کی شادی سے ازدواجی زندگی میں تلخی اور ناہمواری نہ واقع ہو، اور مرد کے لیے ضروری نہیں کہ اس کی جیسی عالی مرتبت اس کی رفیقۂ حیات ہو، کیوں کہ مرد عورت کی حیثیت میں بدیہی طور پر بڑا فرق ہے، عورت اپنی فطری انفعالی کیفیت کی بنا پر اس کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ پست رتبہ کے مرد کی شوہرانہ حیثیت آسانی کے ساتھ تسلیم کر لے، اور اس کی مستفرشہ بن جانے میں انقباض کے جذبہ سے عاری ہو جائے، لیکن اعلیٰ سے اعلی درجہ کا مرد طبعاً ایسا منفعل نہیں ہوتا کہ اپنے سے کم مرتبہ کی عورت کو کسی حالت میں برداشت نہ کر سکے، پھر اگر لائق و فائق ہو تو عورت کو اپنی زندگی کے سانچے میں آسانی کے ساتھ ڈھال سکتا

ہے،جس سے ایک گونہ طبعی مناسبت پیدا ہوجائے گی، اورکارگاہ حیات میں اپنے عمل وحرکت سے ایک دوسرے کے دوش بدوش توافق وہم آہنگی کے ساتھ منازل حیات طے کریں گے۔

یہ تھی مسئلہ کفائت کی وہ توضیح وتشریح جس کو ہم نے فقہ اسلامی کے ایک مکتب فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے کی ہے،لیکن اسلامی مفکرین میں حضرت امام مالک،سفیان ثوری، امام کرخی **رضی اللّٰہ عنھم** کے نزدیک سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، یہ اسلاف کرام فرماتے ہیں:

"لاتعتبرالکفائۃ فیہ لان الناس سواسیۃ بالحدیث ،قال ﷺ :الناس سواسیۃ کاسنان المشط، لافضل لعربی علی عجمی، انما الفضل بالتقویٰ، وقد تائید ذالک بقولہ تعالیٰ: ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقاکم"۔

نسب کے سلسلے میں کفائت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ حدیث پاک سے ثابت ہے کہ کنگھی کے دندانوں کی طرح لوگ برابر ہیں، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اس کی تاکید اللہ تعالیٰ کے قول "**ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقاکم**" سے ہوتی ہے۔

ان ائمہ اسلاف کے مذہب کی بنا پر عورت ومرد اگر حلقہ بگوش اسلام ہوں اور مرد عورت کی کفالت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو تو عورت چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ خاندان سے شمار کی جاتی ہو اس کا عقد خاندانی لحاظ سے فروتر درجہ کے مسلمان سے ہوسکتا ہے، اور کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا، گووہ باپ، دادا، جیسے ولی اقرب کیوں نہ ہوں، نہ ایسے عقد میں کسی کو عار محسوس کرنا چاہیے، کیوں کہ اسلام کے نزدیک اس باب میں تمام مسلمان ایک درجہ کے ہیں اور ایک دوسرے کے مساوی ہیں ،لیکن یہاں یہ ذہنی خلش ضرور باقی رہے گی کہ پورے ہندوستان میں ایسے مسلمان نایاب ہیں جن کے یہاں مسئلہ کفائت کا اعتبار نہ ہو، یہاں فقہ حنفی اور شافعی مکتبہ فکر کے مسلمان پائے جاتے ہیں جن کے نزدیک ایک اعلیٰ ذات کی عورت نچلی ذات کے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی ، پھر کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ کی ہولناکی اپنی جگہ برقرار ہے۔

ہم نے اوپر واضح کیا ہے کہ کفائت میں اس کا لحاظ ضرور کیا جاتا ہے کہ عورت کے برابر مرد کو ہونا چاہیے، اور یہ اعتبار ضروری نہیں ہے کہ عورت مرد کے ہم پایہ و ہمسر ہو، اس لیے ایک نومسلم لڑکی کا عقد اگر کسی سید زادے سے ہو جائے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں پائی جاتی ہے، اور اس نکاح کے جواز میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا، ہاں نومسلم لڑکے سے اگر کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا عقد اس کے باپ، دادا یا ولی شرعی کی صریحی رضا کے بغیر ہو جائے تو ضرور اس نکاح کے عدم جواز کا فتویٰ ان مکتبہا ے فکر کے علما کی طرف سے دیا جائے گا، اس نکاح کے نا قابل اعتبار ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ نومسلم مسلمانوں کے نزدیک ایک حقیر و ذلیل ہے، یا اسلام کی نگاہ میں وہ توقیر و احترام نہیں بلکہ اس کی علت صرف یہ ہے کہ اس صورت میں زندگی خوشگوار ماحول میں نہیں گزر پائے گی، اس کے علاوہ ولی عورت کی رضا کے بغیر چوں کہ یہ نکاح وجود میں آیا ہے، اس لئے الگ وہ ایک کوفت میں مبتلا ہوسکتا ہے، اور شریعت نے مختلف مصالح کے پیش نظر اس کے حق کا پاس و لحاظ ضروری قرار دیا ہے۔

لیکن یہی مرد علم و فضل، تقویٰ و طہارت کی وجہ سے اونچے مقام پر فائز ہو جائے تو اگر چہ اس کا تعلق ایک نیچی ذات سے تھا تاہم وہ عقد نکاح ایک اعلیٰ طبقہ کی عورت سے کرسکتا ہے، علماے اسلام فرماتے ہیں:

”العالم العجمی کفؤللعربی الجاھل اذاکان متدینا لان شرف العلم فوق شرف النسب“۔

عجمی عالم اگر دین دار ہوتو ناخواندہ عرب کا کفو اور ہم پایہ ہے، کیوں کہ علم کی شرافت کا درجہ نسب کی شرافت سے اونچا ہے۔

حضرت سیدنا ابن عباس **رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ** فرماتے ہیں:

”للعلماء درجات فوق المومنین بسبع مائۃ درجۃ مابین کل درجتین مسیرۃ خمسمائۃ عام“۔

علما کو عام مومنین پر سات سو درجہ کی بلندی حاصل ہے، اور دو درجہ کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

اور فقہ حنفی کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوکر سامنے آتی ہے کہ اگر ایسا معاشرہ قائم کر دیا جائے جس میں نیکی و پارسائی کا دور دورہ ہو، اور عوام الناس کے ذہنوں سے اونچ نیچ کا فرق و امتیاز بالکل مٹ جائے ، اور سماج میں جس کو حقیر درجہ کا انسان تصور کیا جاتا ہے وہ اپنے علمی کمال وتقویٰ وطہارت سے بلند ہوکر مکرم ہو جائے، تو اس کا عقد نکاح اونچے سے اونچے خاندان کی عورت سے ہونے میں کوئی قباحت باقی نہیں رہ جاتی، اس کا تعلق ذہنی احساسات سے ہوتا ہے، جب تک یہ صورت حال برقرار رہے گی ننگ و عار کا احساس ہوتا رہے گا، جس سے تعلقات میں کشیدگی کا امکان غالب ہوگا، اس لیے شریعت نے اس کا لحاظ کیا کہ عورت کو اس کی شایان شان رفیقۂ حیات ہونا چاہیے، تاکہ اس کا خاندان شرم وعار محسوس نہ کرے۔

مسئلہ کفائت سے دو شبہے عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں:
(۱) اس سے حقیر و ذلیل ،اعلیٰ واکرم کی تفریق محض خاندان یا پیشہ کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے، (۲) اس سے اسلامی رشتۂ اخوت اور مسلمانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات پر ایک ضرب کاری پڑتی ہے، اور یہ احساس اُجاگر ہوتا ہے کہ جذبۂ اخوت اسلامی یہاں آکر بے دست و پا ہو جاتا ہے، جو روح اسلام کے سرتا سر منافی ہے۔

انھی شبہوں کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ عتیق الاسلام مسلمانوں کے مابین جب اس کی بنا پر تفریق روا رکھی جاتی ہے تو نومسلموں کے ساتھ اچھے سلوک اور مساویانہ برتاؤ کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ لیکن میرے نزدیک یہ دونوں شبہے مسئلہ کفائت کی واضح شکل لوگوں کے ذہنوں میں نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، کیوں کہ اسلام کی نگاہ میں جو شخص اس کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لے، نیکوکاری اور پارسائی میں اونچا مقام حاصل کر لے، وہی انسان علیٰ انسان شمار ہوتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

”**إن أكرمكم عند الله اتقاكم**“۔ تم میں زیادہ مرتبہ والا اللہ کے نزدیک وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہو۔

پس کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسا نومسلم جو پست اقوام سے تھا، اوراب اس نے اسلام کا دامن تھام لیا، اور کفر کی پستی سے نکل کر اسلام کی بلندی تک پہنچ گیا، کفر کی آلودگی سے پاک ہوکر اسلام کی طہارت حاصل کر چکا ہے، وہ اسلام کے نزدیک حقیر و ذلیل شمار کیا جائے گا، عصر حاضر کے بلند پایہ فقیہ اسلام فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنہ** ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

''ہماری شریعت مطہرہ نے حکم دیا ہے ''**اذااتاکم کریم قوم فاکرموہ**'' جب تمہارے پاس کسی قوم کا عزت دار آدمی آئے، تو اس کی خاطر کرو، خالی آنے پر تو یہ حکم تھا، پس جو بندۂ خدا توفیق الٰہی سے ٹوٹ کر ہمیں آملا، ہم میں کا ہو گیا، اس کا کس قدر اعزاز و اکرام اللہ کو پسند ہو گا، اسلام کے برابر اور کیا عزت ہو گی، اس نے تو اسے چار چاند بلکہ ہزار چاند لگا دیئے، اگر کوئی چمار (ہریجن) بھی مسلمان ہو جائے، تو دین میں اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھنا حرام اور سخت حرام ہے، وہ ہمارا دینی بھائی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :''**انما المؤمنون إخوة**'' اور یہ بھی فرمایا گیا کہ ''**فاخوانکم في الدين**''۔

اس استفسار کے جواب میں آگے چل کر نومسلم کا اعزاز و اکرام اس انداز میں واضح فرماتے ہیں کہ اسلام کا جلوۂ زیبا پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

''ہمارے امام اعظم کے استاذ امام **عطا رضی اللّٰہ عنہ** کا مذہب یہ تھا کہ جو شخص جس کے ہاتھ پر مسلمان ہو، اس کی ولا اس کے لئے، درمختار میں بحوالۂ ''بدائع'' مذکور ہے کہ ''**ھو مولیٰ الذی اسلم علی یدیہ**'' اور ولا ایک رشتہ ہے جو نسب کے مثل ہے، حدیث پاک میں ہے کہ ''**الولاء لحمة کلحمة النسب**'' جس کی ولا جس قوم سے ہو وہ انہیں میں گنا جاتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''**مولی القوم من انفسھم**'' اس مذہب کا پتہ ایک حدیث بھی دیتی ہے ''**من اسلم علی یدیہ رجل فلہ ولاءہٗ**'' جس کے ہاتھ پر کوئی شخص اسلام لائے، تو اس کا رشتہ ولا اسی سے ہے''۔

ان تمام تصریحات کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

''اس مذہب کے اعتبار سے جو شخص جس کے ہاتھ پر اسلام لائے بطور رشتۂ ولا اسی قوم میں شمار کے قابل ہوگا''۔

مثلاً اگر کوئی ہریجن ایک سید کے ہاتھ پر ایمان لایا تو وہ بطور رشتۂ ولا سید میں شمار کیے جانے کا لائق ہو جاتا ہے، اس میں اس لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے وجود مادی کا سبب ہوتا ہے، اور اس کے باعث اس کی اولاد اس کی طرف منسوب ہو کر اس کی قوم میں شمار ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح جس شخص کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس کے ہاتھ پر ایک غیر مسلم اسلام کی دولت بے بہا سے مالا مال ہو گیا اور وہ اس کے روحانی وجود کا سبب ظاہر بن گیا (کیوں کہ کفر کی حالت ظلمت و عدم کی حالت ہوتی ہے اور اسلام کی حالت نور و وجود کی حالت ہوتی ہے) اس طرف منسوب ہو کر وہ نو مسلم اس کی قوم میں شمار ہونے لگے گا، اور اولا د روحانی کی نسبت پر اس کو کوئی عار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسلامی جذبۂ اخوت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کو اس پر مسرور و شاداں رہنا چاہیے۔

اب آپ اس کو اس طرح تصور فرمایئے کہ ایک چمار جب کفر کی حالت میں تھا تو وہ ذلیل و خوار تھا، وہ وہ تھا کہ اس کے ساتھ اس کے مذہب کے لوگ احترام کا تعلق استوار کرنے میں ننگ و عار محسوس کرتے تھے، وہ ذلت و حقارت کی نگاہ سے اس طرح دیکھا جاتا تھا کہ وہ بڑی ذات والوں کے قریب اگر بیٹھ جاتا تو اس سے ان اونچی ناک والوں کی ناک کٹ جاتی تھی، وہ اگر مندروں میں داخل ہو جاتا تو وہ نجس و ناپاک ہو جاتی تھیں، وہ اگر ان کے ساتھ سوئے اتفاق سے کھانے پر بیٹھ جاتا تو وہ کھانا ہی نا قابل استعمال ہو جاتا، اسے اونچی ذات والوں سے رشتۂ نکاح قائم کرنے کا کیا سوال؟ اگر اس کا خیال بھی ان کے دل میں آجاتا اور ان اونچی ناک والوں کو کسی ذریعہ سے اس کی خبر ہو جاتی تو وہ اس کے وجود ہی سے اس دھرتی کو پاک کر دیتے۔

لیکن وہ جیسے ہی اسلام کے دامن اقدس سے وابستہ ہو گیا وہ اتنا مکرم ہو گیا کہ اس کو

حقارت کی نگاہ سے دیکھنا سخت حرام اور گناہ عظیم ہوگیا، وہ مسلمانوں کے جملہ تقریبات مذہبی و غیر مذہبی میں بلا جھجک شریک ہوسکتا ہے، کوئی اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھے تو وہ مجرم گردانا جائے، وہ مسجدوں میں صف اول میں بیٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف ہوسکتا ہے، اس کے پیچھے اسلامی حکومت کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو جس کی پیشانی سجدہ کی حالت میں اس کے قدموں سے مس کر رہی ہو، اس سربراہ مملکت کو خجالت محسوس کرنے کا کوئی حق نہ پہنچے گا، وہ سید کے خاندان کا ایک رکن ہو گیا، اس کا نکاح سیدزادی سے ہوسکتا ہے، اسلام نے پستی کے قعر مذلت سے بلندی کی کس سطح پر پہنچادیا کیا اس کا تصور کسی مذہب میں کیا جا سکتا ہے؟

غور فرمایئے کہ مسئلہ کفائت اس کی سر بلندی کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے؟ اس کو سماجی زندگی میں کسی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا؟ ہرگز نہیں، پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہریجن کا وقار اسلام سے وابستگی کے بعد بھی بلند نہ ہوگا، اور وہ پہلی جیسی خواری کی زندگی میں مبتلائے آلام رہے گا۔

ہم کو یہ تسلیم ہے کہ فقہ حنفی و شافعی کی رو سے کفائت کی ایک بنیاد اسلام میں موجود ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام جو عزت و احترام کی زندگی آنِ واحد میں عطا کر دیتا ہے، اور وابستگی کی حالت میں بھائی چارگی اور مواخات کے مستحکم رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے، جہاں تحقیر کی نگاہ سے ایک نومسلم کو دیکھنا اشد حرام اور بڑا گناہ ہوتا ہے، کیا اس کے ماننے والوں کا اہم فریضہ نہ ہوگا کہ اگر ایک نومسلم اپنی معاشرتی زندگی میں زبوں حالی کا شکار ہو جائے یا اپنی جنسی قوت کی تسکین کے لیے کوئی راہ نہ پائے تو اس کی مدد و اعانت، فراخدلانہ جذبہ کے ساتھ کریں، ضرور ایسے نو وارد بھائی کے لئے فیاضانہ جذبہ کا اظہار بڑا ثواب کا کام ہوگا، اور دین اسلام کے ماننے والوں کا فریضہ ہوگا کہ امکانی حد تک اس کی کفالت ہر معاملہ میں کریں، چنانچہ فاضل بریلوی **رحمۃ اللہ علیہ** ایسے شخص کے عقد نکاح کے لیے مختلف طریقہ پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

(۱) بالغ عورت جس کا کوئی ولی نہ ہو برضائے خود اس سے نکاح کرے، یعنی چاہے

وہ عورت کتنی ہی اونچے خاندان کی ہو بہر حال اس سے نکاح کے جواز میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) ایسی عورت کا ولی پیش از نکاح اسے نومسلم جان کر اس کے ساتھ نکاح کرنے پر صراحۃً اپنی رضامندی ظاہر کر دے۔

(۳) نابالغہ کا باپ یا یتیمہ کا دادا اس نومسلم کے ساتھ عقد کر دے، ان تمام صورتوں میں نکاح کے عدم جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔

اس سے ظاہر ہو کر رہا کہ اصل یہ نہیں ہے کہ تحقیر کی بنا پر نکاح کا مکمل امتناع ہوتا ہے، بلکہ ممانعت تعلقات میں غیر اعتدالی کیفیت سے اجتناب کے لیے بعض صورتوں میں ہے، کیوں کہ اگر امتناع کلی ہوتا اور کسی حالت میں ایسی عورت کا عقد غیر کفو نومسلم سے جائز نہ ہوتا تو باپ دادا یا ولی اقرب کی صریحی اجازت و مرضی کے بعد بھی نکاح کے جواز کی کوئی صورت نہیں پیدا ہو سکتی، جیسے کہ کسی مشرک سے نکاح کی ممانعت و حرمت مکمل ممتنع ہے، تو اس کے جواز کی کوئی شکل کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی، اس لیے مسئلہ کفائت سے واویلا مچانا اور اس کو اسلام کے دامن پر دھبہ قرار دینا یا حد سے تجاوز کر کے اسلام کے قانون ازدواج کو ناقص کہنا انصاف و دیانت کے بالکل خلاف ہے، اب مسئلہ کا پس منظر ملاحظہ فرمائیے۔

بالغہ عورت پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے (یعنی اس کو اختیار ہے کہ جس سے چاہے عقد کرے) اس کے اختیار کو باپ دادا یا اولیاے شرعی بھی سلب نہیں کر سکتے، لیکن اس اختیار کو کفاءت کے دائرہ میں محدود کر دیا گیا کیوں کہ اس اختیار کے بعد اپنے رفیق حیات کے انتخاب میں اپنی رائے کا آزادانہ استعمال کر سکتی تھی، جس کے باعث خاندان کے افراد کافی ذہنی اذیت و کوفت میں مبتلا ہو سکتے تھے، اس لئے عورت پر لازم کیا گیا کہ اپنے سرپرستوں کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اپنے سے فروتر درجہ کے مرد سے عقد نہ کرے، اس پابندی کے بعد اگر وہ خودسری پر آمادہ ہو جائے اور ان کی مرضی کے بغیر عقد کر لے تو اس نکاح کو شریعت یا تو کالعدم قرار دیتی ہے، یا ولی کو یہ حق عطا کرتی ہے کہ اس کو منسوخ کر دے ، ہاں اس کا ولی ایسے نکاح پر قبل نکاح اپنی صریحی رضامندی ظاہر کر دے تو چونکہ عورت اور

ولی کی رایوں میں توافق اورہم آہنگی پیدا ہوگئی، اس لیے یہ نکاح جائز ہوگا۔

اس تفصیل کے بعد کفائت کے اعتبار کی جو حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے وہ صرف اتنی سی ہے کہ کوئی عورت خودسری پر آمادہ ہوکر اپنے سرپرستوں کی مرضی کے خلاف اقدام نہ کرے، جنھوں نے اس کو پروان چڑھایا، جس سے وہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہوئی، اور اسلام نے اس پر پابندی کا دائرہ اتنا وسیع نہیں کردیا کہ وہ اگر اپنے ہمسر یا کفو سے عقد کرے تو اس کے ولی کو خواہ مخواہ کے لیے مداخلت کرنے کا اختیار ہو اور نکاح کو منسوخ کرسکے، اس سے ظاہر ہوکر رہا کہ کفائت کے اعتبار کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ بالغہ عورت کا عقد غیر کفو میں کسی صورت میں نہیں جائز ہے، اور ہر حالت میں نکاح ممنوع وباطل ہے، بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ جب کہ پیغمبر اسلام **صلی اللہ علیہ و سلم** اور آپ کے صحابہ کرام **رضی اللہ تعالیٰ عنھم** سے غیر کفو میں نکاح کا ثبوت ملتا ہے، حضور اکرم **صلی اللہ علیہ و سلم** نے حضرت اسامہ بن زید کے عقد کا پیغام نہایت معزز خاتون قرشیہ فاطمہ بنت قیس کو دیا تھا، حضرت بلال حبشی **رضی اللہ عنہ** سے عبدالرحمن بن عوف کی ہمشیرہ نے شادی کی تھی، حضرت ابوحذیفہ نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام سے کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلاف کرام نے عظیم الشان اسلامی اخوت کا مظاہرہ فرمایا تھا، وہ غلام جس کو عرب کی دنیا میں بدتر انسان شمار کیا جاتا تھا، اور جن کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا، نہ صرف یہ کہ آزاد کرکے شریف انسان کا رتبہ عطا کیا، بلکہ ان کے ساتھ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے عقد کرنے میں کوئی شرم وعار نہیں محسوس کیا، ان کے سامنے انسانیت کا واضح مقام تھا، انھوں نے اپنے اسلامی معاشرہ میں تمام طبقاتی ونسلی امتیازات کو تحلیل کرکے صرف ایک تفریق روا رکھی تھی وہ تھی نیکی اور بدی، کفر واسلام کی تفریق۔

آج کی طرح ان کا معاشرہ نہ تھا، ایک چھوٹے سے گاؤں میں مسلمانوں کی دسوں ذاتیں آباد ہوتی ہیں، اور محض ذہنی اختراع کی بنا پر باہمی مناکحت کو معیوب سمجھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے رشتۂ مناکحت میں بجائے وسعت پیدا ہونے کے ایسی تنگی پیدا ہوتی ہے کہ

کتنے خاندان کی جوان لڑکیاں اپنا رفیق حیات پانے سے محروم ہوتی ہیں، اور طرح طرح کے غیر اسلامی رسموں کی پابندیوں سے کتنی زندگیاں اذیت ناک حالت میں سسکتی ہیں، اس المناک صورت سے فائدہ اٹھا کر جو لوگ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے ہیں، ان کو گمراہ کرنے اور برگشتۂ اسلام کرنے کے لیے ہماری حالتوں کا حوالہ دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہے وہ اسلام جس کے اندر داخل ہو کر تم روحانی سکون، قلبی اطمینان، سماجی مساوات، اخوت اسلامی کے برکات وحسنات حاصل کرنا چاہتے تھے، اس کو مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی آبادی میں جا کر دیکھ لو، پھر تم کو احساس ہوگا کہ یہاں صرف زبانی جمع خرچ ہے، اور اقدار عالیہ، مکمل مواخات بالکل ناپید ہیں، حالاں کہ ایسی دس ذاتیں جو ایک آبادی میں پائی جاتی ہیں ان میں فقہ اسلامی کے مکتبہاے فکر میں سے کسی کے اعتبار سے ان کا لحاظ ضروری نہیں ہے، الا یہ کہ معروف النسب اور اسلامی معیار تفوق کے لحاظ سے ان میں برتری کسی کو حاصل ہو، کیوں کہ ہندوستان کی بیشتر مسلم آبادیوں پر فقہی کفائت یا عدم کفائت کا ایسا اطلاق نہیں ہوتا جس سے نکاح کے جواز یا عدم جواز پر اثر پڑے، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی **رضی اللہ تعالیٰ عنہ** فرماتے ہیں کہ:

’’بعض عوام میں دستور ہے کہ اپنے ہم قوم کو اپنا کفو سمجھتے ہیں، دوسری قوم والے کو اگرچہ ان سے کسی بات میں کم نہ ہو غیر کفو کہتے ہیں، ان کا شرعاً لحاظ نہیں ہے، جیسے شیخ صدیقی ہو وہ شیخ فاروقی کو اپنا کفو نہ جانے، یا سید ہو وہ شیخ صدیقی یا فاروقی یا اور قریشی کو اپنا کفو نہ جانے‘‘۔ (فتاوی رضویہ ج:۶۔ص:۳۰۰)

خواطر کے احکام

❁❁

خیالات وخواطر قلبی پر قابو حاصل کرنا بڑا مشکل امر ہے، انسان کا ذہن بڑا اثر پذیر ہے، نہیں کہا جا سکتا ہے کہ خیالات آن کی آن میں کیا کرشمے دکھائیں، ایک خیال ذہن میں آیا اور مسکرانے لگے، تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا خیال آیا تو ہمارے اوپر رقت طاری ہوگئی جس سے بے قابو ہوکر رونے لگے، بعض اوقات غیر شعوری طور پر ہمارے اعضا وجوارح سے ایسی حرکت کا ظہور ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کے لئے مضحکہ بن جاتے ہیں، ہماری قوت خیال آن واحد میں بے انتہا وسعتیں طے کر لیتی ہے، اس کی سرعت رفتار کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اور یہ طائر بلند پرواز کسی متعین حد میں پہونچ کر چین نہیں پاتا، جب تک چمن چمن چکر نہ لگائے اس کی بے قرار طبیعت کو قرار نہیں ملتا۔

فضا میں آزاد پھرنے والا ایک پرندہ قفس کی تنگ نائیوں میں سکون نہیں پا سکتا، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے متعدد آیات میں خواطر وخیالات پر کیوں پابندی لگائی جب کہ ایسے طوفانوں پر اس کو قدرت نہیں اور وہ کھلے طور پر ان کے بارے میں بے بس و بے اختیار ہے، نیز کیوں دھمکی دی کہ اپنے خیال کو اس کے جائز حدود میں رکھو، ورنہ قدرت الٰہی کا قانون محاسبہ حرکت میں آکر تم کو خائب وخاسر بنا سکتا ہے، قرآن حکیم کی درج ذیل آیات غور سے پڑھیے:

﴿وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (البقرة: ۲۸۴)

اگر تم ظاہر کرو وہ چیز جو تمہارے نفسوں میں پوشیدہ ہے، یا چھپا کر رکھو، اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ فرمائے گا، پس جس کو چاہے گا بخش دے گا، اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا، اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس آیت کریمہ میں نفوس میں پوشیدہ امور پر تہدید فرمائی گئی، جس سے بظاہر نتیجہ یہی

نکلا کہ وسواس اور قلبی خواطر پر بھی گرفت ہوگی، اوران کی بنا پر انسان عتاب الٰہی کا سزاوار ہوگا۔

ایک دوسری آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ آنکھ، کان، دل سب کے بارے میں سوال ہوگا، یعنی جس طرح ظاہری اعضا کے بارے میں مواخذہ ہوگا، اسی طرح باطن کی قوتوں کی بے اعتدالی پر محاسبہ ہوگا۔

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا﴾(بنی اسرائیل: ۳۶)

آپ اس کے پیچھے نہ چلیے جس کا آپ کو علم نہیں، بلا شبہ آنکھ، کان، دل سب کے بارے میں سوال ہوگا۔

گواہی چھپانے والے کو بتایا گیا کہ اس کا دل گناہ گار ہے۔

﴿ولا تکتموا الشّھادۃ ومن یکتمھا فانّہ اٰثمٌ قلبہٗ﴾

اور گواہی نہ چھپاؤ جو شخص گواہی چھپائے گا، تو بلا شبہ اس کا دل گنہگار ہے۔

اعمال قلبی پر مواخذہ کا واضح ثبوت یہ آیت کریمہ ہے۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾(البقرۃ:۲۲۵)

ان آیات الٰہی پر ایک نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خواطر، دلوں کے ارادوں، وسوسوں پر پکڑ ہوگی، اوران کی بنا پر انسان جزا وسزا کا مورد قرار پائے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس دنیاے دوں میں عام انسانوں میں ایک فرد بھی ایسا پایا جاتا ہے جو اپنے ہر خیال کی پاکی کا دعویٰ کر سکے، کیا اس بات پر قادر ہے کہ سیکڑوں عوامل ومحرکات کے اثرات اس کے ذہن وشعور میں نہ ہوں، یہ آدم زاد اپنے خیالات کے سلسلہ میں اس قدر بے بس ہے کہ مزاج کے خلاف اگر ایک لفظ کان میں پڑ جائے تو اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتا ہے، اور اس کا جذبۂ انتقام اس کو خیالات کی دنیا کی سیر کراتا ہے، اسی بے بسی کے باعث جب آیت کریمہ "**وان تبدوا ما فی انفسکم**" نازل ہوئی، آفتاب رسالت کے نجوم ہدایت

نے بارگاہ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا جس چیز کی ہم استطاعت نہیں رکھتے ہم کو اس کا مکلف بنایا گیا ہے، فرمایا کہ شاید تم یہود کی طرح کہتے ہو "**سمعنا وعصینا**" ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی، تم کو "**سمعنا واطعنا**" کہنا چاہیے، آپ کا مقصود یہ تھا کہ شیوہ تسلیم و رضا کے خلاف ہے کہ ایسے ناروا کلمات شرعی تکلیفات کے متعلق زبان پر لاؤ، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا شفیق و مہربان ہے، اس کی رحمت گوارہ نہیں کرسکتی کہ تمہیں ایسے کاموں کا مکلف بنائے جس کی تم استطاعت نہیں رکھتے، اگر تم کو ایسا ہی نظر آئے تو تم اطاعت شعار بنو اور اس کے آگے کی فکر نہ کرو، اس کے بعد آیت کریمہ "**لا یکلف اللّٰہ نفساً الاّ وسعھا**" نازل ہوئی، اور رمز شناسان نبوت حضور اکرم **صلی اللّٰہ علیہ وسلم** کے اطمینان دلانے سے مطمئن ہو گئے، لیکن ایک عامی کے لیے شبہ کی گنجائش باقی رہی کہ خدائے کریم نے کیوں خواطر قلبی پر محاسبہ کی تہدید فرمائی ہے، انسان ہمہ وقت اپنے دل کو وساوس وافکار فاسدہ کی آماجگاہ پاتا ہے، جس میں بعض اوقات بڑا بے بس ہوتا ہے، اور کریم کی کرم نوازی گوارہ نہیں کرسکتی کہ عالم بے بسی میں اپنے احکام کا بوجھ بندے پر ڈالے۔

یہ کائنات بے حد وسیع ہے اور نیرنگیاں بھی غیر محدود، جو انسان کی قوت پرواز کے لئے سامان پرواز فراہم کرتی ہیں، اس لئے لازم نہیں کی وہ اپنے جائز حدود میں رہے، بلکہ ایک ایسا انسان فرض کیجئے جو کسی پہاڑ کی تیرہ و تنگ گھاٹیوں میں مقیم ہو، اس کے خلوت کدہ میں کسی کو باریاب ہونے کی کوئی صورت نہ ہو، وہاں اس کو من وسلویٰ سے روزی پہنچائی جاتی ہو، برائیوں اور فحش کاریوں کی طرف مائل کرنے کے ظاہری اسباب ومحرکات نہ ہوں، غالباً ایسے مجرد شخص کے متعلق سوچا جائے گا کہ اس کی قوت خیال کی ہر حرکت پاک وصاف ہوگی، لیکن یہ محض غلط ہے، اس تیرۂ وتاریک غار میں اس کی فطری قوتیں اس کو گدگدائیں گی، جس سے اس کے دل میں خیالات کا طلسم ہوگا، جس میں برے بھی ہوں گے اور اچھے بھی، اسی وجہ سے بعض عرفا فرماتے ہیں کہ حالت ذکر میں بھی خیالات کا چکر چلتا رہتا ہے، اس حالت میں

بھی اس سے رہائی نہیں ملتی، ان وجوہات کو پیش نظر رکھ کر انسان کی بے بسی دیکھیے، اور رحمت اللعالمین کی رحمت بیکراں کی موجوں میں ڈوبے ہوئے ارشادات عالیہ ملاحظہ فرمائیے:

"عن ابي هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: ان اللّٰه تجاوز عن امتى ماوسوست به صدورها مالم تعلم او تتكلم" (مسلم، حديث نمبر: 332)۔

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا میری امت کے سینوں میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے، جب تک عمل یا گفتگو نہ کرے۔

"عن ابي هريرة قال: جاء ناس من اصحاب النّبي صلى الله عليه وسلم الى النّبي صلى الله عليه وسلم، فسالوه انا نجد في انفسنا ما يتعاظم احدنا ان يتكلم ،قال:او قد وجدتموه؟ قالوا: نعم، قال: ذاك صريح الايمان"۔{مشكوٰة شريف، باب فى الوسوسة، ص:۱۸ }

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ چند صحابہ **رضی اللّٰہ عنهم** حضور **صلی اللّٰہ علیه وسلم** کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر عرض کی کہ ہم اپنے نفسوں میں ایسے ایسے وسوسے پاتے ہیں جن کو ہم میں سے کوئی بھی زبان پر لانا گوارہ نہیں کرسکتا، آپ نے فرمایا کہ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا یہ صریح ایمان ہے۔

ان احادیث کریمہ سے عیاں ہے کہ خواطر قلوب پہ میلانات نفس سے مکمل طور سے بندش نہیں لگائی جاسکتی، معاصی کی طرف صرف میلان طبع ہو جانے سے کوئی عذاب وعتاب کا سزاوار نہ ہوگا، کیوں کہ انسان اس بارے میں مجبور ہے، لیکن اس حقیقت کو پھر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ خیالات کا اثر اعضاوجوارح پر نمایاں طور سے پڑتا ہے، کوئی شخص اگر برے خیالات میں مسلسل ڈوبا رہے تو ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب وہ دماغی وجسمانی امراض میں مبتلا ہو جائے گا، خیالات کی گندگی وہجوم سے صحت جسمانی پر برا اثر پڑتا ہے، اس کا کون

سلیم الطبع منکر ہوگا، پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ پہلے انسان کا دل گناہ گار ہوتا ہے، اس کے بعد وہ گناہوں میں آلودہ ہوتا ہے، دل میں کسی حسین عورت کا خیال آیا، اور اس کا بلاؤ کچھ عرصہ تک رہا تو وہ رفتہ رفتہ دل و دماغ پر چھا جاتی ہے، اب وہ عمل اقدام کر کے معصیت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اس طرح عذاب الٰہی کا مستحق ہو جاتا ہے، اس لیے دو علتوں کی بنا پر خیالات پر پابندی لگانا ضروری قرار پایا۔

(۱) خواطر کے جماؤ سے انسان معاصی کا مرتکب ہو کر حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو برباد کرتا ہے۔

(۲) خود انسان اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے، اور اپنے آپ کو مبتلاے آلام و مصائب کر لیتا ہے، ہر عمل چاہے اس کا تعلق دل سے ہو یا ظاہری اعضا سے، جب انسان کی ذات کے لیے برے نتائج پیدا کرنے کا باعث ہو، یا اس کے مضر اثرات دوسروں تک منجر ہوں، دونوں صورتوں میں عقل و منطق کا فیصلہ یہی ہے کہ اس کے عدم جواز کا قانون نافذ ہو، ان دونوں نکتوں کے پیش نظر قرآن حکیم کی آیات بجا طور پر محاسبہ کی تہدید فرما رہی ہیں، مگر اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ خیالات کے ہجوم میں انسان بسا اوقات مجبور ہوتا ہے، اس باطنی عمل کی معافی کا پروانہ ملنا چاہیے، اس لیے ان آیات الٰہی اور احادیث کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہوا کہ وسواس نفسانی پر دقیق نظر ڈالی جائے، اور اس کے مراتب و مراحل کی تعیین و تشخیص کی جائے۔

فلسفۂ اسلام، امام غزالی احیاء العلوم میں اس مسئلہ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”والحق عندنا في هٰذا المسئلة لا يوقف عليه ما لم تقع الاحاطة بتفصيل اعمال القلوب من مبدءظهورها الىٰ ان يظهر العمل علىٰ الجوارح“۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں جو حق ہے اس کی واقفیت حاصل نہیں کی جا سکتی، جب تک اعمال قلوب کا تفصیلی تجزیہ اس کی ابتداے ظہور سے لے کر جوارح پر عمل ظاہر ہونے تک نہ کیا جائے۔

پھر تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

”فنقول: اول ما یرد علی القلب الخاطر کمالو خطر له مثلا صورة امرأة وانها وراء ظهرهٖ في الطريق لو التفت اليه لرآها والثاني هيجان الرغبة الى النظر و هو حركة شهوة التي في الطبع وهٰذا يتولدمن الخاطر الاول ونسميه ميل الطبع ويسمى الاول حديث النفس والثالث حكم القلب بان هذا ينبغي ان يفعل اى ينبغي ان ينظر اليها فان الطبع اذا مال و عدم هٰذه الصوارف ربمايكون بتامل وهوعلى كل حال حكم من جهة العقل ويسمىٰ هذا اعتقاداً والميل الرابع تصميم العزم علي الالتفات وجزم النية فيه وهذا نسميه همابالفعل ونية وقصد اوهذاالهم قد يكون له مبدء ضعيف ولكن اذااصغى القلب الى الخاطر الاول حتى طالت محاربة للنفس تاكد هذالهم وصار ارادة مجزومة فاذا انحرمت الارادة فربما يندم بعد الجزم فيترك العمل وربما يغفل به ولا يلتفت اليه وربمايعوق عائق فيعتذر عليه العمل“۔(احياء علوم الدين، ج۸، ص:۴۳)

تو ہم کہتے ہیں کہ پہلے جو دل پر وارد ہوتا ہے جیسے کسی عورت کا خیال آ کر دل سے نکل گیا، اور وہ اس کے پیچھے راستے میں تھی، اگر اس کی طرف التفات کرتا تو ضرور دیکھ لیتا (ثانی) عورت کو دیکھنے کی خواہش کا ابھرنا اور وہ طبیعت میں خواہش کی حرکت ہے، یہ خاطر اول سے پیدا ہوتا ہے، اس کو ہم میل طبع کا نام دیتے ہیں، اور پہلے کا نام حدیث نفس ہے، (ثالث) دل کا فیصلہ کرنا کہ یہ کام مناسب ہے، اس لئے کہ طبیعت جب مائل ہو جائے تو ہمت اور نیت اس وقت تک نہیں ابھرے گی جب تک پھیرنے والی چیزیں دور نہ ہو جائیں، کیوں کہ کبھی اس عورت کی طرف متوجہ ہونے سے حیا یا خوف منع کرے گی، اور ان کے پھیرنے والی چیزوں کا معدوم ہونا بسا اوقات غور کرنے سے ہوتا ہے، بہر حال وہ عقل کی طرف سے ایک حکم ہے، اور اس کا نام اعتقاد رکھا جاتا ہے، (رابع) عورت کی طرف متوجہ

ہونے کا عزم مصمم اور مستحکم ارادہ کرنا اس کو نیت ،ہم، بالفعل ،اور قصد کہتے ہیں، ار ادے کا مبدا کبھی کمزور ہوتا ہے،لیکن جب قلب مسلسل خاطر اول کی طرف مائل رہے، یہاں تک کہ کشمکش تو یہ ''ہم'' مستحکم ہوجاتا ہے، اور قطعی ارادہ بن جاتا ہے، اور قطعی ارادہ اور عزم مصمم کبھی معدوم ہوجاتا ہے، اور عمل چھوڑ دیا جاتا ہے، اور کبھی کسی عارض کی وجہ سے غافل ہوجاتا ہے، اور عمل نہیں کرتا ہے، نہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، بعض اوقات کوئی مانع پیش آجاتا ہے تو اس پر عمل دشوار ہوجاتا ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی **رحمۃ اللہ علیہ** کی اس بحث سے حدیث نفس، میل طبع، اعتقاد، عزم مصمم سب کی الگ الگ حقیقت متعین وممتاز ہوجاتی ہے، جس سے ان پر احکام نافذ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ،اس مسئلے میں سب سے بڑی دقت یہی ہوئی کہ مختلف نفسانی کیفیات جو اپنے اثرات کے لحاظ سے الگ الگ تھے سب ایک ہی قسم کے الفاظ مثلاً حدیث نفس و وسواس سے تعبیر کیے گئے، امام صاحب عورت کی صورت ذہن میں آنے کو حدیث نفس کا نام دیتے ہیں، اس کے بعد عورت کے دیکھنے کی خواہش کے ابھرنے کو میل طبع سے تعبیر کرتے ہیں، اور دل کے اس فیصلہ کو کہ عورت کو دیکھنا مناسب ہے اعتقاد کا لقب دیتے ہیں ،اور میل طبع اور اعتقاد میں فرق اس طرح واضح کیا کہ میل طبع کے بعد اعتقاد کا وجود اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اعتقاد کے موانع معدوم نہ ہوں، حیا غالب ہو تو میل طبع کے باوجود اعتقاد قلب نہ ہوگا، سب سے آخر میں یہ قلبی حرکت ہوتی ہے کہ انسان عزم مصمم کر لیتا ہے، یہ مستحکم ارادہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر عورت کی طرف التفات کے موانع نہ ہوں یا غفلت طاری نہ ہو یا کوئی عارض پیدا نہ ہو تو اس کے بعد عمل کا ظہور ضرور ہوگا، یہ ایک ایسا مرحلہ ہے کہ اس میں انسان کے اختیار کا دخل بالکل واضح ہے، اس لیے اس کے بارے میں مواخذہ نہ ہونے کا سوال نہیں، حالتیں چونکہ مختلف ہوتی ہیں اس لئے اعتقاد کبھی اختیاری ہوتا ہے اور کبھی اضطراری ہوتا ہے، اضطراری معاف اور اختیاری پر گرفت ہوگی، خلاصہ یہ ہے کہ اعتقاد اختیاری اور عزم مصمم پر مواخذہ ہوگا ،اور جن احادیث میں خیالات وساوس کو معاف کرنے کی بات بیان کی گئی ہے ان میں حدیث نفس اور میل طبع مراد ہیں۔

سپریم کورٹ کی مداخلت کے خطرناک نتائج
اور نفقۂ مطلقہ کے متعلق شرعی احکام

وقت کا ایک سنگین مسئلہ مسلم پرسنل لا میں سپریم کورٹ کی مداخلت ہے، اور یہ مداخلت قانون کے سہارے کی گئی، اس لیے ارباب اقتدار کو بتا دینا ضروری ہے کہ آزاد ہندوستان کے دستور نے تمام مذہبی طبقوں کا یہ بنیادی حق تسلیم کیا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کے موافق زندگی گزارنے کے لیے کسی طبقے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنے لئے اسلامی طرز زندگی اختیار کیا ہے، اور یہ طرز زندگی جان و مال، عزت وآبرو سب سے زیادہ عزیز ہے، مسلمان ہر تکلیف برداشت کرسکتا ہے لیکن اسلامی قوانین سے دستبرداری کسی حال میں گوارہ نہیں کر سکتا، اس لئے حکومت کو موجودہ صورتحال پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کر کے سپریم کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دینا چاہیے، اور آئندہ ایسی مداخلت کا امکان باقی نہ رہے اس کی تدبیر فوراً کرنی چاہیے تاکہ مسلمانوں کو حکومت اور مذہب دونوں سے اپنی وفاداریوں میں تصادم کی صورتحال سے دوچار نہ ہونا پڑے، اتنی بڑی اقلیت کو مضطرب و پریشان اور بے قرار رکھ کر جمہوری نظام کو اس کے صحیح راستے پر چلنے کی کوئی تدبیر نہیں پیدا ہوسکتی۔

اس وقت پیدا ہونے والی پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم مسلم پرسنل لا پر ایک نظر ڈالیں، مسلم پرسنل لا مسلمانوں کا خصوصی قانون ہے جس کے دائرہ میں مندرجہ ذیل مسائل آتے ہیں:

(۱) قانون وراثت یعنی مرنے والے کی جائیداد میں کس کو کتنا حصہ ملے گا۔

(۲) نکاح وطلاق کا مسئلہ۔

(۳) گزارے اور نفقہ کا مسئلہ کہ کس ضرورت مند کو کس سے کیا خرچ دلایا جائے۔

مذکورہ بالا مسائل کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے ہے،اور دنیا کا ہر سماج اور ہر گروہ ان مسائل سے دوچار ہے، چنانچہ دنیا کے ہر مذہب نے اپنے اپنے طور پر ان مسائل کا حل پیش کیا ہے، یہاں ہم مثال کے طور پر صرف دو مذاہب کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) مسئلہ وراثت کو اسلام نے اس طرح حل کیا ہے کہ میت کے نسبی رشتہ داروں سے کچھ مردوں اور عورتوں کا حصہ مقرر کردیا اور بقیہ نہایت قریبی رشتہ داروں کے لئے یہ حکم دیا کہ مذکورہ بالا افراد کے حصہ دینے کے بعد جو بچے پورا یہ لوگ حصہ رسدی تقسیم کرلیں، وہ بھی اس حساب سے کہ مرد کو پورا حصہ اور عورت کو اس کا آدھا۔

گویا اسلام میں وراثت کی بنیاد دو باتوں پر ہے: (۱) جس کا نسبی تعلق ہے وہ پائے گا، جس کا نسبی علاقہ نہیں وہ نہیں پائے گا، اگر چہ منہ بولا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ (۲) نسبی علاقہ ہے تو حصہ ضرور ملے گا چاہے مرد ہو یا عورت، جنسیت کی بنیاد پر محرومی کا کوئی سوال نہیں۔

جب کہ ہندو مذہب اس کو اس طرح حل کرتا ہے کہ میت کی وراثت سے صرف اولاد نرینہ (لڑکوں) کو حصہ ملے گا، لڑکیاں محروم رہیں گی، اور جس کو گود لیا گیا ہے وہ بھی ترکہ سے حصہ پائے گا اگر چہ اس کو میت کے نسب سے کوئی تعلق نہ ہو۔

(۲) میاں بیوی کے رشتہ کے مسئلہ کو اب اسلام نے یوں حل کیا کہ مرد، عورت علی الاعلان یکجائی کا معاہدہ کریں اور مرد ایک رقم ادا کرے، معاہدے کا نام نکاح ہے اور اس رقم کا نام مہر ہے۔

جب کہ ہندو سماج میں یکجائی کے معاہدے کو ایک علامتی فعل سے ظاہر کیا، یعنی مقدس آگ کے گرد سات پھیرے پوتر اشلوکوں کی جاپ کے ساتھ، اور بجائے مرد کے عورت کو کوئی رقم دینے کے خود عورت ہی سے تلک اور جہیز کے نام پر ایک غیر معمولی رقم وصول کرنا، (اسلام میں اگر چہ اس کا کوئی قانونی مقام نہیں لیکن ابنائے وطن کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی یہ بیماری پھیل گئی ہے) مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

ہندو سماج چونکہ عورت کو شادی کے بعد باپ کے خاندان سے کاٹ کر شوہر کا اٹوٹ

انگ بنا دیتا ہے، اس لیے اس سماج میں میاں بیوی کی علیٰحدگی کا کوئی تصور ہی نہیں، نہ تو مرد کے بس میں ہے کہ عورت کو اپنے سے علیٰحدہ کرے، نہ عورت کو ہی یہ اختیار ہے کہ مرد سے قطع تعلق کرلے، اس لیے وہاں طلاق کا کوئی تصور ہی نہیں۔

اس کے برخلاف اسلام ناگزیر حالات میں اور نباہ کی کوئی صورت نہ ہونے کی حالت میں نہایت ناگواری کے ساتھ مرد کو عورت کے علاحدہ کرنے کا حق دیتا ہے، جس کو طلاق کہتے ہیں۔

اسی طرح اسلام نے ہر بے سہارا مرد وعورت کے لیے گزارے کی ذمہ داری باپ بھائی، شوہر، بیٹا اور دیگر ترکہ پانے والے رشتہ داروں، سوسائٹی اور گورنمنٹ کے سر ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ ڈالی، جس کو فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ اور اس قسم کے دیگر بہت سے مسائل پر مشتمل قوانین کو جو شریعت اسلامیہ کے دائرے میں ہوں، آج کل مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے، اور چونکہ یہ مسائل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے بہت سی جگہ اس کا نام عائلی قانون بھی ہے، عائلی قوانین کی اس بھیڑ میں چوں کہ آج کل طلاق سے جڑے ہوئے نفقہ اور گزارہ کا مسئلہ سب کی نگاہوں کا مرکز ہے، اس لیے میں اس کو تھوڑی تفصیل سے بیان کرنا چاہوں گا:

☆ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے قانون ملاپ کو اپنی قدرت کی نشانی اور آئینۂ رحمت قرار دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (روم:۲۱) اس کی قدرت کی نشانی ہے کہ اس نے تمہیں سے تمہارا جوڑا بنایا، تاکہ تم اس سے سکون پاؤ اور تم دونوں کے دل میں مہر ومروت کا بیج بو دیا۔

قرآن نے اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ زندگی میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کی سخت ضرورت ہے، ارشاد الٰہی ہے: **ھن لباس لکم و انتم لباس لھن** ''عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورت کا لباس ہیں'' لباس سے تین فائدے حاصل ہوتے ہیں، آرائش،

حفاظت اور ستر پوشی، مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کا سنگار ہیں، اور عورت مردوں کا جمال ہے، عورتیں مردوں کے دین و ایمان اور مال کی محافظ ہیں، تو مرد عورت کی ناموس اور نسوانیت کی حفاظت کے لیے سد سکندری ہیں، عورت مرد کی کوتاہیوں کی پردہ پوش ہے، اور مرد عورت کی کمزوریوں کا پردہ دار ہے، اس آیت مبارکہ میں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ قرآن عظیم نے مرد کو جسم اور عورت کو اس کا لباس نہیں قرار دیا، جس سے عورت کے تابع اور محکوم ہونے کا مفہوم نکل سکے، بلکہ ہر ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا، جس سے میاں بیوی کی مساوات کا تصور ملتا ہے، جو سب سے پہلے اسلام او صاحب اسلام کی دین ہے۔

قرآن نے دونوں کے حقوق، رتبے اور مقام کا تعین فرمایا: "**ولهن مثل الذی عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة**" جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حق مردوں پر ہیں، ہاں مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے ، گذشتہ آیات کی روشنی میں جب اس آیت کو دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مردوں کی اس افضلیت سے مراد صرف وہ برتری ہے جو خاندان کے ہر انتظام کار کو ہر خاندان میں حاصل ہوتی ہے، اور عائلی نظام کے لیے جس کی ضرورت ناگزیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مردوں کو حکم دیا: "**وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ**" **(النساء: ۱۹)** عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو، اور رسول اللہ **صلی اللہ علیہ وسلم** نے فرمایا: "تم میں اچھا وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے اچھا ہو"۔

الغرض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول **صلی اللہ علیہ وسلم** نے میاں بیوی کی زندگی کے جو خطوط اور حدود متعین کیے ہیں، فریقین ان کی رعایت کے ساتھ زندگی گزاریں تو بلا شبہ یہ گھر جنت ارضی ہوگا۔

لیکن طبیعتوں کا تضاد اور مزاجوں کا اختلاف کبھی اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ حدود اللہ کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں گھر بھی جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے، ایسی صورت میں بھی اسلام نے انہیں ملاپ کی ایک آخری جدوجہد کر لینے کا مشورہ دیا: ﴿وَاِنْ

خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا﴾“
(النساء:۳۵) اگر میاں بیوی میں اختلاف کا خطرہ ہوتو جانبین سے حکم مقرر کریں جو صلح کی جدوجہد کریں، اور اگر اس طرح پنچوں کی جدوجہد سے مصالحت ہو جاتی ہے اور دل کی کدورت دور ہو جاتی ہے تو یہ اور خوب ہے کہ زندگی کی دلکشیوں میں لذت اور بڑھ جاتی ہے۔

بڑا مزا اس ملاپ میں ہو کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

لیکن خدا نہ کرے اگر صلح کے چھینٹوں سے بھی جنگ کی آگ نہ بچ سکے اور نباہ کی کوئی صورت نہ رہ جائے تو نہایت ناگواری سے شریعت علیحدگی اور طلاق کی اجازت دیتی ہے: ”**ابغض الحلال الی اللہ الطلاق**“ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین حلال چیز طلاق ہے، جن عورتوں کو طلاق دی جائے قرآن عظیم سے ان کی چار قسمیں ظاہر ہوتی ہیں، کیوں کہ ایسی عورت دو حال سے خالی نہیں، شوہر سے اس کا ملاپ ہو چکا ہے یا نہیں، جس کا ملاپ نہیں ہوا اس کی بھی دو قسمیں ہیں: نکاح کے وقت مہر مقرر ہوا یا نہیں، اور جس کا ملاپ ہوا اس کی بھی دو قسمیں ہیں: نکاح کے وقت مہر مقرر ہوا یا نہیں، اور جس کا ملاپ ہوا، اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ملاپ کے نتیجے میں حاملہ ہوئی یا نہیں۔

(۱) جس کا مہر مقرر ہوا ہو اور ملاپ بھی نہ ہوا ہو ایسی عورت کی کوئی عدت نہیں اور شوہر اس کو طلاق دے تو صرف متعہ دے گا۔ **{سورۃ بقرۃ:۲۳۶}**

”لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ متعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ متاعاً بالمعروف حقا علی المحسنین“۔

تم پر کوئی حرج نہیں اگر تم ان عورتوں کو طلاق دو جن سے ملاپ نہ ہوا ہو اور جن کا مہر بھی نہ مقرر کیا ہو انھیں متعہ دو کشادہ دست پر ان کی وسعت بھر اور تنگ دست پر ان کی وسعت بھر، یہ نیکو کاروں پر واجب ہے۔

(۲) وہ عورت جس کا مہر مقرر ہو مگر ملاپ نہ ہوا ہو اس کے لئے بھی کوئی عدت نہیں

،اورشوہر طلاق دے تو عورت کو مہر مقرر کا آدھا دے گا۔{سورہ بقرہ، آیۃ:۲۳۷}

﴿وَ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ﴾(البقرۃ:۲۳۷)

اور اگر عورت کو ملاپ سے پہلے ہی طلاق دے دی اور مہر مقرر ہو چکا تھا تو نصف مہر دینا ہوگا۔

(۳) وہ عورت جس کا ملاپ ہو چکا ہو مگر حاملہ نہ ہوئی ہو، اس کی عدت حائضہ ہو تو تین حیض اور آئسہ یا صغیرہ ہو تو تین ماہ اور شوہر طلاق کے بعد عدت تک کا خرچہ دے گا۔{ سورہ بقرہ:۲۴۱}

﴿وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتٰعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ﴾ (البقرۃ:۲۴۱)

اور طلاق شدہ عورتوں کے لیے متعہ ہے، یہ مسلمانوں پر واجب ہے۔

(۴) وہ عورت جو حاملہ ہو چکی ہو شوہر اسے طلاق دے دے تو اس کی عدت وضع حمل ہے اور پوری عدت تک خرچہ شوہر کے ذمہ ہے۔{سورۃ طلاق:٦}

﴿اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَ لَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ وَ اِنۡ كُنَّ اُولٰتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ﴾(الطلاق:٦)

مطلقہ عورتوں کو عدت میں جہاں تم رہتے ہو وہیں رکھو، اپنی طاقت کے حساب سے، انہیں ضرر نہ دو کہ ان پر تنگی کرو اور اگر وہ عورت حمل سے ہو تو وضع حمل تک ان کا نفقہ دو۔

اس چارٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان عورتوں کی عدتوں میں بھی فرق ہے اور طلاق کے بعد ان کے مطالبات اور حقوق بھی جدا جدا ہیں، سب کے لئے کوئی مشترکہ مطالبہ نہیں۔

دوسری اور چوتھی قسم کی عورتوں کے لئے تو قرآن نے علی الترتیب نصف مہر اور تا وضع حمل کا گزارہ مقرر فرمایا، البتہ پہلی اور تیسری قسم کیلئے لفظ متاع آیا ہے، یہ متاع کیا ہے

؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے تو عربی لغات کی مندرجہ ذیل کتابوں میں اس کے معنیٰ برتنے ،فائدہ اٹھانے کی چیز ہے۔{مصباح اللغات ص، ۸۰۳، ۸۰۴ ۔منجد اردو،ص ۹۴۵ ۔قاموس ص 509 ۔صراح ۳۳۸۔جمہرۃ اللغۃ، ج ۲۔ص 22 ۔المفردات: ص ۴۶۱}

بعض ائمہ لغت اس میں قلیل ہونے کی قید بھی لگاتے ہیں، اور بعض یہ قید بھی لگاتے ہیں کہ سونے چاندی کے علاوہ ہو اتنے پر سب کا اتفاق ہے کہ متاع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اس متاع کی مقدار کیا ہوگی اسے متعین کرنے کے لیے ہمیں کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں، پیغمبر خدصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآنی آیت سورہ بقرہ: ۲۳۶ اور سورہ بقرہ: ۲۴۱ دونوں کے لفظ متاع کی تشریح فرمادی ہے۔

پہلی آیت کے لفظ متاع پر آپ کی حدیث مندرج بخاری شریف جلد دوم صفحہ ۷۹۰ سے روشنی پڑتی ہے۔

”عن سهل و ابي اسيد قال: تزوج النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم اميمة بنت شراحيل ،فلما ادخلت عليه بسط يده اليها، فكانها كرهت ذلك، فأمر أبا أسيد أن يجهزها ويكسوها ثوبين رازقيين“ ۔{اول کتاب الطلاق}

سہل بن سعد اور ابو اسید بیان کرتے ہیں کہ حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** نے امیمہ بنت اسید سے شادی کی جب وہ آپ کے پاس لائی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا تو امیمہ نے اس کو ناپسند کیا آپ نے ابو اسید سے فرمایا انہیں ایک ریشمی جوڑا دے دو اور انہیں ان کے میکے بھیج دو۔

اور دوسری آیت کے لفظ متاع پر پیغمبر خدا **صلی اللہ تعالی علیہ وسلم** کی حدیث سے روشنی پڑتی ہے جو مسلم شریف جلد اول، ص ۴۸۵ میں ہے۔

”قال عمر رضي الله عنه لا نترك كتاب اللّٰه وسنة نبينا صلى اللّٰه عليه وسلم بقول امراة لا ندري لعلها حفظت او نسيت لها النفقه و الكسوة“ ۔

حضرت عمر **رضی اللہ عنہ** نے فرمایا ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کو

ایک عورت کے قول کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے ،ہمیں معلوم نہیں کہ وہ بھولی یا اس نے یاد رکھا (مطلقہ ثلاثہ) کے لیے نفقہ اور سکنی دونوں ہیں۔

مطلقہ عورتوں کے حقوق اور مطالبات کا یہ صاف اور ستھرا اور تفصیلی بیان قرآن وحدیث کے ارشادات کے مطابق ہوا جس میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ نہ تو موت تک گزارے کا کوئی ذکر ہے نہ دوسرے نکاح تک خرچ کی کوئی گنجائش ہے،اس لیے قرآن کی آیت میں ایسی گنجائش تلاش کرنا جرأت بیجا کے سوا کچھ نہیں۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، بہت سے ایسے لوگ جو دوسرے علوم وفنون میں چاہے کتنی ہی مہارت کیوں نہ ہو چکی ہو اسلام کے مزاج اور شریعت محمدی کی روح سے نا آشنا ہیں وہ سوچتے ہیں کہ ان مسائل کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہے اس لیے اس سلسلہ میں آج تک مسلمان علما وفقہا کا کیا فیصلہ رہا اس سے کچھ بحث نہ ہونا چاہیے، انھوں نے جو کیا اپنے ماحول اور سماج کے لحاظ سے ٹھیک ہی کیا،آج جب زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں تو ان معاشرتی مسائل میں ترمیم واصلاح کر لینے میں کیا حرج ہے اور دین اسلام کا اس میں کیا نقصان ہے؟ وہ بے چارے یہ سمجھتے ہیں کہ دین اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح صرف چند عبارتی رسوم کا مجموعہ ہے اور بس بقیہ معاشی و معاشرتی معاملات یا دیگر شعبہ زندگی میں ہم آزاد ہیں۔

وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دوسری قومیں حالت کے موافق اپنے سماجی قوانین میں برابر ردوبدل کرتی رہتی ہیں جیسے ہندو سماج میں طلاق کا تصور نہیں تھا لیکن ہندو کوڈ بل نے اب میاں بیوی دونوں کو طلاق کا حق دیا۔

ہندو سماج میں لڑکیوں کا حق باپ کی جائیداد میں نہیں ہوتا لیکن قانون نے انہیں لڑکوں کے برابر حق دیا، یہاں کا پورا معاشرہ چھوت چھات میں غرق تھا لیکن اب یہ قانوناً جرم ہے،رواجاً جہیز اور تلک کے بغیر شادی نہیں ہوسکتی تھی لیکن اب اس کے خلاف قانون بنا دیا گیا ہے،ان کا خیال ہے کہ یہی روش اسلامی سماجی قوانین کے بارے میں کیوں نہ اختیار کی جائے

اوراس میں مذہبی اعتبار سے کیا خرابی ہے؟

لیکن یہ حضرات ایک بہت بڑی بھول میں مبتلا ہیں، اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق نہیں، زندگی کے تمام شعبوں میں جن جن مسائل کے بارے میں اللہ و رسول کے صاف اورصریح احکام موجود ہیں ان کے خلاف فیصلہ یا عمل درآمد کا کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا ،اوراللہ ورسول **جل جلاله** ،**وصلی اللہ علیه وسلم** کے علاوہ کائنات میں کسی کو بھی ان میں مداخلت کا یارانہیں ہوسکتا۔

قرآن عظیم میں ہے:

"**إن الحکم إلالله**"۔حکم صرف خداہی کے لیے ہے۔

مسلمانوں کو عام حکم ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾(المومنون:۵۱)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤاور شیطان کے نشان قدم کی پیروی نہ کرو یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

واضح ہو کہ یہ تنبیہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کے صرف اونٹ کا گوشت چھوڑ دینے پر اتری تھی۔

اللہ رب العزت قرآن مقدس میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷)

اللہ کے رسول تم کو جو حکم دیں اس کو مضبوطی سے تھام لواور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

الغرض اسلام میں اللہ ورسول کے حکم کے خلاف کسی معاملے میں بھی زمانہ کے ساتھ سازگاری کا کوئی تصور نہیں ہے، اوراسی نقطہ کی طرف ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے:

حدیث بے خبرانست بازمانہ بساز
زمانہ باتو نسازد توبازمانہ ستیز

یہ انجانوں کی کہاوت ہے کہ تم زمانہ کے ساتھ چلو، زمانہ اگر تمہارے موافق نہ ہوتو حق کے لیے تم زمانہ سے جنگ اختیار کرو۔

اس لیے ایسے حضرات سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ خدارا آپ اپنے کو اسلام کے موافق بدل سکتے ہوتو بدلیے، اسلام کو اپنے موافق بدلنے کی ہرگز کوشش نہ کیجیے یہ امر مسلمان قوم برداشت نہیں کرسکتی۔

یہاں تک پہنچ کر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی تاریخ پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے، ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں اس قسم کا کوئی سوال نہیں اٹھ سکتا تھا کہ فی الجملہ اسلامی قوانین ہی تمام عدالتوں میں جاری وساری تھے اور کبھی کچھ ہوا تو وقت کے علما وصلحا نے اس کا تدارک بھی کرا لیا، اور انگریزوں نے بھی ایسے مسائل میں مداخلت اصول جہاں بانی کے خلاف سمجھا بلکہ ۱۹۸۹ء میں تعزیرات ہند میں بھی حصہ ۴۸۸-۳ کے ذریعہ نان ونفقہ نہ دینے والے شوہر کے خلاف چارہ جوئی میں بھی بیوی کی بات اسلامی شرع کے موافق رہی۔

البتہ آزادی کے بعد ۱۹۷۳ء میں اس دفعہ میں تجدید کی ضرورت محسوس ہوئی اور قانون ۴۸۸-۳ میں ترمیمات کی گئیں، اور دفعہ ۱۲۵ بنی، جس کا عنوان ہے ''بیویوں، بچوں اور والدین کے نان ونفقہ کا حکم''۔

اسی دفعہ میں بیوی کی تعریف یہ ہوئی: لفظ بیوی اس عورت کو شامل ہے جس کے شوہر کے ذریعہ طلاق دی گئی ہو، یا اس نے شوہر سے طلاق لی ہو اور اس نے نکاح ثانی نہ کیا ہو۔

اس ترمیم کی مسلمانوں نے اس وقت شدید مخالفت کی کہ یہ بیوی کے اسلامی تصور کے خلاف ہے۔

کیوں کہ اس دفعہ کے ذریعہ مسلمانوں کو بھی تا نکاح ثانی نفقہ دینا پڑے گا جب کہ

اسلامی قوانین کے تحت ایک شوہر اپنی مطلقہ بیوی کو صرف عدت کے دوران نان ونفقہ دینے کا پابند ہے۔

اہل اسلام کے شدید احتجاج کے نتیجہ میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور دفعہ ۱۲۷ جز ۳/جزb کے ذریعہ یہ ترمیم شامل کی گئی، جب کہ کوئی حکم زیر دفعہ ۱۲۵ ایسی عورت کے حق میں ہو جس کو شوہر نے طلاق دی ہو یا جس نے شوہر سے طلاق لی ہو تو مجسٹریٹ اگر مطمئن ہو تو یہ کرے گا۔

عورت کو شوہر کے ذریعہ طلاق دی گئی اور مذکورہ بالا حکم [۳] سے پہلے یا بعد عورت نے وہ ساری رقم وصول کر لی جو کسی ایسے دستور یا پرسنل لا کے تحت تھی جو فریقین کے لیے قابل قبول تھا اور ایسی طلاق کے وقت قابل ادائی تھا، تو مجسٹریٹ ایسے حکم کو مندرجہ ذیل صورتوں میں منسوخ کر سکتا ہے۔

{الف} ایسی حالت میں جہاں مذکورہ حکم سے قبل ایسی رقم ادا کر دی گئی یعنی اس تاریخ سے پہلے کہ جس تاریخ کو یہ حکم دیا گیا۔

{ب} کسی دوسرے معاملہ میں (یعنی) ایسے معاملہ میں کہ جس میں شوہر نے واقعةً نان ونفقہ کی رقم ادا کر دی ہو تو مدت ختم ہونے کی تاریخ سے مجسٹریٹ ایسے حکم منسوخ کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل میں ایک بات بہت صاف اور واضح ہے کہ دفعہ ۱۲۷ کا حکم جز[۳] جزb کی صورت میں منسوخ ہوگا، اب اگر کوئی اس صورت میں بھی دفعہ ۱۲۵ کو ہی نافذ مانے تو وہ پارلیمنٹ کے ذریعہ نافذ دفعہ ۱۲۷ کو رد کر رہا ہے، اس کو خوب یاد رکھنا چاہیے کیوں کہ مقدمہ شاہ بانو بنام محمد احمد میں یہی ہوا۔

چنانچہ بہت سے مقدمات میں اسی بنیاد پر فیصلہ ہوا اور عدت کے بعد والے نفقہ کو واپس کرنا پڑا، ادھر شاہ بانو کے مشہور کیس میں سپریم کورٹ کی بنچ نے پھر دفعہ ۱۲۵ کے ماتحت ایک مسلم شوہر پر تا نکاح ثانی یا موت نان ونفقہ کی پابندی لازم کر دی جس سے صورتحال بے حد ہیجانی ہوگئی۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے:

{۱} دفعہ ۱۲۵ میں بیوی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ عام ہے چاہے مسلمان عورت ہو چاہے غیر مسلم، اس لئے مسلمان مطلقہ بھی بیوی کی تعریف میں آتی ہے اور اس دفعہ کے مطابق نان ونفقہ پانے کی مستحق ہے۔

{۲} اس دلیل پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ یہ دفعہ مسلم پرسنل لا کے خلاف ہے تو یہ سپریم کورٹ کہتی ہے کہ تعزیرات ہند اور مسلم پرسنل لا میں تعارض ہو تو تعزیرات ہند قانون پرسنل لا کو رد کرسکتا ہے۔

{۳} سپریم کورٹ کا یہ استدلال بھی ہے کہ مسلم پرسنل لا اور دفعہ ۱۲۵ میں کوئی تعارض نہیں، کیوں کہ مسلم پرسنل لا مطلقہ عورت کی عدت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ڈالتا ہے تو عدت کے بعد کے وقت کے لئے یہ خاموش ہے، اور دفعہ ۱۲۵ اس کے بعد کے لئے بھی آڈر کرتی ہے تو ان دونوں (قانون) میں کوئی تعارض نہیں۔

بلکہ سپریم کورٹ نے ترقی کر کے یہ دعویٰ کیا کہ مسلم پرسنل لا کی اصل قرآن ہے، اور اس کی آیت "**وللمطلقٰت متاع بالمعروف**" سے تا زندگی یا دوسری شادی تک نان و نفقہ کا اشارہ ملتا ہے، (تو گویا دفعہ ۱۲۵ قرآن عظیم کی تعبیر وتوضیح ہے)

{۴} مقدمہ شاہ بانو بنام محمد احمد میں شوہر نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ دفعہ ۱۲۷ جزb کے تحت میں نے طلاق کے وقت واجب الادا مہر کی رقم دے دی تھی اور دفعہ ۱۲۷ کا یہی مفاد ہے کہ طلاق کے وقت قابل ادا رقم دے دی جائے تو دفعہ ۱۲۵ کا حکم منسوخ کردیا جائے گا، سپریم کورٹ کہتی ہے مہر کی رقم نکاح کے احترام میں واجب ہوئی ہے اس لیے اس کو وہ رقم قرار نہیں دے سکتے جو طلاق کے وقت واجب الادا ہو، اس لیے مہر ادا کرنے سے دفعہ ۱۲۵ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس مقام پر پہنچ کر ان دلائل کا جائزہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

{۱} دفعہ ۱۲۵ میں بیوی کی تعریف میں جو وسعت پیدا کی گئی ہے اس کا نام ونشان

تک مسلم پرسنل لا کے ماخذ قرآن وحدیث میں کہیں نہیں ملتا، بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے عدت کے ایام گزر جانے کے بعد مطلقہ عورت ایسی اجنبیہ ہو جاتی ہے کہ اگر اس کا شوہر سابق اپنے طور سے بیوی ہونے کا اطلاق کرے تو شریعت کی رو سے اپنے حدود سے تجاوز کے جرم کا مرتکب ہوگا، اور خود ایک مسلمان عورت اور جو اسلامی شعور و ادراک رکھتی ہو وہ قطعاً گوارہ نہیں کر سکتی کہ طلاق اور انقطاع کلی کے بعد اس کا شوہر سابق اپنی بیوی قرار دے۔

بیوی کا یہ وسیع تر مفہوم اس لیے اختراع کیا گیا ہے کہ اس سے مطلقہ عورت استحقاق مالی کے سلسلے میں اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے میں قانون کا سہارا لے سکے اور اس سے اپنی گزر بسر کے لیے شوہر سابق کو عدالت کے کٹھرے میں کھڑا کر کے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ محسوس کرے، گویا انصاف کا تقاضا پورا کرنے کا اس طرح انتظام کیا گیا ہے، لیکن بیوی کا یہ مفہوم وضع کرتے وقت مسلم پرسنل لا کی آئینی حیثیت کا لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا نہ ہی مسلمانان ہند کے احساسات وجذبات کو خاطر میں لایا گیا، تعزیرات ہند کی اس دفعہ کو اس کی کی عمومی حالت میں چھوڑ کر عدالتوں کے ذریعے اسلام کے سماجی مسئلہ میں مداخلت کا موقع فراہم کیا گیا، عدالت عالیہ کے ججوں کی ذمہ داری تھی کہ اپنے فیصلے کی اساس صرف مسلم پرسنل لا کو تسلیم کرتے اور ایسی مشکل ترین اور سنگین صورتحال میں اپنے ذہن وفکر کو مخصوص حالات کا پابند نہ بناتے، مگر یہاں یہ المیہ ہوا کہ ہمارے فاضل ججوں نے آئین کے حدود سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس دفعہ کا اطلاق اس کی عمومی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر مسلمان مطلقہ عورت پر بھی ہونے کا فیصلہ صادر کیا، اس کے بعد توجیہہ وتاویل کے ایسے چکر میں گرفتار ہو گئے کہ انہوں نے اسلامی قوانین کو اپنے فکری عمل کے گرفت میں لینے کی لایعنی کوشش کی جو کسی طرح ان کے لئے مناسب وزیبا نہیں تھی، اور اگر اپنی فکری کاوشوں کا دائرہ وسیع کرنا ہی چاہتے تھے تو ان کو اس حساس مسئلہ میں محض اپنی تجدّد پسندی یا عورتوں کے حال زار کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہیے تھا بلکہ اس سلسلے میں اسلام کے ان اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے تھا جو مطلقہ عورت کی حیثیت سے متعین کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں مثلاً:

{الف} طلاق کا نفاذ جب کامل طور پر ہوگیا تو گو کہ عورت و مرد رشتۂ ازدواج میں پچاس سال تک منسلک رہے ہوں لیکن ایک دوسرے کا کوئی تعلق اب برقرار نہیں رہتا کہ ایک کا حق دوسرے کی ذات کے ساتھ وابستہ رہے۔

{ب} رشتۂ نکاح میں منسلک رہتے ہوئے مسلمان عورت اپنے فرائض زوجیت ادا کرنے کی صورت میں نان ونفقہ پانے کی حقدار ہوتی ہے لیکن اگر اس کی جانب سے نشوز و نافرمانی ایسی پائی جائے جو اسلامی ضابطے کی رو سے جرم کا درجہ رکھتی ہو، یا وظیفۂ زوجیت کی راہ میں قصداً بلا عذر کوئی رکاوٹ پیدا کرتی ہو تو ایسی صورت میں بیوی ہوتے ہوئے نان ونفقہ کا حق دار نہیں ہوتی۔

{ج} مطلقہ عورت کی کفالت کی ذمہ داری اس کے سابق شوہر پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اپنے مستقل جائیداد سے یا تو گزر بسر کرے گی یا اس کے اقربا اس کی کفالت کے ذمہ دار ہیں، ان کے بعد سماج پر اس کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

{د} طلاق کے بعد عورت مکمل طور پر آزاد و خود مختار ہو جاتی ہے، اس کے اوپر شوہر سابق یا اس کے اولیاے شرعی کی جانب سے کوئی بندش عائد نہیں کی جاسکتی، مکمل خود مختاری کی صورت میں مرد کا احتباس عورت کے اوپر سے ختم ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نان ونفقہ کے پانے کے حقدار تھی۔

جب اسلامی شریعت میں ایسے قوانین پائے جاتے ہیں جن سے مطلقہ عورت کی شرعی حیثیت قانونی طور پر بالکل واضح ہو جاتی ہے تو بیوی کی تعریف میں محض وسعت پیدا کر دینے سے اس میں مسلمان مطلقہ عورت کیسے شامل ہوسکتی ہے؟

اب اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ بیوی کا مفہوم جو دفعہ ۱۲۵ میں مذکور ہے اس میں مسلمان عورتیں بھی شامل ہیں تو کیسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ طلاق اور ایام عدت کے گزر جانے کے بعد استحقاق مال کا دعویٰ کرسکتی ہے، جب کہ اس کی راہ میں اسلام کے دوسرے قوانین رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، اس کا جواب فاضل ججوں کی طرف سے یہ دینا

کہ تعزیرات ہند کو اسلامی قوانین پر بالادستی حاصل ہوگی ایک مسلمان مرد یا عورت بحیثیت مسلمان اس کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے۔

(۲)اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہوا کہ وہ قوانین اسلام جن کا نفاذ مسلمان اپنے اوپر چاہتا ہے ان کے بجائے تعزیرات ہند کی بالادستی تسلیم کرے اور اس کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہ ہو۔

ہندوستانی جمہوریت کی اتنی بڑی اکثریت کو ان کی مرضی کے خلاف ان کے سماجی و معاشرتی معاملات میں مداخلت کر کے مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے شرعی احکام کے مطابق اپنی زندگی کے مسائل کو حل نہ کریں، کیوں کہ جبراً ان پر ایسا قانون مسلط کیا گیا ہے جو خود ان کے مذہب کے سماجی اصولوں کے خلاف ہے، اس سے تو یہ ثابت ہورہا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے نے مسلمان کو عملی جدوجہد کی دعوت دی ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بحالی کے لیے معرکہ آرائی شروع کردیں، کیوں کہ قوموں اور جماعتوں کی خواہش ومرضی کے خلاف جب کوئی فیصلہ مسلط کیا جاتا ہے تو اس سے جذبات میں اشتعال پیدا ہوجانا لازمی امر ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مسلمانوں میں اضطراب و بے چینی کی لہر پائی جاتی ہے، جس کی ذمہ داری فاضل ججوں سے زیادہ حکومت پر عائد ہوتی ہے، اور مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا دروازہ کھول دیا گیا ہے، اور اسلامی حقوق سے محروم کرنے کی تدبیر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جاری ہے، اور یہ احساس دن بدن بڑھتا جاتا ہے، اگر اس کے بارے میں تغافل وتساہل سے کام لیا گیا تو اسلام کے معاشرتی نظام وعائلی قوانین کو اس دور جمہوریت میں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا جائے گا، اس لئے اب مسلمانوں کے سامنے دو راستے رہ گئے ہیں کہ وہ یا تو تعزیراتِ ہند کو من وعن تسلیم کرلیں جس کی بالادستی کی سند جمہوریہ ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت کے ججوں نے دے دی ہے، اور اسی کے مطابق نان ونفقہ، وراثت وہبہ کے مسائل حل کریں، تجدد پسندوں کی طرح اسلامی قوانین کو فرسودہ نظام کی یادگار تصور کریں یا پھر کامل

جدو جہد اور پر امن تحریک جاری رکھیں، اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک کہ اس مداخلت کے دروازے کو بند کرنے کا کامل انتظام ایوان قانون ساز سے حاصل نہ کر لیں۔

(۳) آیت کریمہ "**وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین**" سے نکاح ثانی یا حین حیات نفقہ کا ثبوت وہی فراہم کرے گا جس کو قرآن حکیم کے بیان کردہ احکام کا کوئی علم و بصیرت حاصل نہ ہو، اس آیت میں صراحتاً یا ضمناً یا اشارۃً کسی طرح مذکور نہیں کہ مطلقہ عورت کو تا حیات یا تا نکاح ثانی نفقہ دینا ضروری ہے، کوئی بڑے سے بڑا دانشور یا ماہر قوانین یا عربی زبان و ادب کا عالم اس بات کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا کہ میں اس کو ثابت کر سکتا ہوں، جو بات زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی نفع رسانی کی چیز تمام مطلقہ عورت کے لئے مردوں پر دینا لازم ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکیں، اس کی تحدید نکاح ثانی یا موت تک دراز کرنا سراسر سفسطہ و مغالطہ آرائی ہے جسے شیطانی وسوسہ یا خواہش نفس کی بنا پر گڑھا جا سکتا ہے، یہ قرآن حکیم کے مفہوم کی ایسی تعبیر ہے جس کو شریعت اسلام کے احکام کا طالب علم سن کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیں کہ اس آیت کریمہ سے تمام مطلقہ عورتوں کے لیے تا حیات نفقہ دینا ضروری ہے تو قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ سے تعارض لازم آئے گا، جس میں صراحتاً مطلقہ حاملہ کے لئے وضع حمل تک نفقہ واجب کیا گیا ہے، جب تمام مطلقہ عورتوں کے لئے زندگی بھر نفقہ دینا قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کا مفہوم ہے اور یہ ان کا قانونی حق ہے تو اس حق سے حاملہ عورت کو کیوں محروم رکھا جائے گا، کیا اس لیے کہ اس کے بطن سے ایسے بچے کی ولادت ہوئی جو شوہر سابق کا نسبی بچہ قرار پاتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان بچہ صلہ رحمی و حسن وسلوک، باہمی مروت و الفت کا سبب ہوتا ہے، اس صورت میں بدسلوکی بلکہ ظالمانہ برتاؤ کا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے، کیا دنیا کا کوئی انسان جس کو عقل و شعور سے ذرہ برابر تعلق ہوگا اس بوالعجبی کی کوئی معقول وجہ بیان کرنے کے لیے آمادہ ہو سکتا ہے، کیا عقل انسانی باور کر سکتی ہے کہ اگر عورت کو طلاق دے دی جائے اور اس کے بعد اس کے بطن سے بچے کی ولادت نہ ہوئی ہو تو زندگی بھر اپنے شوہر سے قانوناً نفقہ وصول کرتی رہے، اور اگر اس کے شکم سے بچہ

پیدا ہوا ہوتو قانون کا ہاتھ اتنا مجبور ہو جائے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی وہ نفقہ کا حقدار نہ رہ جائے اس بچہ کی پیدائش سے ایسی کیا خطا سرزد ہوگئی جو اس کی محرومی کا باعث بن گئی۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی زیر بحث آیت کریمہ سے تمام قسم کی مطلقہ عورتوں کے لیے تاحیات نفقہ ثابت ہو رہا ہے اور حاملہ مطلقہ کہ وضع حمل سے جو محروم ہو رہی ہے اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ وضع حمل تک نفقہ دینا لازم کیا گیا ہے اور بعد وضع حمل کے لیے یہ آیت خاموش ہے اور اس پر اضافہ آیت کریمہ "**وللمطلقات متاع بالمعروف**" **الخ** سے کیا جاسکتا ہے، یہ تاویل وتشریح عقل وخرد سے بیگانگی کی دلیل ہوگی، اس سلسلہ میں یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ وضع حمل کی تحدید بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گی، حد بندی تو اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کے آگے کا حکم کوئی دوسرا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اگر **متاع بالمعروف** سے تمام عورتوں کے لئے نفقہ تاحیات فرض کرلیا جائے تو وضع حمل والی آیت سے اس کا کھلا ہوا تعارض ہوگا۔

پھر یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ وہ عورت جو عقد مناکحت کے بعد اپنے شوہر کے قریب نہ گئی ہو تو اس کے لیے قرآن حکیم کا شرعی حکم ہے کہ اگر اس کا مہر مقرر ہوا ہو تو نصف مہر پائے گی، اور اس کے سوا اس کو کچھ نہ ملے گا، اور اگر اس کا مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو اس کو صرف متعہ ملے گا، ان دونوں قسم کی عورتوں کا صریح حکم جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں قرآن حکیم میں موجود ہے، اب اگر ان عورتوں کے لیے نفقہ تاحیات لازم کر دیا جائے جیسا کہ آیت زیر بحث کا مفاد بتایا جارہا ہے تو اس آیت کریمہ اور ان آیات میں جن میں ان دونوں قسم کی عورتوں کا حکم بیان کر دیا گیا ہے سخت تعارض لازم آئے گا، پھر کیا عقل ومنطق گوارہ کرسکتی ہے کہ ایسی عورت جس کے ساتھ اس کے شوہر نے کسی قسم کا کوئی تعلق برقرار نہیں رکھا حتیٰ کہ خلوت میں اس کو دیکھ بھی نہ سکا تاہم اس کے طلاق کے بعد اس کے شوہر کے ذمہ لازم ہو گیا کہ اس کو نفقہ کی رقم زندگی بھر ادا کرتا رہے بشرطے کہ وہ دوسرا نکاح نہ کرے، اور اگر اس کی ادائیگی میں کوتاہی کے جرم کا مرتکب پایا جائے تو اس کو جیل کی کوٹھڑی میں بند کر دیا

جائے، کیا کوئی عقل مند آدمی عدل وانصاف کے نام پر ایسا قانون بنا سکتا ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ ''**للمطلقٰت**'' سے مراد تمام مطلقہ عورتیں نہیں ہو سکتیں یا لفظ **متاع** سے مقصود تاحیات نفقہ نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے علمائے سلف اور خلف میں سے کسی نے اسلام کے عہد زریں سے لے کر اب تک آیت کا وہ مفہوم نہیں بتایا جو ہماری عدالت عالیہ کے ججوں نے اپنی طرف سے کھینچ تان کر کے ترجمہ کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، بعض مفسرین کرام نے ''**متاع**'' کے لفظ سے عدت کے ایام کا نفقہ مراد لیا ہے، اس صورت میں تمام آیتوں میں کوئی تعارض نہیں لازم آئے گا، اور اسی سے یہ ثابت ہوا کہ عدت گزاری کے ایام میں جو نفقہ دیا جاتا ہے دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں مطلقہ عورت گویا اپنے شوہر سابق کے احتباس میں رہتی ہے اور یہی وہ عقلی ومنطقی بنیاد ہے جس کی بنا پر نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد کی جا سکتی ہے، چنانچہ وہ عورت جو مطلقہ ہوتے ہوئے عدت میں نہیں رہتی شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ شریعت اسلام نے لازم نہیں کیا، اور بعض مفسرین کرام نے لفظ ''**متاع**'' سے یہ مراد لیا ہے کہ مفارقت اور انقطاع کلی کے بعد شوہر کے ذمہ لازم ہے کہ اپنی مطلقہ بیوی کو کچھ فائدے کا سامان ادا کرے، اور حنفی مکتب فکر کے مفسرین کرام نے اس کو مستحسن گردانا ہے، ''**حقاً**'' کے لفظ سے وجوب کا معنیٰ مراد نہیں لیتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ **حقاً** کا لفظ عربی زبان وادب میں کبھی ایسے موقع پر بھی بولا جاتا ہے جہاں وجوب ولزوم نہیں ہوتا ہے استحسان واستحباب مقصود ہوتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کے اردو ترجموں کو دیکھ کر اس آیت کریمہ سے تاحیات جو نفقہ سمجھا گیا وہ سرتاسر غلط ہے، یہ ایسی غلطی ہے جس کے دوررس نتائج آپ کے سامنے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ججوں نے پہلے سے اپنے ذہن میں ایک نظریہ قائم کر لیا تھا اور اسی کے مطابق اپنے ذہن وفکر کو اس راہ پر لگائے رہے کہ اسلامی قانون کی تشریح اپنے نظریہ کے مطابق کریں حالاں کہ عدالتوں کے ججوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط نہ کریں، بلکہ نہایت صاف ذہن اور غیر جانبدار ہو کر حقائق کا سامنا کریں۔

کسب حلال کے فضائل

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگوں کو اس کی پرواہ نہ ہوگی کہ مال حلال ذریعہ سے حاصل ہورہا ہے یا حرام ذریعہ سے، آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہے، کیوں کہ اس دور میں حلال وحرام کمائی کے درمیان فرق وامتیاز لوگوں کے دلوں سے مٹتا جارہا ہے، خشیت الٰہی کے زوال اور عقیدۂ آخرت میں ضعف وانحطاط کے باعث اسباب معیشت کی فراوانی کے دور میں جائز وناجائز کے فرق میں بڑا خسارہ تصور کیا جارہا ہے، بلکہ یہ سوچا جاتا ہے کہ اس دنیا میں وہ بڑا بے وقوف ہے جو اپنی کمائی کے دائرۂ کار میں دولت کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کرتا، دنیوی زندگی کی ظاہری چمک ودمک کو سب کچھ تصور کرلیا گیا ہے، حیات اخروی میں محاسبہ یا مکافات عمل کے قانون کا اب کوئی خوف باقی نہیں رہ گیا ہے، انسان کی مثال اس دور میں چوپائے جیسی ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں چرتا ہے اور اس کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان ہری بھری گھاسوں میں جو بظاہر بڑی خوش نما نظر آتی ہیں ایسی زہریلی گھاس بھی پائی جاتی ہے جو اس کی ہلاکت کا باعث ہوسکتی ہے، ٹھیک اسی طرح اس دور کا انسان بھی عقل وشعور سے بیگانہ ہوکر دولت وثروت کی بہتات کی خاطر کسب حلال وحرام میں کوئی امتیاز نہیں کرپاتا، حصول زر کا تصور ذہنوں پر ایسا چھا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کسب حلال کے فائدے نظر نہیں آتے، نہ ہی حرام کمائی کی ہلاکت خیزیاں دکھائی پڑتی ہیں۔

اس دنیائے ناپائیدار میں خدا کے وہ نیک بندے جو انسان کی ہدایت کے کام پر مامور تھے ان سب کی تعلیمات کا خلاصہ دو لفظوں میں صرف یہ تھا کہ پاک وطیب چیز کھاؤ اور عمل صالح بجالاؤ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسلم شریف میں سرکار دوعالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ اللہ طیب ہے اور پاک ہی چیز قبول فرماتا ہے، مسلمانوں کو انھیں چیزوں کے کمانے کا حکم دیا ہے جن کا حکم پیغمبروں کو دیا تھا، اللہ تعالی فرماتا ہے:

"یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا" اور یہ بھی فرمایا: "یا ایھا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقنا کم"۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ فرمایا جو عبادت الہٰی میں پراگندہ بال، غبار آلود، طویل سفر کرتا ہے اور ہاتھوں کو آسمان کی طرف دراز کرتا ہے اور کہتا ہے اے رب اے رب! دراں حالیکہ اس کا کھانا پینا اور ستر پوشی کا لباس سب کچھ حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی پرورش ہوئی ہے، پھر کہاں اس کی دعا خدا کی بارگاہ میں مقبول ہوگی۔

پہلی آیت سورۃ المومنون کی ہے، اس میں انبیاے کرام **علیھم السلام** سے خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ پاک چیزیں کھاؤ اور عمل صالح کرو، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انبیاے کرام **علیھم السلام** کہیں ایک جگہ موجود تھے اور ان کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا، بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر چہ یہ سب خدا کے برگزیدہ بندے انسانوں کی رہبری کے واسطے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں مبعوث کیے گئے تھے مگر سبھی کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اپنے اپنے عہد میں اپنے اپنے پیروؤں کو باخبر کر دیں، یعنی دنیا کی کوئی قوم کسی زمانہ میں اس حکم الہٰی کی بجا آوری سے بری نہیں کی گئی تھی، بہت سے جزئی اور فروعی احکام میں اختلاف کے باوجود اس حکم میں شریک رہے، اس حدیث پاک سے حلال کمائی کی اہمیت اور اس کی فضیلت عیاں ہے۔

دوسری آیت کریمہ سورۂ بقرہ کی ہے، اس میں مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ جو کچھ ہم نے فراہم کیا ہے اس میں سے صرف پاک چیز کھاؤ، یعنی دنیا کی چیزیں تمہارے ہی نفع و فائدے کے لیے بنائی گئی ہیں، مگر ان میں سے صرف حلال چیز کو کمانا اور کھانا ہے، اور اس کے سوا کسی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھنا ہے، ان دونوں آیتوں کے تذکرے کے بعد ایک ایسے شخص کی حالت بیان کی گئی ہے جو اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے بڑا بے تاب رہا، اپنے

عمل خیر کا سہارا ڈھونڈ تا ہے، حج، جہاد کے لئے لمبا سفر کرتا ہے، مگر اس کی محرومیٔ قسمت کا یہ عالم ہے کہ خدائے پاک کی بارگاہ میں اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، وہ بار بار یارب یارب کہہ کر اپنے پروردگار کو پکارتا ہے، لیکن اس کی رحمت و ربوبیت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دعاؤں کی قبولیت کی جو پہلی شرط تھی اس شخص میں نہیں پائی جا رہی تھی، دعائیں تو اس وقت مقبول ہوتی ہیں جب کسب حلال کے کیمیا سے اس میں اثر پیدا کیا جائے اور اس کی پوری کمائی حرام کی تھی حرام غذا سے اس کی پرورش ہوئی تھی پھر کیسے اس کی دعا مقبول ہوتی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ کو مستجاب الدعوات بنا دیجیے، یعنی ایک ایسا آدمی بنا دیجیے جس کی دعائیں خدا کی بارگاہ میں مقبول ہوتی رہیں، آپ نے فرمایا: اے انس! حلال کماؤ تمہاری دعا قبول ہوگی، اس لئے کہ آدمی جب اپنے منہ کی طرف حرام لقمہ لے جاتا ہے تو اس کی دعا چالیس دن تک مقبول نہیں ہوتی۔

حرام کمائی کے اثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ کی بارگاہ میں مبغوض ہو جاتا ہے اور اس کی طرف اس کی رحمت متوجہ نہیں ہوتی، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ: حضرت جابر سے مروی ہے آپ نے فرمایا ایسا گوشت جو حرام سے بڑھا ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا ، ہر ایسا گوشت جو حرام سے پیدا ہوا ہو اس کے لیے جہنم کی آگ ہی بہتر ہے، اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی سے آدمی غضب الٰہی کا مورد ہو کر جہنم کے عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے کیوں کہ حرام کمائی سے اللہ کے حقوق یا بندوں کے حقوق کو انسان تلف کر دیتا ہے اور ایسا عصیاں کار ہو جاتا ہے جس کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔

❁❁

جسمانی معراج کا شرعی ثبوت

ایک بلند پایہ فلسفی اور طفل شیر خوار کی عقل میں جو تناسب ہوتا ہے اس سے ہزاروں گنا فروتر نسبت پیغمبر اور ارباب دانش کی عقل و شعور میں ہوتی ہے، پیغمبر کی قوت فراست کی پہنچ وہاں تک ہوتی ہے جہاں تک مدعیان علم و دانش کے تخیل کی پرواز نہیں ہوسکتی، وہ اس عالم رنگ و بو میں بیٹھے بیٹھے عالم بالا کے کل و جز کو دیکھتا اور سمجھتا ہے، اس کے سامنے دنیا کا عظیم انسان طفل نادان سے کمتر ہوتا ہے۔

اس لیے انبیاے کرام **علیہم السلام** کی معراج کے مناظر، ان کے دیکھے ہوئے عجائب اگر فہم انسانی سے ورا ہوں تو ان میں عام انسانوں کے لیے تعجب کی بات ضرور ہے، انکار کی گنجائش نہیں، جو اس وادی کا راہ رو نہ ہو اس کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ **علیہ السلام** نے سیر ملکوت سماوات کیوں کر فرمائی، موسیٰ کلیم اللہ **علیہ السلام** نے طور سینا پر جلوہاے ربانی کیسے دیکھے اور کیوں کر تاب نظارہ نہ لا سکے، حضرت مسیح **علیہ السلام** کس راہ اور کس زینہ سے آسمان پر تشریف لے گئے، یہ سب **معجزات** بجاے خود نہایت محیر العقول واقعات سہی لیکن جس طرح ایک وحشی غیر متمدن عصر حاضر کے اکتشافات سے بالکل نابلد حیرت انگیز ایجادات کے بارے میں تسکین خاطر کے لئے تاویلیں سوچنے کا حق ضرور رکھتا ہے، انکار محض کا حقدار نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح ایک شہرہ آفاق فلسفی انبیاے کرام کے **معجزات** اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج جسمانی کے بارے میں عقلی استبعاد دور کرنے کے لیے مادی تمثیلات پیش کرسکتا ہے مگر یہ دعوی کرنا کہ سلسلہ معراج کی فلاں کڑی ہماری عقل کی گرفت میں نہیں آتی، اس لیے بے جوڑ، ناموزوں وخلاف عقل ہے، اپنی حدود عقل سے میلوں آگے جانا ہے، اگر ایک طفل ناداں کے لئے جائز نہیں کہ علم ریاضی کے کسی اصول مسلمہ کو محض اس لئے غلط قرار دے کہ اس کے دائرہ عقل سے باہر کی بات ہے، تو راہ معنیٰ سے

نا آشنا کے لیے یہ کہنا غلط اور محض غلط ہے کہ معراج نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوائف وحالات ہماری حدود عقل سے باہر ہیں، اس لیے تسلیم نہیں کیے جاسکتے، آسمانوں کا سیر کرنا، لاکھوں میل کی مسافت پل بھر میں طے کرنا، جنت نعیم کو عزت بخشنا، جہنم پر دیدۂ عبرت ڈالنا، جنت والوں کو باغ و بہار میں لذت یاب ہوتے دیکھنا، جہنمیوں کو عذاب الیم اور حسرت ناک حالات میں ملاحظہ فرمانا، ہزاروں لاکھوں قدسیوں کے جھرمٹ میں چلنا، انبیاے کرام سے دید وشنید ہونا یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہہ عقل حیلہ جو نہیں کرسکتی، تو کیا کسی عقل پرست کو انکار کرنے کا حق ہے؟ نہیں! کیوں؟ اس لیے کہ عام عقل انسانی اپنے حدود سے بیروں اشیا کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نافذ نہیں کرسکتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی معراج جسمانی میں وہ کچھ دیکھا جن کو کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا، وہ کچھ سنا جن کے سننے کے لیے آپ ہی کا گوش مبارک موزوں تر تھا، آپ کا قدوم میمنت لزوم وہاں تک ہوا جہاں کے لیے آپ کا پاے ناز مبارک تھا، اتنے غرائبات آپ نے دیکھے جن پر ایک نظر ڈالنے کے لیے مہینہ دو مہینہ، سال آدھ سال نہیں بلکہ لاکھوں برس کی مدت ہونی چاہیے، پھر کیسے سمجھا جائے کہ ''**لیلاً**'' رات کے تھوڑے حصہ میں دونوں جہاں کی وسعتیں طے ہوئیں، اور سب کچھ دیکھ بھال لیا گیا، کون ہے جو اس عقدۂ لاینحل کو کھول دے؟ کہاں سے نور بصیرت ملے کہ زمان ومکان کے اسرار کھل جائیں؟ وہی بتا سکتا ہے جس نے زمان ومکان سب کو سمیٹ دیا، لیکن کیسے وہ مکمل تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے، جب کہ اس کو اپنے مخاطبین کے قدر عقول کا خیال تھا، بایں ہمہ معراج کی ساری ثابت حقیقتوں کو ماننا اور سر تسلیم خم کرنا لازمی ہے، ایمان ویقین کی دولت اسی سے حاصل ہوتی ہے، حیلہ و حجت سے بے نوری پیدا ہوتی ہے۔

پھر ایک اور نکتہ ملاحظہ کرتے چلیے کہ اگر ماورائیت دلیل انکار تسلیم کرلی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نظام مذہب درہم برہم ہو جائیں، ادیان وملل کی پرشکوہ عمارتیں پیوند خاک ہوجائیں، حالاں کہ مادہ پرستوں کو چھوڑ کر انسان کا اکثریتی طبقہ عقل انسانی سے ماورا

مسائل کا یقین رکھتا ہے اور انھیں پر اپنے ایمان وایقان کی بلند عمارت کی بنیاد کھڑی کرتا ہے، جنت، دوزخ، بعث، نشر، حساب و کتاب، وحی، الہام، جزا و سزا، حور و ملک یہ سب ایسے حقائق ہیں جنہیں تقریباً تمام مذاہب کے اصول کے مطابق کسی نہ کسی نہج سے مانا جاتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ معراج نبوی **صلی اللہ علیہ وسلم** کے بارے میں کہا جائے کہ اس میں بہت سے مافوق غرائب ہیں جن پر ایمان لانے میں ہماری عقل کا جنازہ نکل جائے گا، یہ کون سی انصاف کی بات ہے کہ مذہب کے مابعد الطبیعات مسائل تو آپ اپنے تجربات و مشاہدات کی زد میں نہ لائیں، لیکن معراج جسمانی کی ایک ایک کڑی کی چھان بین کریں اور موافقت عقل کی زد میں مبتلا رہیں، یہ کیسی بصیرت ہے کہ علم جغرافیہ سے آپ بالکل نابلد ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمالیہ جیسے فلک بوس پہاڑ کا وجود نہیں ہوسکتا، یہ کہاں کی نادانی ہے کہ جس صحرائے اعظم کے ایک ذرّہ سے آپ واقفیت نہیں رکھتے اس کی بے انتہا وسعتوں کو اپنی عقل کے پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں، عارف رومی **رحمۃ اللہ علیہ** فرماتے ہیں:

چوں بیک شب مہ برید ابراج را
از چہ منکر می شوی معراج را
صدچوں ماہ است آں عجب دریتیم
کہ بیک ایماے او مہ شد دو میم
آں عجب کو در شگاف مہ نمود
ہم بقدر ضعف حس خلق بود
کاروبار انبیا و مرسلوں
ہست از فلاک واخترہا بروں
تو بروں روہم ز افلاک دوار
وآنگہاں نظارہ کن آں کاروبار
درمیان بیضۂ چوں فرخہا
نشنوی تسبیح مرغان ہوا

الغرض انبیاے کرام **علیھم السلام** کی عقل وشعور اور ظاہر و باطن میں قدرت الٰہی اتنی توانائی بخشتی ہے کہ ان کے مقابلے میں اس عالم آب و خاک میں گرفتار انسان بہت کم عقل وقوت کا مالک ہوتا ہے، بلکہ ایک ذرۂ بے مقدار کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے حضور اکرم **صلی اللہ علیہ وسلم** کی جسمانی معراج کے بارے میں عقل کی موافقت وعدم موافقت کے لحاظ سے بحث نہیں ہونی چاہئے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کتاب و سنت میں معراج نبوی ﷺ کے بارے میں کیا تصریحات ہیں اور جمہور علماے اسلام کا رجحان معراج جسمانی کی طرف ہے یا روحانی کی طرف، یہی امر زیادہ لائق التفات ہے، دوسری تمام بحثیں عبث و بے کار ہیں، ارشاد ربانی ہے:

"سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً مّن المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیٰتنا انہ ھو السمیع البصیر "۔ (الاسراء:۱)

پاک ہے وہ ذات جس نے راتوں رات سیر کرائی اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے اردگرد ہم نے برکتیں دے رکھی ہیں تا کہ اس کو ہم اپنی آیات دکھائیں بے شک وہ سمیع وبصیر ہے۔

عبد (بندہ) کے لفظ سے معلوم ہوا کہ معراج جسمانی تھی، اور قرآن حکیم کی اصلاح میں یہ لفظ جسد وروح کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔

درج ذیل آیات میں ملاحظہ فرمائیے:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی ،عَبْدًا اِذَا صَلّٰی﴾ **(العلق: ۹۔۱۰)**۔

بھلا دیکھو تو جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھے۔

﴿وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا﴾ **(الجن: ۱۹)**۔

اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کی بندگی کرنے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ وہ اس کے اوپر بھیڑ بھاڑ سے چھا جائیں۔

﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا﴾ (مریم: ۲)۔

یہ تذکرہ ہے تیرے رب کی اس رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کی۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان مختلف سورتوں کی آیات میں محض روح کو عبد کہا گیا ہے۔

سیرت النبی میں محض اس لیے کہ جسمانی معراج بڑی مستبعد ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حقیقی عبد روح ہی ہے اور قرآن حکیم میں عبد (بندہ) کا اطلاق روح پر ہوا ہے۔

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)۔

اے طمانیت والی جان! اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ جا کہ خدا تم سے خوش ہو اور تم خدا سے خوش ہو، جا میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں اندر چلی جا، میرے بندوں میں داخل ہو جا۔

اس میں **عباد** ارواح کے لیے بولا گیا ہے، معلوم ہوا کہ روح پر لفظ عبد کا اطلاق ہوتا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''**فادخلی فی عبادی**'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

:''یقال لها فی القیامة: فادخلی فی جملة عبادی الصالحین وادخلي جنتي معهم'' نفس مطمئنہ سے روز حساب کہا جائے گا میرے نیک بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں ان کے ساتھ چلی جا، مطلب یہ ہے کہ اس وقت کہا جائے گا جب صالح و نیک بندوں پر لباس عنصری چست کر دیا جائے گا، جنت میں لوگ جسم کے ساتھ داخل ہوں گے نہ کہ صرف ارواح جنت میں قیامت کے دن جائیں گی، اس لحاظ سے ارواح مع الاجساد پر عباد کا اطلاق ہوا۔ لہٰذا آیت کریمہ سے ہرگز نہیں ثابت ہوتا کہ صرف روح پر لفظ عبد کا اطلاق ہوتا ہے۔

تاریخ کی مشہور کتاب حبیب السیر میں ہے کہ:

''واکثر اکابر سلف وخلف برآن رفتہ کہ معراج خاتم الانبیا **علیہ الصلوٰۃ اتمہا وانماھا** بہ بیداری بود، روح مطہر آں حضرت بمرافقت جسد معطر در بعض از شب از مکہ بہ بیت المقدس رفتہ واز آں جاباوج سمٰوت عروج فرمودہ، نزول آیت باعنایت ''**ثم دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین اوادنیٰ**'' مویداین معنی است۔

اکثر اکابر سلف وخلف کا مذہب یہ ہے کہ خاتم الانبیا **صلی اللہ علیہ وسلم** کی معراج بیداری کی حالت میں ہوئی تھی، روح پاک نے جسم معطر کے مرافقت میں رات کے تھوڑے حصہ میں مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمان کی بلندی پر عروج فرمائی تھی، آیت ''**ثم دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنی**'' اس کی تائید کر رہی ہے۔

اکثر مفسرین نے سورۂ والنجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر ایسی کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا تعلق واقعہ معراج سے برائے نام ہے، حقیقت میں جبرئیل امین اور حضور ﷺ کی دید و ملاقات کا منظر کھینچا گیا ہے، اور عبارت بالا میں بتایا گیا ہے کہ آیت ''**ثم دنا فتدلی**'' الخ سے معراج جسمانی کی تائید ہوتی ہے، اس لیے ہم سورۂ والنجم کی ان آیات کو فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** کے ترجمہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں، پھر اس مسئلہ پر ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ ان آیات سے معراج جسمانی ثابت ہوتی ہے۔

"والنجم اذا ھوی ما ضل صاحبکم وما غوی وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی علمہ شدید القوی ذو مرۃ فاستوی وھو بالافق الاعلی ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی فاوحی الی عبدہٖ ما اوحی ما کذب الفوادمایریٰ افتمارونہ علی ما یری ولقد رآہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتھی عندھا جنۃ الماوی اذیغشی السّدرۃما یغشی ما زاغ البصر وما طغی لقد راٰی من آیات ربہ الکبری"(سورۃ والنجم:۱۔۱۸)۔

اس پیارے چمکتے تارے محمد کی قسم جب یہ معراج سے اترے، تمہارے صاحب نہ بہکے نہ بے راہ چلے، اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے، وہ تو نہیں کہتے مگر انہیں جو وحی کی جاتی ہے، انہیں سکھایا سخت قوتوں والے طاقت ور نے، پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا اور وہ آسمان بریں کے سب سے بلند کنارے پر تھا، پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا، پھر خوب اتر آیا، تو پھر اس جلوہ اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا، بلکہ اس سے بھی کم، اب وحی فرمائی اپنے بندے پر جو وحی فرمائی، دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا، تو کیا تم ان سے ان کے دیکھے ہوئے پر جھگڑتے ہو، انہوں نے تو وہ جلوہ دوبارہ دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اس کے پاس جنت الماویٰ ہے، جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھایا تھا، آنکھ نہ کسی طرف پھری نہ حد سے بڑھی، بے شک اس نے اپنے پروردگار کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنہ** کے اس ترجمے سے آیات کا باہمی ربط واضح ہو رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک لڑی میں موتی پروئے ہوئے ہیں، مفسرین کی تفسیر کی رو سے ترجمہ کیا جائے تو ان آیات میں ربط و نظم کمزور پڑ جاتا ہے یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ جناب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اپنے ایک عقیدت مند کے سوال کے جواب میں اسی کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ میرے عزیز! روایات حدیث اور عربیت دونوں کے اعتبار سے اس آیت کریمہ میں قرب حق تعالیٰ فقیر کے نزدیک راجح تر ہے، روایات حدیث کے لحاظ سے اس طرح کے امام بغوی اور اصحاب حدیث مفسرین حضرت انس بن مالک اور ابن عباس رئیس المفسرین سے روایت کرتے ہیں اور ان کے علاوہ سلف سے بھی مروی ہے کہ: "**دنا الجبار رب العزت فتدلی حتّٰی کان منہ** ﷺ **قاب قوسین اوادنیٰ**" اگر چہ حضرت عائشہ **رضی اللّٰہ عنہا** اور دوسرے بعض مفسرین حضرت جبرائیل کے قرب پر عمل کرتے ہیں، اس گروہ کے قول کا منشا یہ ہے کہ، دنو، تدلی، التواء جو خواص جسم میں سے ہیں اللہ کی ذات میں مستبعد ہیں اور یہ استبعاد بلا وجہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن حکیم کی بعض آیات محکمات ہیں اور یہ ام الکتاب ہیں اور دوسرے

متشابہات ہیں، قرآن حکیم میں اس قسم کے متشابہات بہت ہیں ”**الرحمٰن علی العرش استویٰ، ویبقیٰ وجه ربک، ید الله فوق ایدیهم، ویایتهم الله فی ظلل من الغمام**“ پس کیوں نہیں اس آیت کو بھی اس قبیل سے شمار کرتے اور رقیق تاویلیں کرتے ہیں، اور عربیت کے اعتبار سے اس طرح راجح تر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ ”**ما ینطق عن الهوی ان هو الا وحي یوحی علمه شدید القوی**“ اور جملہ ”**علمه شدیدالقویٰ**“ وحی کی صفت ہے اور تمام وحی جبرئیل کے واسطے سے نہیں نازل ہوئی بلکہ بعض بتوسط جبریل اور بعض ان کے توسط کے بغیر نازل ہوئی، پس اگر ”**شدید القوی**“ سے جبرائیل مراد ہوں تو ہر فرد وحی کی تعلیم پر شدید القوی صادق نہیں آئے گا، نیز اللہ تبارک و تعالیٰ کا قول: ”**فاوحی الی عبده ما اوحی**“ اس بات کی صراحت ہے کہ ”**شدیدالقویٰ**“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے نہ کہ جبرائیل، ورنہ انتشار ضمائر لازم آئے گا جو فصحا کے کلام میں ناپسندیدہ بات ہے، اور ”دنو وتدلی“ جبرائیل حضور **صلی الله علیه وسلم** کے لیے موجب کمال نہیں، کیوں کہ آپ جبرئیل سے افضل ہیں اور جس شخص نے جبرائیل کا قرب مراد لیا ہے گویا اس آیت میں اس کے نزدیک اس واقعہ کی حکایت ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل کو ان کی اصل صورت میں چھ سو پروں کے ساتھ جبل عرفات کے متصل دیکھا تھا، یہ واقعہ ایسی حالت ہے کہ جملہ ”**ان هوالا وحی یوحیٰ**“ سے اس کا ربط نہیں حالاں کہ جملہ ”**دنی فتدلی**“ جملہ ”**علمه شدیدالقوی**“ پر معطوف ہے، عطف کی وجہ سے صفت وحی نہیں ہوسکتا، پس واضح ہوگیا کہ ”دنو وتدلی“ سے خدائے بے مثل کا قرب مراد ہے۔

اگر آیات کا یہ ترجمہ اور ان کے بارے میں یہ بسط وتفصیل حق ہے اور یقیناً حق ہے تو ان سے درج ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱) نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرب الٰہی اس عالم آب وخاک میں نہیں بلکہ عالم بالا کے کسی بلند مقام پر حاصل ہوا۔

(۲) آپ نے جلوہائے ربانی کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا دیدار بچشم سر آپ کو حاصل ہوا، "**مازاغ البصر وماطغیٰ**" کہاں دیکھا؟ آیت کے سباق سے پتہ چلتا ہے کہ اس عالم کون وفساد میں نہیں بلکہ کسی اور عالم میں "**عندھا جنۃ الماویٰ**"۔

(۴) نظم آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرب الٰہی کے بعد آپ کی طرف اسرار الٰہیہ کی وحی کی جاتی ہے، ان تمام مقدمات کی ترکیب سے با آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج روحانی نہیں جسمانی ہوئی تھی، اگر جلوہائے ربانی سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بچشم سر اس مادی دنیا سے دیکھے جا سکتے ہیں تو وہاں جسم کے ساتھ کیوں نہیں دیکھے جا سکتے، اگر جنت الماویٰ کے پاس اسرار الٰہیہ کی وحی محض روح معطر پر ہو سکتی ہے تو روح مجسم پر کس دلیل سے نہیں ہو سکتی، اگر سدرۃ المنتہیٰ کے قریب آپ نے تجلیات الٰہیہ عالم رویا میں محض قلب سے دیکھا تھا تو اس کی کیا دلیل ہے، "**مازاغ البصر وماطغیٰ**" کے بجائے "**مازاغ القلب وماطغیٰ**" کیوں نہیں ارشاد فرمایا گیا، کیا چشم سر کے لیے بصر کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے یا ایسی کوئی اصطلاح ہے جس سے پتہ چلے کہ چشم دل کے لیے ہی بصر بولا جاتا ہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچشم سر عالم بالا میں دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوئے اور آپ کا جسم معطر اس مادی دنیا میں محبوس ومقید تھا، یا یہ کہ آپ جسم مع روح تشریف لے گئے اور تجلیات الٰہیہ سے فیض یاب ہوئے، حق تو یہ ہے کہ آپ نے عالم بالا میں جسم اقدس کے ساتھ عروج فرمایا اور سب کچھ دیکھ بھال کے واپس آ گئے، یہ آیات الٰہی پکار پکار کر ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہیں کہ عروج روحانی اور عالم رویا کی باتوں کی طرف ان آیات سے اشارہ تک نہیں ملتا پھر کیا وجہ ہے کہ ہم معراج جسمانی نہ تسلیم کریں۔

شرح عقائد نسفی میں بحث معراج میں علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

جسم اطہر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے معراج حالت بیداری میں آسمان تک پھر جہاں تک اللہ نے چاہا حدیث مشہور سے ثابت ہے، یہاں تک کہ جو شخص اس

کا منکر ہوگا وہ بدعتی شمار کیا جائے گا، محال ہونے کا یہ دعویٰ فلاسفہ کے اصول پر مبنی ہے، ورنہ آسمانوں میں خرق والتیام ممکن ہے، تمام اجسام ایک دوسرے کے مماثل ہیں، جو چیز ایک پر صحیح ہوگی وہ دوسرے پر بھی صحیح ہوگی، اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے۔

اس عبارت میں علامہ موصوف نے فلاسفہ کے ہوائی قلعوں کو مسمار کیا ہے، جن کی بنا پر کہا جاتا تھا کہ آسمانوں میں خرق والتیام ممکن نہیں ،فکر ونظر کے ارتقا سے ثابت ہو گیا کہ آسمانوں کے متعلق قدیم فلاسفہ کے نظریات تخیلاتِ باطلہ سے زیادہ واقعیت نہیں رکھتے تھے، اس پر دعویٰ تھا کہ معراج جسمانی ناممکن ہے۔

اس دور میں بھی مسئلہ معراج پر غور وفکر کی راہ میں سخت ٹھوکر نادانوں کو یہ لگی ہے کہ مادی جبر ومقاومت جو عام انسانوں کے مقابلے میں فطرت کی اشیا میں پائی جاتی ہے اور ایک حد تک ان کے بارے میں یہ مقاومت درست ہے، اس کو قدرت الٰہی پر چسپاں کر دیا گیا ، مادی وسائل کے بغیر مریخ، عطارد پر جانا ناممکن تصور کیا گیا، اس لیے محال قرار دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اتنی بلندیوں پر کسی انسان کو پہنچائے جہاں وسائل وذرائع کی ہمہ گیری کے باوصف اب تک انسان نہ پہنچ سکا، خیالی محالات کو مبدع فیض کی قدرت پر منطبق کر کے کہا گیا کہ کسی انسان کو چاہے وہ انسان کامل ہی کیوں نہ ہو اس کو آسمانوں کے آگے خدائے قدوس نہیں لے جا سکتا، اس پر نظر نہ پڑی کہ وہ خدائے توانا جس نے مادہ پرستوں کو یہ قدرت عطا کی کہ دور قدیم کے محالات کے پہاڑ **هباً منثورا** ہو رہے ہیں ،فطرت کی چیزوں میں اتنی توانائی ودیعت کر دی ہے کہ اس کے لاکھوں حصوں میں سے ایک حصہ پر بھی انسان اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکا، اور عالم یہ ہے کہ کائنات سفلی کا ذرہ ذرہ اس کی وحشت انگیزی وتوانائی سے کانپ رہا ہے اور خدا جانے کتنے ناممکن ہو رہے ہیں وہ قادر مطلق بلاشبہ اپنی مصنوعات و ممکنات پر ہر طرح کی قدرت رکھتا ہے، انسان تو اپنی عجز وناتوانی کے باوجود اپنی طاقت و قوت کا لوہا سیارگان فلک سے منوا رہا ہے، اور قادر مطلق ایک نور مجسم کو اپنی بے انتہا قوت کے باوصف آسمانوں کی سیر وسیاحت نہ کرا سکا، **معاذاللّٰہ**، اور محالات کے سینکڑوں پہاڑ راہ میں

حائل ہوجائیں، معراج جسمانی کے سلسلہ کی تمام کڑیاں نا صرف ممکن ہیں بلکہ واقع ہیں۔

پس کیوں نہ یقین کیا جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی "**سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ**" **واللہ تعالیٰ قادر علی الممکنات کلھا**۔

شفا شریف میں عاشق رسول قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"اکابر علماے سلف اور تمام مسلمانوں کا مذہب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج بیداری میں جسمانی تھی، اور یہی قول حق ہے، اور یہی مذہب حضرت ابن عباس ، حضرت جابر، حضرت انس ، حضرت خدیجہ، حضرت عمر، حضرت ابو ہریرہ، حضرت مالک ابن صعصعہ ، حضرت ابن مسعود، حضرت ضحاک ، حضرت سعید ابن جبیر، حضرت قتادہ ابن مسیّب، ابن شہاب زہری ابن زید، حسن ، ابراہیم ، مسروق ،مجاہد، عکرمہ، ابن جریج کا ہے اور یہی دلیل حضرت عائشہ **رضی اللہ عنہ** کے قول پر حجت ہے، طبری، ابن حنبل اکثر فقہاے متاخرین ، محدثین، متکلمین اور مفسرین کا یہی مذہب ہے۔

اخوت اسلامی کا احترام

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ ایک مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو اپنے قول وفعل سے اذیت پہنچائے، اس لیے کہ ایک مسلمان کی شخصیت خواہ اس کا تعلق کسی ملک اور قوم سے ہو نہایت ہی قابل احترام ہے، اس کے ساتھ سلوک و برتاؤ کے لیے کچھ ایسے طریقے ہیں جن کی رعایت ہر حال میں مسلمان پر لازم ہے، آپ نے بہت سی ایسی باتوں سے منع فرمایا جو تلخ کلامی اور موجب لعن وطعن ہوا کرتی ہیں، جن سے مسلمانوں میں باہمی نفرت وعداوت کے جذبات ابھرتے ہیں، اور بہت سے ایسے امور بھی آگاہ فرمایا جن سے ایک مسلمان کو قصداً ضرر پہنچ جاتا ہے، انھیں چیزوں میں سے ایک امر راستوں میں پیشاب یا پاخانہ کرنا، اور لوگوں کے آنے جانے کی راہ میں غلاظتوں کا ڈالنا بھی ہے، مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اتقوا اللعانين۔قالوا:وما اللعانان يارسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال:الذی يتخلى في طريق الناس او في ظلهم" ۔(صحیح مسلم، حدیث:۲۶۹)

تم لوگ ایسی دو چیزوں سے بچو جو باعث لعنت ہوں، آپ سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون سی ایسی دو چیزیں ہیں جو موجب لعنت ہوتی ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کے راستے میں یا ان کے سایے میں قضاے حاجت کرنا۔

اس ارشاد سے صاف ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص لوگوں کی آمد ورفت کی جگہوں میں قضاے حاجت کرتا ہے تو اس سے ان میں سخت نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے، جس سے لوگ اس کے اوپر لعنت بھیجتے ہیں۔

اس لیے ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے وہ لعنت کا مستحق ہو جائے، لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی پر لعنت کرنے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے فقہاے کرام نے لعنت شخصی کو ناجائز قرار دیا، البتہ کسی کو اس کے

برے اوصاف کے بنا پر انھیں اوصاف کے ذریعہ اس کے اوپر لعنت کی جاسکتی ہے، چنانچہ ظالم و فاسق و کافروں جھوٹوں پر قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی لعنت آئی ہے، یعنی جو شخص ان اوصاف واعمال کے ساتھ متصف ہوگا وہ اپنے آپ کو ملعون کے زمرے میں داخل کرلے گا، اور وہ اپنے اوپر لعنت کا دروازہ کھول لے گا، اس لئے کہ یہ ایسی چیز ہے جو انتہائی نفرت و حقارت کے وقت وجود میں آتی ہے، اسی وجہ سے ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھلائی کی راہ تلاش کرے تاکہ نیک کاموں پر عمل کر کے نجات وسعادت کا مستحق ہوجائے، اور یہ ایسے کام سے اجتناب کرے جو دوسروں کے لئے پریشانی ومشقت کا باعث ہو، اس طرز عمل سے سماج اور معاشرے کے افراد کو خوشی اور شادمانی حاصل ہوتی ہے، اور لوگوں میں محبت اور باہمی ربط اجاگر ہوتا ہے، جو اسلام کے خصوصی امتیازات میں سے ہے، "**انما المؤمنون إخوة**"۔

دوسرے یہ کہ کسی مسلمان کے خلاف آلۂ جارحہ مثلاً لوہا وغیرہ اٹھانا جس سے اس کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو یا قصداً اس کو مارنے یا قتل کرنے کا ارادہ ہو سخت ممنوع ہے، اسلام نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کیا جائے یا اس کو دھمکایا جائے یا اس کو معمولی اذیت پہنچا کر کبیدہ خاطر کیا جائے، یہ حرکت ایک مسلمان کے شایان شان نہیں، جب کوئی شخص شریعت اسلامی کا دامن تھامے ہوئے ہے تو اس کو اللہ کی جانب سے امن وسلامتی کا ایسا پروانہ مل جاتا ہے کہ کسی طرح کی کوئی زیادتی اس کے ساتھ نہیں کی جاسکتی، نہ تو اس کو ڈرایا دھمکایا جاسکتا ہے نہ ہی اس کو کسی طرح سے کوئی نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، یعنی اس کے ساتھ معمولی بدسلوکی بھی روا نہیں رکھی جاسکتی، کیوں کہ اسلام نے اس کو رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا ہے کہ اسلامی کنبے کے ہر فرد پر اس برادرانہ رشتہ کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔

لیکن یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس رشتہ اخوت کو مسلمان محسوس نہیں کرتے، کیوں کہ اسلامی تعلیم ان کے دل کی گہرائیوں میں گھر نہیں کیے ہوتی اور نہ وہ اس کے اوپر عمل پیرا ہوتے ہیں، اس لئے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے قول وفعل سے اذیتیں پہنچتی رہتی ہیں، ہمارے اسلاف کرام جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت کے نور سے اپنے دلوں کو روشن کیے

ہوئے تھے انہوں نے اسلامی اخوت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اس طرح اتار لیا کہ وہ کبھی بھی اس رشتہ سے صرف نظر نہیں کرتے تھے۔

اسلامی برادرانہ رشتہ کو واضح کرنے کے لئے تاریخ اسلام کا صرف ایک عظیم الشان واقعہ اس موقع سے ذکر کرنا کافی ہوگا، جب صحابۂ کرام **رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین** مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کثیر تعداد میں ہجرت کر کے تشریف لے گئے، تو اس دارالاسلام کی چھوٹی سی آبادی میں بہت سے اقتصادی و معاشی، سماجی و معاشرتی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن شمع رسالت کے پروانوں نے ان کو ایسے اسلوب و حسین انداز سے حل کیا کہ اقوام و ملل کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، زبان نبوت میں ذرا سی جنبش ہوئی اور ارشاد فرمایا گیا کہ تم سب اس رشتۂ اسلامی سے منسلک کر دیے گئے ہو، اور تم سب کو میں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہوں، آپ کے زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی انصار نے مواخات کا عدیم النظیر کارنامہ یہ انجام دیا کہ وہ اور مہاجرین ایک دوسرے سے گلے مل کر بھائی بھائی ہو گئے، اور انصار نے اپنی جائیداد اور اپنی تمام ملکیتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور مہاجرین کو اس کا نصف حصہ بڑی فراخدلی اور وسعت قلبی کے ساتھ ادا کر دیا، بلکہ معاملہ اسی حد تک محدود نہیں رہا، اس کے آگے بڑھ کر ان فرشتہ صفت انسانوں نے اپنی انسانیت دوستی کا مظاہرہ یوں کیا کہ اگر کسی انصار کے پاس دو بیویاں تھیں تو ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی سے اس کا عقد کر دیا، آناً فاناً تمام معاشی دشواریوں، معاشرتی مسائل پر قابو پا لیا گیا۔

عصر حاضر میں مہاجرین یا ترک وطن کرنے والے شرنارتھیوں کا ایک پیچیدہ مسئلہ دنیا کے سامنے پایا جاتا ہے، بین الاقوامی ادارے، سرمایہ دار ممالک اور اس کے مفکرین اس مسئلے کو حل کرنے میں عاجز و درماندہ نظر آتے ہیں، دنیا کے مختلف گوشوں میں لاکھوں انسان بے آسرا و بے سہارا پڑے ہوئے ہیں، انسانیت بھوک و پیاس اور اقتصادی بدحالی و زبوں حالی سے سسکتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن اگر انسانیت دوستی کے جذبے کو انسانوں کے دلوں میں پیدا کر دیا جائے، تو ترک وطن کرنے والے مہاجرین کے مسائل یا شرنارتھیوں کی پریشانیاں بغیر کسی دقت کے تھوڑے ہی عرصے میں دور کی جا سکتی ہیں، کم از کم امت مسلمہ کے افراد ہی

اپنی اخوت اسلامی کا جذبہ دلوں میں رکھتے ہوئے دنیا کے مختلف علاقوں میں بے یارومددگار پڑے ہوئے ترک وطن کرنے والے مسلمانوں کے مسائل، ان کی موجودہ دشواریاں اوران کے مصائب کا بہت حدتک مداوا کر سکتے ہیں۔

اسی ایک تاریخی واقعے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلامی تعلیم انسانیت کو کتنی بلندی پر لے جانا چاہتی ہے، اور کیسا فراخدلانہ، فیاضانہ اخلاق کے جذبے کو ابھارنا چاہتی ہے، ایک عرب سیاح امریکی سماج کے ایک واقعے کو ذکر کرتا ہے کہ میں نے امریکہ میں اپنے نومسلم بھائیوں سے ملاقات کی اور انہیں میں سے ایک کے ہمراہ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گیا، وہاں عشا و مغرب کے درمیان مسلمانوں سے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، اس کے بعد درس قرآن کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جلسے کے جتنے حاضرین تھے سب نے اپنے نومسلم بھائی کا کھڑے ہوکر استقبال کیا، مصافحہ و معانقہ کیا، دعائیہ کلمات کے بعد ''**اھلا وسھلا**'' کے الفاظ سے مبارکباد پیش کی، جب ہمارے اس نومسلم بھائی نے مسلمانوں کے خلوص اوران کی گرمجوشی اور اسلامی برادرانہ رشتہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اپنے اوپر قابو نہ پاسکا اور بے ساختگی میں رونے لگا، تمام مسلمانوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ آخر بات کیا ہے؟ ہم لوگ توان سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے تو پھر آخر وہ کیوں کر رورہے ہیں؟ ایک صاحب نے جرأت کر کے دریافت کیا کہ آپ کے رونے کا سبب کیا ہے، تو انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ اس اسلامی ماحول میں ایسا محسوس کیا کہ میں اس کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا، آج پہلی بار میں نے اسلامی برادرانہ رشتہ کو محسوس کیا، اور میرے اوپر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ مذہب اسلام کتنی بلندی پر دنیاے انسانیت کو پہنچانا چاہتا ہے، میں نے پوری زندگی امریکی معاشرے میں گزار دی، لیکن جس گرم جوشی اور جیسی محبت اور خلوص اور جیسی بھائی چارگی اور جیسی انسانیت و یگانگت آج میں نے محسوس کی ایسی کبھی بھی امریکی معاشرے میں نہیں پایا، اس سے میں نے یہ یقین کیا کہ پوری انسانیت کا نجات دہندہ اور امن وسلامتی کا پیغامبر، صلح و آشتی کا معلم اگر کوئی مذہب اس صفحۂ ہستی میں پایا جاتا ہے، تو وہ اسلام ہے، اور

صرف اسلام ہے، اسی ایک واقعے سے یہ درس عبرت ملتا ہے کہ ہم کسی سماج یا کسی ماحول میں زندگی گزاریں یا کیسے ہی مایوس کن حالات ہوں اگر ہم اسلامی تعلیم کو اس کے تمام پہلوؤں اور جوانب کے ساتھ بروئے کار لائے تو ہماری بہت سے تکلیفوں اور مصیبتوں کا مداوا ہوسکتا ہے، اور ہمارے احترام انسانیت کو دیکھ کر دوسری قومیں ہمارا احترام کرنے پر مجبور ہوجائیں گی، ہمارے اخلاق کا دائرہ صرف گھریلو زندگی تک یا صرف اپنے لوگوں پر محدود نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس میں اتنی وسعت وگنجائش ہونی چاہیے کہ دوسری قومیں ہمارے عمل و کردار کو دیکھ کر نفرت وحقارت کے بجائے عزت و وقار کے ساتھ پیش آئیں، لیکن ہماری بنیادی کمزوری یہ ہے کہ دوسری قوموں کو تو چھوڑ یئے خود اپنے لوگوں کے ساتھ اچھے سلوک و برتاؤ کے ہم روادار نہیں ہیں، حالاں کہ احترام مسلم ہر ایک پر لازم ہے، جو اسلام کا دعویٰ کرتا ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا يحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث :الثيب الزاني، والنفس بالنفس، والتارك لدينه المفارق للجماعة"۔(صحیح بخاری، حدیث:۶۸۷۸)

کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہے، ہاں تین باتوں سے حلال ہوسکتا ہے: ایک یہ کہ شادی شدہ ہوکر زنا کا مرتکب ہو، دوسرے یہ کہ بلاسبب کسی کو قتل کرڈالے، تیسرا یہ کہ مرتد ہوکر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے۔

روے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں پایا جاتا ہے جو اپنے ماننے والوں اور پیروکاروں کو اتنی عزت واحترام کی زندگی عطا کرتا ہو، اسلام کا مقصود صرف یہ نہیں کہ خدائے قدوس کی عبادت و بندگی کے چند طریقوں پر عمل کرلیا جائے اور اس کے بعد دوسرے حقوق و واجبات سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری، آپس میں ایک دوسرے کے احترام، انسان کی جان کی حفاظت وصیانت کو بھی لازم کرتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انسان کے باطن میں انقلاب پیدا کیا جائے، اور اسلامی رشتہ کا احساس و شعور اس کے دل ودماغ پر ایسا مسلط ہوجائے کہ اس کے اثرات ظاہر پر بھی نمایاں ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عالمی منشور پوری انسانیت کے لیے ارشاد فرمایا تھا، اگر اس کو غور سے پڑھا جائے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو دنیا کو امن وسلامتی کا پیامبر بنانے کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا ہوسکتی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

”ان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا في شهرکم هذا في بلدکم هذا“۔ {بخاری شریف، ۱/۱۱۸}

بے شک تمہارے خون و مال اور تمہاری عزت وآبرو تمہارے اوپر حرام ہیں، جیسا کہ تمہارا یہ دن اس مہینے میں اس شہر میں محترم ہے۔

عالمی منشور کے اس حصے کے نکات حسب ذیل ہیں:

{الف} ”**ای یوم هذا**“؟ یہ کون سا دن ہے؟ کیا سرکار کو معلوم نہیں تھا کہ آج جمعہ مبارکہ کا دن ہے، لوگوں نے جواب میں کہا، عید تکبیر کا دن ہے، آپ نے پھر پوچھا: **ای شهر هذا**“؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ کیا آپ کو نہیں معلوم تھا کہ ذوالحجہ کا مہینہ ہے، صحابۂ کرام نے جواب میں عرض کی کہ ذوالحجہ کا محترم مہینہ ہے، پھر آپ نے دریافت فرمایا: ”**ای بلد هذا**“؟ یہ کون سا شہر ہے؟ کیا حضور کو معلوم نہیں تھا کہ مکہ معظّمہ ہے، لوگوں نے جواب میں کہا کہ اللہ کا محترم گھر کعبہ معظّمہ ہے۔

نبی امی **فداہ ابی وامی** کو سب کچھ معلوم تھا، آپ کا سوال برائے طلب علم نہیں تھا، بلکہ یہ سوال تقریری تھا، یعنی اس دن اور اس مہینے اور اس مقدس شہر کی اہمیت وعظمت واضح کرکے یہ بتانا مقصود تھا کہ جو فرمان میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں، اس کی عظمت و بڑائی کو تمہیں محسوس کرنا چاہیے، اور یہ پیام رحمت تمام شک وشبہات سے بالاتر ہے۔

{ب} تقریباً ایک لاکھ کے مجمع میں یہ عالمی منشور پیش کیا جارہا تھا اور اس کا اسلوب بیان نہایت ہی نرالا اور انوکھا تھا، کیوں کہ یہاں یہ تشبیہ دی گئی کہ جس طرح تمہارا یہ دن لائق احترام، تمہارا یہ مہینہ قابل احترام، تمہارا یہ مقدس شہر عظمت و بڑائی کا منبع ہے، اسی طرح

انسان کی جان و مال، عزت و آبرو بھی لائق صد احترام ہے، ظاہر ہے کہ اس موقع پر جو مجمع موجود تھا اس کے دل میں وہ مہینہ، وہ دن، وہ شہر باعظمت اور نہایت ہی محترم تھا، اگر ان کے دلوں میں اس کے احترام میں کوئی کمی ہوتی تو دور دراز کی مسافتیں طے کر کے یہاں کیوں آتے؟۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس انوکھے اسلوب بیان یا تشبیہ بلیغ سے یہ حقیقت واضح کی کہ اگر تم اس دن کا احترام کرتے ہو، اور اس میں غلط کاریوں کے مرتکب نہیں ہوتے ہو، اگر تمہارے قلوب میں اس مہینے کی عظمت پائی جاتی ہے، اور تم قتل وقتال اور جنگ وجدال سے اس مہینے میں باز رہتے ہو، اور اگر تمہارے دل کے گوشوں میں خانۂ کعبہ کا جلال و جبروت پایا جاتا ہے، اور تم اپنی نگاہ عرفان سے تجلیات الٰہیہ کی بارش دیکھ رہے ہو، تو تمہارے اوپر لازم ہے کہ ان سب احتراموں کے ساتھ اپنے دل میں اخوت اسلامی کا جذبہ اس طرح بیدار رکھو کہ کبھی بھی کسی صورت میں کسی کے خون سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دو، کسی کے مال کو غصب کر کے اپنی انسانیت کو بھینٹ نہ چڑھاؤ، کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کر کے اپنی قوت بہیمیہ کو تسکین کا سامان فراہم نہ کرو۔

{ج} سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عالمی منشور کے اس پہلو پر بھی نظر رہنی چاہیے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ مجمع کے سامنے جو فرمان آپ نے پیش فرمایا وہ آپ کا وداعی وآخری پیغام تھا، اور اس کے لئے مناسب آپ نے ایسے ہی موقع کو تصور فرمایا جب کہ دور دراز علاقوں سے انسانوں کا ایک جم غفیر، عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کے چہرہ منور اور روئے زیبا کی زیارت پر آپ کے کلام بلاغت نظام کی سماعت کے لیے بے تاب تھا، اور آپ اس وقت صاف لفظوں میں ارشاد فرما رہے تھے کہ شاید تم لوگ اس بابرکت مہینے، اس یوم سعید اور اس مقدس جگہ میں پھر دوبارہ میری زیارت سے مشرف نہ ہوسکو، اس لیے اس ارشاد کی اہمیت وعظمت کا احساس تمہارے دلوں میں ایسا پیدا ہونا چاہئے کہ تم اس سے کسی حالت میں غافل نہ رہو، میں تم کو اسلام کے برادرانہ رشتے میں منسلک کر کے تمہاری ظاہری

نگاہوں سے روپوش ہو جاؤں گا، لیکن یہ ابدی پیغام صفحات عالم پر سنہری حروف میں منقوش رہے گا، تو تمہارے دلوں میں بھی نقش کل الحجر ہونا چاہیے، اپنے ذہن وفکر کو آج سے چودہ سو برس پیشتر کے اس میدان عرفات کی طرف مائل کر کے سوچو کہ اسلامی برادری کے اس رشتے کو بیان کرنے اور احترام مسلم کو واضح کرنے کے لئے اتنے عظیم الشان جملے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس کو مدینے کی گلیوں، مکے کی سنگلاخ زمینوں اور دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا جا سکتا تھا، لیکن اس اہم وصیت کے واسطے ضروری تھا کہ اس مقدس جگہ میں بیان کیا جائے جہاں پر ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر رنگ ونسل کے لوگ موجود ہوں، اور سب پر یہ بات واضح کر دیا جائے کہ نسلی امتیازات، قومی افتخار، قبائلی عصبیتیں اور رنگ ونسل کا فرق وامتیاز کوئی بھی چیز احترام مسلم کی راہ میں حائل ہو جائے تو تمہیں اس کا مقابلہ پوری قوت ایمانی کے ساتھ کرنا چاہیے، تم اخوت اسلامی کا جذبہ اپنے دلوں میں اس طرح سے جمائے رکھو کہ ملکوں اور قوموں کی حد بندیوں کی چٹان اگر اس کے سامنے آجائے تو وہ پاش پاش ہو جائے۔

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

اے میرے بھائی ذرا داڑھی منڈانا چھوڑ دے

عاشقان رسول ﷺ کے نام ایک درد بھرا پیغام

اے میرے بھائی، ذرا داڑھی منڈانا چھوڑ دے
شرم کر بہر خدا، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

ہیں بظاہر بال لیکن نور ہے اسلام کا
شکل ،نورانی بنا،داڑھی منڈانا چھوڑ دے

شکل سے بیزار ہیں تیری خدا و مصطفیٰ
ان کو راضی کر ذرا، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

تیری صورت دیکھ کر شیطاں کو ہوتی ہے خوشی
اور وہ دشمن ترا ،داڑھی منڈانا چھوڑ دے

اپنی چوٹی بھی کسی ہندو نے کاٹی ہے بتا
تو نے کیوں ایسا کیا، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

آل واصحاب نبی نے بھی کبھی ایسا کیا
تو ہے کیوں ان سے جدا، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

کیا عجب ہے عورتوں پر بھی پڑے اس کا اثر
وہ بھی دیں سر کو منڈا، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

مرد پیدا ہو کے تو بالکل مخنث بن گیا
یہ غضب کیسا کیا،داڑھی منڈانا چھوڑ دے

داڑھی کترانا، چڑھانا، مونڈنا سب ہے حرام
مان حکمِ مصطفی ،داڑھی منڈانا چھوڑ دے

فرض ہے بھائی پہ دے بھائی کو راہِ حق بتا
اس لیے میں نے کہا، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

ہوجمیلؔ قادری کی التجا یا رب قبول
امتِ خیرالوریٰ ، داڑھی منڈانا چھوڑ دے

آپ حاجی ہیں، نمازی ہیں، بہت نیک اور شریف آدمی ہیں، اور اس کے باوجود آپ قدرتی اور فطرتی نظام کے بالکل خلاف اپنے چہرے کی بہاروں کو اجاڑتے ہیں، اپنے چہرے کا ''ایڈریس'' خراب کرتے ہیں، اور داڑھی منڈانے کترانے کے شوق وفیشن میں گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، آپ سوچتے کیوں نہیں، کہ ایسا کرنا سوشہید کے ثواب سے محروم ہونا ہے، داڑھی منڈانا نظام قدرت کی مخالفت و مقابلہ اور گناہ ہے، خداے تعالیٰ کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑنا گناہ ہے، سنت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مٹانا اور منہ پر قوم لوط و مجوس و یہود و نصاریٰ کا نشان قائم کرنا کتنا بڑا جرم ہے، عورتوں جیسی شکل بنانا گناہ ہے، مٹھی بھر مسنون شرعی حد کو توڑنا گناہ ہے، خدا/رسول کی نافرمانی وشیطان کی خوشنودی و پیروی گناہ ہے، داڑھی منڈانا اللہ کی نعمت و زینت کو ضائع کر کے خداے تعالی کی ناشکری کرنا ہے، کہ اس نے ہمیں مرد کیوں بنایا، ہمارا عورت ہونا اور بغیر داڑھی عورتوں جیسی صورت ہونا بہتر تھا، "**ولا حول ولاقوة الا بالله**"۔

ذرا سوچیے! کہ داڑھی منڈانا کترانا کتنی قباحتوں اور کتنے گناہوں کا مجموعہ بن کر کتنا بڑا گناہ کبیرہ ہے، مگر آپ حاجی، نمازی اور نیک آدمی ہو کر سوچتے ہی نہیں، کہ آپ اپنے ہاتھوں اپنا کتنا بڑا نقصان کر رہے ہیں، کتنے گناہوں اور گناہ کبیرہ کے بوجھ کا اپنی گردن پر اضافہ کر رہے ہیں، کیا آپ کو اپنے اللہ کی تخلیق، اس کی عطا کردہ نعمت سے کوئی پیار نہیں، کیا آپ کو اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری سنت و ادا سے کوئی پیار نہیں، کیا آپ کو اپنے اسلامی شعار کی کوئی غیرت و پاس نہیں، کیا آپ کو اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھانے، اپنا ایڈریس خراب کرنے اور پے در پے اپنا شدید نقصان کرنے، اپنی نیکی و شرافت و پرہیز گاری کو داغدار کرنے اور اپنی نمازوں کے نقصان، انہیں مکروہ بنانے کا کوئی افسوس نہیں؟

عالم خواب کی تفصیل

خدائے قدوس نے انسان کے باطن میں ایسی پراسرار قوتیں ودیعت فرمائی ہیں جن کی سراغ رسانی میں حکمائے قدیم وجدید نے اپنی عمریں صرف کر دی ہیں، مگر ان عجائبات کے سر کرنے میں جتنی کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں وہ اتنی مختصر ومحدود ہیں کہ ایک اتھاہ سمندر کے مقابلے میں جو نسبت ایک قطرے کی مقدار کی ہے وہی نسبت ان کی معلومات اور اس جہان باطن کے اسرار ورموز کے درمیان ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے فروتر درجہ کی نسبت ہے جس طرح کائنات خارجی بظاہر غیر محدود و بے انتہا ہے۔ ع

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

اسی طرح عالم نفس یا عالم اصغر کے اسرار ورموز بھی غیر محدود ہیں، عرفا اور صوفیائے کرام نے اس بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کی ہے، فلاسفہ وحکما نے اس کی بے انتہا وسعتوں کو ناپنے کی سعیٔ مسلسل کی ہے، ان کے علمی کمالات سے کون انکار کر سکتا ہے، بلاشبہ ان کی جگر سوزی اور دل سوزی سے اس دنیا کے بہت سے مخفی رموز سے ہم واقف ہو گئے ہیں، علم تشریح ابدان، وعلم نفسیات جدید نے اپنی کاوشوں اور باریک بینیوں کے ذریعہ ہماری معلومات میں بڑا اضافہ کیا ہے، لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ جتنا ہم کو معلوم ہو چکا ہے وہ مجہول کے مقابلے میں بہت کم ہے، اسی لئے ہر حالت میں ہم کو عجز و نارسائی کا احساس ہونا چاہیے، کیوں کہ کسی علم نے اب تک یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ ہم نے اپنی آخری منزل پالی ہے، اور سراغ رسانی کی آخری سرحد کو پار کر لیا ہے، انسان کا ذہن کیا ہے، اس کے اعمال وحرکات میں ربط وتسلسل کیسے ہے، جب حواس ظاہرہ نیند کی حالت میں مختل ہو جاتے ہیں تو حواس باطنہ میں علم واحساس کا چراغ کیسے جلتا رہتا ہے؟ انسان جس چیز کو بیداری کی حالت میں محسوس نہیں کرتا نیند کی حالت میں کیوں کر محسوس کر لیتا ہے؟ اس قسم کے سیکڑوں سوالوں کے جواب ابھی تک فلسفہ وحکمت کے ذمہ باقی ہے۔

روح انسانی کو جو حالات نیند میں پیش آتے ہیں بعض اوقات وہ سرتاسر باطل ہوتے ہیں، اور بعض کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ انسان جب سوجاتا ہے تو اس پر عجائب وغرائب کے دروازے کھل جاتے ہیں، اس کا جسد خاکی اگر چہ اس مادی دنیا میں میں محبوس ومقید ہوتا ہے مگر روح انسانی کی پرواز کے لیے وسیع تر کائنات مل جاتی ہے، انسان کبھی ان مقامات کی سیر کرتا ہے بیداری کی حالت میں جن کا اس کو تصور تک نہیں ہوتا، وہ کبھی بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفر کرتا ہے، تو کبھی دریاؤں میں تیرتا ہے، کبھی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے، اور کبھی طوفان، ابروباد سے دوچار ہوتا ہے، کبھی اس کی آنکھوں کو بجلیاں خیرہ کر دیتی ہیں، تو کبھی کڑک کی مہیب آواز سے لرز اٹھتا ہے، چاندوسورج کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اور فرشتوں سے باتیں کرتا ہے، اور کبھی شیطان سے، وہ آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرش الٰہی کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیتا ہے، اس کی پہنچ سدرۃ المنتہٰی تک ہوجاتی ہے، اور لوح وقلم کو دیکھتا ہے، دن میں رات کی تاریکی نظر آتی ہے، رات میں دن کا اجالا دکھائی پڑتا ہے، قوس وقزح کی رعنائیوں ودلفریبیوں کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، اور وہ اولہ و شبنم کی برودت سے ٹھنڈک محسوس کرتا ہے، قیامت اور اس کی ہولناکیاں اس کے سامنے ہوتی ہیں، وہ جنت کی سیر کرتا ہے، اور آتش دوزخ کو دیکھ کر خوف ودہشت سے اس پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے، انبیاے کرام **علیهم الصلوٰة والتسلیم** سے اس کی ملاقاتیں ہوتی ہیں جن کو اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتا ہے، خانۂ کعبہ کا طواف کرتا ہے، میدان عرفات اور منی ومزدلفہ میں مناسک حج ادا کرتا ہے، سرکار **علیه الصلوٰة والسلام** کے روضۂ اطہر کی زیارت سے اس کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے، وہ مرے ہوئے عزیزواقارب سے اس طرح باتیں کرتا ہے گویا وہ زندہ ہیں، اور مردوں کو زندہ دیکھتا ہے۔

غرض مسرت وشادمانی کے واقعات سے لے کر خوف وہراس کے حادثات تک اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، وہ کچھ دیکھتا ہے جس کو سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، وہ ایسی آوازوں کو سنتا ہے جن کو مادی کانوں سے نہیں سن سکتا، حتی کہ وراء الوریٰ، ذات

بے ہمتا و بے مثل سے اس کو ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، پھر آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے، اور انسان پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے بلکہ نیند کی حالت میں اس پر ایسے کوائف وحالات طاری ہوتے ہیں، جن سے متاثر ہو کر خوب خوب ہنستا ہے، اور اس کی ہنسی کی آواز کو دوسرے لوگ سنتے ہیں، رنج والم میں وہ روتا ہے اس کے رونے کی آواز دوسروں تک پہنچتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نیند بھی قدرت الٰہی کی نشانیوں میں سے ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ ابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ﴾ (الروم:۲۳)

خدا کی نشانیوں میں سے دن رات میں تمہاری نیند بھی ہے، اور (بیدار) ہو کر اس کا فضل تلاش کرنا، اس میں ان لوگوں کے لئے جو (بصیرت کی باتیں) سنتے ہیں قدرت کے بڑے دلائل ہیں۔

یہاں یہ باریک نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ نیند کی حالت میں سیر روحانی کتنے ہی اعلیٰ پیمانے پر ہو لیکن اس میں اور موت میں ایک گونہ مشابہت بھی پائی جاتی ہے، اس حالت میں انسان کے جسد خاکی سے روح جدا نہیں ہوتی، اور نہ ہی تمام تعلقات جسمانی ٹوٹ جاتے ہیں، تاہم بعض قوتوں میں اختلال و تعطل ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے قرآن نے اس کو موت سے تشبیہ دی ہے، ارشاد ربانی ہے:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۔(الزمر،آیۃ:۴۲)

اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے، اور جو نہ مرے انھیں ان کے سوتے میں، پھر جس پر موت کا حکم فرما دیا اسے روک رکھتا ہے (یعنی اس جان کو اس کے جسم کی

طرف واپس نہیں کرتا) اور دوسری (جس کی موت مقدر نہیں فرمائی اس کو) ایک میعاد مقرر تک چھوڑ دیتا ہے، (یعنی اس کی موت کے وقت تک) بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں، (کہ جو اس پر قادر ہے وہ ضرور مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے)۔

لیکن اس عارضی موت میں ہم ایسے واقعات و حادثات سے دوچار ہوتے ہیں ،جیسا کہ ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کیا ہے جن کی عقلی توجیہہ یا اس کی علت تک رسائی فلسفۂ قدیم اور نفسیات جدید نے بڑی تگ و دو کے بعد بھی اب تک نہیں کر پائی ہے۔ مثلا:

(۱) ایک شخص رات کو نیند میں دیکھتا ہے کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، وہ بہت پریشان ہوتا ہے اور روتا ہے، جب بیدار ہوتا ہے تو اس کو خواب سمجھ کر اپنے کو قابو میں لاتا ہے، اور صبح اٹھ کر گھر جاتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ پورا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے، اور کہرام مچا ہوا ہے کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

(۲) ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی آدمی آ کر اس سے کہہ رہا ہے کہ اس کا بھائی دو روز کے بعد آگ میں جل کر ہلاک ہو جائے گا، دو دن کے بعد واقعی یہ حادثہ پیش آ جاتا ہے۔

(۳) ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی اس سے بیان کر رہا ہے کہ کچھ لوگ اس کی بیوی کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالیں گے، وہ اپنے گھر آتا ہے، اس المناک حادثہ کی اس کو اطلاع ملتی ہے۔

اس قسم کے بہت سے خواب ایسے ہوتے ہیں جو ماضی و مستقبل کے واقعات کی بلا تمثیل وتشبیہ اطلاع و آگاہی دیتے ہیں، قدیم فلسفہ خواب کی علت یہ بیان کرتا ہے کہ انسانی ذہن و دماغ ہر آن مصروف عمل رہتا ہے، نیند کی حالت میں کہ اس کے ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں، لیکن باطن کی قوتوں کا عمل جاری رہتا ہے، اور انسان چونکہ عام طور پر گہری اور پرسکون نیند سوتا ہے، اس لئے اس کو حالت نوم کے اعمال کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی

گہری نیند نہیں ہوتی تو اس کو اپنے اعمال ذہنی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔

قدیم فلسفہ کے اس نظریہ سے واقعات بالا کی تشریح و تطبیق ممکن نہیں ہے۔

جدید نفسیات کا نظریہ یہ ہے کہ انسان بیداری کی حالت میں جن جذبات و خیالات، احساس و خواہشات کو اپنے ذہن کے نہاں خانے میں چھپا کر رکھتا ہے اور معقول وجوہ کی بنا پر ان سے صرف نظر کرتا رہتا ہے، وہی نیند کی حالت میں حقائق کا پیکر بن کر اس کی روح کو متاثر کرتے ہیں، مثلاً ہمارے خیال میں یہ آرزو مستتر تھی کہ ہمارا دشمن ہلاک ہو جائے یا ہمارے دوست سے ہماری ملاقات ہو جائے، اور دشمن کی ہلاکت کے مادی اسباب یا دوست سے ملاقات کے مادی ذرائع فی الحال مفقود ہیں اس لیے ان جذبات کو دماغی قوت اپنے مدفن میں دفن کر لیتی ہے، نیند کی حالت میں دشمن کی ہلاکت یا دوست سے ملاقات محسوس ہوتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جدید نفسیات کے اس نظریہ سے کیا مذکورہ بالا واقعات کی تطبیق ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی شخص اپنی والدہ کی موت کو بطور خواہش اپنے ذہن کے نہاں خانہ میں چھپا کر رکھے گا؟ کیا کوئی شخص اپنے بھائی کو آگ میں جلنے کی خواہش کرے گا؟ کیا کوئی شخص اس بات کی تمنا کرے گا کہ دوسرا اس کی بیوی کو زہر دے کر ہلاک کر دے؟ عام حالات میں ایسی خواہش اور جذبے نہیں ابھرتے، پھر اگر ایسی خواہش اور جذبے ابھرتے رہتے ہوں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خواہشات سے خارجی دنیا میں واقعات و حوادث کا ظہور کیسے ہوتا ہے؟

بیوی کو زہر دینے کی خواہش سے موت کیسے واقع ہو گئی؟ والدہ کے انتقال کا جذبہ خارج کی دنیا میں موت کا سبب کیسے ہو جاتا؟

اس بحث سے واضح ہوا کہ فلسفۂ قدیم اور جدید نفسیات دونوں عاجز و درماندہ ہیں کہ خواب کی کوئی ایسی تشریح و توجیہ پیش کریں جو اس کے تمام مناظر و واقعات پر منطبق ہوں۔

اس لیے آیئے قرآن حکیم وحدیث کریم کی مشعل لے کر اس جہانِ عجائبات کی سیر کریں، قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ (یونس: ۶۳ـ ۶۴)

جو لوگ ایمان لائے اور پرہیزگاری کرتے ہیں انہیں خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں، اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہ بڑی کامیابی ہے۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ کے اصحاب کرام **رضی اللہ عنھم** نے عرض کیا کہ یارسول اللہ **صلی اللہ تعالی علیہ وسلم** متقی مسلمان کے لئے دنیا میں کیا بشارت ہے؟ گویا آفتاب رسالت کے نجوم ہدایت اخروی بشارت کو تو سمجھ گئے تھے کہ مومن کامل آخرت میں رضائے الٰہی اور جنت نعیم کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا جائے گا، لیکن ان کے فہم سے یہ بات بالاتر تھی کہ دنیا میں بھی ان کے لیے بشارت ہوگی، کیوں کہ دنیا تو "**سجن المومنین**" ہے، اس لیے انہوں نے آپ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ مومن کا سچا خواب ہے جس میں اس کی فتح ونصرت اور غیبی امداد کی خوشخبری ہوگی یا اس کو یہ دولت لازوال ملے گی کہ وہ مکالمہ الٰہی سے نوازا جائے گا۔

اس آیت کریمہ کی مزید تشریح ایک دوسری حدیث سے ملتی ہے:

"ان الرسالة والنبوة قد انقطعت، لا رسول بعدی ولا نبي، قال: فشق ذلك على الناس، فقال :لكن المبشرات، فقالوا: یا رسول اللّٰه ﷺ وما المبشرات؟ قال: رؤیا المسلم وهي جزء من اجزاء النبوة"(الجامع الصغیر: حدیث ۱۹۹۴)

بلا شبہ نبوت اور رسالت ختم ہوگئی، اب میرے بعد کوئی رسول اور نبی نہ ہوگا، راوی حدیث کا بیان ہے کہ آپ کا یہ ارشاد جب لوگوں پر گراں گزرا تو آپ نے فرمایا کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ تو ختم ہوگیا لیکن بشارت دینے والی چیزیں ہیں، صحابہ نے عرض کیا کہ مبشرات کیا ہیں؟ تو سرکار **علیہ الصلوٰۃ والتسلیم** نے جواب میں ارشاد فرمایا: وہ مومن کا خواب ہے، اور وہ اجزاء نبوت میں سے ایک جز ہے۔

قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ اور حضور **صلی اللہ تعالی علیہ وسلم** کی احادیث کریمہ سے واضح ہوا کہ سیر دماغی جو نیند کی حالت میں ہوتی ہے، وہ مطلقاً حاصل نہیں ہے، بلکہ نیک دل، پاک باطن، متقی آدمی کا خواب خدا عزوجل کی طرف سے بشارت ہوتا ہے، اوراس میں تائید الٰہی اور امداد خداوندی کا مژدہ سنایا جاتا ہے، اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ نبوت کا جز ہے، یعنی پیغمبرانہ خصائل وحمائد میں داخل ہے، چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی **رضی اللہ عنہ** "**جزء من اجزاء النبوة**" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ظاہر آن ست مراد بجزئیت حقیقت آں کہ متعارف مصطلح معقول است نیست بلکہ مراد آں ست کہ رؤیاے صالحہ از لواحق نبوت وصفات انبیاے **علیہم الصلوٰۃ والسلام** بعد از انبیاباقی بود، وغیر انبیا بداں موصوف، مقصود مدح رویاواعلاے درجۂ ا واست، یعنی پرتو ازآں عالم است وبہ بداں است، اگرچہ صاحب او نبی نہ باشد، چنانچہ درحدیث دیگر آمدہ است کہ راہ روشن نیکو وعلم گراں باری ومیانہ روی از نبوت است بلکہ جمیع صفات کمال اصل ازانجا"۔

نبوت کا جز ہونے سے مراد فلسفیوں کا متعارف اور اصطلاحی معنی نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ رویاے صالحہ نبوت کے لواحق اور صفات انبیا **علیہ الصلوٰۃ والسلام** سے ہے ،اور انبیا کی صفات ان کے بعد باقی رہتی ہیں، اور غیر انبیا ان سے موصوف ہوتے ہیں، اس ارشاد گرامی سے مقصود رویا کی تعریف اور اس کے درجہ کی بلندی کو ظاہر کرنا ہے، یعنی نبوت کا یہ عکس ہے اور اس کے مشابہ ہے، اگرچہ ایسا خواب دیکھنے والا نبی نہ ہو، جیسے کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اچھا اور سیدھا راستہ، علم، تحمل، اعتدال، میانہ روی، نبوت کا حصہ ہے، بلکہ تمام صفات کمال کی اصل اسی جگہ سے ہے۔

جب رویاے صالحہ پیغمبران عظام کے صفات کمال میں داخل ہے، اور اسی وجہ سے حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** نے اس کو نبوت کا ایک حصہ قرار دیا ہے، تو پھر مطلقاً رویا یا

خواب کو پراگندہ خیالات کا احساس نفس یا تمناؤں یا آرزوں کا پیکر بتانا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ جس کی اصل نبوت سے جا کر جڑتی ہو، اس کو بے اصل کہنا کہاں کی دانشمندی ہے ؟البتہ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواب کبھی خواہشات وجذبات کی عکاسی کرتا ہے، تو پھر کیسے کہا گیا کہ یہ نبوت کی صفات میں سے ہے؟۔

اس عقدے کی گرہ کشائی پیغمبر اسلام **صلی اللہ علیہ وسلم** نے حدیث ذیل میں فرمائی ہے، حضرت ابو ہریرہ **رضی اللہ عنہ** سے روایت ہے کہ سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے ارشاد فرمایا کہ:

''قرب قیامت میں مومن کے بیشتر خواب سچے ہوں گے، مسلمانوں میں زیادہ سچ بولنے والا، خواب میں زیادہ سچا ہوگا، اس کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جز ہے، اور خواب کی تین قسمیں ہیں، {۱} رویاے صالحہ (اچھا خواب) جو اللہ کی طرف سے ایک بشارت ہے، {۲} شیطان کی طرف سے ڈراؤنا خواب، {۳} انسان کے خیالات جو بیداری کی حالت میں اس پر مسلط رہے، اور جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو کھڑے ہو کر تھوکے اور لوگوں سے بیان نہ کرے''۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ خواب کو صرف ایک صورت میں منحصر کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کی تین قسمیں ہیں اور جو خواب صفات نبوت میں سے ہے، وہ رویاے صالحہ ہیں۔

اس حدیث سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ عقل پرستوں نے خواب کے بارے میں جو نظریات قائم کیے ہیں وہ خواب کی تیسری قسم پر منطبق کیے جا سکتے ہیں، باقی خواب کی دو قسموں پر ان کی ''موشگافیاں'' کسی طرح صادق نہیں آسکتیں اور جو خواب نبوت کے بلند صفات میں شامل ہے محض ''خواب وخیال'' نہیں ہوا کرتے ہیں، واقعات کی دنیا سے ان کا گہرا ربط وتعلق ہوا کرتا ہے، یعنی انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو مادی اور محسوس دنیا میں یا جو ہونے والے ہیں، یا ماضی اور حال کے واقعہ کی صحیح عکاسی اور جلوہ نمائی کرتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام **صلی اللہ تعالی علیہ وسلم** نے خواب کی جو دو

قسمیں، رویاے صالحہ وتخویف شیطان بیان فرمائی ہیں وہ حکما اور فلاسفہ کے نزدیک ثابت نہیں ہیں، وہ مذہبی خوش عقیدگی کی بنا پر تسلیم کیے جاسکتے ہیں، لیکن عقل ومنطق کے دلائل کی قوت ان کی پشت پناہی نہیں کرتی، نہ جدید نفسیات سے ان کا ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے۔

اس کے جواب میں اولاً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خواب کی جوتوجیہہ عقل پرستوں نے دور قدیم اور عصر حاضر میں کی ہے اس کے لیے قطعیت کے ساتھ یہ کیسے فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ اس کے مطابق جن خوابوں کا وجود ہوگا وہی عقل سلیم کے نزدیک لائق تسلیم ہوں گے، اوراس کے علاوہ کے ماننے میں عقل وخرد کا دیوالہ نکل جائے گا، ثانیاً میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس مضمون میں میں نے بیان کیا ہے کہ سینکڑوں خواب ایسے ہوتے ہیں جو ماضی اور مستقبل کے واقعات کی ہوبہوتصویر ہوتے ہیں، جن میں جو کچھ دیکھا گیا وہی اس خارجی دنیا میں موجود پایا گیا، اور یہ معاملہ ایک عالم، ایک جاہل، ایک غیر متمدن دیہاتی، ایک متمدن شہری سب کو آئے دن پیش آتا رہتا ہے، بلفظ دیگر سچا خواب مومن، کافر، شقی وسعید، بوڑھے اور جوان سب دیکھتے رہتے ہیں، پھر ایسی بات جس کا بار بار مشاہدہ اور تجربہ کرلیا گیا ہو یا ایسا معاملہ جو سب کو آتا رہتا ہو اس کو غلط قرار دینے کی کوئی عقلی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی، زیادہ سے زیادہ اتفاق کا سہارا لیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص نے ایک خواب دیکھا، مادی دنیا میں اس کے مطابق کسی شے کو موجود پایا گیا، جیسے کسی فرضی داستان میں تخیل کی بلند پروازی سے ایک المناک حادثہ کو بیان کیا گیا، اس کی مطابقت کسی شخص کے واقعہ سے ہوجائے تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ فرضی داستان اس شخص کے احوال واقعی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح خواب اور واقعہ میں کبھی مطابقت پائی جاسکتی ہے، جو محض اتفاقی معاملہ ہوتا ہے، اس کو سند مان کر خواب کی مذہبی یا ماورائی تشریح قابل قبول نہیں ہوسکتی، لیکن اس وسوسے کا ازالہ اس طرح ہوجاتا ہے کہ اگرچہ ہر شخص کا ہر خواب واقعہ ثابت نہیں ہوتا ہے تاہم اس دنیا میں ایسے انسان کم ہوں گے جن کا خواب غلط ثابت ہوا ہو، بیشتر انسان ایسے ہیں جن کو یہ سابقہ پڑا ہوگا کہ کسی نہ کسی وقت ان کا کوئی نہ کوئی خواب واقعہ کے مطابق ضرور

ہوا ہوگا، اس لیے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے تجربات کو اتفاق پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے؟ اگر اتفاق اسی کو کہتے ہوں کہ اس میں ہزاروں انسانوں کی سچائی اور صداقت کی جھلک پائی جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس اتفاق کے پس پردہ کسی علت کی کارفرمائی ہے، کیوں کہ وہ واقعہ جو بیشتر انسانوں کو پیش آئے اور اس میں ہر شخص بیک آواز حقیقت کی ترجمانی کرے ناممکن ہے کہ بغیر کسی علت کے وجود میں آجائے، اس لئے خواب کی مطابقت کی توجیہ اتفاق سے کرنا ہمارے نزدیک بے عقلی کی دلیل ہے، لہٰذا تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کے پس پردہ قادر مطلق کی کارفرمائی کا دست قدرت اپنی گل کاریاں دکھا رہا ہے، جس کے اشارے کے بغیر عالم خواب میں حواس ظاہر کے معطل ہو جانے کے بعد اتنے سارے واقعات ذہن انسانی میں نہیں پیدا ہو سکتے، جو خارج کی دنیا سے مطابقت رکھتے ہوں۔

بس ہماری اس وضاحت سے ثابت ہوا کہ پیغمبر اسلام **علیہ الصلوٰۃ والسلام** نے خواب کی جو تقسیم فرمائی ہے وہ اپنے طور پر قطعاً درست ہے، اور اس کو کسی عقلی دلیل کے ذریعہ باطل نہیں کیا جا سکتا۔

کیا بندوں کا حق خدائے تعالیٰ پر ہے؟

بعض غیر مقلدین جو نجدی تحریک کی آلودگی سے ملوث ہوکر دعاؤں میں توسل بالانبیاوالاولیا کے نہ صرف منکر بلکہ اس کو شرک و بدعت کہتے ہیں، فقہ حنفی کی کتابوں سے یہ سند لاتے ہیں کہ "**ویکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلاں او بحق انبیائک ورسلک**" یعنی دعا میں **بحق فلاں یا بحق انبیائک ورسلک** کہنا مکروہ ہے، مزید یہ الزام دیتے ہیں کہ مقلدین خود فقہی مسئلہ میں فقہ حنفی کی مخالفت کرتے ہیں کہ دعاؤں میں وسیلہ کے جواز واستحسان کے قائل ہیں حالاں کہ فقہ حنفی کی کتابوں سے اس کی کراہت ثابت ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ہدایہ" میں علامہ برہان الدین اس کی کراہت کی دلیل ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ "**لانہ لا حق للمخلوق علی الخالق**" کیوں کہ مخلوق کا کوئی حق خالق پر نہیں ہے، اس لیے دعا کرنے والا اپنی دعا میں "بحق فلاں" کہتا ہے، تو گویا وہ ولی یا نبی کا حق خدائے تعالیٰ پر جتاتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی حق جب کسی کا خدائے تعالیٰ پر نہیں ہے، تو اس قسم کی دعا کی کراہت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن احادیث کریمہ میں "**حق العباد علی اللہ**" آیا ہے، چنانچہ امام بخاری و مسلم نے یہ حدیث روایت کی ہے:

"**عن معاذ قال کنت ردف النبی ﷺ علی حمار لیس بینی وبینہ الامؤخرۃ الرجل، فقال: یامعاذ! ھل تدری ماحق اللہ علی العباد وماحق العباد علی اللہ؟ قلت :اللہ ورسولہ اعلم، قال: فان حق اللہ علی العباد ان یعبدوہ ولا یشرکوا بہ شیئا وحق العباد علی اللہ ان لا یعذب من لا یشرک بہ شیئا ،قلت: یارسول اللہ ﷺ افلا ابشر بہ الناس قال لا تبشرھم فیتکلوا**"۔(صحیح مسلم، حدیث:۳۰)

حضرت معاذ سے مروی ہے کہ میں ایک گدھے پر حضور کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، ہمارے اور سرکار دوعالم ﷺ کے درمیان صرف کجاوہ کا آخری حصہ تھا، سرکار دوعالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول خوب جاننے والے ہیں ،آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ اس کو عذاب نہ دے، جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے ، میں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت دے دوں؟ آپ نے فرمایا کہ بشارت مت دو لوگ بھروسہ کرلیں گے۔

اور یہ حدیث بھی صحیح ہے۔

”من آمن بالله ورسوله واقام الصلوٰة وصام رمضان کا ن حقا علی الله ان یدخله الجنة ،هاجر فی سبیل الله اوجلس فی ارضه التی ولد فیها“

(صحیح بخاری، حدیث: ۷۴۲۳)

جو شخص ایمان اللہ اور اس کے رسول پر لائے اور نماز قائم کرے، رمضان کا روزہ رکھے ،تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم یہ ہوگا کہ اس کو جنت میں داخل کردے، اللہ کے راستے میں ہجرت کرے یا اپنی زمین پر بیٹھا رہے جس میں وہ پیدا کیا گیا تھا۔

ان دونوں حدیثوں سے یہ دلیل ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے کہ بندہ کا کوئی حق کسی معنیٰ میں خالق السماوات والارض پر نہیں ہے، بلکہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بندوں کا بھی حق خدائے تعالیٰ پر ہے۔

ایک شبہہ:

لیکن اس مقام پر یہ شبہہ باقی رہتا ہے کہ حقوق وفرائض اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندہ پر عائد ہوں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے بھی حقوق ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتے ہیں ،جس طرح بندہ حقوق اللہ کی ادئیگی کے بغیر اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوسکتا ،اسی طرح حق العبد کی بجاآوری بھی خدائے برتر وتوانا کے لیے ضروری ہے ،اس سے خدائے تعالیٰ کی عظمت وکبریائی پر بے جا

جسارت پیدا ہوتی ہے، اور معاذ اللہ یہ واضح ہوتا ہے کہ خالق ومخلوق کے مابین گویا ''معاہدہ حقوق'' ہوگیا ہے، جس کی بجا آوری دونوں فریقوں پر لازم ہے، یہ بات قطعاً خدا کی قدوسیت وجبروتیت کے منافی ہے، اوراس کے اقتدار اعلیٰ وحاکمیت مطلقہ کے خلاف جاتی ہے۔

ازالہ شبہہ:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی **رحمۃ اللہ علیہ** تفسیر فتح العزیز میں ''**فتلقیٰ آدم من ربہ کلمات**'' کی تفسیر میں حاکم، ابونعیم، بیہقی کی روایت نقل فرماتے ہیں کہ:

''حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب آدم سے لغزش سرزد ہوگئی اور وہ معتوب ہوئے تو قبول توبہ کے لیے سرگشتہ وحیران رہے، اچانک ان کو یاد آیا کہ جس وقت حق تعالیٰ نے مجھ کو پیدا فرمایا تھا اور اپنی خاص روح میرے قالب میں پھونکی تھی اس وقت میں اپنے سر کو عرش اعظم کی طرف اٹھا کر دیکھا تھا، اس میں لکھا ہوا تھا کہ ''**لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ** ﷺ'' اس سے میں نے جانا کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک محمد سے زیادہ معزز نہیں ہے، کیوں کہ ان کے نام کو اپنے نام کے برابر لکھا ہے، اب تدبیر یہ ہے کہ ان کے حق سے میں دعاے مغفرت کروں پھر آدم نے کہا کہ ''**اسئلک بحق محمد**'' الخ خداے تعالیٰ نے آدم کی مغفرت فرمائی۔

حضرت آدم **علیہ السلام** کے قبول توبہ کے بارے میں اس روایت کے ذکر کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** فرماتے ہیں کہ:

''درایں جا باید دانست کہ در کتب فقہ مذکور است کہ دعا کردن بحق کسے مکروہ است زیرا کہ کسے را بر خداے تعالیٰ حقے نمی باشد''۔

پھر حق العبد علی اللہ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معتزلہ کے نزدیک بندے خود اپنے افعال کے خالق ہیں، اس طور پر لازم آتا ہے کہ ان افعال کی جزا خداے تعالیٰ پر حق حقیقی ہے اور اہل سنت کا مذہب ہے کہ افعال عباد کا خالق خداے تعالیٰ ہے تو بندوں کا ان افعال کی جہت سے کوئی حق خداے تعالیٰ پر حقیقتاً ثابت نہیں ہوتا، بلکہ خداے

تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنے وعدہ کے مطابق ضرور افعال عباد کی جزا دے گا، لہٰذا دونوں حدیثوں میں حق العباد علی اللہ سے یہ مراد ہے کہ اپنے ذمہ کرم پر یہ کیا ہے کہ ضرور میں بندوں کے افعال حسنہ کا صلہ دوں گا، اس سے خدائے پاک کی قدوسیت و جبروتیت پر کوئی اثر پڑنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، اور نہ ہی اس کے اقتدار اعلیٰ وحاکمیت مطلقہ کے خلاف یہ بات جاتی ہے، اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں جو یہ مذکور ہے کہ بحق فلاں دعا کرنا ممنوع ہے اس حق سے مراد حق حقیقی ہے، اس لیے اگر حق تفضّل مراد لیا جائے جیسا کہ حضرت آدم کی دعا میں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم یہ کیا ہے کہ ضرور اپنے نیک بندوں کو نیک جزا اور بہترین صلہ سے نوازے گا، تو اس کے عدم جواز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی، پھر یہ نقطہ بھی لائق اعتنا ہے کہ: ''از بس کہ درزمانہ سابق مذہب معتزلہ رواج بسیار داشت واستعمال ایں لفظ موہم مذہب ایشاں شد فقہا مطلقاً از استعمال ایں لفظ منع نمودند تا خیال بآں مذہب نہ رود''۔ یعنی زمانہ سابق میں معتزلہ کا مذہب بہت رائج رہا اور اس لفظ کے استعمال سے ان کے مذہب کی طرف خیال جاتا تھا، تو فقہا نے مطلقاً اس لفظ کے استعمال سے روک دیا تاکہ کسی کا خیال ان کے مذہب کی طرف نہ جائے، لیکن متاخرین فقہا نے جب یہ دیکھا کہ معتزلہ کے مذہب کا خدوخال صرف تاریخ کے آئینہ میں نظر آتا ہے، اور صفحۂ ہستی پر اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا، نیز اس لفظ کے استعمال پر کوئی نہی شارع اسلام کی جانب سے نہیں وارد ہوئی ہے بلکہ اس کا استعمال حدیثوں میں ہوا ہے، تو وہ اس کے جواز واِستحسان کے قائل ہوئے۔

شعار اسلام

❁❁

اسلام میں مکارم اخلاق اور صفات محمودہ کی تلقین و ہدایت نہایت اعلی پیمانے پر کی گئی ہے، نبی امی **فداہ ابی و امی** کی زبان فیض تر جمان سے جن اخلاقی قدروں کی اہمیت و فضیلت کا بیان بڑے حسین پیرایہ اور بلیغ اور موثر انداز میں کیا گیا ان میں شعار اسلام کو بلند و ارفع مقام حاصل ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

”لاتدخلون الجنة حتیٰ تومنوا ولا تومنوا حتیٰ تحابوا اولاادلکم علی شئ اذافعلتموہ تحاببتم، افشوالسلام بینکم“ ۔(صحیح مسلم، حدیث: ۵۴)

تم لوگ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ ایمان لے آؤ اور تم مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ ایک دوسرے سے محبت کرو، کیا تمہیں وہ تدبیر نہ بتاؤں جس کو اختیار کر کے آپس میں محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے کہ) آپس میں سلام پھیلاؤ۔

اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب واقوام میں بھی کچھ ایسے جملے اور طریقے پائے جاتے ہیں، جو ایک دوسرے کو مائل کرنے والے باہمی الفت و محبت پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، اوران کو اعزاز وتکریم کا ذریعہ بھی قرار دیا جاتا ہے، مثلاً ایک غیر مسلم ہندو اپنے جیسے دوسرے غیر مسلم سے ملتا ہے تو ”نمسکار“ کا لفظ اس کے سامنے دست بستہ ہو کر بڑے پر تپاک انداز میں استعمال کرتا ہے، اور اپنے مسلمان شناسا سے ملتا ہے تو اس کے لئے بالعموم ”آداب عرض“ کا لفظ پیش کرنا ایک مہذب طریقہ تصور کرتا ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو ملاقات اور مراسلت کے وقت بطور تکریم یا دعا ایک دوسرے کے لئے بولے اور لکھے جاتے ہیں، لیکن اگر کوئی ہندوستانی یا انگلستانی یا چینی مسلمان اپنی مادری زبان کا استعمال کر کے وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہو جائے کہ ایک مسلمان کا وہ حق ادا کر دیا جو ملاقات کے وقت دوسرے مسلمان کا ہوتا ہے، تو اس کی یہ سادہ لوحی اور لاعلمی کی دلیل ہوگی، کیوں کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے جس

کے ماننے والے اور احکام الٰہی کے پیروی کرنے والے کم و بیش دنیا کے کونے کونے میں پائے جاتے ہیں، سیکڑوں زبانوں میں گفتگو کرتے ہیں مگر یہ سب دین حنیف کی ''حبل متین'' یعنی ایک مضبوط رسّی سے بندھے ہوئے ہیں، اسلام کے دامن مقدس سے وابستہ ہونے کے ناطے جغرافیائی حد بندیاں ان کو اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہونے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتیں، ان سب پر لازم ہے کہ زبان و بیان کے اختلاف کے باوجود اسلامی شعائر کی پابندیاں انہیں طریقوں اور انہیں الفاظ سے کریں جن الفاظ اور طریقوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کارگاہ حیات میں اسلامی تہذیب سے آراستہ انسانوں یعنی مسلمانوں کے لئے متعین و مقرر کر دیا ہے، ان سے ذرہ برابر انحراف اسلام کی کشش و جاذبیت کی قوت میں ضعف کے آثار پیدا کر دیتا ہے، فرض کیجیے کوئی بنگلہ دیشی یا کوئی چینی یا کوئی جاپانی مسلمان ہو وہ ''**السلام علیکم**'' کے بجائے اپنی زبان کا ہم معنی لفظ (بالفرض ان کی زبان میں موجود ہو) استعمال کرے تو اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ اس نے طریقۂ اسلام سے انحراف کی روش اختیار کی ہے۔

اس لیے دنیا کے کسی ملک کے رہنے والے مسلمان ہوں، کالے ہوں یا گورے ان کا رنگ و روپ کیسا ہو اور کوئی بولی بولنے والے ہوں سب کے لئے ضروری ہے کہ باہمی ملاقات یا مراسلت کے وقت وہ الفاظ جو ''**السلام علیکم**'' کے ہم معنی ہوں یا بے معنی ہو ں استعمال نہ کریں، بلکہ ''**السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ**'' جیسے جامع و پرکشش ،نہایت سادہ بامعنیٰ اور سبک الفاظ استعمال کریں، کیوں کہ یہ دعاے خیر و برکت کے علاوہ باہمی ربط و تعلق اور محبت و انس کا ایک ذریعہ ہے، بالفاظ دیگر ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کے اوپر حق ہے کہ جب ملاقات ہو تو خندہ پیشانی سے اس کو سلام کرے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں کے آپس کے حقوق بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے اوپر یہ حقوق ہیں''۔

(۱) جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرے۔ (۲) وفات پا جائے تو اس کے جنازہ میں حاضر ہو۔ (۳) وہ دعوت دے تو اس کی دعوت منظور کرے ۔ (۴) اس سے

ملاقات ہوتو سلام کرے۔(۵) جب اسے چھینک آجائے، تو اس کا جواب دے۔(۶) ہر حالت میں خواہ حاضر ہو یا غائب اس کا خیر خواہ رہے۔(ملخصاً نسائی بحوالہ مشکوٰۃ باب السلام ،ص ۳۹۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کرنے کا حکم:

محاسن اخلاق میں سلام کو جو رتبۂ بلند حاصل ہے، اس کا اندازہ سورۂ انعام کی اس آیت کریمہ سے کیا جاسکتا ہے، جس میں خود سرکار **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کو ان کی خدمت اقدس میں حاضر آنے والے مسلمان کو طریقۂ سلام سکھانے کے لیے سلام کرنے کا حکم دیا گیا، ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾{سورہ انعام: ۵۴}

اے رسول! جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہیں، تو آپ ان سے ''**سلام علیکم**'' کہیے، تمہارے پروردگار نے اپنی ذات پر اپنے فضل سے مہربانی لازم کرلی ہے، جس نے تم میں سے برا کام نادانی سے کرلیا، پھر اس کے بعد توبہ کرلی، اور اپنے کو درست کرلیا، تو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دار فانی میں اپنے قول و فعل سے تعلیم امت کے لیے تشریف لائے ، اس لیے اللہ کی جانب سے ان کو یہ ہدایت کی گئی کہ آپ خود سلام کرکے مسلمانوں کو سلام کا طریقہ سکھا دیں ، لہٰذا امت کو یہ ہدایت ملی کہ جن الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو سلام کرنے کی تعلیم دی انہیں الفاظ میں مسلمان کو سلام کرنا چاہیے، اور دوسرے الفاظ اپنی طرف سے ایجاد نہیں کرنے چاہیے، کیوں کہ اس ''بدعت حسنہ'' کی ''**السلام علیکم**'' کے مقابلہ میں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

بعض مفسرین کرام نے اس آیت کریمہ کا مطلب کچھ اور بیان کیا ہے، لیکن سورۂ

نور کی آیت کریمہ اس بارے میں اتنی واضح ہے کہ اس سے کوئی دوسرا مفہوم نہیں بیان کیا جا سکتا، اور ارشاد فرمایا گیا کہ:

﴿ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ تَحِیَّۃً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً ﴾ (سورہ نور، آیۃ: ۶۱)

پھر جب گھروں میں تم داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو، یہ اللہ کی طرف سے بابرکت پاکیزہ دعاے بقاے حیات ہے۔

سورۂ نور کی اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ لفظ ''**السلام علیکم**'' دعاے سلامتی و عافیت کے علاوہ بقاے حیات کی بھی دعا ہے، اس لیے اس مؤثر اور بامعنیٰ طریقہ سلام کے علاوہ دوسرے الفاظ سے سلام کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی، ''**السلام علیکم**'' یا اس سے ملتے جلتے الفاظ مثلاً ''**سلام علیکم**'' پر اکتفا کرنا چاہیے، لیکن اس مقام پر بعض ذہنوں میں یہ خلش پیدا ہو سکتی ہے کہ جب سورۂ نساء کی آیت کریمہ :''**فاذا حییتم بتحیة (الخ)**'' میں صاف لفظوں میں تحیت کا حکم دیا گیا ہے، تو پھر اس کے بجائے لفظ سلام ہی پر کیوں زور دیا جاتا ہے، اور کیوں اصرار کیا جاتا ہے کہ ''**السلام علیکم**'' ہی شعار اسلام ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ:

اس موقع پر تمام خلش ذہنی کے ازالہ کے لئے حضرت علامہ احمد صاوی مالکی کے تفسیری حواشی کو پیش نظر رکھنا چاہیے، وہ فرماتے ہیں:

''والتحیة في الاصل الدعاء لطول الحیاۃ، و کانت العرب اذا یلقی بعضهم بعضا یقول: حیاك الله، ثم استعمل في الاسلام، وانما اختیر لفظ السلام علی لفظها الاصلی لانها اتم وانفع ،لان السلام معناه السلامة من الآفات الدنیویة والاخرویة،ورحمة الله انعامه واحسانه وبرکاته حفظه من

الزوال، واما طول الحياة فلا يلزم منه السلامة من الآفات بل قد يكون طول الحياة مذموما كما اذا كان في المعاصي وكان السلام بهذا المعنى اتم واكمل‘‘۔{حاشیہ صاوی شریف علی الجلالین،ص ۲۰۴}

اور تحیۃ دراصل درازیٔ عمر کی دعا ہے، اور عرب جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے، تو ’’ **حیاک اللّٰہ** ‘‘ کہتے تھے، پھر یہ لفظ اسلام میں استعمال کیا گیا، اور صرف لفظ اسلام کو تحیت کے اصل لفظ پر ترجیح دی گئی، کیوں کہ یہ زیادہ مکمل اور زیادہ فائدہ دینے والا ہے، اس لیے کہ **السلام** کا معنیٰ آفات دنیویہ واخرویہ سے سلامتی ہے، اور **رحمة اللّٰہ** کا مفہوم اللہ کا انعام، اور اس کا احسان ہے، اور **برکاتہ** کا مفہوم تباہی و بربادی سے حفاظت ہے، باقی رہی درازیٔ عمر تو اس سے لازم نہیں ہے کہ آفات سے حفاظت ہو، بلکہ کبھی درازیٔ عمر مذموم ہوتی ہے جیسے کہ عمر معاصی میں گزرے، خلاصہ یہ ہے کہ **السلام** اس معنیٰ میں مکمل اور کامل تر ہے۔

مفسرین کرام کا اتفاق:

حضرت احمد صاوی کی اس تفسیر سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوکر سامنے آ گئی کہ قرآن حکیم کی آیت کریمہ میں تحیۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد ’’**السلام علیکم**‘‘ ہے نہ خود تحیۃ کا لفظ بولنا اور استعمال کرنا، مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تحیت سے مراد لفظ ’’**سلام**‘‘ ہے، چنانچہ حضرت علامہ بدرالدین عینی حنفی آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تحیت کا حکم عام لفظ **السلام** کے ساتھ خاص ہے‘‘۔{حاشیہ بخاری شریف، باب السلام، ص:۹۲۰}

ان کے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ جس لفظ سے بقاے حیات کی دعا ہو وہ تحیت اور اس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن لفظ ’’**السلام علیکم**‘ پر علماے کرام کا اجماع ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں:

’’معنیٰ الآية اذا سلم عليكم المسلم فردوا اليه افضل مما سلم أوردو

إليه بمثل ماسلم به، فالزيادة مندوبة والمماثلة مفروضة"۔(ایضا)

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان تم کوسلام کرے تو اس کے سلام کا بہترین جواب دو، یا اس کے مثل جواب دو، بہتر جواب دینا مستحب ہے، اور اس کے مثل جواب دینا فرض ہے۔

اس آیت کریمہ کی بہترین تفسیر بخاری ومسلم کی یہ حدیث صحیح ہے کہ:

"عن ابی هريرة قال ،قال رسول الله ﷺ خلق الله اٰدم على صورته، طوله ستون ذراعا،فلما خلقه قال إذهب فسلّم على هٰؤلاء النفر،وهم نفر من الملائكة جلوس، فاستمع ما يحيونك فانها تحيتك وتحية ذريتك ،فذهب فقال :السلام عليكم ،فقالوا السلام عليك ورحمة الله قال فزادوه رحمة الله"۔{بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ شریف باب السلام ۳۹۸}

حضور **عليه الصلوٰة والسلام** نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی شکل وصورت پر پیدا کیا، اوران کا قد ساٹھ ہاتھ کا تھا، ان کو پیدا کرنے کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ جاؤ اور اس گروہ ملائکہ کو سلام کرو، وہ بیٹھے ہوئے ہیں، پھر غور سے سنو پھر وہ جو کچھ تمہارے لئے تحیۃ کریں یعنی بقاے حیات کی دعا کریں وہی تمہاری اورتمہاری ذریت کی بقاے حیات کی دعا ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کے پاس جاکر **السلام عليكم** کہا، انہوں نے جواب میں **السلام عليك ورحمة الله** کہا، آپ نے فرمایا کہ فرشتوں نے **ورحمة الله** کا اضافہ کیا۔

اس حدیث پاک میں واضح لفظوں میں بیان کیا گیا کہ اولاد آدم کی تحیۃ "**السلام عليكم ورحمة الله**" کے الفاظ ہوں گے ،خواہ وہ مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں رہتے ہوں، سب کا شعار اسلامی ان الفاظ کے سوا دوسرے الفاظ نہیں ہو سکتے ،اس لیے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو باہمی ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت حضرت آدم **عليه السلام** اور فرشتوں کا طریقۂ سلام اختیار کرنا چاہیے، نہ کے تحیۃ کا لفظ لکھنا اور بولنا چاہیے۔

بخاری و مسلم شریف کی اس حدیث پاک کے علاوہ ترمذی اور ابوداؤد کی حدیث پاک زیادہ جامع تفسیر قرار دی جاسکتی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک شخص نے حاضر ہوکر **السلام علیکم** کہا، آپ نے اس کو جواب دیا ،اور وہ بیٹھ گیا، پھر آپ نے فرمایا کہ اس کے لئے دس نیکیاں ہیں، اس کے بعد دوسرا شخص آیا تو اس نے کہا **السلام علیکم ورحمة الله**، اس کے سلام کا جواب دے کر فرمایا اس کے لیے بیس نیکیاں ہیں، پھر تیسرا شخص آیا اس نے **السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته** کہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بھی انہیں لفظوں میں جواب دیا، اور یہ بھی بیٹھ گیا، پھر آپ نے فرمایا اس کے لیے تیس نیکیاں ہیں۔

انہیں احادیث کریمہ کی روشنی میں مفسرین کرام نے فرمایا کی تحیۃ کا لفظ عام لفظ **السلام علیکم** کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بیان کیا گیا، پھر کیا کسی کے لئے گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اس آیت کریمہ سے استدلال کرے کہ لفظ تحیت مسنونہ وغیرہا لفظ **السلام علیکم** کا بدل الکل بمعنی مکمل بدل ہے، میرے اپنے خیال میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سے ہم کو یہی درس حیات ملتا ہے کہ اسلام کا شعار **السلام علیکم** ہے، نہ کہ تحیت وغیرہ الفاظ ، پھر مفسرین کرام کا اتفاق بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

آیت کریمہ سے تحیۃ کی تفسیر:

"**القرآن یفسر بعضه بعضا**" قرآن کا بعض، بعض کی تفسیر کرتا ہے، اگر کسی آیت کریمہ کی تفسیر دوسری آیت سے ہورہی ہو تو آیت کے مفہوم و معنیٰ کے متعین کرنے میں یہ دلیل قطعی ہے، اس اصل عظیم کو تمام ائمۂ کرام کے نزدیک تسلیم کیا جاتا ہے، اس لیے آیئے غور وفکر کرلیا جائے کہ قرآن میں لفظ تحیۃ کا کیا مفہوم بیان کیا گیا ہے، اگر یہ ثبوت فراہم ہوجائے کہ تحیت سے مراد لفظ سلام ہے، تو پھر زیادہ بحث ومباحثہ کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

ذیل کی آیت کریمہ ہم کو دعوت نظر وفکر دیتی ہے:

سورہ یونس میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ﴾ {یونس، ۱۰}

جنتیوں کی پکار جنت میں "**سبحانک اللهم**" ہوگی، اوران کی تحیت میں **سلام** ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا کہ جنتی لوگ جنت میں یہ نغمہ سرائی کریں گے کہ اللہ تیری ذات پاک ہے، اور وہ باہم ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

عصر جدید کے رئیس المفسرین بلکہ مفسر اعظم حضرت صدر الا فاضل علیہ الرحمہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اہل جنت آپس میں ایک دوسرے کی تحیۃ وتکریم سلام سے کریں گے، یا ملائکہ انہیں بطور تحیۃ سلام عرض کریں گے، یا ملائکہ رب عزوجل کی طرف سے ان کے پاس سلام لائیں گے۔

حضرت صدر الا فاضل رحمۃ اللہ علیہ نے تحیت کا یہ مفہوم واضح کیا کہ جنتی لوگ آپس میں جو سلام کریں گے، وہ سلام بطور دعا نہیں ہوگا، بلکہ برائے تعظیم وتکریم ہوگا۔

سورۂ ابراہیم میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ﴾۔{ابراهیم: ۲۳}

ہمیشہ اس میں رہیں گے، اپنے رب کے حکم سے اس میں ان کے ملنے کے وقت کا اکرام سلام ہے۔

یعنی اللہ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے اور آپس میں ایک دوسرے کی طرف سے برائے اکرام سلام ہوگا۔

سورۂ احزاب میں اسی بات کی وضاحت نہایت موثر انداز میں کی گئی ہے۔

﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا﴾{احزاب: ۴۴}

ان کے لیے ملنے کے وقت کی دعا سلام ہے، اوران کے لئے عزت کا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت صدرالا فاضل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ملنے کے وقت سے مراد، یا موت کا وقت ہے، یا قبروں سے نکلنے، یا جنت میں داخل ہونے کا وقت ہے، کیوں کہ مروی ہے کہ حضرت ملک الموت کسی مومن کی روح اس کو سلام کیئے بغیر قبض نہیں کرتے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ملک الموت مومن کی روح قبض کرنے کے لیے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تیرا رب تجھے سلام فرماتا ہے، اور یہ بھی وارد ہوا ہے کہ مومن جب قبروں سے نکلیں گے تو ملائکہ سلامتی کی بشارت کے طور پر انہیں سلام کریں گے۔

سورۂ فرقان میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا﴾ {فرقان: ۷۵}

ان کو جنت کا سب سے اونچا بالا خانہ انعام ملے گا، بدلہ ان کے صبر کا، اور وہاں مجرا اور سلام کے ساتھ پیشوائی ہوگی۔

اس آیت کریمہ میں تحیۃ اور سلام کو ایک دوسرے کے مغایر بتایا گیا، اسی لئے فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** نے تحیۃ کا ترجمہ مجرا کیا جو آداب بجالانے کے معنی میں ہے۔

ان تمام آیات کریمہ پر غور وفکر کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ سلام کا صحیح طریقہ جس کو اسلام کے شعار کا درجہ حاصل ہے وہ ''**السلام علیکم**'' ہے، کیوں کہ اس دنیا سے رحلت کے بعد جنت میں داخل ہونے کے وقت مومنین کرام برائے تکریم ایک دوسرے کے لیے سلام کا لفظ استعمال کریں گے، نیز قدسیوں کا گروہ بھی ایسے وقت میں مسلمانوں کو سلام کرے گا، پھر یہ بات بڑی عجیب وغریب ہوگی کہ اس دنیا میں ہم ''تحیۃ'' کا لفظ استعمال کر کے مگن رہیں کہ ہم نے اسلامی شعار کو مکمل طور سے ادا کر دیا ہے، جب کہ ہم کو قرآن حکیم کی تعلیم سے لفظ ''سلام'' ادا کر کے سلام کرنے کی ہدایت مل رہی ہے، میرے سامنے میرے اپنے خیال میں قرآن حکیم کی آیات کریمہ اور احادیث شریفہ سے ان کی تفصیل سے غض بصر کا یہ نتیجہ ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی بزرگ ہستی نے کبھی کبھی ''تحیۃ مسنونہ'' یا ''سلام مسنون'' کا لفظ لکھا ہو،

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بالکلیہ اسلامی شعار سے صرف نظر کر کے اپنے کسی ادارہ کے مراسلات میں (جو اسلامی احکام وشرائع کی تشریح واشاعت کے لیے قائم کیا گیا ہو) اپنی عادت بنا کر برابر دوسرے الفاظ کو بجائے **السلام علیکم** کے استعمال کرتے رہیں۔

مسائل سلام:

اس بحث کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے سے پہلے میں مناسب تصور کرتا ہوں کہ اپنے ناظرین باتمکین کے سامنے کچھ فقہی مسائل پیش کر کے ان کو اس بارے میں اسلامی آداب وطریقے سے مطلع کرنے کی سعادت حاصل کروں، وہ مسائل حسب ذیل ہیں:

(۱) خط میں سلام لکھا ہوتا ہے اس کا جواب دینا واجب ہے، اور یہاں جواب دو طرح ہوتا ہے، ایک یہ کہ زبان سے جواب دے دے، دوسری صورت یہ ہے کہ سلام کا جواب لکھ کر بھیجے، مگر چونکہ جواب سلام فوراً دینا واجب ہے، تو اگر فوراً تحریری جواب نہ ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ایسا ہی ہے کہ خط کا جواب فوراً نہیں لکھا جاتا ہے خواہ مخواہ کچھ دیر ہوتی ہے، تو زبان سے جواب فوراً دے دے تاکہ تاخیر سے گناہ نہ ہو۔

(۲) سلام کی میم کو ساکن کہا یعنی "**سلامْ علیکم**" جیسا کہ جاہل اسی طرح کہتے ہیں، یا "**سلامُ علیکم**" میم کے پیش کے ساتھ کہا، ہاں ان دو صورتوں میں جواب دینا واجب نہیں، کہ یہ مسنون سلام نہیں۔ {بہار شریعت، ص ۹۲}

مجدد اسلام کا اہم فتویٰ:

فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** سے استفسار کیا گیا کہ:

"چند اشخاص ایک جگہ پر بیٹھے ہیں، اور ایک شخص نے آ کر "**السلام علیکم**" کہا، اس کے جواب میں انہوں نے جواب دیا "آداب عرض" یا "تسلیمات" یا "بندگی" یا ان میں سے ایک شخص نے اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھایا اور منہ سے کچھ جواب نہ دیا، پس کفایہ اشخاص مذکورہ سے اس صورت میں اٹھ گیا یا نہیں، اس صورت میں کیا حکم ہے؟"

حضرت فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنہ** نے اس استفسار کا جو جواب دیا، وہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا کہ:

''نہ اور سب گنہگار رہے، جب تک ان میں سے، **وعلیکم السلام، و علیک، یا السلام علیکم** نہ کہے کہ الفاظ مذکورہ آداب، تسلیمات، بندگی وغیرہا الفاظ سلام سے نہیں ہیں، اور صرف ہاتھ اٹھا دینا کوئی چیز نہیں، جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی لفظ سلام نہ ہو''۔

ردالمحتار میں ظہیریہ سے ہے کہ:

''لفظ السلام في المواضع کلھا ''السلام علیکم'' أو ''سلام علیکم'' بالتنوین و بدون ھذین، کما یقول الجھال لا یکون سلاما۔ الخ

اقول: فلا یکون جوابا لأن جواب السلام لیس الا بالسلام إما وحدہ أو بزیادۃ الرحمۃ والبرکات لقولہ تعالیٰ ''وإذا حییتم بتحیۃ فحیوا بأحسن منھا أو ردّوھا'' و معلوم أن ما اخترعوا من الالفاظ او الاکتفاء بالایماء إما أن یکون تحیۃ أولا، علي الثاني عدم براءۃ الذمۃ ظاھر، لان المامور بہ تحیۃ وعلي الاول لیس عین السلام وھو ظاھر و لا أحسن منہ لأنہ لا یمکن أن یکون أحسن من الوارد، فخرج عن کلا الوجھین وبقی الواجب الکفائی علی کل عین''{فتاویٰ رضویہ کتاب الحظر والاباحۃ، جزء اول، ص: ۱۹۸، ۱۹۷}

تمام جگہوں میں **السلام علیکم یا سلام علیکم** (تنوین کے ساتھ ہے) اور ان دونوں کے علاوہ، جیسا کہ جاہل لوگ کہتے ہیں، سلام نہیں ہوگا، میں (اعلیٰ حضرت) کہتا ہوں کہ جواب بھی نہیں ہوگا، اس لیے کہ سلام کا جواب صرف سلام ہی سے ہے، خواہ تنہا لفظ سلام ہو یا رحمت و برکات کی زیادتی کے ساتھ ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: ''جب تم کسی لفظ سے سلام کیے جاؤ، تو اس سے بہتر جواب دو، یا اسی کو لوٹا دو،'' اور یہ بات واضح ہے کہ لوگوں کے گڑھے ہوئے الفاظ اور اشارہ پر اکتفا کرنا یا تو وہ سلام ہوں گے یا نہیں، سلام نہ ہونے کی صورت میں اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہوا، یہ ظاہر ہے اس لئے کہ

جس چیز کا حکم دیا گیا وہ سلام ہے، اور پہلی صورت میں یہ عین سلام نہیں ہے، اور وہ ظاہر ہے اور نہ اس سے بہتر ہے، کیوں کہ جو چیز گڑھ لی گئی ناممکن ہے کہ (قرآن وحدیث میں) وارد شدہ الفاظ سے بہتر ہو، تو یہ دونوں صورتوں سے باہر نکل گیا، اور جو ذمہ میں واجب کفائی تھا ،وہ ہر ایک شخص پر باقی رہ گیا۔

ان مذکورہ بالا عبارتوں سے حسب ذیل نتائج بآسانی اخذ کیے جا سکتے ہیں:

(۱) ''**السلام علیکم**'' اور ''**سلام علیکم**'' کے علاوہ سلام کے لیے جتنے الفاظ بولے جاتے ہیں، وہ نہ سلام ہیں اور نہ ان سے ''**السلام علیکم**'' کا جواب ہو سکتا ہے۔

(۲) مسنون سلام جس کا جواب واجب ہوتا ہے وہ **السلام علیکم** ہے یا **سلام علیکم** ہے۔

(۳) سلام کے سلسلہ میں جتنے الفاظ اختر ع کر لیے گئے ہیں، وہ سب نہ سلام بن سکتے ہیں، اور نہ سلام کا جواب بن سکتے ہیں، اس لئے آداب عرض، تسلیم وتسلیمات جیسے الفاظ سلام نہیں ہیں، انہیں پر ''تحیۃ مسنونہ'' بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۴) آیت کریمہ: ''**فاذاحییتم بتحیة**'' کے اندر تحیۃ سے مراد سلام ہے، نہ کہ اس کے علاوہ دوسرے الفاظ ہیں، جن کو سلام کے لیے استعمال کیا جائے۔

ان تمام مباحث کے بعد دلائل کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہے کہ ''تحیۃ مسنونہ'' یا ''سلام مسنون'' مسنون سلام نہیں ہے، اور بالفرض اگر تسلیم کر لیا جائے کہ ان سے سلام ہو جاتا ہے، تو ان کو شعار اسلام کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

دلائل کا خلاصہ:

ہمارے دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) کیوں کہ دنیا کے گوشے گوشے میں مختلف زبان کے بولنے والے مسلمان پائے جاتے ہیں، اس لئے اسلامی وحدت اور اسلامی اخوت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام بر اعظموں کے مسلمان ''**السلام علیکم**'' یا ''**سلام علیکم**'' کے الفاظ

سے سلام کریں، کیوں کہ قرآن حکیم میں بتایا گیا ہے کہ:

﴿كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ {نحل: ۳۱}

ایسے ہی خدائے تعالیٰ متقی لوگوں کو جزا دے گا، جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں فرشتے قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''**سلام علیکم**'' اپنے نیک کاموں کے صلہ میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اسی طرح جنت کے دروازوں پر جب متقی لوگ پہنچیں گے، تو جنت کے اہل کار فرشتے بھی انہیں الفاظ کے ساتھ ان کا شاندار خیر مقدم کریں گے۔

﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ﴾ {سورۃ زمر، آیۃ: ۷۳}

جو لوگ پرہیزگاری اور پاکیزگی کی زندگی گزارتے ہیں، ان کے گروہ کی طرف روانہ کر دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اور ان کے لیے جنت کے دروازے (پہلے سے) کھول دیئے جائیں گے، اور جنت کے ذمہ داران سے کہیں گے **سلام علیکم** بہت ہی اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس جنت میں ہمیشہ کے لیے۔

ان دونوں آیات کریمہ سے ثابت ہوا کہ فرشتگان خدا بڑے پرتپاک انداز میں سلام کے بعد جنت میں داخل ہونے کی بشارت دیں گے، ان کی تعظیم وتکریم کے لیے **سلام علیکم** کا لفظ استعمال کریں گے، اس لئے اس جہان رنگ و بو میں مسلمان کے لیے یہ مستحسن قرار پایا کہ اپنے اسلامی شعار کی اشاعت اور پھیلاؤ کے لئے **السلام علیکم** کا طریقہ اپنائیں، یعنی دنیا کے کسی گوشے میں رہتے ہوں، اور کوئی بولی بولتے ہوں، اسلامی وحدت کا تقاضہ یہی ہے کہ **السلام علیکم** ملاقات کے وقت اور اپنے مراسلے میں بولیں اور لکھیں۔

(۲) آیات کریمہ اور احادیث شریفہ سے جب اس بات کی شہادت مل گئی کہ

ہماری تحیۃ (دعاے بقا) سلام ہے، سلام کے بجائے تحیت کا لفظ استعمال کرنا کیسے مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے، اگر چہ فقہ اسلامی کے نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز موجود ہو، تاہم اس کو استحسان کا درجہ یا اسلامی شعار کا رتبہ نہیں حاصل ہوسکتا۔

(۳) فقہ اسلامی کی کتابوں میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ ''**السلامْ علیکم**'' ساکن کے ساتھ یا ''**سلامُ علیکم**'' بغیر تنوین کے اگر کسی نے سلام کیا تو ان دونوں صورتوں میں سلام کا جواب واجب نہیں ہے، کہ یہ مسنون سلام نہیں ہے، جب صرف ساکن یا محض پیش پڑھ دینے سے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہوتا ،تو سلام کے لیے دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے مسنون سلام کیوں کر ہوگا، یعنی ''تحیۃ مسنونہ'' خط میں لکھ دینے سے مرسل الیہ پر واجب نہیں ہوگا کہ اس انداز کے سلام کا جواب دے، حالاں کہ سلام اسی نیت سے کیا جاتا ہے یا لکھا جاتا ہے کہ لفظاً یا تحریراً جواب ملے۔

(۴) خطوط و مراسلات میں مخاطبت ہوتی ہے، اسی لیے ان کو نصف ملاقات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور ''تحیۃ مسنونہ'' میں مخاطبت نہیں ہو پاتی ہے، اس لیے مرسل الیہ پر لازم نہیں ہے کہ اس کا جواب دے، حالاں کہ فقہ اسلامی کی کتابوں میں صراحۃ مرقوم ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مراسلہ میں سلام لکھے تو مرسل الیہ خط پڑھتے وقت فوری طور پر اس کا جواب دے، پھر بعد کا مضمون پڑھے، اور اگر فوراً جواب لکھے تو ''**وعلیکم السلام**'' لکھے، لیکن بالفرض کسی شخص نے ''تحیۃ مسنونہ'' لکھا تو اس کے جواب میں مرسل الیہ کیا بولے، اور کیا لکھے ، کیا ''**وعلیکم التحیۃ المسنونۃ**'' لکھ دے؟ شاید ہی فقیہان حرم و مفتیان عصر اس قسم کا فتویٰ دیں گے کہ فی الواقع جواب ''**وعلیکم التحیۃ المسنونۃ**'' ہونا چاہیے۔

(۵) امام وقت، مجدد اسلام، فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** کے دسوں مکتوبات کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، جن میں انہوں نے اپنے خلفا و مسترشدین کو مخاطب کیا ہے، اب تک میرے مطالعہ میں کوئی ایسا مکتوب نہیں آیا ہے، جس میں انہوں نے ''تحیۃ مسنونہ'' یا ''سلام مسنون'' یا ''تسلیمات'' و ''آداب'' کے الفاظ لکھے ہوں، اور وہ کیوں کر لکھ سکتے

ہیں، جب کہ ان کے مذکورہ فتویٰ سے یہ ثابت ہوتا ہے یا میرے ناقص فہم میں یہ آتا ہے کہ وہ **السلام علیکم یاسلام علیکم** کے علاوہ دوسرے الفاظ کے ذریعہ سلام کرنے سے منع فرما رہے ہیں، چنانچہ اپنے ایک دوسرے فتویٰ میں ایک استفسار کے جواب میں رقمطراز ہیں کہ:

''**السلام علیکم**'' کے جواب میں ''**السلام علیکم**'' کہنے سے جواب ادا ہو جائے گا، اگرچہ سنت یہ ہے کہ'' **وعلیکم السلام**'' کہے، آداب، تسلیمات، بندگی، کہنا ایک مہمل بات ہے، اور خلاف سنت ہے، اس کا جواب کچھ ضرور نہیں، وہاں مصلحت پر نظر کرے، اگر صورت یہ ہے کہ اس کے جواب نہ دینے سے وہ متنبہ ہوگا، اور آئندہ خلاف سنت سے باز رہے گا، تو کچھ جواب دے دے، اور اگر وہ دنیا کے اعتبار سے بڑا شخص ہے، اور اسے جواب نہ دینے میں ضرور ایذا کا اندیشہ ہے، تو ویسے ہی کوئی مہمل جواب دے دے۔ {فتاویٰ رضویہ، جلد ثانی، کتاب الحظر والاباحۃ، ص:۹۰}

فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** کے مندرجہ بالا دونوں فتوؤں سے اگرچہ صراحۃً ثابت نہیں ہوتا ہے کہ لفظ'' سلام مسنون'' یا'' تحیۃ مسنونہ'' سلام نہیں ہوتا، لیکن انہوں نے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے اگرچہ اس سے عدم جواز کا ثبوت فراہم نہ کیا جائے تاہم اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ'' تحیۃ مسنونہ'' یا'' سلام مسنون'' سلام نہیں ہے، اور جب مسنون سلام نہیں ہے، تو اس کو شعار اسلام کا بلند رتبہ حاصل نہ ہوگا، اور ہمارے لئے مستحسن یہ ہے کہ ہم اسلامی شعار کی ترویج واشاعت اور اس پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

(۶) عبادتوں میں سب سے افضل عبادت نماز ہے، اس بات سے انکار کی کسی مسلمان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، اس اعلیٰ ترین عبادت میں بھی تشہد کے اندر بندوں کے اوپر ''**السلام**'' ہی لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس میں'' تحیۃ'' کو خدا کے لیے بولا گیا ہے، جب اس افضل ترین عبادت میں سلام کرنے کا حکم ہوا، خواہ تشہد پڑھنا سنت ہو یا واجب تو اس سے اس بات کا عرفان ہوا کہ ہم کو بیرون صلاۃ بھی'' **سلام**'' ہی کا لفظ استعمال کرنا چاہیے، پھر اس پر بھی غور کیجیے، نماز سے باہر نکلنے کے لئے بہت سارے الفاظ ممکن تھے، لیکن

اختلاف مسالک ومذاہب کے باوجود کسی شخص نے اب تک یہ فتویٰ نہ دیا ہوگا کہ ’’سلام‘‘ کے بجائے دوسرا لفظ استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس سے بھی یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ ’’سلام‘‘ کے لیے ’’**السلام علیکم**‘‘ سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے غیر مسلم بادشاہوں کے پاس خطوط ارسال کیے، ان میں یہ تحریر کیا گیا ’’**سلام علی من اتبع الھدیٰ**‘‘ اس سلام یعنی سلامتی کی دعا کو ہدایت کی پیروی پر موقوف کیا گیا، لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مسلمان کے پاس خط لکھواتے تو اس میں ضرور ’’**السلام علیکم**‘‘ لکھا ہوتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر مسلموں کو بھی ہدایت کی پیروی کی شرط کے ساتھ سلام کرنا جائز ہے، اور مسلمانوں کے لئے شرط نہ رہے گی، اس لیے اگر ہم مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکتوبات مبارکہ وعالیہ کی پیروی کریں تو ہمارے لئے مستحسن یہی ہوگا کہ ’’تحیۃ مسنونہ‘‘ کے بجائے ’’**السلام علیکم**‘‘ لکھا کریں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطوط اسلام کی تبلیغ اور اس کی ترویج کے لیے تھے، اس لیے کہ وہ تمام لوگ جو رشد وہدایت اور اسلام کے احکام وشرائع کی اشاعت کا کام کریں خواہ وہ انفرادی طریقہ پر کریں یا اجتماعی شکل میں کریں تو ان کے لیے نہایت موزوں بات یہی ہوگی کہ اپنے مراسلات میں ’’**السلام علیکم**‘‘ یا ’’**السلام علیکم ورحمۃ اللہ**‘‘ یا ’’**السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**‘‘ کا التزام کریں کیوں کہ اسلام کی تحیۃ (دعاے بقا) یہی ہے، جو شعار اسلام ہے، بلکہ اعظم شعائر اسلام ہے۔

حضرت مخدوم اشرف علیہ الرحمہ کی سلطنت کبریٰ

سرزمین ہند میں حضرات صوفیاے کرام کی ذواتِ مقدسہ سے اسلام کو جتنا فائدہ پہنچا مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں کے ذریعے اتنا فائدہ نہ پہنچا، یہ طویل مدت تک حکمرانی کے تخت پر متمکن رہ کر صرف اپنی حکومت کے استحکام کی فکر میں لگے رہے، اگر انھوں نے اسلام کے فروغ اور اس کی دعوت وتبلیغ میں اپنی توجہ مبذول کی ہوتی تو آج بھارت کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، بعض حکمرانوں نے اپنی تنگ دلی اور پست ہمتی سے اسلام کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اسلامی اخلاق واقدار کا مظاہرہ ان کی جانب سے نہ ہونے کا یہ اثر اور نتیجہ نکلا کہ اس ملک کے قدیم باشندے جو اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے اپنے فرسودہ نظامِ حیات اور جاہلانہ خیالات ونظریات میں گرفتار رہے اسلام سے ان کی دوری روز بروز بڑھتی رہی، لیکن اللہ کے وہ نیک بندے جن کو عرف عام میں صوفیاے کرام کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اپنی زبان مقدس میں ایسی مقناطیسی کشش رکھتے تھے کہ اگر ایک طرف مسلمان ان کے گرویدہ وآشفتہ ہوئے تو دوسری جانب انھوں نے غیر مسلموں کے قلوب واذہان کو مسخر کیا، انہیں اصفیا کی مقدس جماعت میں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سرفہرست نظر آتا ہے، انھوں نے اپنے زہد واتقا، اپنے اخلاق کریمانہ، اپنی روحانی قوت، اپنی شرافت نفس وسیادت سے بلاتفریق مذہب وملت انسانوں کے دلوں میں اپنی گہری محبت وعقیدت کے نقوش چھوڑے، یہی وجہ ہے کہ شاہی درباریوں سے زیادہ ان کے آستانۂ عالیہ پر حاجت مندوں اور پریشاں حالوں کا اژدحام نظر آتا ہے، یہ ان کی ظاہری زندگی میں بھی تھا، اور ان کے اس دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد بھی ہے، اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی مقبولیت عامہ ان کی محبوبیت کی دلیل ہے، قرآن حکیم میں خداوند قدوس نے ارشاد فرمایا کہ:

"ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا"۔
(مریم: ۹۶)

بے شک جو لوگ ایمان لائے ،اور اچھے کام کیے عنقریب ان کے لیے رحمٰن (انسانوں کے دلوں میں) محبت پیدا فرمائے گا۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اپنی جماعت کے مشہور مفسر حضرت صدرالافاضل رحمۃ اللہ علیہ خزائن العرفان میں رقم طراز ہیں کہ:

اپنا محبوب بنائے گا،اور اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دے گا۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو محبوب بنالیتا ہے،تو جبرائیل سے فرماتا ہے کہ فلاں بندہ میرا محبوب ہے، جبرائیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں،اور آسمانوں میں ندا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے کو محبوب رکھتا ہے،سب اس کو محبوب رکھیں،تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر زمین میں اس کی مقبولیت عام کردی جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ اور صحیحین کی حدیث سے حضرت صدرالافاضل رحمۃ اللہ علیہ اولیاے کرام کی مقبولیت سے ان کی محبوبیت پر دلیل پیش کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: حضور غوث اعظم **رضی اللہ عنہ** اور حضرت سلطان نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی **رضی اللہ عنہ** کو جو عوامی مقبولیت حاصل ہے وہی ان کی محبوبیت کی دلیل ہے، حضرت سید سلطان اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس وصف خصوصی میں بہت کم خدا کے محبوب بندے ان کے شریک و سہیم مل پائیں گے،انہوں نے حکومت و جہاں بانی پر درویشی اور فقیری کو ترجیح دی، وہ اگر چہ ایسے شرفا وامرا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے،جو شاہانہ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ دین و دیانت ،تقوی و پرہیز گاری، بھلائی اور نیکی میں ممتاز تھے،اور اسی ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی تھی،تاہم آپ کی ذات والا تبار میں فقر و استغنا کی شان بچپن ہی سے نمایاں تھی،اور آپ کی طبیعت کا

رجحان سلطنت کے جاہ وحشم کی طرف نہیں ہو پاتا تھا، اس لئے سلطنت وامارت کو خیر باد کہہ کر قناعت وتصوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے، اوراپنے اعمال وکردار سے فرماں رواؤں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے کہ درویشانہ زندگی کبھی شاہانہ زندگی پر غالب آجاتی ہے، اللہ کے نیک بندوں کی ولایت ان کی کرامتوں اور خوارق کے پیمانے سے عام طور پر ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن قدسی صفات بزرگوں سے خوارق وعجائب کا جتنا زیادہ ظہور ہوتا ہے، ان کو اتنا بڑا اولی اور خدا کا مقرب بندہ تسلیم کیا جاتا ہے، بلاشبہ خاصانِ خدا سے کرامتوں کا ظہور ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی ایک پیمانہ ہے، جس سے ان کی عظمت و بڑائی ناپی جائے۔

حضرت محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے خوارق وعجائب کی لمبی فہرست ہے، ان کے تذکرہ نگاروں نے تفصیل کے ساتھ ان کی کرامتوں کو بیان کیا ہے، چنانچہ اس صدی کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ سید علی حسین اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ''صحائف اشرفی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں انہوں نے حضرت مخدوم کی ذات اقدس پر اپنے صوفیانہ رنگ میں بھرپور روشنی ڈالی ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مرتب کو حضور مخدوم اشرف رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت ومحبت تھی، کیوں کہ بڑی تفصیل کے ساتھ ان کی کرامتوں کو بیان کیا ہے، اور ایسے محیرالعقول واقعات کا ذکر کیا ہے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے، اس قسم کی حیرت افزا کرامتوں کا تذکرہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے دلوں میں سوز وگداز، آخرت کی طرف طبیعت کا رُجحان ومیلان پیدا ہونے کے علاوہ بزرگوں سے گہری عقیدت ومحبت کا جذبہ ابھرتا ہے، اسی کے پیش نظر میں کچھ کرامتوں کا تذکرہ ذیل میں کررہا ہوں۔

(۱) حضرت مخدوم شرف رحمۃ اللہ علیہ بہت سے مشائخ کرام کے ہمراہ بحری جہاز میں سفر پر تھے، اوراس زمانے میں جہاز صرف موافق ہواؤں سے اپنا سفر جاری رکھتے تھے، اتفاقاً باد مخالف چلنے لگی، کشتی اپنی جگہ پر جامد ہوگئی، حضور مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ

ایسی حالت میں بھی عجیب وغریب وجد وکیفیت میں پائے جا رہے تھے، اپنے تمام معمولات ادا فرما رہے تھے، ادھر جہاز والوں کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا، کچھ لوگوں نے اس بارے میں عرض کیا کہ جہاز کے لوگ بے حد پریشان ہیں، آپ نے ہنس کر فارسی زبان کا یہ شعر پڑھا:

کشتی شکست گانیم اے باد شرط بر خیز
باشد کہ باز بینم آں یار آشنارا

ابھی آپ اپنی زبان مبارک سے یہ شعر گنگنا رہے تھے موافق ہوا چلنے لگی اور جہاز تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا، آپ کے ہمراہ حضرت نظام الدین یمنی بھی تھے، جو ''لطائف اشرفی'' کے مصنف ہیں، ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ معرفتِ دل کی شرائط سے ایک شرط یہ بھی ہے، کہ دنیا کے ظاہر و پوشیدہ حالات سے آگاہ ہو، کیا کوئی عارف اس زمانے میں ایسا پایا جاتا ہے؟ جو سمندروں اور دریاؤں میں رہنے والے عارفوں کی خبر دے، ابھی حضرت نظام الدین یمنی کے دل میں یہ خیال گزر ہی رہا تھا کہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ عرفانِ حق کے لیے اتنی بات جان لینا ایک گھاس کے جان لینے سے بھی کم ہے، اسی اثنا میں دریا کے پانی سے ایک شخص نمودار ہوا، اور اس نے کہا میں ان شخصوں میں سے ہوں جو دریا میں رہ کر خدا کی عبادت کرتے ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ تمہارا نام کیا ہے، اور کہاں رہتے ہو، اور تم کس کے مرید ہو؟ تو اس نے بتایا کہ سمندر میں ایک شہر ہے، اس کو مدینۃ الاشراف کہتے ہیں، اس میں ایک بزرگ ہیں، جن کو درّ البحر کہا جاتا ہے، وہ خلفاے اشرفی میں سے اپنے کو سب سے کمتر تصور کرتے ہیں، دس ہزار آدمی ان کے مرید ہیں، میرا نام کیکل ہے۔

حضرت نظام الدین یمنی نے کہا کہ تمہارے پیر جن کے خلیفہ ہیں وہ اسی جہاز پر تشریف فرما ہیں، اسی اثنا میں وہ دریائی شیخ برآمد ہوئے، بڑے حسین وجمیل لباس میں ملبوس تھے، حضرت مخدوم اشرف سمنانی سے ایسی زبان میں گفتگو کر رہے تھے کہ ساتھیوں میں سے

کسی کو ان کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ {صحائف اشرفی، ص ۲۳۶، ۲۳۷}

(۲) حضرت مخدوم اشرف سمنانی کا معمول تھا کہ خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں کبھی بھی نماز جمعہ ترک نہیں فرماتے تھے، جب آستانۂ عالیہ پر مسجد تیار نہیں ہوئی تھی تو ایک قصبہ ''سبھولی'' نماز جمعہ پڑھنے کے لیے جاتے تھے جو آستانۂ عالیہ سے تقریباً سات کوس کے فاصلے پر تھا، اس قصبہ میں کثیر تعداد میں علما تھے، ایک طالب علم نے حضرت والا کی خدمت میں علم کلام کا یہ مسئلہ پیش کیا کہ: بندے کو اختیار ہے یا نہیں؟ اگر بندہ با اختیار ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدریہ کا مسلک صحیح ہے جو بندے کو اپنے افعال کا خالق مانتے ہیں، اور اگر بندہ بے اختیار، مجبور محض ہے، تو اس سے جبریہ کا مسلک ثابت ہو جائے گا، پھر بندے کو اس کے افعال کے سلسلے میں کیا مانا جائے، مختار، یا مجبور محض، یا نہ مختار ہو، نہ مجبور محض، بلکہ اس کے درمیان ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ علم کلام کا انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے، حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مسئلہ اگلے لوگوں کے لیے بھی مشکل تھا، لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ظاہری اختیار ہے، اور باطن میں مجبور ہے، جیسا کہ امام فخر الدین بزدوی نے فرمایا ہے کہ: ''**اختیار بالصورة والجبر في المعنیٰ**'' وہ طالب علم حضرت مخدوم یزدانی سے اس پیچیدہ مسئلہ میں الجھ پڑا، اور بحث کو طول دیتا رہا، وہ مسئلہ کو سمجھنے سے زیادہ اپنی قابلیت جتانے لگا، اور کچھ بے ادبی کے الفاظ اس کی زبان سے ادا ہو گئے، حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کو جلال آ گیا، چہرہ مبارک تمتما اٹھا، اسی جلال میں آپ نے فرمایا کہ ابھی تیری زبان کام کر رہی ہے، یہ فرمانا تھا کہ اس کی زبان منہ سے باہر لٹک پڑی، اس میں بات کرنے کی سکت نہ رہی، تمام حاضرین مجلس اس کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے، اور حضرت سے معذرت کرنے لگے، اس طالب علم کی ماں ایک غریب بڑھیا تھی، اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر نہایت عاجزی وزاری سے رو رو کر عرض کرنے لگی، حضرت میرا یہی ایک لڑکا ہے، اس نے ہندی زبان میں کہا: ''اے میرے پوت بھیک دے دے'' اس پر حضرت کو

ترس آیا، اورآپ نے دعا فرمائی، اس کی زبان منہ کے اندر چلی گئی، مگر لکنت کے آثار اس کی زبان پر ہمیشہ باقی رہے، اور وہ صاف گفتگو پر زندگی بھر قادر نہ ہوسکا۔

(۳) ایک مرتبہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ ''قصبہ جائس'' تشریف لائے، رات میں بعد نماز عشا آپ کے اصحاب ذکر بالجہر کرنے لگے، اس کی گونج سے قرب و جوار کی آبادی متاثر ہوئی، اس آبادی میں مولانا اعلام الدین رہتے تھے، انہوں نے ذکر کی آواز سن کر کہا کہ یہ غوغائی کہاں سے آئے ہیں؟ مولانا صاحب کا دستور یہ تھا کہ اس قصبہ کے ایک بزرگ حضرت معروف شہید کے مزار پر صبح کے وقت روزانہ حاضر ہوتے تھے، یہاں آئے تو دیکھا کہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصحاب کے ساتھ قیام فرما ہیں، مولوی صاحب نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ تو حضرت نے خود فرمایا کہ ہم سب غوغائی ہیں، اس جملہ کو سننا تھا کہ چونک پڑے، اور ان کو رات کا اپنا جملہ یاد آ گیا، بے حد نادم و شرمندہ ہوئے، اور معافی مانگی۔

حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا خیر کوئی بات نہیں، ہم لوگ اس قسم کے جملے سنتے رہتے ہیں، اس کے بعد مولوی صاحب مذکور حضرت کے عقیدت مند ہوگئے، اور اپنے فرزند کے ساتھ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ {لطائف اشرفی، ص ۴۷}

(۴) ایک مرتبہ بنارس میں آپ سیر و تفریح اور مناظر قدرت دیکھنے کے لئے صبح کے وقت نکلے، آپ کا گزر مشرکین کی ایک عبادت گاہ پر ہوا، لوگ پتھر اور مورتیوں کی پوجا کر رہے تھے، آپ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، مندر کے بڑے بڑے پجاری آکر آپ کے اردگرد کھڑے ہوگئے، اور انہوں نے خود چھیڑ کر مذہب اسلام کی سچائی پر بحث شروع کردی، حضرت نے فرمایا کہ میں مذہب اسلام اور اللہ کی وحدانیت پر بہت کم بحث کرتا ہوں، البتہ اپنے دین کی حقانیت کا معیار تم کو بتاتا ہوں، جن پتھروں کو پوج کر مگن رہتے ہو اگر وہ خود تمہارے مذہب کے خلاف میرے رسول کا کلمہ پڑھ کر سنا دیں، تو کیا تم لوگ دین حق کی

سچائی کوتسلیم کرلو گے؟ سب نے اقرار کیا کہ اگر ایسا ہوتو ہم آپ کے دین حق کو مان لیں گے، چنانچہ آپ اس کے بعد آگے بڑھے اور ایک بت کو اٹھا کر فرمایا کہ اے بت اگر دین اسلام سچا ہے،تو میرے رسول کا کلمہ پڑھ، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اکٹھے تھے،سب نے دیکھا بلکہ اپنے کانوں سے سنا کہ بت نے با آواز بلند ''**لا اله الا الله محمد رسول الله**ﷺ''۔ پڑھا آپ کی اس کرامت کو دیکھ کر سب مسلمان ہو گئے،اور بت پرستی کو چھوڑ دی۔{لطائف اشرفی،ص٦٦}

ظاہر ہے کہ ان واقعات عجیبہ کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے،جس کو اولیاے کرام کی ذوات مقدسہ کا صحیح ادراک نہیں ہوتا، وہ ثقہ سے ثقہ روایت پر اعتماد نہیں کر پاتا،لیکن بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ صحائف اشرفی وغیرہ میں حضرت مخدوم اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو حیرت انگیز عجائب بیان ہوئے ہیں، وہ صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے ،تو آپ کی اس ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی کرامت کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ کہ سلطنت کو چھوڑ کر آپ نے شاہانہ زندگی پر فقیرانہ زندگی کی برتری واضح کردی،اس تاریخی حقیقت سے انکار کی جرأت وہی شخص کرسکتا ہے جس کو خود حضرت مخدوم اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شبہ ہو جائے کہ تاریخ میں ایسی ہستی گزری ہے، یا نہیں؟ پھر یہ کتنی بڑی کرامت ہے اس کا اندازہ اس طرح سے کیا جا سکتا ہے کہ حکومت و جہاں بانی کا جذبہ انسانوں میں بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، ایک خاندان کا سربراہ اپنے کنبے کے تمام افراد پر حکومت کرنا چاہتا ہے، حاکم اپنے ماتحتوں پر اپنی حکومت چلاتا ہے، باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بیٹے اس کی مرضی کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کریں ،شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص پایا جائے جو اپنے ماحول میں کچھ بھی حکمرانی کا شوق نہ رکھتا ہو، یہی وہ جذبہ ہے جو دنیا میں بیشتر تباہی و بربادی کے اسباب پیدا کرتا ہے، قتل وخونریزی، آبادی کی ویرانی، کمزوروں اور ناتوانوں پر ظلم وستم اسی کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں، قرون مظلمہ سے اس روشن دور تک انسانوں کے خون سے زمین لالہ زار نظر آتی ہے، اس میں اسی دیو استبداد کے خونی پنجے کی کارستانی دیکھی جاسکتی ہے،

اس لیے جب دنیا میں حکومت و جہانبانی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا، تو اس سے باآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت مخدوم اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اچھی خاصی مملکت پر حکمرانی قائم تھی، تاہم انہوں نے ترک دنیا کو اختیار کر کے نیکی و پارسائی، سلوک الی اللہ کی زندگی کو فوقیت دی، اس سے بڑی کرامت کیا ہوسکتی ہے؟

اگر اس ذات بابرکات سے مادی کرامتوں کا ظہور نہ ہوا ہوتا جب بھی ان کی عظمت و بڑائی میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہوتی، کیوں کہ اگرچہ انہوں نے مادی دنیا کی حکمرانی کو ٹھوکر مار دی، اور فقر و استغنا کی زندگی کو پسند فرمایا تاہم قدرت الٰہی نے روحانی سلطنت کا تاج ان کے سر مبارک پر رکھ دیا، مادی دنیا کے حکمراں اپنے شاہانہ کروفر اور اپنے لاؤ لشکر سے انسانوں کے جسموں پر قبضہ جما سکتے ہیں، ملکوں اور قوموں کو اپنے زیر نگیں کر سکتے ہیں، سلطنتوں کا نقشہ بدل سکتے ہیں، مگر ان کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی حکومت قائم کر سکیں، اور انسانوں کے دلوں اور روحوں پر اپنا قبضہ جما سکیں۔

یہ وہ بزرگ ہستی ہے جس کی روحانیت کا فیضان آٹھویں صدی کے درمیان سے جاری ہوا تو کئی صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی جاری ہے، ہندوستان کے گنگا جمنا جیسے دریا اپنے آب رواں سے خشک ہو سکتے ہیں، لیکن اس بزرگ ہستی کے فیض روحانی کا دریا نہیں سوکھ سکتا، اس کا بہاؤ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک سورج اپنی کرنوں کی بارش اس کائنات ہستی پر کرتا رہے گا، جب تک ستاروں کی انجمن اپنی ضیا پاشیوں سے اس دنیا کے حسن و جمال میں اضافہ کرتی رہے گی، اس وقت تک اس تاجدار کی حکومت دلوں پر محیط رہے گی، یہ وہ سلطنت کبریٰ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں۔

حضرت محبوب یزدانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خداداد صلاحیت اور روحانی قوت سے سرزمین ہند میں اسلام کو بڑا فائدہ پہنچایا، اور ان کی یہ روحانی قوت وہبی کے ساتھ ساتھ کسبی بھی تھی، یہ ان درویشوں میں سے تھے، جو شریعت اسلامی کے نہ صرف خود پابند تھے بلکہ

دوسروں کو بھی پابند رکھنے کی کوشش فرماتے تھے، یہ ان متصوفین کے زمرے میں شامل نہیں تھے، جو شریعت اسلامی کے احکام کو ظاہری اطوار قرار دے کر ایک گونہ اسلام کی تحقیر کر رہے تھے، اور یہ تبلیغ کر رہے تھے کہ شریعت اور طریقت دو الگ الگ راہیں ہیں، بلکہ آپ کا شمار ان اولیاے کاملین میں ہوا، جو پوری انسانی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی جد وجہد میں مصروف رہے، اور اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو ہمیشہ یہ تلقین و ہدایت کرتے رہے کہ شریعت سے ماورا طریقت کوئی دوسری راہ نہیں، بلکہ طریقت کا منبع و سرچشمہ شریعت ہی ہے، اسی کے سوتے سے طریقت کا آب حیات اُبلتا ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:

{الف} جو شریعت پر عمل نہیں کرتا، وہ طریقت سے محروم رہتا ہے۔

{ب} کوئی شخص اس وقت تک ولی نہیں ہوسکتا، جب تک وہ ظاہر و باطن، قول وفعل ہر لحاظ سے شریعت کا پابند نہ ہوجائے۔

{ج} دنیا میں اعمال صالحہ مطلوب ہیں، لہٰذا صوفی کی ایسی بے خودی کہ عمل اس سے ساقط ہوجائے، محض خسران اور نقصان ہے۔

{د} اگر کوئی شخص جان لے کہ اس کی زندگی صرف ایک ہفتہ باقی ہے، تو اسلامی کے مسائل جاننے میں مشغول ہوجائے، کیوں کہ علم دین کے ایک مسئلہ کا جان لینا ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

{ھ} فرائض اور واجبات کے بعد مخلوق کی حاجت روائی سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔

ان اقوال زریں کی روشنی میں حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات میں ایک دردمند انسان کامل، ایک متبع سنت صوفی، ایک عظیم عالم دین کی شخصیت مکمل طور پر جلوہ گر نظر آرہی ہے۔

❁❁

حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ علماے اسلام کی نظر میں

اے نسیم کوے جاناں جب مدینے سے تو آنا
بوے زلف یار لانا دل پریشاں ہے سونگھانا

یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک صلوات اللہ علیک

اشرفی شیدا تمہارا کرکے دنیا سے کنارا
رکھتا ہے تم سے سہارا لو خبر جلدی خدارا

یا نبی سلام علیک یارسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک صلوات اللہ علیک

آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے جب میں ضلع گونڈہ (بلرام پور) کی مشہور درس گاہ انوار العلوم تلسی پور میں زیر تعلیم تھا، جس کے ناظم اعلی رئیس المتکلمین، سلطان المناظرین حضرت علامہ مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب **رحمة الله عليه** تھے، اور اس کے سرکردہ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد علی صاحب **رحمة الله عليه**، حضرت مولانا مفتی عبد المنان صاحب قبلہ **مدظله العالى (رحمة الله عليه)**، اور حضرت مولانا قاضی شریعت شفیع صاحب **رحمة الله عليه** سابق ناظم اعلی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک جیسی برگزیدہ ہستیاں تھیں، اس سرچشمہ علم کے سوا کوئی لائق ذکر ادارہ اس زمانے میں ضلع گونڈہ، فیض آباد، بستی، بہرائچ میں نہیں پایا جاتا تھا، اس دار العلوم میں تعلیم بڑے دھوم دھام سے ہو رہی تھی، طلبہ کا ذوق علم اتنا بیدار ہو گیا تھا کہ یہ تشنگان علوم اسلامیہ دن رات کے بیشتر حصہ میں مطالعہ کتب اور تکرار اسباق میں بڑی جانکاہی وجاں فشانی کے ساتھ مصروف عمل رہتے تھے، باہر سے آنے والے طلبا کے ذوق علم کو دیکھ کر نا صرف یہ کہ حیران ہو جاتے تھے، بلکہ اپنے تاثرات کا

اظہار بڑے حسین پیرایہ بیان میں کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ بڑھنی کے مشہور حکیم جناب مقبول احمد صاحب کسی ضرورت سے اس دارالعلوم میں آئے، یہ اگرچہ مسلکاً غیر مقلد تھے تاہم بڑے علم دوست تھے، اور حضرت سلطان المناظرین کے رشتہ داروں میں سے تھے، انہوں نے طلبا کی محنت وجاں فشانی اور ایک بجے رات تک ان کا مطالعہ اور تکرار دیکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار نہایت حسین انداز میں کیا۔

مولانا! سلطان المناظرین سے مخاطب ہوکر کہا: آج اس دارالعلوم میں آکر میں بے حد مسرور ہوں، یہاں کے طلبا کی کتب بینی اور ان کا شغف علمی دیکھ کر مجھے قلبی سرور حاصل ہورہا ہے، اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں علم وفن کی ایک دلفریب وادی میں پہنچ گیا ہوں، مولانا! آپ کا ابر کرم اگر ایسے ہی جھوم جھوم کر برستا رہا تو یہ ادارہ مستقبل قریب میں ایک عظیم اسلامی علوم وفنون کا مرکز بن کے ابھرے گا، اور اس میں تعلیم پانے والے مہمانان رسول اپنی قابلیت اور صلاحیت کا لوہا ارباب علم ودانش سے منوالیں گے، **الفضل ماشھدت به الاعداء**، حکیم صاحب موصوف تو غیر تھے، انہوں نے اس ادارے کی تعریف، اپنے تاثرات کا اظہار جن پرشکوہ الفاظ میں کیا وہ ان کی علم دوستی کی برہان قاطع ہے یا بین دلیل ہے، اپنی جماعت کے کتنے صلحا اور مشائخ اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہے، انہیں بزرگوں کی دعاؤں کی برکت تھی، اس کی تعلیم کا غلغلہ بلند تھا، اس کی تعلیم وتربیت کے اثرات اطراف وجوانب کے مختلف اضلاع میں پھیل رہے تھے، اور علوم اسلامیہ کے شائقین دور دور سے اس ادارہ میں جوق در جوق آرہے تھے، حضرت مولانا عتیق الرحمن صاحب **رحمة اللّٰه علیه** کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور ان کی بدولت اس ادارہ کی علمی شہرت ہر چہار جانب اپنی روشنیاں پھیلا رہی تھی، سنیت کا بول بالا ہورہا تھا، اس منبع علم وحکمت سے علم کا آب حیات ابل رہا تھا، وہابیوں اور دیوبندیوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی، ایسی حالت میں مجالس مولود پاک گاؤں گاؤں منعقد ہورہے تھے، اساتذہ کرام دن کے اوقات میں درس و تدریس کی خدمات کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اور راتوں میں محافل مولود پاک میں

اپنے خطبہ وتقریر ووعظ و پند سے غیر مقلدوں، وہابیوں کی بیخ کنی کررہے تھے، ہر مولود پاک کے اختتام پر ایک مترنم اپنی نغمہ بار آواز سے بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صلوٰۃ وسلام کا نذرانہ پیش کررہا تھا، اور بار بار یہ الفاظ اپنے لحن داؤدی اور خوش آوازی کے ساتھ دہرائے جاتے تھے۔

اے نسیم کوئے جاناں جب مدینے سے تو آنا
بوے زلف یار لانا دل پریشاں ہے سونگھانا

یا نبی سلام علیک یارسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک صلوٰات اللہ علیک

اشرفی شیدا تمہارا کرکے دنیا سے کنارا
رکھتا ہے تم سے سہارا لو خبر جلدی خدا را

اس وقت میری عمر کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن سن شعور کو پہنچ چکا تھا، اور بچپن ہی سے چون و چرا اور کرید کی طرف طبیعت کا میلان تھا، جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کے دریافت کرنے میں جھجھک نہیں محسوس کرتا تھا، ایک دن مذکورہ بالا موثر اور سہل ممتنع اشعار کو سن کر بلکہ اس کے کیف اور سرور سے دل ودماغ پر ایسے اثر مرتب ہوئے کہ استاذ کریم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** سے یہ معلوم کیا کہ یہ اشرفی شیدا کون ہے؟ جن کے نعتیہ کلام محافل مولود پاک میں بارگاہ رسالت مآب **صلی اللہ علیہ وسلم** میں نذرانہ عقیدت صلاۃ وسلام پیش کرنے کے لئے اس قدر دہرائے جاتے ہیں، کوئی مجلس ایسی نہیں ہے کہ خوش آواز نعت خواں ان مصرعوں کو دہراتا نہ ہو، حضرت استاذ مکرم نے اولاً میری غلطی پر تنبیہ فرمائی کہ اگرچہ لفظ اشرفی کے ساتھ شیدا کا لفظ لگا ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دونوں مل کر یا دونوں کا مجموعہ مرکب کسی ایک شاعر کا لقب یا تخلص ہے، بلکہ لفظ اشرفی ایک تخلص ہے، اور اس کے ساتھ جو شیدا کا لفظ لگا ہوا ہے، اس کا معنی عشق، زیادت محبت کے اعلیٰ اظہار کا لفظ ہے، تم کو صرف اشرفی کے متعلق دریافت کرنا چاہئے تھا، ثانیاً انہوں نے فرمایا کہ

کبھی کچھوچھہ شریف کسی کے ہمراہ جانے کا اتفاق ہوا ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ ابھی تک مجھے پچپڑوا، تلسی پور، بڑھنی، بلرام پور، گونڈہ جیسے قصبوں اور شہروں کے سوا کہیں جانے کی نوبت نہیں پیش آئی، انہوں نے فرمایا گونڈہ کی جانب سے دریائے گھاگھرہ پار کرنے کے بعد ایک چھوٹا سا قصبہ کچھوچھہ شریف ہے، غالباً پہلی بار اس مبارک قصبہ سے میں آشنا ہوا، حضرت استاد مکرم اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اس قصبہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر بزرگ ہستی کا مزار پرانوار ہے جو مرجع خلائق ہے، جہاں کتنے آسیب زدہ، مصیبتوں کے مارے، اولاد سے محروم لوگ جاتے ہیں، اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں، اور اپنی مرادیں پاتے ہیں، ان بزرگ ہستی کا نام نامی، اسم گرامی محبوب یزدانی حضرت مخدوم اشرف سمنانی **رحمة الله عليه** ہے، ان کے فیض کا دریا ہمیشہ جاری رہتا ہے، مزار پاک پر نامرادوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، اسی بزرگ ہستی کے خاندان کے چشم و چراغ بلکہ عاشق زار حضرت شاہ علی حسین صاحب **رحمة الله عليه** ہیں، ان کا تخلص اشرفی ہے، جنہوں نے سلسلہ اشرفیہ کو ایشیائی ممالک میں مشہور و معروف کیا ہے، حضرت مخدوم سمنانی **رحمة الله عليه** کے مزار پرانوار کے بجانب جنوب ان کا مرقد انور ہے، یہ نہایت بزرگ، صوفی، متقی و پرہیزگار، دین و دیانت کے حامل، اعلیٰ اقدار کے مالک تھے، ان کے مریدین و متوسلین بھاری تعداد میں مبارک پور کے قصبہ میں پائے جاتے ہیں، ان کی ذات اقدس کی طرف منسوب کر کے ہمارے قصبہ مبارکپور کا عظیم المرتبت ادارہ دارالعلوم اشرفیہ ہے، (جس کو اب الجامعۃ الاشرفیہ) کہا جانے لگا ہے، یہ اشرفی میاں **رحمة الله عليه** ایک خدا رسیدہ بزرگ ایسے تھے کہ لاکھوں کی تعداد میں عرب وعجم میں ان کے ارادت مند پائے جاتے ہیں، ان کی باعظمت شخصیت کو دیکھ کر ہر شخص مرعوب ہو جاتا تھا، یہ بڑے وجیہ اور خوبرو تھے، آج کل ضلع گونڈہ بستی وغیرہ میں مولود پاک کی محفلوں میں صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے لئے نہایت خوش الحانی کے ساتھ جو مصرعے دہرائے جاتے ہیں جس میں اشرفی شیدا کا لفظ آتا ہے یہ حضرت شاہ علی

حسین میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** ہیں، یہ بہت عمدہ نعتیہ کلام لکھتے تھے، ان کی نعت میں جذب وشوق، عشق ومحبت، سرمستی وکیف پایا جاتا ہے، کیوں کہ ان کا قلب مبارک عشق رسول کے جذبہ سے سرشار تھا، بلفظ دیگر یہ ایک ولی کامل واکمل تھے۔

حضرت استاذ مکرم **رحمۃ اللّٰہ علیہ** نے حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کی عظیم شخصیت پر اس حقیر کے اصرار کے سبب بھرپور روشنی ڈالی، اسی زمانہ سے اس خدارسیدہ بزرگ کی ذات والا تبار سے میں گہری عقیدت رکھتا تھا، پھر اس کے بعد متعدد مرتبہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کے مزار پرانوار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، آستانہ عالیہ پر بیماروں، آسیب زدہ لوگوں کے ازدحام اور ان کی مستانہ وار حرکتوں کو دیکھ کر نہ صرف دنگ رہ جاتا تھا بلکہ دل میں ایک گونہ خوف ودہشت پیدا ہوتی تھی، حاضری کی اس سعادت سے مشرف ہوکر میں ضرور حضرت شاہ علی حسین **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کے مرقد انور پر بڑے شوق سے حاضر ہوتا تھا، اور بار بار کی ان حاضریوں سے میرے دل کو سکون وراحت حاصل ہوتی تھی، جہاں حضرت مخدوم کے پرجلال آستانہ سے میرے دل میں خشیت پیدا ہوتی تھی وہیں ان کے عاشق زار حضرت شاہ صاحب کے مرقد انور سے مجھ کو قلبی اطمینان حاصل ہوتا تھا، اس کی عقلی توجیہ خواہ کچھ بھی کی جائے، اس کو گہری عقیدت کا اثر ونتیجہ بتایا جا سکتا ہے یا یہ کہا جائے کہ ان کا مزار پاک ایک الگ جگہ پر ہے، جہاں آسیب زدہ لوگوں کی دھوم دھام نہیں ہے، بہر حال میری حاضری سے مجھ کو روحانی کیف ولذت ملتی تھی۔

۱۹۵۳ء میں جب میں مبارکپور دارالعلوم اشرفیہ کی شہرت سن کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا، اور حضرت حافظ ملت **نور اللّٰہ مرقدہٗ** کی عظیم شخصیت سے بے حد متاثر ہوا، اور ان کی کرم فرمائی سے میں وہاں مسلسل چار سالوں تک زیر تعلیم رہا، تو اس طویل مدت میں حافظ ملت کی زبان مبارک سے خدا جانے کتنی مرتبہ حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کی تعریف وتوصیف کو سن کر ان کی عظمت وسیادت کا سکہ دل پر بیٹھ گیا، بڑے والہانہ انداز میں حضرت حافظ ملت جب شاہ صاحب کا تذکرۂ جمیل فرماتے تھے تو خود

آپ پر بھی عجیب وغریب حالت طاری ہوجاتی تھی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا آپ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت جلیلہ اتنے حسین انداز میں بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ اس میں تصنع و بناوٹ کا شائبہ قطعی نہیں ہے ، بلکہ آپ کے دل کی صدا ہے، جو آپ کی زبان مبارک سے کیف وسرور لیے نکل رہی ہے۔

ہمارے ناظرین کرام غور فرمائیں کہ جس شخص کو اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل سے حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت کے گہرے نقوش ذہن میں مرتسم ہوئے ہوں، بھلا وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں دھندھلے پڑ سکتے ہیں، حضرت اشرفی میاں **رحمة الله عليه** ان بزرگوں میں شامل ہیں جنہوں نے خلوص ومحبت کا اظہار حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس کے تعلق سے اس حقیر کے روبرو بارہا کیا ہو، اور عصر حاضر کی بزرگ ترین ہستی جن کا ذکر جمیل بے خودی کے عالم میں کرتے رہے ہوں، کیسے ذہن وفکر اس سے متاثر نہ ہوں گے بلکہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ گہرے نقوش کا ہی نتیجہ ہے کہ میں سلسلۂ اشرفیہ کا براہ راست ارادت مند نہیں ہوں، یا بلفظ دیگر اشرفیوں میں شمار کیے جانے کے لائق نہیں ہوں، تاہم جہاں تک اشرفی شیدا کا معاملہ ہے میں بلاخوف لائم یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرا ذہن وفکر ہمیشہ ان کی عقیدت سے لبریز رہا ہے، اور اس کی عقلی توجیہ صرف یہی ہے کہ استاذ کریم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب **رحمة الله عليه**، مرشد برحق، حافظ ملت **نور الله مرقده** کے کلمات طیبات حضرت اشرفی میاں **رحمة الله عليه** کے متعلق بارہا اپنے کانوں سے سنے ہیں، کیا اپنی سماعت پر اعتبار نہ کروں؟ یا اپنی سماعت پر اعتبار کروں، اور ان بزرگوں کے کلمات طیبات کو معاذ اللہ ظاہر داری یا سیاست پر محمول کروں؟ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں، اس لیے میں اپنے عرفان ویقین کی روشنی میں بلاخوف تردید کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجاہت اور سطوت کا یہ عالم تھا کہ ہمارے بزرگوں کی عقیدت و نیاز کی پیشانی نہایت فروتنی اور عاجزی کے ساتھ یا نیاز وخلوص کے ساتھ ان کی بارگاہ میں جھکی ہوئی نظر آتی ہے، چنانچہ حضرت حافظ ملت **نور الله مرقده** ارشاد

فرماتے ہیں:

''یہ مدرسہ اشرفیہ ہے، اس پر بزرگوں کی نظر ہے، حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** ان کی ولایت میں کوئی شبہ نہیں ہے، ان کی شان یہ تھی کہ ان کے چہرۂ مبارک پر نور کی بارش ہوتی تھی، جہاں بیٹھ جاتے تھے ایک بھیڑ جمع ہوجاتی تھی، کیا ہندو، کیا مسلمان تمام مذاہب والے دیکھ کر فریفتہ ہو جاتے تھے، جب حضرت ایک مرتبہ اجمیر شریف تشریف لے گئے، جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی نماز پڑھائی، پھر نماز کے بعد تقریر فرمائی، اس کے بعد فرمایا کہ آج فقیر خواجہ کی بارگاہ میں بیعت کرنا چاہتا ہے، جس کا جی چاہے اپنا ہاتھ دیدے، یہ فرمانا تھا کہ سارا مجمع ٹوٹ پڑا، اور تمام حاضرین فوراً داخل سلسلہ ہو گئے، ایسا منظر اور ایسی مقبولیت تو میں نے دیکھی ہی نہیں، اجمیر شریف کے اسٹیشن پر میں نے دیکھا کہ حضرت لیٹے ہوئے ہیں، نہ کسی سے کچھ کہنا نا بولنا، لیکن لوگ ہیں کہ جوق در جوق زیارت کے لیے چلے آرہے ہیں، آپ حج سے واپس تشریف لائے تو بیمار ہو گئے، مجھے معلوم ہوا تو فوراً کچھوچھہ مقدسہ زیارت کے لئے حاضر ہوا، حضرت نے دیکھتے ہی سب سے پہلے مدرسہ کے بارے میں دریافت فرمایا کہ مدرسہ چل رہا ہے؟ میں نے عرض کیا: حضور مدرسہ چل رہا ہے، پھول رہا ہے، پھل رہا ہے، اس وقت ستر طلبہ کو تقریباً خوراک ملتی تھی، اور جب حضرت نے بازار میں نئے مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کا تاریخی نام ''باغ فردوس'' (۱۳۵۳ھ) ہے اور واقعی یہ باغ فردوس ہے تو اس کی پہلی اینٹ رکھنے کے بعد فرمایا جو اس کی ایک اینٹ کھسکائے گا اللہ تعالیٰ اس کی دو اینٹ کھسکائے گا۔''

حضرت حافظ ملت کے ملفوظات کا ایک طویل اقتباس میں نے پیش کیا ہے۔

یہ نہایت لائق توجہ ہے، اس کے ایک ایک لفظ سے گہری عقیدت کا اظہار ہو رہا ہے، اگر اس کا جائزہ پیش کیا جائے تو یہ کہنے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا کہ حافظ ملت **نور اللّٰہ مرقدہ**، حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کو تقرب الٰہی کے اونچے مرتبہ پر فائز دیکھ رہے تھے، جبھی تو کبھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کی ولایت میں کوئی شبہ نہیں ہے، کبھی ان کی درویشانہ ادا کو بیان کر کے اس سے مسرور ہوتے ہیں، کہیں فرماتے ہیں کہ ایسا منظر اور ایسی مقبولیت تو میں نے دیکھی ہی نہیں اور کہیں آپ کا یہ انداز بیان سرور قلب کے لیے بہت کافی ہے کہ حضرت نے بازار میں نئے مدرسہ کی بنیاد رکھی تو فرمایا کہ جو اس کی ایک اینٹ کھسکائے گا اللہ تعالیٰ اس کی دو اینٹ کھسکائے گا، دل کے تاثرات الفاظ کا جامہ پہن کر کھلم کھلا آپ کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہیں، اور اس اعتراف حقیقت میں آپ کے ادب واحترام کا حسین منظر یہ نظر آتا ہے کہ جب بھی آپ کو مخاطب کیا یا آپ کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا تو حضرت اور حضور توقیر کے الفاظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، اگر چہ حافظ ملت **رحمۃ اللّٰہ علیہ** نے تصوف کو اپنا فن نہیں بنایا بلکہ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر کا درس اپنی پوری زندگی دیتے رہے، لیکن اس کے ساتھ اس بزرگ صوفی سے ان کو جو سبق ملا تو یہی ملا کہ ہمیشہ اپنے اخلاص کی پیشانی اس پاک بارگاہ میں جھکاتے رہے اور آپ کی تعریف اور منقبت میں تاحیات رطب اللسان رہے، بلکہ حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کی خصوصیات جب آپ نہایت بلیغ انداز میں بیان فرماتے تو آپ کا اس سے قلبی ارادت کا اظہار ہوتا تھا، آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ:

> ''حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** بڑی خصوصیتوں کے مالک تھے، ان میں ایک خاصیت یہ تھی کہ آپ نہایت خوبصورت، وجیہ اور لامبے تھے، اب تک آپ جیسا چہرہ دیکھنے میں نہیں آیا، آپ کا لقب شبیہ غوث تھا، حضور غوث پاک **رضی اللّٰہ عنہ** کو عالم خواب میں دیکھنے والوں نے اس کی شہادت دی ہے اور شبیہ غوث ہونے کا اقرار کیا ہے''۔

حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کے حسن وجمال، خوبی وکمال کو جس اسلوب سے بیان کیا گیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ آپ سے حسن عقیدت کا اظہار ہے بلکہ ایک ایسی شہادت ہے کہ حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** بڑے خوبیوں کے مالک تھے، اس کا انکار ایک معاند ہی کرسکتا ہے، لیکن جو شخص انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑتا ہو، وہ یقین کرلے گا کہ حافظ ملت **رحمۃ اللہ علیہ** حضرت اشرفی میاں کو شبیہ غوث اعظم تسلیم کرتے تھے، بلکہ اس کا ثبوت بزرگوں کے خواب سے پیش فرماتے تھے، اس لیے یہ ایسی زبردست شہادت ہے جس سے آپ کی ولایت شک وشبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے، کیوں کہ حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ معمولی درجہ کے انسان نہ تھے، بلکہ ایک عظیم محدث، ایک بلند پایہ مفسر، علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ رکھنے کے علاوہ ایک متبع سنت بزرگ تھے، ان کی زندگی کے تمام کارنامے اوران کی تمام حرکات وسکنات اتباع سنت کے دائرے میں محصور رہتی تھیں، اس لئے خود ایک ولی کامل کے خصائص کبریٰ سے ان کی ذات بابرکات متصف تھی، عرفان حق وولایت کے اونچے مقام پر فائز تھے جہاں سے حقیقت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں، وہیں پر آپ نے حقائق کے ادراک میں کبھی کوتاہی نہیں کی، بلکہ حقیقت شناسی اور مردم شناسی کے اونچے مرتبہ پر فائز تھے، پھر اگر یہ بات صحیح ہے کہ ولی را ولی می شناسد تو اس کا یقین کرنا چاہیے کہ حافظ ملت نے خوب اچھی طرح سے اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کو پہچان لیا تھا، اسی وجہ سے زندگی بھر ان کی ولایت کا پرچم لہراتے رہے، اب اگر کوئی شخص اپنی کج فہمی یا ہٹ دھرمی سے حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کے خدارسیدہ ہونے کو تسلیم نہ کرے، اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ عام انسانوں کی سطح سے وہ ایک بلند وبالا انسان نہیں تھے، تو اس کے بارے میں صرف اتنی سی بات کہی جاسکتی ہے کہ توحید وخدا پرستی، حیات بعد الممات، نبوت ورسالت، وحی الٰہی جیسے عقائد کا انکار کرنے والے اسی زمین پر اور اسی آسمان کے نیچے پائے جارہے ہیں، بلکہ انسان کی ذہنی وفکری گمراہی کا عجوبہ یہ ہے کہ کبھی اپنی محسوس ہستی کا انکار کر بیٹھتا ہے، اگر کوئی ایسا منکر موجود ہو جو اپنے انکار وسرکشی میں یا اپنی خدائی اور

خود بینی میں انصاف کے تمام تقاضوں کو بالاے طاق رکھ کر حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کی بزرگی اور ان کی نیکی و پارسائی، ان کی خدا ترسی اور نیک نیتی کا انکار کر بیٹھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس دنیا کے اندر اللہ کے نیک بندوں کو اپنے سیف قلم اور زبان کا تختۂ مشق کتنے لوگوں نے بنایا ہے کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا، البتہ انہیں یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ایسے بدنصیب انسان کتنے اونچے درجہ پر پہنچ جائیں اور دنیا کی دولت وثروت کے مالک ہو جائیں، خواہ بنی اسرائیلیوں کی طرح ان کے اوپر من وسلویٰ اتر رہا ہو، خواہ ان کی چابکدستی سے ان کو ''فتوحات غیبیہ'' حاصل ہو رہے ہوں، وہ ہر حالت میں نیک طینت اور اچھی فطرت کے انسان تصور نہیں کئے جا سکتے۔

حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے عظمت کی دلیل قاہرہ یہ ہے کہ اپنی جماعت کے جید علما وفضلاے روزگار جن کے اوپر اسلامی دنیا کو ناز ہے، وہ ان کے معتقد وارادت مند نظر آتے ہیں، مفسر قرآن حضرت صدر الافاضل جیسی نادر روزگار ہستی بھی ان کی بارگاہ بلند میں اپنی محبت واخلاص کی پیشانی جھکائے ہوئے نظر آتی ہے، بلکہ حضرت مفسر قرآن والہانہ حد تک اپنی شیفتگی اور فریفتگی میں بہت دور نکل جاتے ہیں، ان کے عشق ومحبت کی داستان بڑا سبق آموز اور نصیحت آمیز ہے، وہ نہ صرف یہ کی بارگاہ اشرفی میں سالہا سال حاضر ہوتے تھے، بلکہ آستانہ عالیہ اشرفیہ کے قریب خود اپنی طرف سے ایک حجرہ تعمیر کیا تھا، تا کہ اپنے مرشد سے زیادہ سے زیادہ قرب روحانی کے ساتھ ساتھ مادی اور محسوس طریقہ پر بھی ان سے قریب رہ سکیں، یہ اس لیے تھا کہ حضرت صدر الافاضل **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کو حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللّٰہ علیہ** سے خلافت و اجازت حاصل تھی، بلکہ آپ ہی کی اجازت سے حضرت فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنہ** سے بھی کو آپ خلافت واجازت حاصل تھی، اور زندگی بھر ان کے ہمدم وساتھ رہے، خلفاے اعلی حضرت کے مصنفین حضرت صدر الافاضل **رضی اللّٰہ عنہ** کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مراد

آبادی کی ولادت باسعادت ۲۱ رصفر المظفر ۱۳۲۰ھ میں ہوئی، ان کے استاد گرامی مولانا شاہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ عارف کامل اور فاضل اجل تھے، سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت گل محمد سے بیعت کے بعد خود آپ کو حضرت شاہ اشرفی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کیا، صدرالافاضل نے آپ سے استفادہ کیا اور آپ سے خلافت واجازت حاصل کی اور آپ ہی کے اس ارشاد کے مطابق حضرت فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** سے بھی اجازت حاصل کی، فاضل بریلوی کے راز دار، رمز شناس تھے، آپ نے ان کے مشن کو بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا، اور مسلمانان ہند کی سیاسی و مذہبی امور میں رہنمائی فرمائی''۔

کیا کوئی شخص اس تاریخی حقیقت کے انکار کی جرات کرسکتا ہے؟ اور اگر کوئی شخص اپنی معاندانہ ذہنیت کی بنا پر یہ کہے کہ حضرت صدرالافاضل کے متعلق جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کے خلیفہ ومجاز تھے وہ درست نہیں ہے، تو اس کے لیے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ تعصب وتنگ نظری کے عمیق غار میں رہنے کا عادی ہے، یا اس کی نگاہوں کے سامنے ظلمتوں اور تاریکیوں کا تہہ بہ تہہ حجاب پڑا ہوا ہے، کہ وہ اپنے بزرگوں کے علم وعرفان کی روشنی حاصل نہیں کر پاتا ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اپنی ذہنی آلودگی کو دور کرکے اور تزکیۂ نفس کے لیے تیرہ وتاریک ماحول سے اپنے آپ کو نکال کر صحیح راستہ پر آنے کی جدوجہد کرے، اور بارگاہ خداوندی میں نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ دعا کرے کہ وہ ذہنی نجاست سے اس کو پاک وصاف کردے، کیوں کہ انسان کے لیے ذہنی طہارت کے لیے کوئی سبیل نہ رہ جائے، تو اس کو اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ مشیت ایزدی ہی جب اس کو توفیق دے گی تو وہ اپنی فکری قوت کو صحیح سمت میں مائل کر پائے گا۔

حضرت صدرالافاضل **رحمۃ اللہ علیہ** کے معاصرین میں ایک عبقری شخصیت حضرت مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی کی ذات بابرکات ہے، جن کی واحد

شخصیت ہے کہ ان کو عالمی زبانوں پر مہارت حاصل تھی، جن کی سعادتوں اور برکتوں کا بادل برسنے کو آیا تو صرف یہ نہ ہوا کہ برصغیر ہی میں ان کے عرفان کا دریا جاری ہوا بلکہ ایشیا، یورپ اور امریکہ کے کتنے ممالک کے کتنے انسانوں کو اپنی ذات ستودہ صفات سے فائدہ پہنچایا، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** کے نہ صرف خلیفہ تھے بلکہ ان کے عاشق زار بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ بارگاہ رضویت سے ان کو علیم رضا کا معزز خطاب ملا تھا، اور اپنے اس خطاب پر ان کو پوری زندگی میں بڑا ناز تھا، امام احمد رضا کی بارگاہ میں مبلغ اسلام نے جیسی منقبت پیش کی ہے وہ ان کے سوز و گداز، اور عشق و سرمستی کا واضح ثبوت ہے، میں مناسب تصور کرتا ہوں کہ ہمارے ناظرین کرام اس نذرانہ عقیدت سے اپنے ذہن و فکر کو انجلا بخشیں، حضرت مبلغ اسلام فرماتے ہیں:

تمہاری شان میں جو کچھ کہوں اس سے سوا تم ہو
قسیم جام عرفاں اے شہ احمد رضا تم ہو

غریق بحر الفت مست جام بادہ وحدت
محب خاص منظور حبیب کبریا تم ہو

مزین جس سے ہے تاج فضیلت تاج والوں کی
وہ لعل پر ضیا تم ہو وہ در بے بہا تم ہو

تمہیں پھیلا رہے ہو علم حق اکناف عالم میں
امام اہل سنت نائب غوث الوریٰ تم ہو

بھکاری تیرے در کا بھیک کی ہے جھولی پھیلائے
بھکاری کی بھرو جھولی گدا کا آسرا تم ہو

علیم خستہ ایک ادنیٰ گدا ہے آستانہ کا
کرم فرمانے والے حال پر اس کے شہا تم ہو

مبلغ اسلام کی اس منقبت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے علم و دانش کا لوہا دنیا

کے بڑے بڑے دانشوراورادیب اور علما، فقہا، جدید تعلیم یافتہ، سائنسداں، انگریزی زبان و ادب کے ماہر لسانیات مانتے تھے، جنہوں نے عرب ممالک کے اونچے درجہ کے علما اور صحافیوں کو متاثر کیا تھا، تاہم وہ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کی پیشانی کو اس طرح جھکائے ہوئے ہیں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا جیسے آفتاب علم کے مقابلہ میں ایک ذرۂ ناچیز کی حیثیت رکھتے ہوں، اپنے کو ایک ادنیٰ گدا اور اعلی حضرت کے در کا بھکاری کے لفظ سے تعبیر کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، آستانہ عالیہ پر آکر اپنے تمام تبلیغی کارناموں کو بھول جاتے ہیں، اور دنیا کے عظیم انسانوں نے جو خطابات عطا کیے تھے ان کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، بلکہ علیم رضا ہونے پر اپنی ہستی کی سب سے بڑی معراج تصور کرتے ہیں، لیکن یہ بھی حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کے پروردہ ہیں اوران کے آستانہ عالیہ کے فیوض و برکات سے مالامال ہیں، ان سے بھی آپ کو خلافت وارادت حاصل ہے، ''خلفاے حضرت'' میں یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ جو ذات بابرکات اس صدی کے امام مجدد سے منسلک ہو اوران سے اس کو خلافت واجازت حاصل ہو پھر اس کو کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ بارگاہ رضوی کے دریاے علم سے مستفید ہونے کے باوجود ایک صوفی منش بزرگ کے دربار میں بھی حاضر ہے، اور اپنے روح کو سرور اور قلب کو نور سے منور و تاباں کرتا ہے، ''خلفاے اعلیٰ حضرت'' میں یہ عبارت مذکور ہے کہ آپ کی روحانی تربیت والد ماجد مولانا عبد الحکیم صاحب صدیقی، برادر گرامی مولانا مختار احمد صاحب صدیقی، سید شاہ علی حسین کچھوچھوی ، اعلی حضرت امام اہل سنت نے کی ہے۔

آج کے اس پرفتن دور میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ علوم اسلامیہ میں درجہ کمال حاصل کر لینے کے بعد صوفیاے کرام کی بارگاہوں میں اتنے جلیل القدر علما کیوں حاضری دیتے تھے، اب تو حالت یہ ہے کہ علوم اسلامیہ میں عبور حاصل کرنا تو بڑی بات ہے کہ کچھ کتابیں پڑھ لی جاتی ہیں اور وعظ وتقریر میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کر لی جاتی ہے، اس کے بعد کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ صحبت اولیا حاصل ہو، لیکن آج سے ساٹھ ستر برس پہلے

کی طرف جب ہم نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ علوم اسلامیہ میں کمال کے باوجود کسی ایسی چیز کی ضرورت باقی رہتی تھی جس کے پورا کرنے میں ایسی تشنگی پائی جاتی تھی جس کے لیے **قال اللہ و قال الرسول** کے مجالس کے علاوہ صحبت اولیا کی بھی ضرورت باقی رہتی تھی، اسی لیے حضرت مبلغ اسلام بارگاہ رضوی سے وابستہ ہونے کے باوجود صوفی بزرگ اشرفی میاں کے دربار میں حاضری کو اپنی بڑی کامیابی تصور فرماتے تھے۔

ان بزرگوں کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ایسے اہل علم کی طرف اپنی نگاہ دوڑائیں جن کو وصال فرمائے چالیس پچاس سال کا عرصہ نہیں گزرا ہے بلکہ حال ہی کے وصال یافتہ بزرگ ہیں، وہ بھی حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کی بارگاہ میں اپنی نیازمندانہ پیشانی جھکائے ہوئے ہیں، حضرت شیخ العلما مولانا غلام جیلانی صاحب سابق شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول، حضور صدر الشریعہ **علیہ الرحمۃ و الرضوان** کی بارگاہ میں ایک سعادت مند تلمیذ رشید کی حیثیت سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور اسی کے ضمن میں حضرت اشرفی میاں **رحمۃ اللہ علیہ** کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں گویا ان کو خادمانہ حیثیت حاصل تھی ، یہ ان کے نزدیک ایک مخدوم اور بزرگ ترین شخصیت تھی آپ فرماتے ہیں کہ:

> ’’ہر سنی خواہ رضوی ہو یا اشرفی، حامدی ہو، یا مصطفوی، امجدی ہو یا نعیمی یکساں حضرت (صدر الشریعہ) کو محبوب تھے، رضویت و اشرفیت وغیرہما کو ایک ہی درخت (سنیت) کی متعدد شاخیں سمجھتے تھے، اس وجہ سے آپ کو ہر شعبے کی ترقی کی وجہ آپ کو خوشی ہوتی، اور ہر سنی جماعت کے علما و صالحین کی تعظیم و توقیر محبوب تھی، کسی دوسرے شعبہ کے صالحین کی سربلندی کو اپنی سربلندی سمجھتے تھے ،اگر کسی جماعت میں عصبیت کی آگ سلگتی نظر آتی تو وہ حتی الوسع جلد از جلد بجھانے کی کوشش فرماتے، اگر کوئی شخص ایسی بات پیش کرتا جس سے سنیوں کی دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوتا تو اس کو روک دیتے تاکہ

ہماری طاقت فنا نہ ہوجائے اس خصوص میں مجھے بہت سے فوائد معلوم ہیں''۔

حضرت شیخ العلما **رحمۃ اللّٰہ علیہ** اپنے استاد کریم حضرت صدر الشریعہ **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کی اسی خصوصیت کو بیان کرتے ہیں جو آج کل گروہ علما میں نادر الوجود ہے، لفظ لفظ سے خلوص ومحبت کے قطرات ٹپک رہے ہیں، حضرت صدر الشریعہ **رحمۃ اللّٰہ علیہ** کی عظمت کا خطبہ پڑھتے ہوئے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ سنی جماعت کے مختلف گروہوں میں جب اختلاف رونما ہوجاتا تھا، تو اس کے رفع کرنے میں آپ بڑی کوشش فرماتے تھے، میں نہایت کرب واضطراب کے ساتھ موجودہ دور کے امجدی حضرات سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اپنے اقوال وافعال اپنے طور طریقہ پر گہری نظر ڈال کر یہ بتلانے کی زحمت گوارہ فرمائیں کہ آپ کا طریقہ عمل حضور سیدی استاذ الاساتذہ صدر الشریعہ کے طریقہ عمل اور ان کی خصوصیت سے کچھ میل کھاتا ہے؟ اگر آپ زیادہ امجدی کے جذبات کی رو میں بہہ کر ہٹ گئے ہوں، تو میں آپ کو اصلاح حال کی دعوت دیتا ہوں۔

حضرت مبلغ اسلام اوران کے تبلیغی کارنامے

حامدًا و مُصليًا

امابعد!

برصغیر ہند و پاک میں کتنے مبلغین و مصلحین اُمت منصۂ شہود پر آئے جن کے اصلاحی وتبلیغی کارناموں سے انکار اسلامی تاریخ کے روشن باب سے انکار ہے، ان علما ومشائخ نے اپنی پرکشش شخصیت یا اپنی مقناطیسی قوت سے نہ صرف یہ کہ اسلامی تعلیمات کو عام کیا بلکہ اغیار کو بھی اپنی طرف مائل کیا بہت سے غیر مسلم ان کے شیدا وفریفتہ ہوئے، اور ان کی روحانیت سے فیض یاب ہونے کا ان میں جذبہ وشوق پیدا ہوا۔

لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں جو نادر روزگار ہستی رونما ہوئی اس نے اپنے تبلیغی کارناموں سے بڑا اونچا مقام حاصل کرلیا، میری مراد اس عظیم شخصیت سے ہے جو سراپا تقوی وطہارت، نازش سنیت، حضرت علامہ مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی **علیه الرحمة والرضوان** کی ذات والا صفات ہے، جن کو بجا طور پر ''مبلغ اسلام'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بھارت کی سرزمین پر علم حدیث وفقہ کے ماہر پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی تصنیف وتالیف سے اسلامی احکام کی نشر واشاعت میں بڑا کارنامہ انجام دیا، بہت سے مفسر ومحدث ظاہر ہوئے جنھوں نے حدیث کی شرح و بیان اور قرآن حکیم کی تفسیر میں بڑی دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کیں، کتنے منطق و فلسفہ کے امام پیدا ہوئے جنھوں نے معلم اول و ثانی سے زیادہ علوم عقلیہ میں اپنے کمالات علمیہ کا اظہار کیا، مگر میں اس حقیقت کے بیان کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتا کہ مبلغ اسلام جیسی شخصیت اس صدی کے نصف اول میں کم پیدا ہوئی، کیوں کہ اگر علم وفن کے دفتر تیار کر لیے جائیں اور کتابوں کی تصنیف وتالیف سے لائبریریوں کو گنجینۂ معارف بنا دیا جائے تاہم اس سے اسلام کو محدود

فائدہ پہنچے گا، اس لیے کہ اسلام کے احکام وشرائع کی تبلیغ ودعوت اس وقت بھی ہوئی تھی، جب علوم وفنون کے یہ دفتر بے پایاں تیار نہ ہوئے تھے، مشکوٰۃ نبوت کے انوار وتجلیات سے کرہ ٔارض کا ایک بڑا حصہ منور وتاباں ہو گیا تھا، اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کے احکام کو بنی نوع انسان تک پہنچایا جائے، اگر سب کچھ موجود ہو اور اسلام کی دعوت کا کام نہ پایا جائے تو اس کی تابانی ماند پڑ جائے گی۔

تبلیغ کی حکمت عملی:

اس سے واضح ہوا کہ تبلیغ اسلام کے بغیر تمام علمی کاوشیں کبھی کبھی بے سود ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ تصنیف وتالیف کی اصل قدر وقیمت اسلامی احکام کی تبلیغ میں مضمر ہے، جب ہم اس لحاظ سے حضرت مبلغ اسلام **علیہ الرحمۃ والرضوان** کی عظیم شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ، آیۃ من آیات اللہ، معجزۃ من معجزات رسول اللہ، اور برہان شریعت وطریقت تھے، جنہوں نے زمانہ کی نبض کو اچھی طرح پہچان لیا تھا، ان کی دوررس نگاہوں کے سامنے یہ حقیقت آشکار تھی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عصر حاضر میں نئے اسلوب سے ضروری ہے، اس سے بڑا تغافل برتا جا رہا ہے، بڑی ضخیم اور اونچے درجہ کی کتابیں ضرور لکھی جا رہی ہیں، مجالس وعظ وتقریر اور محافل مولود پاک آراستہ کی جا رہی ہیں، لیکن اسلام کے اس عظیم فریضہ سے کماحقہٗ سبکدوش ہونے کی کوئی تدبیر نہیں ہو رہی ہے، حالانکہ قرآن حکیم نے نہایت بلیغ الفاظ میں امت مسلمہ کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ {آل عمران:۱۱۰}

تم اے مسلمانو! بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں امت مسلمہ کی مدح وستائش اس لیے کی گئی ہے کہ اچھے کاموں کا حکم دیتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر تمام امت دعوت وتبلیغ

کے کام میں لگ جائے تو اس کی ضروریات کا سارا کارخانہ معطل ہو کے رہ جائے گا، اسی لئے علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ فرض کفایہ ہے، ایک دوسری آیت میں اس کو مکمل طور سے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلۡتَكُن مِّنكُمۡ أُمَّةٞ يَدۡعُونَ إِلَى ٱلۡخَيۡرِ وَيَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ﴾ {آل عمران:۱۰۴}

اور چاہئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے جو لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتی رہے، اور اچھے کاموں کی تعلیم دیتی رہے، اور بری باتوں سے روکتی رہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

اس فرمان الٰہی سے ثابت ہوا کہ اس اہم ترین فریضہ کی ادائیگی کی ذمہ داری کچھ پاک نفس انسان حسن وخوبی کے ساتھ سنبھالیں، اگر انہوں نے اس فرض کو ادا کر دیا تو امت مسلمہ اس کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گی تاہم اس فرض کے ادا کر دینے کا مطلب محض یہی نہیں ہے کہ کچھ حضرات اٹھیں جو مبعوثین یا مبلغین کے نام سے یاد کیے جاتے ہو ں، وہ اپنی شعلہ بار تقریروں اور اپنے وعظ و پند سے تھوڑی دیر کے لئے دلوں کو گرما دیں، اور جوش عمل پیدا کرنے میں ناکام رہیں، یا غیروں میں اسلام کی صداقتوں کو پیش کرنے میں عاجز و درماندہ رہیں، بلکہ اس کے واضح مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اسلام کی تبلیغ اتنے اعلیٰ پیمانے پر ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں عمل کا جذبہ بیدار ہو جائے اور اغیار میں اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کا ازالہ ہو جائے۔

البتہ بیسویں صدی میں حضرت مبلغ اسلام کی ذات قدسی صفات نے بے سروسامانی کے عالم میں اپنا تبلیغی مشن جاری کیا، تو اپنی پرکشش شخصیت سے کتنے بے راہوں کو راہ ہدایت پر لائے، اور کتنے گم گشتہ راہ ضلالت کو ہدایت کی مشعل ہاتھ میں دے دی، پھر انہوں نے برصغیر ہی تک اپنے اس عمل خیر کو محدود نہیں رکھا، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اپنی قوت تاثیر سے دلوں کو اسلام کے لئے مسخر کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی، آج دنیا میں سیکڑوں

مبلغین کام کر رہے ہیں ، اور لوگوں کو صراط مستقیم پر لانے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں ،تاہم ان کا اکیلا کارنامہ ان تمام حضرات کے کارناموں پر بہت بھاری نظر آرہا ہے۔

مبلغ اسلام کا غیر معمولی تحمل:

اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مبلغ اسلام علیہ الرحمہ نے اپنے تبلیغی مشن کے لیے کیا لائحۂ عمل متعین کیا؟ ان کی جدوجہد، محنت و جانفشانی پر نیز ان کے طریقۂ عمل پر جب ہم گہری نظر ڈالتے ہیں، تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ میں اسلام کی حکمت عملی کو مکمل طور سے برت کر کے دکھایا ہے، اشتعال انگیزی ، باہمی منافرت کے جذبے کو ابھارنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی ، بلکہ نہایت حسین پیرائے میں اسلام کے احکام وشرائع ،اس کے عقائد ونظریات، اس کے فلسفۂ حیات اور اس کی اقتصادی ومعاشی زندگی کے تصورات کے پیش کرنے میں کمال دانشمندی ودیدہ وری کا ثبوت فراہم کیا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جذبات کی رو میں بہہ گئے ہوں، چنانچہ جارج برناڈ شا اور حضرت مبلغ اسلام کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا، اس میں جارج برناڈ شا ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا تھا، جہاں اس نے اپنے دعوی علم کے باوجود بڑی شستہ زبان میں بلکہ نہایت چابکدستی کے ساتھ ایسی اشتعال انگیز اور نفرت انگیز بات کہہ دی تھی کہ اگر حضرت مبلغ اسلام غیر معمولی ضبط وتحمل کے عادی نہ ہوتے تو اس سے مشتعل ہو کر اس کی غیر مناسب بات کا جواب سختی کے ساتھ دیتے کیوں کہ جارج برناڈ شا نے کہا تھا کہ:

> ''میں پیغمبر عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بہت عزت کرتا ہوں، اور یہ بات بھی سمجھتا ہوں کہ وہ ایسی جاہل و بے بہرہ قوم کو جو گناہوں کے سمندر میں غرق ہو، غیر اخلاقی حرکتوں سے آزاد کرنا پھر انہیں حق کی تلاش وجستجو پر آمادہ کرنا، انتہا درجہ کی خوبصورت جنت اور اتنے ہی خوفناک دوزخ کی تصویر دکھائے بغیر ناممکن رہا ہوگا''۔(حیات علیم رضا،ص ۳۸،۳۹)

یہ عبارت پکار پکار کر بول رہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جارج برناڈ شا اگر چہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے، تاہم جنت و دوزخ کی ایسی عقلی توجیہ پیش کر رہا ہے، جو ان کے انکار کے مترادف ہے، گویا وہ کہنا چاہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسین وجمیل جنت اور خوفناک جہنم کی جو تصویر کھینچی تھی فی الواقع نہ ایسی جنت پائی جاتی ہے، اور نہ ایسا جہنم، پیغمبر اسلام نے انتہا درجہ کی زیرکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وحشی عرب قبائل اور غیر مہذب انسانوں کو عالم وحشت و بداخلاقی سے نکالنے کے لیے محض ایک افسانہ گڑھا تھا، معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ۔

اگر ایسے موقع پر مبلغ اسلام علیہ الرحمہ کے سوا کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ مشتعل و چراغ پا ہو جاتا، اور بجائے حکیمانہ اسلوب اختیار کرنے کے اس کے کلام میں جذباتیت کا رنگ غالب آجاتا مگر آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں کمال درجہ کی معقولیت پائی جاتی ہے، اور تفہیم بھی نرالی ہے، آپ فرماتے ہیں:

> ”ایسی صورت میں کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ جنت کی نعمتیں کسی لحاظ سے بھی دنیا کی ایسی چیزوں سے مماثلت رکھتی ہوں جو ہمارے لیے خوشی کا باعث ہیں، اب جیسا کہ قانون ہے کہ ہر چیز آگے بڑھ رہی ہے، اور مائل بہ ترقی ہے تو اس کی ترقی کی بھی لامحالہ کوئی معراج ہونی چاہیے جہاں یہ رک جائے، اور مزید ترقی کا امکان ختم ہو جائے، آرام و خوشی اور تکلیف و رنج ایسی چیزیں ہیں جن کا سابقہ دنیا میں انسان کو پڑتا رہتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ دونوں حالتوں کا کوئی انتہائی مقام ہو، خوشی کی معراج جنت ہے، اور تکلیف و اداسی کی معراج دوزخ کہلاتی ہے“۔
>
> (حیات علیم رضا، ص ۴۰، ۴۱)

حضرت مبلغ اسلام کا یہ پر حکمت بیان صرف عقلی توجیہ نہیں ہے کہ انہوں نے اسے اپنے دانشور مخاطب کو محض لاجواب کرنے کے لیے پیش کیا ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم

کی آیت کریمہ میں بھی اس کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ {الکھف، آیۃ، ۱۰۷۔۱۰۸}

بلاشبہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ان کے لیے فردوس کی جنتیں مہمانی ہیں، اور ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان سے باہر آنے کی خواہش نہ کریں گے۔

اس کی تفسیر میں علامہ ابوالبرکات نسفی رقم طراز ہیں:

"أی لا مزید علیها حتی تتنازع أنفسهم إلی أجمع لأغراضهم وأما نیهم وهذه غایة الوصف لأن الإنسان فی الدنیا فی أی نعیم کان فهو طامع ،مائل الطرف إلی أرفع منه" {مدارک، ج ۳، ص ۴۸}

جنت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، جو ان کی مقاصد اور تمناؤں کا زیادہ جامع ہو، جن کی خواہش جنتی کرسکیں، یہ جنت کی انتہائی تعریف ہے، اس لئے کہ انسان دنیا میں جس نعمت میں بھی ہو اس سے زیادہ بلندی کی طرف اپنی نگاہ کو اٹھانے والا ہے، (لیکن انسان جنت میں پہنچ کر اس سے بڑھ کر کوئی آرزو نہیں رکھے گا)۔

مبلغ اسلام کی تبلیغ کا امتیازی وصف:

مبلغ اسلام علیہ الرحمہ نے اپنی تبلیغ کی راہ میں جیسی ہوشمندی و دیدہ وری سے کام لیا، اس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی ہے، وہ کسی حالت میں بھی اپنے مخاطب کو اپنی قوت بیان، اپنے زور استدلال نیز اپنے طرز تقریر سے مرعوب نہیں کرتے تھے، جس سے ان کا مخاطب ایسا شرمندہ و نادم ہو جائے کہ آپ کی بات سننے کے بجائے آپ سے متنفر ہو جائے، بلکہ اگر آپ کا مخاطب با کمال ہوتا اور اس کے علم و دانش کی شہرت ہوتی تو اس کے اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے، جارج برناڈ شا کے مکالمہ میں اس کے کمال علمی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''آپ فن تقریر وتحریر کے استاد ہیں، اور آپ کے ساحرانہ قلم کی نکلی ہوئی خوبصورت اور لاجواب تحریریں قارئین کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کرتی ہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے، ملتی جلتی شکلوں اور چہروں کی مدد کے بغیر مادی زبان کے ذریعہ روحانی مسائل اور عمل کو سمجھا نہیں جا سکتا''۔ (حیات علیم رضا، ص۳۹)

ظاہر ہے کہ جارج برناڈ شا خواہ کتنا ہی بڑا فلسفی رہا ہو، اور اس کی تحریروں میں کتنی ہی جاذبیت پائی جا رہی ہو، تاہم وہ مذہبی علوم وفنون میں مبلغ اسلام کے مقابلہ میں ایک طفل ناداں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لیکن آپ نے ایسی زبان استعمال نہیں کی جس سے اس کی بے علمی ظاہر ہو، اور نہ ہی اس کے اوپر چھا جانے کی کوئی کوشش کی جس سے اس کے اندر اپنی ہمہ دانی کا جذبہ ابھر کر خود آپ ہی کی ذات سے نفرت وحقارت پیدا ہو، اور آپ کی گفتگو سننے کے لئے آمادہ نہ ہو، یہی وہ طریقۂ تبلیغ ہے جو مبلغ اسلام کو دوسرے مبلغین سے ممتاز کر کے اونچے مقام پر فائز کر دیتا ہے، اور ان کی سحر کاری سے متاثر ہو کر بڑا سے بڑا فلسفی اور سائنس داں ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے، بلکہ ان کی عظمت ورفعت کا معترف ہو کر ان کے کمال علمی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

آپ کی قوت استدلال:

غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت وتبلیغ بالخصوص پڑھے لوگوں میں اسلام کے احکام کو پہونچانا دشوار ترین کام ہے، کیوں کہ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور تحقیق کے نام پر کذب بیانیوں کا بڑا زبردست مقابلہ اسلام کے مبلغ کو کرنا پڑتا ہے، اس لیے جب کوئی مبلغ ایسے شخص سے مخاطب ہوتا ہے جس کے ذہن میں یہ بات رچی بسی رہتی ہے کہ اسلام کی تعلیم کے اثر ونتیجہ میں دنیا کی ایک بڑی آبادی وحشی غیر متمدن اور خونخوار ہوگئی ہے، تو اس کی نفرت وحقارت انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے، اور وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ اس مذہب کے نمائندہ ہیں جس

نے اپنی تعلیمات سے جبر واکراہ اور ظلم عدوان کا بازار گرم کر کے اپنا عقیدہ منوانے کے لیے انسانوں کو مجبور کیا ہے، ایسی غلط فہمیوں کا سامنا حضرت مبلغ اسلام علیہ الرحمہ کو بھی کرنا پڑا، اور آپ نے اپنی قوت استدلال اور اپنی شوکت الفاظ سے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بڑی زبردست کامیابی حاصل کی، چنانچہ جب آپ سے جارج برناڈ شا کا مکالمہ ہوا تو اس نے سب سے پہلے یہی بات پیش کی کہ:

''آپ ایسے مذہب کے ترجمان ہیں جو تلوار کے زور پر پھیلا تھا، مجھے افسوس ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث آپ کا لکچر نہ سن سکا، حالاں کہ مجھے آپ کو سننے کا خاص اشتیاق تھا، آپ نے فلسفۂ امن پر تقریر کی، حالاں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ کے لیے زیادہ مناسب یہ تھا کہ آپ فلسفہ جنگ پر روشنی ڈالتے، کیوں کہ بلاشک شبہ اسلام تلوار کی نوک سے پھیلا ہے''۔(حیات علیم رضا، ص ۲۹، ۳۰)

اس کذب وافترا کا جو جواب حضرت مبلغ اسلام نے دیا وہ بہت سنجیدہ اور نپے تلے الفاظ میں تھا، وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا تھا کہ:

''یہ داستان جس کا جھوٹ اب بے نقاب ہو چکا ہے، آپ جیسے عالم کی زبان پر آئی ہے، تاہم مختصر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے لفظی معنی خود ''امن'' کے ہیں، اسلامی تعلیم کا مصدقہ ریکارڈ اپنی پوری صحت کے ساتھ قرآن وحدیث کی صورت میں موجود ہے، جو واضح طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال اسی صورت میں جائز ہے جب مسلمانوں پر حملہ کیا جائے، اور انہیں اپنی دفاع میں تلوار اٹھانی پڑے، علاوہ بریں قرآن حکیم صاف طور پر کہتا ہے کہ اسلام میں زبردستی نہیں''۔

ان زوردار الفاظ میں حضرت مبلغ اسلام نے اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا، اور یہ بتایا کہ یہ غلط فہمیاں عرصہ سے چلی آرہی ہیں، اس کی تردید اسلام کے مصدقہ ریکارڈ سے ہوتی ہے، سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ {الحج: ۳۹}

ان لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی، جن سے قتال کیا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا جاتا ہے، اور بلاشبہہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، جن کو ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا، صرف اس بنا پر کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

اس آیت کریمہ کی شان نزول میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت اذیتیں پہنچاتے تھے، کوئی سرکار کے پاس حاضر ہوکر اپنے جسم پر ضرب کے نشان دکھاتا، کوئی زخم دکھا کر فریاد کرتا تھا، تو آپ فرماتے کہ تم صبر کرو، مجھ کو ابھی جنگ کا حکم نہیں دیا گیا ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو جنگ کی اجازت کے متعلق یہ پہلی آیت کریمہ نازل ہوئی، اور اس سے پہلے بہت سی آیتوں میں جنگ وجدال سے روکا گیا تھا۔

یہ آیت کریمہ صاف لفظوں میں اعلان کر رہی ہے کہ جب تک مسلمانوں پر ظلم نہ کیا جائے یا ان کو ان کے گھروں کو اجاڑا نہ جائے اس وقت تک وہ امن کی حالت کو برقرار رکھیں، اور جنگی حالات پیدا نہ ہونے دیں، لیکن جب ان کے اوپر ظلم کیا جائے اور ان کو ہر طرح سے ستایا جائے یہاں تک کہ ان کو ان کے گھروں سے بھی بے دخل کر دیا جائے، تو اب ان کو ہتھیار اٹھا لینا چاہیے، اور اپنی حربی قوت سے ظالم کے مقابلہ میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، اس سے ثابت ہوا کہ اسلام جارحیت کی جنگ کی اجازت نہیں دیتا کہ خواہ مخواہ کے لیے پرامن شہریوں پر حملہ کیا جائے، اور ان کو اپنا دین اسلام ماننے پر مجبور کیا جائے، بلکہ وہ جنگ کی اجازت اسی وقت دیتا ہے جب ان کو ستایا جائے بہ الفاظ دیگر جارحانہ جنگ کی

اجازت نہیں دیتا ہے، بلکہ جنگ مدافعانہ کی اجازت دیتا ہے، اسی بات کی تشریح ایک نامور فلسفی کے سامنے مبلغ اسلام نے چند مختصر جملوں سے کیا ،تو آپ کی باتوں سے نا صرف وہ حیران وششدرره گیا بلکہ اس کو یقین حاصل ہوا کہ تعصب وتنگ نظری سے اسلام کے متعلق کافی غلط فہمی پھیلائی گئی ہے۔

اسلام کی واضح تصویر:

دنیا میں جتنے خدا کے نیک بندے بنی نوع انسان کی ہدایت ورہبری کے کام پر مامور ہوئے ،سب توحید وحق پرستی کا درس دینے کے لیے آئے ،ان کی تعلیمات کا خلاصہ چند مختصر جملوں میں یہ تھا کہ خدا کو مان کر نیک کام میں لگے رہو،اور پاک چیزوں کو کھاؤ۔

﴿يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صٰلِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ {ألمؤمنون: ۵۱}

اے پیغمبرو! پاک چیزیں کھاؤ، اوراچھا کام کرو، بے شک جو کچھ تم کرتے ہو میں اس کا جاننے والا ہوں۔

لیکن ان کے ماننے والوں نے ہوائے نفس میں مبتلا ہوکر اس درس حیات کو بھلا دیا،اس لیے تمام مذاہب تحریف کا شکار ہو گئے، اسلام نے آکر خدا پرستی کا یہ سبق دہرایا کہ تمام مذاہب کے سچے پیشواؤں کی بنیادی تعلیم یکساں ہے،اس لیے مسلمانوں کو تمام انبیاے کرام پر ایمان لانا لازمی ہے، غالباً اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے،جس نے اپنے پیرووں کو انبیاے کرام **علیہم السلام** کے درمیان تفریق سے شدت کے ساتھ روکا ہے، حضرت مبلغ اسلام اسی بات کو اپنے حکیمانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ:

> ’’قرآن خود اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ جب روحانی مذاہب کا نقطۂ آغاز خدا کے وجود کا اقرار ہے،تو ان کے ارشادات میں ہم آہنگی ناگزیر ہے،خود اسلام کو ایک نیا مذہب سمجھا گیا ہے، حالاں کہ قرآن حکیم کے نزدیک اس کی تمام مذہبی تعلیمات بنیادی طور سے کم و

بیش وہی ہیں، جن کا درس دوسرے سچے پیغمبروں نے دیا تھا''۔(حیات علیم رضا،ص ۳۴)

مبلغ اسلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ اسلام کی ایسی تصویر پیش کریں کہ سامع کی رغبت اس کی طرف پیدا ہوجائے، بلکہ اس کا مقصود یہ بھی تھا کہ اسلام کی غلط وضاحت کے بجائے اس کی واضح تصویر مخالف وموافق سب کے سامنے آجائے، وہ گویا قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کی تفسیر بیان کررہے تھے کہ:

﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۝ وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ﴾{ألأنبياء: ۹۲۔۹۳}

بلا شبہ تمہاری ملت ایک ہی ملت اسلام ہے، اور میں تمہارا پروردگار ہوں، تم صرف میری پرستش کرو، اور لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔

یہ آیت کھلے طور پر اعلان کررہی ہے کہ دنیا میں جتنے سچے پیغمبر تشریف لائے، ان سب کا دین ایک ہی تھا، ان کی بنیادی تعلیم یہی تھی کہ صرف اللہ ہی ان کا پروردگار ہے، اسی کی پرستش ہونی چاہیے، پھر لوگ فرقہ بندیوں کا شکار ہوگئے، اور اس حقیقی دین کو مسخ کر کے مذہبوں اور ملتوں کا تفرقہ ڈال دیا گیا، اور باہم آویزشیں شروع ہوگیں، ورنہ اختلاف ونزاع کی کوئی صورت نہیں تھی، جب کہ انبیاے کرام **علیهم السلام** کی بنیادی تعلیم ایک ہی تھی، اگرچہ وہ مختلف زمان ومکان میں تشریف لائے۔

دیکھیے مبلغ اسلام قرآن حکیم کے نقطۂ نظر کو کتنے اچھے انداز میں پیش کررہے ہیں، کہ جب سب کا دین ایک ہی تھا، اور اس میں بگاڑ پیدا ہوگیا تھا، اسی کو اسلام صاف ستھرے اور واضح لفظوں میں پیش کررہا ہے، تو بحث وحجت چھوڑ کر سب کو اسلام کا دامن مقدس تھام لینا چاہیے، یا کم از کم ایسا جدال ونزاع نہیں کرنا چاہیے، جس سے باہم منافرت کے شعلے بھڑک اٹھیں، بلکہ تمام مذاہب عالم کو ایک مرکز پر جمع ہوکر اپنے مشترک دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بنانا

چاہیے، کیوں کہ وہ مذہب کی بنیاد کو ہلا دینا چاہتا ہے، اور اپنے پروپیگنڈہ کے ہمہ گیر وسائل کی بنا پر مذہبی افکار ونظریات کا مذاق برسرعام اڑانا چاہتا ہے، اور جو انسانیت کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ اگر دنیا میں مذہب نام کی کوئی چیز رہ گئی تو انسان ہمیشہ خوف و ہراس میں مبتلا رہے گا، اور وہ ترقی کی راہ میں میں پیش قدمی کرنے کے بجائے جمود وتعطل کا شکار ہوجائے گا، یہ مشترک دشمن الحاد پرستوں ودہریوں کا گروہ ہے۔

تنظیم بین المذاہب کے قیام کے لیے جدو جہد:

جب اشتراکیت کا زور بندھا ہوا تھا، تو ایسے پرآشوب دور میں تمام مذاہب عالم کی ایک متحدہ قوت کے وجود میں لانے کی جدوجہد مبلغ اسلام نے کی تھی جو الحاد ولادینیت کے مقابلہ میں اپنی طاقت کا لوہا منوا سکے، ماریشس کے کثیر الاشاعت مشہور روزنامہ ''ایڈوانس'' نے لکھا تھا کہ:

> ''مشہور زمانہ مسلمان عالم دین مولانا عبدالعلیم صدیقی جو ابھی ابھی ماریشس تشریف لائے ہیں، یورپ جانے سے پہلے ''تنظیم بین المذاہب'' کے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں، اس نقطۂ نظر کے مطابق کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والوں کے اچھے تعلقات قائم ہوں''۔ (حیات علیم رضا، ص ۸۷)

اور آپ کے تذکرہ نگار مرزا ارشاد احمد علیمی لکھتے ہیں کہ:

> ''مبلغ اسلام حضرت علامہ ومولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی نے سنگاپور میں لادینی افکار ونظریات بالخصوص کمیونزم کے خلاف مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی اور یہودی مذہبی رہنماؤں کا ایک متحدہ محاذ تشکیل کیا، جس کا نام ''تنظیم بین المذاہب'' رکھا آپ کی انہی خدمات کے اعتراف کے طور پر تنظیم میں شامل رہنماؤں نے مشترکہ طور پر آپ کو فضیلت مآب کا خطاب دیا''۔ (حیات علیم رضا، ص ۵۶)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مشترک دشمن کے مقابلے میں مختلف نظریات وعقائد کے رکھنے والے مذہبی پیشواؤں کی کوئی تنظیم قائم ہوجائے تو اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہیے، لیکن یہ سوال بار بار ذہن میں ابھرتا ہے کہ آپ کا تعلق جس اسلامی مذہبی گروہ سے تھا اس کے یہاں اس اتحاد وتنظیم کی گنجائش تھی یا نہیں؟ اس مذہبی طبقہ کے متعلق عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے ساتھ کسی تنظیم میں شریک ہونا تو بڑی بات ہے خود مسلمانوں میں جو مختلف گروہ پیدا ہوگئے ہیں ان کی کسی تنظیم میں یہ فرقہ شامل نہیں ہوسکتا، واقعہ یہ ہے کہ اس مکتب فکر کے لوگوں میں خاص اس معاملہ میں اتفاق نہیں ہے بلکہ اس خصوصی مسئلہ میں مختلف خیال کے لوگ پائے جاتے ہیں، مبلغ اسلام علیہ الرحمہ اس نقطۂ نظر کے قائل تھے کہ اگر کبھی طاقتور مشترک دشمن ہو تو اس سے مقابلہ کے لئے مختلف مذاہب کے پیشواؤں کی ایک متحدہ قوت پیدا کرنا کوئی قبیح امر نہیں ہے، آپ وسیع الخیال، بلند نظر، اعلیٰ ظرف، اقوام وملل کے حقائق کا صحیح جائزہ لینے والے، سیاح یورپ وایشیا وافریقہ وامریکہ تھے، اس لئے آپ نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش مشترک دشمن کے مقابلے کے لئے کی بلکہ ''بین المذاہب'' تنظیم کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہے، غالباً یہی وہ سب اسباب ہیں کہ مشہور صحافی مولانا عبدالماجد دریاآبادی آپ کی بارگاہ میں خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''انصاف کی عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ بریلوی گروہ کے سارے افراد کو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا سمجھنا زیادتی ہے، مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی مرحوم ومغفور نے اس گروہ کا ایک فرد ہوکر بیش بہا تبلیغی خدمات انجام دیئے ہیں''۔ (حیات علیم رضا، ص ۵۸)

دعوت وتبلیغ کی قدر وقیمت کا احساس:

آپ کی تبلیغی خدمات کا صرف یہی ایک پہلو اجاگر نہیں ہے کہ عالمی مذاہب کے لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں

کو ایک مرکز پر لانے کی جدوجہد کی، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ آپ نے دنیا کے کونے کونے میں نغمۂ اسلام کو پہنچایا، اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوکر ہدایت کی راہ پا گئے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ہندوستان کے مبلغین میں پوری اس صدی کے اندر ایسا مبلغ نہیں پیدا ہوا، جس کی تنہا کاوش اور محنت یا جس کی جادو بیانی وسحر کاری سے متاثر ہوکر اتنی بھاری تعداد میں غیر مسلم اسلام کی دولت بے بہا سے مالا مال ہوئے ہوں، اس عظیم شخصیت کا رتبہ کتنا بلند ہوگا کہ جس نے تلوار کی جنگ تو نہیں لڑی لیکن اپنی اخلاقی قوت کی برتری اور اسلام کی دلربا تصویر پیش کر کے ہزاروں بندگان خدا کو حلقۂ بگوش اسلام کیا ہو۔

حضرت مولائے کائنات علی رضی اللہ عنہ کو غزوۂ خیبر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھنڈا عطا فرمایا تو آپ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا تھا:

"فواللّٰہ لان یھدی اللّٰہ بک رجلاً واحدا خیرلک من أن یکون لک حمرالنعم "۔{صحیح بخاری ،کتاب المغازی ،باب غزوۃ خیبر،حدیث نمبر4210}

خدا کی قسم تمہارے ذریعہ ایک آدمی ہدایت یافتہ ہوجائے تو یہ تمہارے حق میں اس سے بہتر ہے کہ تم سرخ اونٹوں کے مالک ہوجاؤ، یعنی تمہارے پاس دولت کی بہتات ہو۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد کہ:

"من دعا الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذالک من اجورھم شیئا ،ومن دعا الی ضلالۃ کان لہ من الاثم مثل آثام من تبعہ ،لا ینقص ذلک من آثامھم شیئا" ۔{مسلم کتاب العلم، باب من سن سنۃ حسنۃ او سیئۃ}

جس نے ہدایت کی دعوت دی، تو اس کو اجران تمام لوگوں کے برابر ملے گا، جو اس پر عمل کریں گے، اوران کے اجروثواب میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی، اسی طرح جس نے کسی گمراہی کی طرف بلایا، تو اس کو عذاب ان تمام لوگوں کے مثل ملے گا جو اس گمراہی کی پیروی کریں گے، اوران کے گناہوں کے عذاب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کے اس مطالبہ پر کہ آپ دین اسلام کی تبلیغ و ہدایت ترک کر دیں، نہایت پر جوش اور رقت آمیز الفاظ میں فرمایا کہ:

"یاعم لو وضعوا الشمس فی یمینی، والقمر فی یساری علیٰ ان اترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ او اھلک فیہ ماترکتہ، قال: ثم استعبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فبقی"۔ {السیرۃ لابن ھشام، ج ۱، ص ۱۷۰}

اے چچا جان! خدا کی قسم اگر سورج میرے داہنے ہاتھ میں رکھ دیا جائے، اور چاند بائیں ہاتھ میں، اس لیے کہ میں دین اسلام کی تبلیغ کو ترک کر دوں، تو میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا یا تو اللہ تعالیٰ اس کو غلبہ عطا فرمائے گا، یا پھر اس راہ میں ہلاک کر دیا جاؤں گا، آپ یہ فرما رہے تھے اور آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے پھر رونے لگے۔

ان ارشادات نبویہ سے رشد و ہدایت، دعوت و تبلیغ کی قدر و قیمت کا شعور حاصل کیا جا سکتا ہے، پھر اس نابغۂ روزگار ہستی نے اس کا احساس کیوں نہ کیا ہوگا، جو تقریباً چالیس سال تک اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے دنیا بھر کی خاک چھانتی رہی، جس کو افریقہ کے وحشی اقوام کا سامنا کرنا پڑا، اور یورپ و امریکہ کے پڑھے لکھے سر پھروں اور ملحدوں پر اسلام کی صداقت و حقانیت واضح کرنی پڑی، جس نے تقریبا دنیا کے چالیس ملکوں کا دورہ کیا، اور اس دوران ان کا مقصد سیاسی یا معاشی منفعت نہیں تھا، بلکہ وہ تن تنہا تبلیغ کے فریضہ کو ادا کر کے ایک مثال و نمونہ قائم کرنا چاہتے تھے، جو اتنا بڑا عاشق رسول تھا کہ آخری عمر میں اپنے وطن عزیز کو ترک کر کے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سر زمین مقدس کو اپنی اقامت گاہ بنالی تھی، اور یہ تہیہ کرلیا تھا کہ اب کچھ بھی ہو جائے مدینہ منورہ سے ایک منٹ کے لئے جدا نہ ہوگا، ایسی عظیم اور لاثانی شخصیت کو کیوں کر تبلیغ کی اہمیت کا اندازہ نہ ہوتا کہ اگر یہی دعوت و ہدایت کا کام نہ ہو تو سب کچھ ہوتے ہوئے اسلام کی روشنی مدھم پڑ جائے گی۔

تبلیغ کے قرآنی اُصول پر مبلغ اسلام کا عمل:

اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس نے دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا

کرنے میں نہ صرف کوتاہی کی ہے بلکہ قرآن حکیم نے جن اصولوں کو اس کے بارے میں متعین کیا تھا، ان سے بھی صرف نظر کیا ہے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ ایک داعی حق کے لیے ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی حکمت عملی پر اپنے مشن کو جاری رکھے، ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجٰدِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ {النحل: ۱۲۵}

اے حبیب! اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلاؤ، اور بحث ونزاع ایسے طریقہ پر کرو جو اچھا ہو، تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا، اور وہ ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ راست پر ہیں۔

قرآن حکیم کی اس حکمت عملی پند و موعظت، بحث و نزاع کے اچھے طریقہ پر حضرت مبلغ اسلام نے مکمل طور سے عمل کیا تھا، چنانچہ ایک طرف ارباب حل وعقد کی اہم مجالس میں آپ نے نہایت معقول اور مدلل تقریر فرمائی، تو دوسری جانب افریقہ کے خانہ بدوشوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو بڑی دانائی سے اسلام کی طرف مائل کیا، اسی بنا پر آپ کو ''عدیم النظیر'' مقرر قرار دیا گیا، چنانچہ ''ٹوکیو'' کے پروفیسر این، ایچ، برلاس لکھتے ہیں کہ:

> ''ہر شخص مولانا صدیقی صاحب کو ہر پلیٹ فارم پر بولتے ہوئے سن سکتا ہے، اور ان سے محظوظ ہوسکتا ہے، اور کیوں نہ ہو جب کہ ایک جانب مولانا کی مقناطیسی شخصیت ہو، اور دوسری جانب ان کی نغمہ بار آواز، اور تیسری جانب ان کی ٹھوس اور مدلل تقریر ہو''۔

دوسرا اُصول یہ ہے کہ ہر مبلغ اپنی جد وجہد، اپنی محنت وجانفشانی کے ذریعہ کسی مادی منفعت کا خواستگار نہ ہو بلکہ دنیا کی تمام آلائشوں اور خواہشوں سے بے نیاز ہو کر محض رضائے حق کی نیت اور خدمت خلق کی خاطر دین کی تبلیغ کا کام کرے، قرآن کریم نے انبیاے کرام

علیهم السلام کی زبان اقدس سے بار بار یہ اعلان کیا کہ:

﴿ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۙ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴾ {یونس: ۷۲}

میرا اجر صرف اللہ کے یہاں ہے، اور مجھے حکم دیا گیا کہ اس کے اطاعت گزاروں میں رہوں۔

سورہ ھود میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴾۔{ھود: ۵۱}

میرا اجر اس ذات کے ذمہ کرم ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا، تو پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ جب اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا تو زندگی اور معیشت کا انتظام اس کے ذمہ کرم ہے، اس لئے دعوت حق کے سلسلہ میں بندگان خدا سے اجر مزدوری کا طلب گار ہونا عقل و دانش کے خلاف ہے۔

سورہ شعرا میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَمَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾{الشعراء: 180}

میں تم سے اس (دعوت) پر کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں، میرا اجر تو جہانوں کے پروردگار کے ذمہ کرم ہے۔

اس لئے جو نفوس قدسیہ انبیاے کرام علیھم السلام کی نیابت میں اس بھاری ذمہ داری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہیں، وہ دنیا والوں کے مادی فائدوں سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالی کی خوشنودی کی خاطر میدان عمل میں سرگرم رہتے ہیں، حضرت علامہ عبد العلیم صاحب صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ایک نائب رسول تھے، انہوں نے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں جو کچھ محنت و مشقت اٹھائی بلکہ جو کچھ کارنامہ انجام دیا اس سے وہ صرف اجر آخرت کے

امیدوار رہے، حرص وطمع دنیا سے بالکل پاک وصاف رہ کر دین اسلام کی خدمت زندگی بسر کرتے رہے، انہوں نے عسرت وتنگدستی میں زندگی گزاری، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ان کے جانثار وفدائی ان کو اس دنیا کے سیم وزر سے تولتے، مگر وہ ایک سچے نائب رسول کی حیثیت سے دنیا سے مستغنی رہے، بلکہ ان کی زندگی کا نمایاں پہلو ان کی شان استغنا ہے، ان کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی اولادوں میں علمی وراثت کے سوا مال ودولت کی وراثت (جو قابل ذکر ہو) نہیں آئی، ان کے فرزند بلند اقبال قائد ملت حضرت علامہ مولانا شاہ احمد نورانی جو اپنے پدر بزرگوار کے نقش پا کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، ان کے متعلق آج بھی مشہور ہے کہ وہ کراچی میں کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں، اور ان کا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے، اگر ان کے والد محترم کے پاس سیم وزر کا انبار ہوتا تو حضرت شاہ صاحب سے بڑھ کر اس کا وارث کون ہوسکتا تھا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ کوئی داعی حق یا کوئی مبلغ اپنی دعوت وتبلیغ میں کامیابی وکامرانی کے منازل طے نہیں کرسکتا جب تک اس کے دل میں خلق خدا کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کا جذبہ موجزن نہ ہو، اور اس کی غلط کاریوں اور گمراہیوں سے خود قلق واضطراب میں مبتلا نہ ہو جاتا ہو، اسی لئے آپ قرآن حکیم اور حدیث شریف کا مطالعہ کریں گے، تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہدایت ورہبری کے کام میں انسانیت کے سچے بہی خواہ وخیر خواہ تھے، رات رات بھر اس کے غم میں ڈوبے رہتے تھے، خدا کی بارگاہ میں اپنی نیازمندانہ پیشانی جھکا کر دعائیں کرتے کہ اے خدائے قدوس! گمراہ انسان کو راہ راست پر لگادے، اس غم میں اتنا گھل گئے تھے کہ قرآن حکیم میں آپ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾ {الکھف:٦}

ممکن ہے کہ آپ ان کے پیچھے انتہائی غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے، اگر وہ قرآن مقدس پر ایمان نہ لائے۔

اسی طرح دیگر انبیاے کرام کی زندگی پاک کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے، کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا ہے جو بنی نوع انسان کی گمراہی اور اس کی بداطواری سے خود رنج وغم میں مبتلا نہ ہوا، خدا کے یہ برگزیدہ بندے ایسے تھے کہ جو لوگ ان کی جان کے دشمن رہے، اور زندگی بھر ان کے درپئے آزار رہے، وہ ان کی بھلائی کے خواست گار رہے۔

اس لیے مبلغ کی شان یہ ہونی چاہیے کہ اس کے دل میں خیر خواہی کا ولولہ اور تڑپ پائی جاتی ہو، وہ اپنے مخالفوں اور معاندوں کا بھی بدخواہ نہ ہو، بلکہ ان کے صلاح وفلاح کا متمنی اور آرزومند ہو، اس معیار سے بھی جب ہم حضرت مبلغ اسلام علیہ الرحمہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں انسانیت کی خیر خواہی و دوستی کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا، وہ اپنی دعا ایسے رقت آمیز الفاظ میں کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنے دل کے ٹکڑوں کو اپنی پردرد آواز کی شکل میں تبدیل کر رہے ہوں۔

''اے مالک ومولیٰ! تو نے ہمیں انسان بنایا، عزت وخلافت کا خلعت پہنایا، ہمیں دولت دی، سلطنت بخشی، زمین میں وراثت عطا کی، مگر آہ آہ ہم نے تیری نعمتوں کی قدر نہ جانی، تو نے ہمیں سنوارا اور ہم نے اپنی صورتوں کو بگاڑا، تیری راہ کو چھوڑا، تیرے حکموں سے منہ موڑا نفس وشیطان کی جال میں پھنسے اور گناہ کیے، اور وہ بھی ایسے سخت کہ جانور بھی پناہ مانگے، نافرمانیاں کیں، اور ایسی سخت کہ ان سے پتھر بھی لرز جائیں''۔ (حیات علم رضا، ص۷۶)

ان دعاؤں کے الفاظ میں کتنا درد وکرب ہے، کتنا سوز دروں پایا جاتا ہے، اس کا صحیح وجدان ایک صاحب دل ہی حاصل کر سکتا ہے، اگر ایک نا آشناے حقیقت پر اس دعا کی آہ وبکا کا اثر نہ پڑے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ پتھر کا دل دکھتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی شقاوت قلبی پتھر سے زیادہ ٹھوس ہے، ورنہ ان دعاؤں میں ایسی تاثیر ہے کہ بڑا سے بڑا سخت دل پگھل کر موم ہو جائے، ان الفاظ سے انسانیت کے درد کا ایسا احساس ہوتا ہے کہ گویا حضرت مبلغ اسلام نے اپنے خدا کی بارگاہ میں بڑے عجز ونیاز مندی کے ساتھ اپنے دل بے قرار کی بے قراری بیان کر دی، یہی شان ایک مبلغ کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے درد

دل سے مضطرب و بے چین رہتا ہے پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ وہ زندگی بھر یورپ و ایشیا، امریکہ و افریقہ کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرتے رہے، زندگی کے کسی لمحہ میں ان کو چین وسکون نصیب نہ ہوا، انھوں نے نہ صرف اپنی ملت کی خاطر بلکہ پورے عالم انسانیت کے لیے اپنا عیش وآرام اور اپنی راحت سرور کی پوری زندگی تج دی، وہ کون سی چیز تھی جو ان کو دردر کی ٹھوکریں کھلا رہی تھی، وہ کبھی یورپ کے مہذب انسانوں کے ایوانوں میں اذان تبلیغ دے رہے تھے، اور کبھی افریقہ کے وحشی قبائل سے انہوں نے اپنا تعلق جوڑا تا کہ اسلام کی تہذیب وشائستگی سے ان کو مہذب وآراستہ کریں۔

میرے خیال میں ان کا اپنے مقصد سے عشق انسانیت کا درد تھا جو ہر آن ان کو گردش میں رکھتا تھا، ان کی حیات پاک سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ان کی جو کچھ کامیابیاں ہیں یا بہ الفاظ دیگر اس کے جو کارنامے ہیں، وہ دنیوی و مادی نہیں ہیں، بلکہ روحانی و اخلاقی ہیں، مادی کارنامے خواہ سیاست کاری کی شکل میں ہوں، یا اقتصادی مسائل کے سلجھانے کی صورت میں ہوں، سب فنا کے گھاٹ پہنچ جاتے ہیں، چند صدی بھی نہیں گزرنے پاتی کہ ایسے قائدین کا نام لیوا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا، لیکن جن بے نفس انسانوں کے کارنامے اخلاقی و روحانی ہوتے ہیں مرور ایام اور امتداد زمانہ سے وہ مٹ نہیں سکتے، ان کی یاد دلوں میں ایسی ثبت ہو جاتی ہے کہ اس کو مٹایا نہیں جا سکتا، اور نسلاً بعد نسلٍ یہ یادیں منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ زندہ و پائندہ ہوتے ہیں، اس زندگی کو ہم یادگاری زندگی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، لیکن میرے اپنے عقیدے کے مطابق ان قدسی صفات کو واقعی اور حقیقی زندگی ملتی ہے۔

حضرت مبلغ اسلام علیہ الرحمہ کو اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف منتقل ہوئے تقریباً اڑتیس سال گزر گئے یعنی ایک نسل دنیا سے ختم ہو رہی اور دوسری نسل کا وجود ہو رہا ہے، مگر وہ حقیقی معنوں میں زندہ جاوید ہیں، اور ان کی یاد بھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ ع

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

اس مقالہ کے اختتام پر یہ بھی عرض کرنا مناسب تصور کرتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق **رضی اللّٰہ عنہ** کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی خدمت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رفاقت کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ حضرات انبیاے **علیہم السلام** کے بعد تمام اولاد آدم میں ان کا رتبہ نہ صرف بلند وارفع ہے، بلکہ حیات ابدی میں بھی سرکار کی مصاحبت کا ان کو شرف حاصل ہوا، تو کہا جا سکتا ہے کہ انہیں کے خاندان کے چشم و چراغ نے اسلام کی تبلیغ میں جو ایثار و قربانی پیش کی اس کا اجر ان کو یہ ملا کہ بھارت کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے، اور یہیں سے اسلام کی شمع فروزاں لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرتے رہے، لیکن ابدی استراحت کے لئے خداے قدوس نے ''جنت البقیع'' میں ان کو اپنی ماں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ **رضی اللّٰہ عنہا** کے مبارک قدموں کے قریب جگہ عطا فرمائی، ایک صدیقی صدیقہ کے پاس پہنچ کر کتنی راحت وسرور حاصل کر رہا ہوگا، اس کا تصور یہ حقیر انسان اپنی عقل ناقص سے نہیں کر سکتا۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

دعا ہے کہ رب قدیر ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین ثم آمین۔

مرشد کامل کی عظیم شخصیت

اصناف انسانی کے لحاظ سے عزت وکرامت عظمت و بڑائی کے معیار مختلف مانے جاتے ہیں سرمایہ پرستوں میں مکرم و معظم وہ ہے جس کے پاس دولت وثروت کا انبار ہو ،سیاست کاروں میں عظیم انسان وہ ہے جو نظام مملکت کے چلانے میں اپنے حسن تدبر،نظم وضبط کا مظاہرہ اکمل طور پر کررہا ہو،فلاسفہ وحکما کے گروہ میں اونچا وہ ہے جو اس جہان کون وفساد کی گرہ کشائی اوراس کے علل واسباب کی سراغ رسانی میں فائق تر ہو،دلدادگانِ شعروسخن کے اعتقاد میں سربلندی اس کا نصیب ہے، جو مظاہرہ فطرت کی عکاسی وتخیل کی بلند پروازی جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی میں اپنے ہمنواؤں میں بلند مقام پر فائز ہو،اس طرح سیکڑوں طبقارت میں بٹے ہوئے افراد انسانی کے لیے اپنے اپنے مرعومات وخیالات کے م،طابق عظمت وکرامت کے الگ معیار ٹھہرا لیے گئے ہیں،لیکن خالص دینی نقطۂ نظر نگاہ سے انسان کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ اس میں طہارت نفس پاکیزگیٔ قلب وپالیدگیٔ روح پیدا ہو جائے یہی وجہ ہے کہ جملہ صحف آسمانی نے واضح طور پر اعلان کیا کہ انسان کی عزت وشرافت کا معیار تقویٰ وپاکیزگیٔ نفس ہے،انبیاے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ انسان اپنے کو مومن صالح ونیکوکار بنائے اس لیے کسی انسان کی عظمت وبڑائی کے ناپنے کا یہ پیمانہ سراسر غلط ہے کہ وہ کتنے علوم وفنون کا جامع ہے وہ سیاست کاری میں کتنا ماہر ہے؟اس کے پاس دولت وثروت کے کتنے خزانے ہیں، وہ فلسفہ ودانش شعروسخن میں کتنی جودت دماغ ومہارت رکھتا ہے، بڑائی کے یہ تمام اسباب انسان کو اس وقت بڑا بناتے ہیں جب اس میں نیکی وپارسائی کا عنصر غالب ہو۔

دنیوی اُمور سے قطع نظر صرف دینی امور پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت زیادہ آشکارا ہوکر سامنے آئے گی کہ اگر کوئی شخص علم وحدیث فقہ وتفسیر کلام واصول میں عبقری شخصیت کا حامل ہو لیکن ان علوم سے اس کی روح متاثر نہ ہوئی ہو، دینداری، دیانتداری،تقویٰ،خشیت

الٰہی اس میں نہ پیدا ہوئی ہو، تو اس کے یہ سارے کمالات ادنیٰ درجہ کی وقعت وحیثیت نہیں رکھتے، پس ثابت ہوا کہ انسان کے اندر لازوال عظمت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کمالات انسانی کے ساتھ ساتھ طہارت نفس ونیکوکاری کا جذبہ غالب ہوجائے، شمائل کریمہ وخصائل حمیدہ کے انوار تجلیات سے اس کا ظاہر و باطن جگمگا اٹھے۔

اس نقطۂ نظر سے جب میں غور کرتا ہوں تو مرشد کامل آقائے نعمت نائب رسول مولانا وماوانا حضرت حافظ ملت نور اللہ مرقدہ کی ذات ستودہ صفات کو میں ایک عظیم انسان قرار دیتا ہوں، وہ اعلیٰ درجہ کے ایسے محدث تھے جنھوں نے ۴۰ رسال کی طویل مدت تک درس حدیث دیا، اور اس کے نکات و باریکیوں سے آپ نے سیکڑوں تلامذہ کو مستفیض فرمایا، وہ قرآن حکیم کے معارف وحقائق کے ایسے محرم اسرار تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس کی تلاوت وتفسیر و بیان میں صرف کیا، وہ بڑے پر خلوص خطیب ومقرر تھے جن کے خطبہ و تقریر کے اثرات عرصہ تک دلوں کو گرماتے رہیں گے، وہ اگرچہ اہل تصوف کے ایسے گروہ میں نہیں شمار کیے جاتے تھے جنھوں نے حیات کے ہنگاموں سے قطع تعلق کر کے تجرد کی زندگی اختیار کرلی ہو، تاہم ان کا باطن یاد الٰہی اور رضائے حق میں مصروف عمل تھا، وہ علم وعمل کا ایسا پیکر مجسم تھے کہ دور دور تک نگاہ ڈالنے سے ایسے انسان کم نظر آتے، وہ خلوص ومحبت کی ایسی دنیا اپنے دل میں آباد رکھتے تھے جہاں اپنے پرائے کا امتیاز نہیں تھا، غرض ان کی خوبی وکمال کی داستان بہت لمبی ہے، لیکن جس کی وجہ سے میں ان کو ایک عظیم انسان تصور کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دیگر کمالات انسانی کے ساتھ ان میں طہارت نفس تقوی وشخصیت ربانی کے پاک عناصر غالب تھے، ان کا ظاہر عام انسانوں جیسا ظاہر نہیں تھا بلکہ شریعت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا، ان کا باطن معمولی انسانوں جیسا باطن نہیں تھا، بلکہ اس میں خلوص وللّٰہیت کا بحر بیکراں تلاطم خیز تھا، ان کے عادات واطوار کے آئینہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی جھلکیاں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔

ان کی روحانی قوت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہزاروں موانع کے سیل

رواں کے باوجود ملت اسلام کے اس بلند مینار کو پستی کی طرف مائل نہ ہونے دیا، بلکہ طوفان حوادث سے ان کے عزم و ہمت میں استحکام پیدا ہوا، اور باغ فردوس کو ایک عظیم دانش گاہ میں تبدیل کردیا، ان کی زبان مبارک کے قوت تاثیر کی یہ برکت تھی کہ کتنے معصیت کار عفت مآب، کتنے نے سیاہ کار نیکوکار و پارسا ہو گئے، کتنے گم گشتۂ راہ ضلالت سے نجات و ہدایت کی راہ پاگئے۔

خدائے قدوس کی طرف سے بندے پر لازوال عظمت کا فیضان اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ظاہر و باطن کو تمام آلائشوں و آلودگیوں سے پاک وصاف کر کے اور اچھے عمل وکردار سے سنوار کر اس کے نزدیک محبوبیت کا اونچا مقام حاصل کرلے، اسی کو شریعت کی زبان میں تقویٰ کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہی تقویٰ تمام خوبیوں کی بنیاد ہے، اسی کے بلند درجہ پر جب انسان پہنچ جاتا ہے تو اس کی عظمت وسطوت کے آگے کائنات خلقت کی ساری بلندیاں ہیچ نظر آتی ہیں، اسی کے مراتب ودرجات کے فرق سے نوع انسانی کے افراد میں بڑائیوں کا فرق ہوتا ہے اور اسی سے بعد ودوری کی صورت میں وہ ذرّہ بے مقدار اور خاک حقارت سے کمتر ہوتا ہے مگر اس کا اعلیٰ مقام حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بڑی جانکاہی وجگرسوزی کے بعد یہ گوہر گراں نمایاں حاصل ہوتا ہے، بالفاظ دیگر اس رتبہ بلند کے حاصل کرنے کے لئے تلوار کی تیز دھار پر چلنا پڑتا ہے ذرا سی لغزش سے اعتدال کی راہ سے بھٹک جانے کا خطرہ شدید لگا رہتا ہے، اسی لیے اس رتبہ کے انسانوں کی تعداد ہر زمانہ میں کم رہی قحط الرجال کے اس دور میں ان پاک نفس انسانوں کی کمی کا احساس ہر اس شخص کو ہوگا جو زہر کو تریاق، تریاق کو زہر نہ سمجھتا ہو، نیکی کو بدی، اور بدی کو نیکی کی شکل میں دیکھنے کا عادی نہ ہو، اس لیے میرا وجدان شہادت دے رہا ہے کہ مرشدی حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان جیسے جامع صفات، برگزیدہ اللہ والے انسان عصر جدید میں بہت کم پائے جاتے ہیں، آپ کی زندگی پاک کی کھلی کتاب میرے اس دعویٰ کا بیّن ثبوت ہے، جس کے ایک ایک ورک کے مطالعہ سے یہ یقین حاصل کیا جاسکتا ہے کہ تقویٰ وطہارت نفس کے پر پیچ ودشوار گزار راستے کو

آپ نے بڑی آسانی کے ساتھ طے کیا، ملت بیضا کے اوامر ونواہی کی بجا آوری تو آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، لیکن اس سے بڑھ کر آداب وسنن میں بھی سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے از سرمو تجاوز کرنے کا کوئی سلیم الطبع ثبوت فراہم نہیں کرسکتا ہے، اٹھنا بیٹھنا، سفر وحضر، بات چیت، باہمی معاشرت، معاملات دین ودنیا، عوامی روابط وتعلقات، اپنے پرائے سے سلوک وبرتاؤ سب میں آپ نے طریقۂ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا، حسان العجم خاقانی نے اپنے پیر ومرشد کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا:

طریقہ رقم ہائے کہ اندر خرقہ مربوز انداز بخیہ
رموز لوح محفوظ است گر خوانی بایقانش

''یعنی میرے مرشد کی گدڑی میں لوح محفوظ کے اسرار ورموز پوشیدہ ہیں، اگر تم ان کو علم وایقان کی روشنی میں پڑھو'' میں اپنے شیخ کے متعلق اتنے بڑے شاعرانہ دعویٰ کی جسارت نہیں کرسکتا لیکن یہ کہنے کی جرأت ضرور کرسکتا ہوں کہ ان کی کتاب زندگی میں رسول اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک تحریریں مرقوم تھیں۔

مرشد کامل کا دربار ایسا دربار تھا جہاں کسی کو بری باتوں کا یارائے کلام نہ تھا، غیبت، چغلی خوری، فحش کلامی، کسی کے متعلق غلط خیال کا اظہار، آپ کی طبیعت سلیمہ کو گوارہ نہ تھی، انسانی فطرت کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ اپنے معاصر کی خوبیوں کا اعتراف صدق دل سے نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی اس کے معاصر کے اچھے اوصاف وکمالات کا ذکر کرتا ہے تو اس کو ایک گونہ انقباض وتکلیف ہوتی ہے اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ ایسا نقص وعیب ڈھونڈ نکالے جس سے وہ لوگوں کی نگاہ میں حقیر نظر آئے اور اس کی اچھائیاں دب کر رہ جائیں، لیکن میرے مرشد کا طرۂ امتیاز وہ وصف خصوصی تھا کہ اگر ان کے سامنے ان کے معاصر کا ذکر خیر کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ کشادہ دلی کے ساتھ سماعت فرماتے بلکہ خود بھی اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہوجاتے یعنی اپنے حسن ظن کا ایسا مظاہرہ فرماتے جو مومن کامل کا شعار ہوتا ہے۔

قرآن حکیم نے پیروان اسلام کو یہ حکم دیا کہ عام حالت میں کسی کے متعلق برا خیال نہ رکھیں کیونکہ اگر وہ خلاف واقع ہے تو گناہ وعذاب کا باعث ہوگا علاوہ ازیں یہ امراض نفسانی میں سے ایک ایسی بیماری ہے جس سے دائمی مناقشت کی وبا عام ہوجاتی ہے، اس سے نفرت و حقارت کا جذبہ ابھرتا ہے، اس کے برعکس حسن ظن، مودت ومحبت اور خوشگوار روابط کا ذریعہ ہوتا ہے، اس وجہ سے جس پاک باطن میں یہ خوبی پائی جائے سمجھو اس کا میلان نیکی کی طرف ہے، اور اس کا دل آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہے، اس اعتبار سے بھی جب ہم حضرت حافظ ملت کی عظیم شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یقین محکم ہوتا ہے کہ آپ کا آئینہ قلب مجلّٰی ومصفّٰی تھا، یہ یقین محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ ٹھوس شہادتوں پر مبنی ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ خدائے پاک نے آپ کی طبع سلیم کو ایسا سنوار کر بنایا تھا کہ اس پر بدگمانی سوءظن وغیرہ کے امراض نفسانی کا اثر نہیں پڑ سکتا تھا، بلکہ بعض سادہ لوحوں نیازمندوں کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح خود حضرت دنیا کی آلائشوں سے ستھرے ہیں ایسا ہی سب کے بارے میں خیال رکھتے ہیں، خود نیک ہیں سب کو نیک سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات والا تبار فطری طور پر اس قسم کی باطنی بیماریوں سے پاک وصاف تھی ہی، اس پر احکام الٰہی کی بجا آوری کے جذبہ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

آقائے نعمت نور اللہ مرقدہٗ "**الحب فی اللّٰہ والبغض فی اللّٰہ**" کا کامل نمونہ اور سچی تصویر تھے، ان کو مذاہب باطلہ والوں، شانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں گستاخی کرنے والوں سے بیر تھا تو وہ محض خوشنودی الٰہ کے لئے تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے نیک بندوں کی بارگاہ میں بےجا جسارت کرنے والا، انسانوں کو گمراہ کرنے والا، مسلمانوں میں غلط نظریات وعقائد کی تبلیغ کرنے والا، خدائے پاک کی ذات وصفات کے متعلق گمراہ کن تصورات کا پرچار کرنے والا، ان کا بڑا مبغوض تھا، یہی وجہ ہے انہوں نے فرقہ باطلہ کی تردید میں " **العذاب الشدید**" جیسی لاجواب کتاب تحریر فرمائی، امر معروف، نہی منکر کا فریضہ بجالانے والا، اسلام کی دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے والا، بدعت وعقائد فاسدہ سے بندگانِ

خدا کی حفاظت وصیانت کرنے والا، آپ کو بڑا محبوب و پیارا تھا، وہ منظر بڑا پر کیف ہوتا تھا جب کوئی نیاز مند آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اپنی دینی خدمات وتبلیغی کارناموں کو بیان کرتا تھا اور خوشی ومسرت سے آپ کا روئے مبارک چمک اٹھتا تھا، حالت وجد میں داد وتحسین کے ایسے الفاظ ارشاد فرماتے تھے کہ جن سے اس نیاز مند کا دل جوش عمل لبریز ہو جاتا تھا، اور ہمت شکن حالات میں بھی دین کے کاموں کے لئے اس میں حوصلہ پیدا ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ غریب خانہ پر تشریف لے گئے، مجلس مولود منعقد ہوئی، عقیدت کیشوں اور نیاز مندوں کا اژدہام تھا، جلسہ وعظ میں اس وقت رونق افروز ہوئے جب برادر محترم مولانا عبدالرحیم خان صاحب عزیزی بڑے پر جوش انداز میں تقریر فرمارہے تھے، حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان بہجت وسرور کے ساتھ ان کی تقریر سماعت فرماتے رہے، اثنائے تقریر میں آپ کی زبان مبارک سے بار بار سبحان اللہ ماشاء اللہ کے کلمات ادا ہوئے، میں خوب محسوس کررہا تھا کہ تقریر سے محظوظ ہونے کے علاوہ مولانا موصوف کی ہمت افزائی اس لیے فرمارہے ہیں کہ آپ کی عظیم شخصیت سے مرعوبیت کے باعث تقریر کی روانی وجوش بیانی میں خلل نہ واقع ہوجائے، برادر مکرم کی تقریر ختم ہوئی اور حضرت والا پند ونصائح کے لیے کرسی پر جلوہ افروز ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ تک ان کی تقریر پر گراں قدر تبصرہ فرماتے رہے، رائی کو پہاڑ کی بلندی عطا فرماتے رہے، ذرّہ کو آفتاب کی تابانی بخشتے رہے فرمایا کہ سنو یہ بڑے صالح نوجوان جید عالم ہیں، اس دور میں اتنے نیک اور اچھے عالم کم ملتے ہیں ان کی قدر پہچانو اور غور سے سنو جب تک اس دنیا میں عالم ہیں اس وقت تک یہ عالَم ہے، جب عالم نہیں رہیں گے تو یہ عالَم بھی نہیں رہے گا، پھر تفنن طبع کے لیے یہ لطیف نکتہ ارشاد فرمایا کہ عالم اور عالَم میں صرف زیر اور زبر کا فرق ہے، اس لفظ کے لام کو زبر دیکر پڑھو عالَم اور زیر دیگر پڑھو عالِم ہے اس سے اشارہ مل رہا ہے کہ جب تک عالم کا وجود ہے اس وقت تک دنیا برقرار رہے گی، اور جب یہ دنیا عالم کے وجود سے خالی ہوجائے گی تو یہ زیر وزبر ہوجائیں گی یعنی نظام ہستی تہہ و بالا ہو جائے گا، حضرت نے اس نکتہ کو ایسے حسین انداز میں ارشاد فرمایا تھا کہ

ہمارے علاقے کے لوگوں کی زبان پر بہت دنوں تک اس کا تذکرہ رہا کہ کہ عالِم ہے تو عالَم ہے، عالِم نہیں تو عالَم نہیں، یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ لفظ کے زیروزبر سے نظام ہستی کے زیرو زبر ہونے پر حضرت نے استدلال قائم نہیں کیا تھا، بلکہ اس حقیقت پر حدیث کریم کی ٹھوس شہادت پیش فرمائی تھی افسوس کہ مجھے یاد نہیں رہی، اس واقعہ کو گزرے ہوئے تقریباً دس سال ہو گئے، لیکن جب کبھی حضرت کی قدر افزائی، ذرّہ نوازی، ہمت افزائی کا خیال آتا ہے تو میرے اوپر کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور میں خوشی و مسرت سے جھوم اٹھتا ہوں۔

آہ! حافظ ملت علیہ الرحمہ

حافظ ملت (**نور اللہ مرقدہ**) کی ذات مقدسہ کی زیارت پہلی بار غالباً ۱۹۵۰ء میں عہد طالب علمی میں ہوئی جب آپ تلشی پور امتحان لینے کے لیے تشریف لے گئے تھے، اس وقت یہ حقیر کافیہ وغیرہ پڑھ رہا تھا، کافیہ کے امتحان میں حضرت **علیہ الرحمۃ والرضوان** نے سوال کیا تھا کہ فاعل کی تعریف میں تقدیم فعل کی قید کیوں لگائی گئی؟ برجستہ جواب عرض کیا: فاعل اور مبتدا میں امتیاز کے لیے یہ قید ضروری ہے۔

میرے اس جواب پر حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے تحسین وآفریں اور ذرہ نوازی کے وہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ آج تک وہ نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ ہیں، اور ان کی حلاوت تاحیات باقی رہے گی۔

آپ کی شخصیت اتنی اونچی اور بلند وبالا تھی کہ عصر حاضر میں آپ کے ہم رتبہ کم ہی لوگ نظر آتے ہیں، آپ اخلاص ودیانت کے پیکر مجسم، مودت اور محبت کی چلتی پھرتی تصویر تھے، آپ مردم شناسی اور خورد نوازی میں یکتا وتنہا تھے، آپ کی ذات والا صفات کو خلوت اور جلوت میں دیکھو بلکہ ہر طرح سے دیکھو مجموعۂ کمالات ماننا پڑے گا، آپ کے اندر جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں آپ اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں، یہ دنیا آنی فانی ہے، یہاں کوئی رہنے کے لیے نہیں آیا، لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اسی دار فانی سے رخصت ہوتے وقت سوگوار تلامذہ کا ایک لشکر چھوڑ گئے ہوں۔

۱۹۵۰ء سے لے کر آج تک تمام شفقتوں کا احاطہ کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے گا، میرا غریب خانہ ضلع گونڈہ بھانبھر کے اس حصے میں واقع ہے جہاں سے نیلے آسمان سے نیلے پہاڑ کی چوٹیاں گویا سرگوشی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، اس پہاڑی علاقے میں آمد ورفت کی سہولتیں ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں اب تک معدوم ہیں، لیکن حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بارہا غریب خانے پر تشریف لے گئے، اور اپنی نوازشوں کی بارش کی،

بلکہ بعض اوقات کسی اطلاع سابق کے بغیر ہمارے گاؤں کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا ،ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ موسم برسات میں حضرت پیدل پچپڑ وا اسٹیشن سے تقریباً چار میل کا راستہ طے کر کے ہمارے گاؤں نا ؤڈ یہہ تشریف لائے ،عرض کی کہ حضور پیدل چلنے کی زحمت فرماتے ہیں اگر آپ اطلاع دیتے تو خادم کم از کم بیل گاڑی کا انتظام کر دیتا۔

ارشاد ہوا کہ گھر آنے کے لیے اطلاع دینے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس کرتا، آپ کا گھر میرا گھر ہے، یہ الفاظ اگر چہ بظاہر ایک معاند تصنع پر محمول کرسکتا ہے مگر جس ذات قدسی صفات کی زبان صداقت بیان سے ادا ہوئے ہیں وہاں تصنع و بناوٹ کی قطعاً گنجائش نہیں، وہاں خلوص ومحبت کا دریا موجزن رہتا تھا۔

۱۰/اگست ۱۹۷۱ء کو ایک حادثۂ جاں کاہ کا شکار ہوا، یعنی والدۂ مرحومہ کی وفات حسرت آیات ۱۷/جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ کو ہوئی، اس حادثہ فاجعہ کا اثر دل و دماغ پر اس قدر ہوا کہ عرصہ تک چین وسکون نصیب نہ ہوا، دل ودماغ کی ہیجانی کیفیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دن رات نیند نہیں آتی تھی ، بے قراری کی کیفیت طاری رہتی تھی ،دوست واحباب بڑے حسین پیرائے میں صبر جمیل کی تلقین فرماتے تھے،لیکن جتنا وقت گزرتا جاتا تھا دماغی انتشار میں اضافہ ہوتا جارہا تھا،ایسی حالت میں اپنے سکون قلب کے لیے حضور حافظ ملت **علیہ الرحمہ** کی بارگاہ عالیہ میں ایک عریضہ حاضر کیا تھا جس میں اپنے والدۂ مکرمہ کی معمولی علالت کے بعد وفات حسرت آیات کی خبر دی گئی تھی اور درخواست کی گئی تھی کہ حضور ہماری واالدۂ مرحومہ کے واسطے دعاے مغفرت فرمائیں۔

بیان کرنے والوں کا بیان ہے کہ حضرت بخاری شریف کا درس دے رہے تھے، اسی اثنا میں میرا خط بارگاہ عالیہ میں پیش کیا گیا،ابھی سبق پورا نہیں ہوا تھا کہ حضرت **علیہ الرحمہ** نے بخاری شریف کا درس دینا بند کر دیا،اور فرمایا کہ مجھے مولانا عبداللہ صاحب کے مکان پر تعزیت کے لیے جانا ضروری ہے،ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، کچھ کلمات اور ارشاد فرمائے جس کو میں اپنے قلم سے لکھنا نہیں چاہتا،حضرت غریب خانہ پر تشریف لے

گئے، ایک روز قیام رہا، پھر محفل میلاد شریف منعقد ہوئی، بڑے ہی رقّت آمیز لہجہ میں میری والدہ مکرمہ کے لیے دعاے مغفرت فرمائی، پھر دوسرے روز وہاں سے روانگی ہوگئی۔

اللہ اللہ کیا کرم وعنایت اس حقیر پر تھی، اس قدر ذرہ نوزی اب کس سے ملے گی، آپ کی شفقتوں اور عنایتوں کا بادل ہمارے سروں پر سایہ فگن تھا، اب وہ وقت گزر گیا جب خوف ورجا کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بارگاہ عالیہ میں حاضری ہوئی تھی، آپ اپنے حوصلۂ بلند کا اظہار فرماتے تھے، یقیناً آپ کے استقلال و پامردی کے آگے پہاڑوں کا ثبات ہیچ تھا، جس چیز کے لیے عزم مصمم کرلیا اس پر اتنی شدت کے ساتھ اٹل رہے کہ پہاڑوں کو جنبش دی جاسکتی ہے لیکن آپ کے پاے ثبات کو لغزش بہت مشکل تھی۔

ابھی گزشتہ سال کی بات ہے کہ میرے مرشد برحق نے گھر والوں کے اصرار کی وجہ سے مکان پر تشریف لے چلنے کی دعوت منظور فرمائی، طبیعت علیل تھی، ارکان جامعہ کو جب اس کی خبر ہوئی متعدد حضرات میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت کی طبیعت کئی مہینے سے ناساز ہے، اور ان کو مکان لے جانے کی دعوت دے دی اور وہ منظور ہوگئی، ایسی حالت میں خود خیال رکھنا چاہیے، حضرت کی بارگاہ عالیہ میں جو بھی عرض ومعروض پیش کرتا ہے اس کو منظور فرمالیتے ہیں، اس لیے احتیاط کی ضرورت ہے، میں اپنی غلطی پر نادم ہوا، سوچا کہ حضرت کی بارگاہ میں حاضری دے کر عرض کروں کہ صحت بحال ہونے کے بعد غریب خانے پر تشریف لے چلیں، اس وقت کمزوری ونقاہت زیادہ ہے، لیکن شش وپنج میں پڑ گیا کہ ایک مرتبہ دعوت دے کر اس کی منظوری حاصل کر لی، پھر دوسری بار اس کو منسوخ کراؤں بڑی بھدی بات ہے، اور یہ بھی سوچا کہ شاید آپ کی خاطر اقدس کی کبیدگی کا باعث ہوجائے، جناب ناظم اعلیٰ قاری محمد یحییٰ صاحب سے اس معاملے میں گفتگو کی، انھوں نے فرمایا کہ حضرت کی بارگاہ میں میرے ہمراہ چلو، جناب ناظم صاحب موصوف ہمارے مرشد برحق کے بڑے مزاج شناس اور موقع ومحل دیکھ کر گفتگو کرنے کے عادی تھے۔

بہر حال خدمت اقدس میں میری اور ناظم صاحب کی حاضری ہوئی، سلام ونیاز

کے بعد کچھ دیر تک سکوت کا سماں رہا، پھر ناظم صاحب نے عرض کی کہ حضور مولانا عبداللہ صاحب بہت نادم ہیں، کیوں کہ ارکان جامعہ ان کو بہت ملامت کررہے ہیں کہ موجودہ حالت میں آپ نے حضرت کو سفر کی دعوت کیوں دی ،اس لیے یہ چاہتے ہیں کہ تاوقتِ صحت ناوَڈیہہ تشریف لے جانے کو ملتوی رکھیں ،فرمایا کہ مجھ کو ناوَڈیہہ جانے سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے،مولانا کا مکان میرا مکان ہے، گھر جانے میں کس کو تکلیف ہوتی ہے۔

پھر غریب خانہ پر تشریف لے گئے محفل میلاد منعقد ہوئی ،دعا تعویذ والوں کی بھیڑ بھاڑ رہی ،آرام وراحت کا موقع کم ہی ملا،لیکن اپنی طرف سے کبیدگی کا اظہار نہ ہونے دیا۔

آج جب حضور حافظ ملت **علیہ الرحمہ** اس دار فانی سے رحلت فرما کر دار جاودانی کی طرف تشریف لے گئے ،ان تمام عنایتوں اور مہربانیوں کو سوچتا ہوں تو میرا دل بے قرار و مضطرب ہو جاتا ہے ،کہ وہ شفقتیں کہاں سے ملیں گی؟ مصائب وآلام میں صبر وثبات کی تلقین کرنے والے کو کہاں سے ڈھونڈھوں ؟وہ کہاں مل پائیں گے ؟اختلاف ونزاع کے وقت اپنا فیصل کس کو قرار دیا جائے گا؟

آہ وہ نہ رہا جو اپنے حسن تدبُّر سے تمام متعلقین ومتوصلین کی تسکین کا باعث رہا،آہ صد آہ! اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا ہوں، چاروں طرف روشنی کی ایک کرن نظر نہیں آتی، کیوں کہ حضور حافظ ملت **علیہ الرحمہ** اس عالم رنگ وبو میں مینارۂ نور تھے جس سے ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی ،وہ آج جامعہ کے سرزمین پر محوخواب ہیں ،مرقد انور کے پاس جا کر اپنا درددکھ بیان کرتا ہوں مگر اپنی تسکین کے لیے ایک لفظ نہیں سنتا ،کیا ایسا ہے کہ وہ جسمانی وروحانی سماعت سے محروم قرار دے دیے گئے ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا ،شیخ محدث دہلوی **رحمۃ اللہ علیہ** کے بقول اللہ والے مادی کثافتوں سے جب الگ ہو جاتے ہیں تو اپنے پکارنے والے کی آواز کو زیادہ سنتے ہیں ،پھر کیا وجہ ہے کہ جو زندگی بھر میری آواز کو سن کر جواب دیتا رہا،وہ آج میری آہ وفغاں پر خاموش ہے،وہ سب دیکھتے اور سنتے ہیں ،لیکن قانون قدرت الٰہی جو عالم مادی اور عالم برزخ میں جاری ہے اس سے بالعموم تجاوز نہیں کرتے ،اس لیے وہ

ہمارا سہارا ضرور بنیں گے مگر ہم اپنی مادی سماعت سے ان کی آواز کو نہیں سن سکتے ہیں، پس ضروری ہوا کہ ان کی روحانیت سے اکتساب فیض کر کے ہم اپنی منزل مقصود کی طرف پیش قدمی جاری رکھیں، کیوں کہ اس سے ان کی روح پاک کو بڑی خوشی و مسرت حاصل ہوگی، وہ ہمارے واسطے اپنی عملی زندگی کے نقوش چھوڑ گئے ہیں، انھیں نقوش پا کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی منزل کی طرف جادہ پیمائی کریں۔

ہمارے مرشد برحق نے اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں جو کچھ کیا اور جتنا بھی کیا سب اپنی جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے اور رضاے الٰہی کے لیے کیا، جامعہ کی پرشکوہ سنٹرل بلڈنگ آپ کی ہی رہین منت ہے، دارالاقامہ کی عظیم الشان عمارت آپ کی عظمت و بڑائی کی شہادت دے رہی ہے، اشرفیہ مارکیٹ ہو یا باغ فردوس سب آپ کی جہد مسلسل کا نتیجہ ہے ،لیکن کہیں بھی آپ کا اسم مبارک کندہ کیا ہوا نظر نہیں آتا، حالاں کہ آپ کے معتقدین کی بڑی آرزو تھی کہ ان عمارتوں میں سے کوئی عمارت آپ کی ذات والا تبار کی طرف منسوب کی جائے ،آپ کے مرید خاص و عقیدت کیش حاجی حفیظ اللہ صاحب بلیاوی نے بڑی محبت سے عرض کی کہ حضور رفتہ رفتہ دارالحدیث کا ہال کمرہ میرے اخراجات سے بنے گا، میری تمنا ہے کہ اس میں میرے نام کے بجائے آپ کا اسم مبارک کندہ کیا جائے ،اور آپ کی ذات اقدس کی طرف منسوب کیا جائے ،مگر میرے مرشد کامل نے ان کی آرزو پوری نہ کی، اور فرمایا کہ وہ ہال کمرہ آپ ہی کی طرف منسوب ہوگا، اس پر آپ ہی کا نام کندہ کیا جائے گا۔

حضور حافظ ملت **علیہ الرحمہ** موت سے قطعی نہیں ڈرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ مولانا محمد حنیف صاحب مبارکپوری نے نہال گڑھ سے ایک خط حضرت کے نام لکھا تھا جس میں انھوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ حضور میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے جس سے اشارہ مل رہا ہے کہ آپ اس دار فانی سے رحلت فرمانے والے ہیں، حضرت کا خط لے کر دارالافتا کے سامنے چارپائی پر تشریف فرما ہوئے ،اور فرمایا کہ مولانا محمد حنیف صاحب نے بڑی محبت کا خط لکھا ہے، جس میں اس بات پر اظہار افسوس

کیا ہے کہ میرا انتقال ہونے والا ہے، میرے نزدیک موت سے ڈرنا بڑی حماقت ہے، موت سے ڈرنے کا کوئی معنیٰ نہیں اور اگر کوئی معنیٰ ہے تو یہ کہ انسان اپنے خدا کی طرف مائل ہو جائے، اور اس کے ذکر وفکر سے لو لگائے رہے، بلا شبہ مرد مومن کی شناخت یہی ہے کہ وہ موت سے نہ ڈرے، بھلا اللہ والے موت سے ڈر سکتے ہیں جب کہ وہ اللہ کی ذات وصفات میں گم رہتے ہیں، ہمارے مرشد کامل نے اپنی علالت کے زمانے میں کسی پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ میں موت سے ڈرتا ہوں، اپنے ایام علالت نہایت صبر وسکون سے گزارے، بلکہ انھیں ایام میں دور دراز کا سفر بھی کیا۔

حضرت صدر العلما کا علمی مقام

ولادت باسعادت:

آفتاب علم، فخر المحققین، وحید عصر، حضرت صدر العلما سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی ابن مولوی حاجی غلام فخر الدین ابن مولانا حکیم سید سخاوت حسین حافظی، فخری، سلیمانی **رحمهم الله تعالیٰ** ۱۱؍ رمضان المبارک ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹۰۰ء علی گڑھ کے سید زادوں میں پیدا ہوئے، کیوں کہ آپ کے دادا بزرگوار سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے نامور بزرگ اور عالم دین سید حافظ محمد علی خیر آبادی **علیه الرحمه** کے مرید وخلیفہ حضرت سید سلیمان تونسی **علیه الرحمه** سے بیعت وارادت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے کو حافظی وسلیمانی لکھا، اور اس نسبت کا آپ انتہائی نیاز مندی کے ساتھ اظہار فرماتے تھے۔

تعلیم:

پرائمری تعلیم درجہ چہارم تک حاصل کرنے کے بعد آپ کا عم محترم حضرت مولانا قطب الدین صاحب برہمچاری نے جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں داخلہ کرایا، اس جامعہ کا نام مدرسہ انجمن اہل سنت تھا، یہ برہمچاری وہی بزرگ ہیں جن کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمود احمد صاحب قادری ’’حیات مخدوم الاولیا‘‘ میں رقم طراز ہیں کہ:

’’حضرت مولانا ہندو مذہب کے اسرار ورموز سے مکمل واقف ہیں اور سنسکرت کے ماہر تھے، شروع ہی سے مشرکوں میں تبلیغ اسلام کا ذوق تھا، وہ پاکباز اور مرد خدا بزرگ تھے، اپنی سعی میں بے حد کامیاب ہوئے تھے‘‘۔

اپنے برادر زادہ سید غلام جیلانی صاحب کو مدرسہ انجمن اہل سنت مرادآباد میں وہاں کے بالغ نظر اساتذہ کے زیر تعلیم وتربیت رکھ کر اپنی دوربینی کا ثبوت فراہم کیا، کیوں کہ حضرت مولانا عبد العزیز خاں صاحب فتح پوری اور حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین

صاحب فاضل مرادآبادی اس ادارہ کے نامور اساتذہ میں سے تھے،جنھوں نے ابتدائی تعلیم اور عربی انشا پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی، ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں حضرت مولانا شمس العلما قاضی شمس الدین جون پوری مولف قانون شریعت وغیرہ کے ہمراہ اجمیر مقدس دارالعلوم معینیہ درگاہ شریف میں حضرت صدرالشریعہ کی خدمت اقدس میں بغرض تعلیم حاضر ہوئے ،امتحان داخلہ کے بعد درجہ شرح جامی (درجہ رابعہ) میں داخلہ ہوا، قیام وطعام کے انتظام کے علاوہ ایک روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا،داخلہ کے ابتدائی ایام میں جب کہ کھانا کا انتظام مدرسہ کی جانب سے نہیں ہوا تھا بہت پریشانی کے ساتھ ہمت شکن حالات میں مصروف تعلیم رہے،اس مدت میں سوکھی روٹی اور نمک مرچ پر گزر بسر کیا،لیکن ذوق تعلیم اتنا بلند تھا کہ حرف شکایت اپنی زبان پر نہیں لائے۔

حضرت مولانا امتیاز علی انبیٹھوی سے جو دارالعلوم معینیہ کے مفتی و مدرس تھے شرح جامی مکمل طور سے پڑھا،آٹھ سال تک مسلسل سالانہ امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے رہے،منطق کی اعلیٰ کتاب ملاحسن کے تحریری امتحان میں ممتحن صاحب کو بے حد متاثر کیا جن کی ستائش پر دارالعلوم نے چار روپیے ماہانہ انعامی وظیفہ مقرر کیا اور مولانا سید عبدالمجید اور مولانا عبدالحی سے بھی اسی دارالعلوم میں اخذ علوم کیا۔

آپ کی بیشتر تعلیم صدرالشریعہ علامہ حکیم امجد علی صاحب سے ہوئی،حضرت قدس سرہ کی ان پر خصوصی نگاہ کرم تھی،درس نظامی کی منتہی کتابیں حضرت صدرالشریعہ سے پڑھیں ۱۳۵۱ھ میں آپ کی ہمرکابی میں مدرسہ منظر اسلام بریلی شریف آئے، یہاں دورہ حدیث کے علاوہ شرح چغمنی اور محقق دوانی کی شرح تجرید،حواشی قدیمہ وجدیدہ اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور محقق طوسی کی شرحوں کے ساتھ ''اشارات'' کی تعلیم حاصل کی، ۱۳۵۳ھ میں مدرسہ کے سالانہ جلسے میں حضرت حجۃ الاسلام کے مبارک ہاتھوں سے دستار فضیلت سے سرفراز ہوئے،اور انھیں سے سند فضیلت حاصل کی۔

درس وتدریس:

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے تدریس کی ابتدا مدرسہ محمدیہ جائس سے کی ،وہاں ایک سال تک حسن وخوبی کے ساتھ اپنا فریضہ تدریس انجام دیتے رہے، پھر مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی دعوت پر دار العلوم عظمت نشان کرنال کے صدر مدرس ہوکر تشریف لے گئے ،سوا سال کے بعد کانپور کی مرکزی سنی درس گاہ مدرسہ احسن المدارس قدیم کے صدر مدرس مقرر ہوئے ،اور ۱۹۳۵ء میں خان بہادر الحاج بھیا بشیر الدین رئیس اعظم لال کرتی میرٹھ کی دعوت پر ان کے مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ کے منصب صدرات پر رونق افروز ہوئے ،اس مدرسہ اسلامی میں آپ کی تقرری عہدہ صدرات پر ایک خاص وجہ سے ہوئی تھی ،مدرسہ میں مفتی عزیز الرحمٰن دار العلوم دیو بند کے مرید وخلیفہ اور مولوی بدر عالم مولف فیض الباری کے پیر قاری اسحٰق احمد صاحب صدر مدرس تھے،اور وہ مسلک دیو بندیت کے غالی قسم کے پیرو کار تھے،اور خان بہادر بشیر الدین کے گھرانے کے افراد وارکان حضرت مولانا شاہ حسن صاحب فاضل کانپوری کے مرید اور حضرت مولانا شاہ عبد السمیع صاحب بیدل مصنف انوار ساطعہ کے عقیدت مند و نیاز کیش شاگرد تھے،خود خان بہادر کو بھی ان دونوں بزرگوں سے انتہائی عقیدت تھی ،ظاہر ہے کہ اس ادارہ کے مہتمم سنی اور مدرسہ بھی سنیوں کا تھا، بدقسمتی سے ایک دیو بندی صدر مدرس گھس آیا،لوگوں کو اس پر شدید اعتراض ہوا،اس لیے قاری اسحٰق احمد صاحب عہدہ صدارت سے سبکدوش کر دیئے گئے ،یہ بات حلقۂ دیو بند میں وقار کا سبب بن گئی ،مولانا بدر عالم میرٹھی مولف فیض الباری اپنے پیر کی حمایت میں حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ کی توہین وتذلیل پر اتر آئے ، غالباً اسی کے پیش نظر اور دوسرے اسباب کی بنا پر حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے فیض الباری پر شاندار تبصرہ کیا،اور اس کی علمی وفنی غلطیوں کو اجاگر کیا اور دلائل وبراہین کی روشنی میں یہ سمجھایا کہ مولانا بدر عالم اور ان کے استاذ انور شاہ کشمیری نے فہم حدیث میں کتنی فحش غلطیاں کیں ،اور تنقیدی کتاب ''بشیر القاری شرح بخاری'' کے نام سے مطبوعہ ہے۔

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ نگار نے اگر چہ وجہ مذکورہ بیان کی ہے اوران کے بیان پر قدرے بھروسہ بھی کیا جاسکتا ہے، تاہم یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ آپ وجہ تالیف کے بارے میں خود رقم طراز ہیں کہ:

''انھیں حالات سے متاثر ہوکر قلب میں خیال پیدا ہوا کہ بخاری شریف کی شرح سلیس اردو میں ایسی لکھ دی جائے جواس کے حل کے لیے کافی ہوتا کہ موجودہ دور کے طلبہ اس کے اور اس کے ساتھ ساتھ گمراہ کن شروح کے چہروں سے نقاب بھی اٹھا دیا جائے تاکہ اساتذہ دھوکہ نا کھائیں، کثرت کار، ہجوم افکار کے باعث ہمت تو نہ ہوتی تھی کہ اس عظیم الشان امر کی طرف اقدام کیا جائے، مگر توکلاً علی اللہ لکھنا شروع کیا اور تقریباً دوسال کی مدت میں یہ شرح مکمل ہوگئی، بزرگان سلسلہ کی توجہ کے اثرات ہیں، ورنہ اپنی حالت تو یہ ہے:

ناکارہ نادان کوئی مجھ سا نہ ہوگا

آیا نہ بجز بے ہنری کوئی ہنر اور

بیعت وارادت:

آپ کو بیعت وخلافت کا شرف شیخ المشائخ حضرت شاہ سید علی حسین صاحب اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھا، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والہ وشیدا اور ان کے معززترین خلیفہ تھے، لیکن بیعت کا سلسلہ جاری نہیں فرمایا، اس بارے میں ان کا معیار بہت بلند وبالا تھا، صرف ایک بنگالی شاگرد رشید کو اپنے سلسلہ میں داخل فرمایا۔

حج وزیارت:

۱۳۸۹ھ میں اپنی وفات حسرت آیات سے دس سال قبل حج وزیارت حرمین شریفین سے بہرہ ور ہوئے، جب کہ آپ کی عمر بہتر (۷۲) سال کی تھی، اور قدوقامت کے لحاظ سے آپ کی شخصیت بھاری بھر کم تھی، تاہم مناسک حج کی ادائیگی میں اپنی روحانی قوت کی بنا پر بہت چاق وچوبند رہے۔

وفات:

مدرسہ اسلامیہ میں اوائل ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء سے لے کر آخری عمر مبارک تک ۴۵ر سال قیام فرمایا، اس طویل مدت میں نہایت انہماک وتوجہ کے ساتھ درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں بعارض فالج میرٹھ میں وصال فرمایا، اور آفتاب ہند ہمیشہ کے لیے زیر زمین روپوش ہوگئے، عمر مبارک بیاسی سال پائی لیکن ان کی نورانی کرنیں ان کی تصانیف کے ذریعہ عرصہ دراز تک ارباب دانش کے ذہن وفکر کو منور تاباں کرتی رہیں گی، **اناللہ واناالیہ راجعون۔**

رفقائے درس:

(۱) مجاہد ملت حضرت مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن صاحب عاشق رسول رحمۃ اللہ علیہ، یہ وہ بزرگ ہستی ہے کہ ان کا حد درجہ نہ صرف یہ کہ احترام ہی کرتے تھے بلکہ تاحیات ان کے ممنون کرم بھی رہے۔

(۲) رئیس المناظرین حضرت مولانا رفاقت حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ امین شریعت، یہ وہ ذات بابرکات ہے جو مدرسہ احسن المدارس قدیم کانپور کے زمانہ دراز تک عہدہ صدارت پر فائز رہے، اور الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے مجلس شوریٰ کے تاحیات ممبر رہے، مفتی اعظم کانپور کے نام سے مشہور ومعروف تھے، ان کے فرزند بلند اقبال حضرت مولانا مفتی الحاج شاہ محمود احمد قادری اپنی جماعت کے مشہور تذکرہ نگار ہیں، اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

(۳) حافظ ملت مولانا الحاج عبد العزیز صاحب محدث مرادآبادی بانی الجامعۃ الاشرفیہ {مجوزہ عربی یونیورسٹی} مبارکپور وسابق شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ، ان کے فضائل ومناقب پر بے شمار مقالات ومضامین لکھے گئے، خود حقیر نے ان کی بارگاہ بلند میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے متعدد مقالات ومضامین تحریر کئے، ان کا مزار پاک

الجامعۃ الاشرفیہ کے احاطہ میں ہے، جو مرجع خلائق ہے، اور اپنی روحانی تابنا کیوں سے جامعہ کو منور و تاباں رکھتا ہے۔

(۴) شمس العلما حضرت مولانا قاضی احمد شمس الدین جونپوری رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم حنفیہ جون پور کے مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، اور تقریباً دو سال تک الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے عہدہ پر فائز رہے، یہ قانون شریعت فقہ اسلامی کی کتاب کے مؤلف ہیں، جو جماعت اہلسنت میں بہت مقبول ہوئی۔

(۵) فخر الاماثل حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب بھاگلپوری رحمۃ اللہ علیہ بنارس کے مشہور دارالعلوم حمیدیہ رضویہ کی مسند صدارت پر عرصہ دراز تک متمکن رہے۔

(۶) رئیس الاذکیا حضرت مولانا غلام یزدانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بریلی شریف کے دارالعلوم منظر اسلام میں عہدہ صدارت پر فائز رہے۔

(۷) رئیس الاتقیا حضرت مولانا سردار احمد صاحب گورداسپوری رحمۃ اللہ علیہ جامعہ رضویہ لائل پور پاکستان کے شیخ الحدیث رہے، اور محدث اعظم پاکستان کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ ملت اسلامیہ کے وہ درخشاں ستارے ہیں جنہوں نے برصغیر ہندو پاک کے آفتاب علم حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ سے نور فیض حاصل کیا، اور تاحیات اپنی علمی شعاعوں سے ارباب علم و دانش کے قلوب و اذہان کو منور کرتے رہے، جس وقت کتاب شرح حدیث ''بشیر القاری'' حضرت صدر العلما کی زیر تالیف تھی، اس وقت یہ علماے اعلام باحیات تھے، جن میں سے بعض کے مختصر تعارف اور سب کے اسماے مبارکہ کے ساتھ حضرت صدر العلمانے **مدظلہ العالی** لکھا تھا سواے حضرت مولانا غلام یزدانی صاحب کے کہ ان کے اسم گرامی کے آگے مرحوم لکھا، لیکن جب کہ آج یہ خلوص وعقیدت کا نذرانہ میں ناظرین کے روبرو پیش کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں تو ان بزرگوں کے نام کے آگے **مدظلہ العالی** کے بجائے **رحمۃ اللہ علیہ** یا **علیہ الرحمۃ والرضوان** لکھنا پڑا۔

یہ حقیر ہیچ مداں ان اعیان اسلام کے حالات وکوائف سے من وجہ یا من کل الوجوہ واقف ہے، اور ان کے علمی وقار وتمکنت سے غافل نہیں ہے، اس لیے ان اساطینِ اسلام کے اسمائے مبارکہ کے سامنے **رحمۃ اللہ علیہ** لکھنا پڑا، لیکن میرا قلم تھرا رہا تھا اور زندگی کی بے ثباتی کا احساس شدید تر پیدا ہو رہا تھا۔

تصانیف:

(۱) "**بشیر القاری شرح بخاری**" یہ ایسی علمی شاہکار کتاب ہے کہ متقدمین ومتاخرین میں ایسی جامع شرح بخاری کی کم پائی جاتی ہے۔

(۲) علامہ ابن حاجب کی کافیہ (جو چیستان کا درجہ رکھتی ہے) کی ترکیب نحوی کے ساتھ ساتھ مبسوط ومدلل شرح "**بشیر الناجیۃ**" ہے۔

(۳) "**البشیر الکامل**" علامہ جرجانی کی **شرح مأۃ عامل** کی بے نظیر شرح اس پر مفصل تبصرہ آ رہا ہے۔

(۴) "**البشیر**" شرح نحو میر عربی قواعد وگرامر کی بے مثال ولاجواب کتاب ہے، مبتدی طالب علموں کے لیے یہ نہایت سود مند ہے، اس کی نظیر کا ملنا ناممکن نہ سہی نہایت مشکل ضرور ہے، یہ صرف مبتدی طلبہ کے لیے مفید نہیں ہے بلکہ اساتذہ ومدرسین اس کے مطالعہ سے عربی قواعد وگرامر پر عبور حاصل کر سکتے ہیں۔

(۵) "**نظام شریعت**" وضو، تیمم وغیرہ کے ضروری مسائل اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں، زبان ایسی سلیس ورواں ہے کہ معمولی اردو خواں بھی اس سے مستفید ہو سکتا ہے ،اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف علام دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اسلامی پر بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔

(۶) "**تبصرہ اعجاز بر تنقید سرفراز**" اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور صدر الافاضل **رضی اللہ عنہما** کے ترجمہ وتفسیر پر مولوی سرفراز خاں دیوبندی نے اپنے اعتراض کے ذریعہ اہل علم کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی لایعنی کوشش کی تھی اس کا مدلل ومفصل

جواب تحقیقی انداز میں لکھا، ان جوابات کو دنداں شکن کہا جاسکتا ہے۔

(۷) "**صحیح النظر فی صعود القمر**" ۱۹۵۷ء میں غالباً امریکہ یا روس نے پہلی مرتبہ انسان کو چاند کی سرزمین پر اتارا تھا، اور دنیا بھر میں اس کا غلغلہ بلند تھا، انسان چاند پر پہنچ گیا، اب پیش قدمی کر کے دوسرے سیاروں تک رسائی حاصل کرسکتا ہے، اس کا سہارا لے کر سائنسدانوں نے مذہبی حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کی اوران پر سخت وار کیا، ایسے پرآشوب دور میں یہ کتاب لکھی گئی، اس کا جواب ان کے تلمیذ رشید مفتی شریف الحق صاحب نے اپنے ایک رسالہ میں دیا، لیکن حضرت صدر العلما **رحمۃ اللہ علیہ** نے اس اجتہادی مسئلہ میں اپنے قلم حقیقت رقم سے کتنی کامیابیاں حاصل کیں، میں اس کے بیان کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوں، لیکن اتنا بیان کرنے کی جرات ضرور کرتا ہوں، کہ خلوص وللّٰہیت کے جذبے کا بھرپور مظاہرہ اسلام کے دفاع میں کیا، اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

(۸) "**صحیح المسلک فی معنیٰ کل فی فلک**" چاند پر پہنچنے کے دلائل کا جائزہ اس کتاب میں لیا گیا ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ آپ کی ذات بابرکات سے متعدد رسائل بھی منصۂ شہود پر آئے لیکن جن تصانیف کا میں نے ذکر کیا ہے ان سے ان کی عظیم شخصیت، علمی مقام، اسلامی علوم وفنون پر مکمل مہارت، جودت فکر، گمراہ گروں اور گمراہوں سے نفرت و بےزاری سب کی جلوہ گری ان میں دیکھی جاسکتی ہے، جس سے ان کا علمی وقار اہل علم کے ذہن وفکر پر حاوی ہو جاتا ہے۔

علم نحو میں مہارت:

آفتاب ہند حضرت علامہ صدر العلما **رحمۃ اللہ علیہ** جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، جس فن میں اپنے قلم کی روانی وجولانی دکھاتے تھے، وہ اس کا حق ادا کردیتے تھے، لیکن علم نحو میں ان کو ایسی شہرت وناموری حاصل ہوئی کہ برصغیر ہندوپاک کے طبقہ علما میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی، ان کو عصر جدید کا سیبویہ یا خلیل نحوی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس علم میں ان کی ژرف نگاہی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دیوبندی مکتب فکر کے کے وہ علما جن کو بڑے بڑے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کی صلاحیت وقابلیت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ ان کی بارگاہ میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی طفل ناداں استاد کامل کے حضور، میں اپنے اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے چند مثالیں ہدیہ ناظرین باتمکین کرتا ہوں۔

{الف} دیوبند کے صف اول کے مدرس مولانا ظہور احمد صاحب کی کتاب ''**ایضاح العوامل فی شرح ماته عامل**'' کا جائزہ اور اس پر تنقید وتبصرہ حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے فاضلانہ انداز تحریر سے پیش کیا ہے کہ مولانا دیوبندی صاحب کی علمی پست معیاری اور ان کی کم نگاہی ومطالعہ کی کوتاہی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، جس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ شہرت وناموری بسااوقات حقیقت کا ساتھ نہیں دیتی ہے، شہرت کچھ ہوتی ہے اور واقعہ اس کے بالکل خلاف، چنانچہ حضرت فخر المتاخرین صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

> ''شان الوہیت اور شان رسالت میں سوء ادبی مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندی کو ان کے اکابر کے ترکہ میں پہنچی ہے ''**بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم**'' کی ترکیب میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ اللہ موصوف اپنی دونوں صفتوں سے مل کر اسم مضاف کا مضاف الیہ ہوا، اسلاف کرام کی مودبانہ تعبیر یہ ہے کہ اسم جلالت اپنے دونوں صفتوں سے مل کر مضاف الیہ ہوا، اور مولوی ظہور احمد صاحب ''آلہ'' کی ترکیب میں لکھتے ہیں کہ ''آل'' مضاف ''ہٖ'' ضمیر واحد مذکر غائب جو کہ راجع محمد صلعم کی طرف ہے''

اس مختصر عبارت میں حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی ظہور احمد صاحب کو ان کی دو غلطی پر بلکہ دو سوء ادبی پر تنبیہ فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ باادب تعبیر یہ ہے کہ اسم جلالت اپنی دونوں صفتوں سے مل کر مضاف الیہ ہوا، اور ''ہٖ'' ضمیر راجع بسوئے اسم رسالت، علاوہ ازیں اسم رسالت کے ساتھ صلعم لکھنا حرماں نصیبی ہے۔

پھر امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا کہ پہلا شخص جس نے درود شریف کا ایسا اختصار کیا سیاستہ اس کا ہاتھ کاٹا گیا، قطع ید کی یہ سزا ''**السنية الانيقة فی فتاوی افريقه**'' میں مرقوم ہے۔

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جو شخص یہ نازیبا حرکت کرے یعنی **صلی اللہ تعالی علیه وسلم** کے بجائے صرف صلعم لکھ دے تو قانون شرع کی رو سے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری سے پہلے صلعم لکھنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔

لہٰذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حضرت علامہ صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر عصر حاضر میں کسی اسلامی حکمراں وقاضی کے لیے اس قسم کی کوتاہی پر اتنی سخت سزا دینا جائز ہے تو یہ سرتاسر غلط ہے، گویا حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کے واقعہ کے تذکرہ سے یہ تنبیہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اس دور میں دیوبندی مکتب فکر کے وہ علما جن کے دین و دیانت اور وفور علم پر ناز کیا جاتا ہے، اگر وہ خود علم و دیانت کے ساتھ غور کریں تو یہ بات اپنی شان علم کے خلاف محسوس کریں گے۔

دیوبند کے علما جماعت اہل سنت کے دیندار، لائق فخر، بلند پایہ علما کی تنبیہات کو بالعموم نظر انداز کر دیتے، اور لائق اعتنا تصور نہیں کرتے ہیں، بلکہ سخن سازی، مناظرہ ومجادلہ آرائی کا بازار گرم کر دیتے ہیں، غرور علم اور فریب نفس میں مبتلا رہ کر اصلاح کو قبول نہیں کرتے، لیکن اس غرور میں کچھ اعتدال پسند عناصر ضرور ہیں جو اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چنانچہ سیرت النبی **صلی اللہ علیه وسلم** مولفہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، ان سب میں جہاں جہاں حضور **صلی اللہ علیه وسلم** کا اسم مبارک آیا تھا صلعم لکھتے چلے گئے، لیکن جب ہماری جماعت کے کچھ علما نے اس غلطی پر تنبیہ فرمائی تو اس کی اصلاح کر لی اور سید سلیمان ندوی نے چوتھے ایڈیشن کے مقدمے میں لکھا کہ:

''حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے

اختصار کے بجائے پورا **صلی اللہ علیہ وسلم** کے لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے، تا کہ اس تساہلی سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو‘‘۔ {سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج:۱، دیباچہ طبع چہارم، ص: ۴}

اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ جماعت اہل سنت کے سرکردہ علما کی طرف سے جو نقد وتبصرہ دوسرے مکاتب فکر کی کتابوں پر کیا جاتا ہے وہ رائیگاں نہیں جاتا ہے، بلکہ کچھ نہ کچھ اس سے اصلاح ضروری ہوتی ہے، کیوں کہ علمائے اسلام کے مساعی جمیلہ حسن نیت پر مبنی ہوتے ہیں، کارخیر خواہ فرقہ باطلہ کی کتابوں پر تنقید ہو یا اس کے سوا کوئی دوسرا کام، اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار انداز میں برآمد ہوتا ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علمائے اہل سنت کے وہ طبقے جن کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے طریقے میں تبدیلی لانا ضروری ہو گیا ہے، اور عرصہ دراز تک ردومناظرہ کی روش پر گامزن رہنا سودمند نہ ہوگا مکمل طور سے یہ نظریہ درست نظر نہیں آتا، اس لیے من کل الوجوہ اس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان تنقیدات وتبصروں سے بہت کچھ فوائد حاصل ہوئے ہیں اور بہت کچھ ہوتے رہیں گے۔

میں نے اس بحث کو اس لیے طول دیا ہے کہ ہمارے ممدوح مکرم صدرالعلما کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے دیوبندی مکتب فکر کے علما میں سے بعض کی سخت گرفت فرمائی ہے، اس لیے کوئی شخص اس وسوسہ میں گرفتار ہوسکتا ہے کہ مباحث علمی میں ایسی سخت روش اختیار کرنے میں کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے، لیکن میری نگاہ میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس سے قبول حق کی راہ ہموار ہوتی ہیں، ایسے تبصرے اور سخت گرفت سے حقیقت اپنی اصل شکل میں نمودار ہوکر انسانی ذہن وفکر پر چھا جاتی ہے، اور اصل واقعہ پردہ حجاب میں نہیں رہ پاتا ہے بلکہ وہ بے نقاب ہوکر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

{ب} مولوی ظہور احمد صاحب نے ’’**وجعل الجنۃ مثواہ**‘‘ کی ترکیب میں لکھا ہے کہ ’’**جعل**‘‘ افعال قلوب میں سے ہے، یعنی ایسا فعل ہے جس کا صدور دل سے ہوتا ہے،

وہی دل جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"الاوان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذافسدت فسد الجسد کله الاوهی القلب" (صحیح مسلم۔حدیث نمبر:1599)۔ غور سے سنو! جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست رہے گا تو سارا جسمانی نظام بھی درست رہے گا، اور جب وہ فاسد ہوجائے گا، تو مکمل جسمانی نظام میں فساد برپا ہوجائے گا، خبردار ہوجاؤ وہ ٹکڑا دل ہے۔

جسم کا یہ ٹکڑا حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، اس سے بھی بہت سے اعمال وافعال صادر ہوتے ہیں، لیکن وہ ہستی جو مادہ ومادیات، جسم وجسمانیات سے مبرا ہواس میں قلب کا پایا جانا محال ہے، اس لیے اس مقام پر "جعل" کو افعال قلوب سے قرار دینا حیرت انگیز لغزش ہے، جس پر ممدوح مکرم نے تنبیہ فرمائی۔

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات تسلیم ہے کہ مولوی ظہور احمد صاحب نے خدائے پاک کے لیے جسم عنصری کا عقیدہ نہیں بنایا ہے، جس کی بنا پر انہوں نے "جعل" کو فعل قلب سے مانا ہے، وہ اللہ کے بارے میں یہ نظریہ نہیں رکھتے ہیں، جیسا کہ فرقہ مجسمہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ جسم رکھتا ہے، جس میں قلب ہوتا ہے، اور قلب بھی ایسا جو تا حیات متحرک رہتا ہے، اس قسم کا عقیدہ کسی ایسے عالم کا نہیں ہوسکتا جس نے اسلامی علم کلام کو پڑھا ہے، پھر مولانا ظہور بہر حال ایک مولانا ہیں ان کا یہ عقیدہ کیسے ہوسکتا ہے، لیکن کبھی کبھی انسان سہواً وبلا قصد ایسی گفتگو کر دیتا ہے جو اس کو مبتلائے آلام کرسکتی ہے، جب کہ اس سے تائب اور اس پر شرمندہ نہ ہو، اور اپنی اس ضد پر قائم وبرقرار رہے کہ جو کچھ میری زبان سے نکل گیا ہے وہی صحیح ہے حالانکہ وہ مکمل طور سے غلط ہے۔

حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"ان العبد لیتکلم بالکلمة من سخط الله لایلقي لهابالا یهوی بها في نار جهنم" بیشک بندہ اللہ کی ناراضگی کی بات کبھی محض بے خیالی میں بول جاتا ہے اس کو اس

کی فکر نہیں ہوتی ہے کہ میں کیا بول رہا ہوں اس کے سبب وہ جہنم میں گر پڑتا ہے۔{بخاری شریف جلد ثانی، جز ۲۶، صفحہ ۹۵۹}

اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بے خیالی کی بات پر سخت محاسبہ کیا ہے، بلکہ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ مولوی ظہور احمد صاحب یہ محسوس نہ کر سکے کہ میں کتنی بڑی بات بول رہا ہوں ''**كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوٰهِهِمْ** ''(**الکھف:۵**)۔ بڑی حیرت انگیز بات زبان سے نہ سہی قلم سے تو لکھ ہی ڈالا۔

اور پھر تحریر فرماتے ہیں کہ ''جعل الجنۃ مثواہ'' میں ''**جعل**'' فعل قلب سے نہیں ہے یعنی ایسے افعال سے نہیں ہے جو دل کے عمل وحرکت پر دلالت کرے، اور عالمانہ انداز میں اپنے مخصوص پیرایہ بیان سے اس دعویٰ پر حجت پیش کرتے ہیں، وہ کافیہ کی شرح'' رضیٰ'' کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''واستعمل عدوجعل لاعتقادکون الشی علی صفةاعتقادا غیر مطابق واذا اولیتهما اسمية نصب جزئيها نحو كنت اعده الفقير فبان غنياقال تعالى :وجعلوا الملائكة الذين هم عباد الرحمن اناثا اى اعتقدوا فيهم الانوثية''{البشير الكامل،ص:۳}

اور **عدوجعل** ایسے اعتقاد کے لیے استعمال کیے گئے کہ شی ایک صفت پر ہے، جو واقع کے مطابق نہیں ہے، اور جب ان دونوں سے متصل جملہ اسمیہ لاؤ گے تو اس کے دونوں جزؤوں کو نصب کرے گا، جیسے:''کنت اعدہ الفقیر فبان غنیا'' میں اس کو فقیر شمار کرتا تھا، پھر ظاہر ہوا کہ وہ مالدار ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''**وجعلوا** ''الخ یعنی ان کے بارے میں مونث کا ہونے کا عقیدہ رکھا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ عقیدہ جو واقع کے مطابق نہ ہو وہ شان الوہیت کے لائق نہیں ہے بلکہ یہ تو نقص ہے اور جو اس کی بارگاہ میں کھلی ہوئی بے ادبی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کتنی دقیقہ سنج وباریک بیں

ہے کہ ایک دیوبندی مکتب فکر کے بڑے مولانا کو اپنی فحش غلطی کا احساس نہ ہوا، بلکہ ان کی جماعت کے دوسرے علما نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دلائی کہ ''**جعل** ''فعل قلب سے نہیں ہے لیکن آپ نے اس کو محسوس کیا کہ اگر چہ یہ بات ترکیب نحوی کی ہے، لیکن قائل کو بے خیالی میں جہنم کی طرف ڈھکیل رہی ہے، اور وہ کفر کی سرحدوں کے قریب پہنچ رہے تھے، اس لئے آپ نے ان کو سیدھی راہ پر لگانے کی کوشش فرمائی۔

بہر حال یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر "**جعل**" فعل قلب میں سے نہیں ہے تو "**جعل الجنة مثواه**"میں "**جعل**" کے کیا معنی ہیں۔

اس کے بارے میں علامہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ "**جعل**"افعال تصیر میں سے ہے، جو متعدی بدو مفعول ہوتے ہیں، ان کی یہ ایسی رائے ہے کہ اس سے انکار مجادلہ ومقابلہ کے سوا کچھ نہیں ہے، راقم الحروف کو معلوم نہیں کہ اس تنبیہ پر علمائے دیوبند نے کوئی توجہ دی یا نہیں؟ تاہم اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے ممدوح مکرم نے ان کی اصلاح کی خاطر جو جاندار تبصرہ فرمایا ہے، وہ علمائے دیوبند پر ایک قسم کا احسان ہے کہ وہ حضرات اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں پر مطلع ہو کر اصلاح حال کی کوشش کریں، کیوں کہ پڑھے لکھے انسان کی عظمت کا راز اسی میں مستتر ہے۔

{ج} قرآن حکیم کی آیت کریمہ:"وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" (**البقرة:۱۹۵**) تم اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو یعنی اپنے آپ کو برباد نہ کرو کوئی ایسا طریقہ نہ اپناؤ جس سے تم اپنے ہاتھوں نقصان اٹھاؤ۔

علامہ عبدالرحمن جرجانی نے اس آیت کریمہ میں "**بایدیکم**" میں بتایا کہ یہ با زائدہ ہے، حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ چوں کہ زبان عربی کے علم نحو پر مکمل عبور رکھتے تھے، اور جس موضوع پر اپنے قلم سے صفحہ قرطاس پر تحریری نقش ونگار بناتے تھے، اس کو اتنے صاف اور واضح لفظوں میں اجاگر فرماتے کہ اس کے سمجھنے میں ذہن وفکر پر کوئی دباؤ نہیں پڑتا ہے، چنانچہ اس حرف جار با زائدہ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

”زائدہ وہ ہے کہ اس کے حذف سے اصل معنی میں کوئی تغیر نہ واقع ہو، لفظاً تغیر ضروری ہے کہ حرکت جر باقی نہ رہے گی اور جو حرف زائد ہو وہ تاکید یا درست وزن کا افادہ کرتا ہے جیسے:

الم یاتیک والانباء تنمی

بما لاقت لبون بنی زیاد

اس شعر میں ”**بما لاقت**“ **یاتیک**“ کا فاعل ہے، وزن شعر کی درستگی کے پیش نظر اس پر با حرف جار کا اضافہ کیا گیا، با کی زیادت دو قسم پر ہے، ایک قیاسی، دوسرے سماعی، قیاسی ”**هل**“ کے بعد مبتدا کی خبر پر ہوتی ہے اور ”**ما**“ حجازیہ اور ”**ليس**“ کی خبر پر ہوتی ہے، اور سماعی **كفى** بمعنی **اكتفى** کے فاعل پر ہوتی ہے، جیسے: ”**كفى بالله شهيدا**“ اور مبتدا پر جیسے: ”**بحسبك زيد**“۔ {البشیر الکامل، ص ۱۴}

اللہ کے کلام میں معاذ اللہ زائد ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بلا فائدہ لایا گیا ہے، اس کے فوائد یقیناً ہوتے ہیں جیسا کہ: ”**ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة**“ میں ”با“ حرف جارہ زائدہ لاریب بلا فائدہ نہیں ہے بلکہ تاکید کے لئے ہے۔

اس کلام بلاغت نظام کی ترکیب نحوی کرتے ہوئے دیوبند کے فاضل جلیل غالباً عالم سکر میں رہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جار مجرور سے مل کر فعل کے متعلق ہوا۔

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ اس ترکیب پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ غلط اور ”**با**“ زائدہ کا معنٰی نہ سمجھنے پر مبنی ہے، وجہ یہ ہے کہ حروف جارہ زائدہ فعل یا شبہ فعل سے متعلق نہیں ہوا کرتا ہے، پھر اپنے دعویٰ کو مدلل کرنے کے لیے جمع الجوامع کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

”**و لا يتعلق من الحروف الجارة زائدة كالباء ومن في كفى بالله شهيدا وهل من خالق غير الله وذلك لان معنى التعلق الارتباط المعنوى والاصل ان افعالا قصرت عن**

الوصول الی الاسماءفاعینت علی ذلك بحروف الجر والزائد انما دخل فی الکلام تقویة وتوکیدا“

{البشیر الکامل،ص:۷(دیباچہ)}

اورحروف جارہ میں سے جوزائد ہووہ متعلق نہیں ہوتا ہے، جیسے کہ’’ **با** ‘‘اور’’ **من** ،، **کفی باللہ شھیدا** ‘‘اور’’ **ھل من خالق غیر اللہ** ‘‘میں متعلق نہیں ہے،اس لیے کہ تعلق کا مطلب ارتباط معنوی اور اصل یہ ہے کہ افعال اسما تک پہنچنے میں قاصر ہو گئے ،توحروف جارہ کے ذریعہ ان کی مدد کی گئی اور زائد کلام میں تقویت اور تاکید کے لئے آتا ہے۔

اس بیان سے ثابت ہوا کہ دیو بند کے فاضل جلیل نے علمی نقطہ نگاہ سے کتنی فحش غلطی کرڈالی اوران کے ذہن کی رسائی حروف جر کے زائد ہونے کے مفہوم تک نہ ہوسکی،اسی وجہ سے حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی سخت گرفت فرمائی۔

علمائے دیو بند نے بالعموم اپنے کاروبار کی ترقی کے لیےعلم نحو وصرف ، معانی وبلاغت ،منطق وفلسفہ،حدیث وتفسیر کی درسی کتابوں کے تراجم اوران کے شروح وحواشی لکھ کر طالبان علوم اسلامیہ کواپنی ہمہ دانی کا ثبوت فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی ،اور جماعت اہل سنت کے علما میں سے بہت کم لوگوں کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ ان کے مطالعہ کے زیور سے آراستہ ہوکر تنقیدی جائزہ لیتے ،ان شروح وتراجم سے تاجران دیو بند نے خواہ کتنا ہی اپنا کاروبار چمکا یا ہولیکن علمی لحاظ سے ان کے دوررس اثرات ونقصانات سامنے آنا شروع ہوگئے ہیں،ان میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ روز بروز اسلامیہ مدارس کے طلبا پر برے اثرات مرتب ہورہے ہیں، یہی ایک کتاب’’ **ایضاح المطالب فی شرح مأۃ عامل** ‘‘کو مدنظر رکھا جائے تو ہمارے بیان کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

’’ **شرح مأۃ عامل** ‘‘شیخ عبدالقاہر جرجانی کی تصنیف ہے،وہ مسلکاً معتزلی تھے، اورفقہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے،۴۷۱ھ میں وفات پائی،ان کی یہ کتاب علمی دنیامیں خاص شہرت رکھتی ہے، دیوبندی مکتب فکر کے علما ہوں خواہ اہل سنت و جماعت یا غیر

مقلد کے فضلا سب نے جرجانی کے عقیدے سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے یہاں نصاب تعلیم میں داخل کیا ہے، اوراس کے متعدد ومختلف شروح وحواشی لکھے گئے ہیں، ترکیب نحوی اور قواعد نحو کی مشق وممارست کے سلسلہ میں شرح ماۃ عامل اول بھی ہے اور آخر بھی، اس لئے علماے دیو بند نے اپنے تاجرانہ نقطہ نگاہ سے اس کتاب کی شرح لکھی، اور تراکیب نحویہ کو بیان کیا، لیکن بہت زیادہ غلطیاں کرڈالیں، حیرانی اس بات پر نہیں ہے کہ ''**ایضاح المطالب**'' میں اتنی خامیاں کیسے ہیں، بلکہ حیرت وتعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ علم نحو پر مکمل عبور اور کامل واقفیت کے بغیر شرح لکھنے کی جرات کیسے ہوئی؟

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے ''**ایضاح المطالب**'' کا مکمل جائزہ لے کر جو کچھ بیان کیا ہے وہ حیرت افزا ہے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''شرح ماۃ عامل ایک سو گیارہ صفحات پر مشتمل ہے، مقام غور ہے کہ چھٹے صفحہ سے ترکیب نحوی شروع ہوکر ایک سو گیارہ پر ختم ہوئی تو کتاب کے کل صفحات ایک سو پانچ ہوئے، جن میں ایک سو چھیاسی غلطیاں ہیں، اور وہ بھی موٹی موٹی ہیں، جن کو دیکھ کر مبتدی بھی انگشت بدنداں رہ جائے، کتاب کا کوئی صفحہ غلطی سے خالی نہیں ہے، ہم نے کل اغلاط بالاستیعاب بیان نہیں کیے ورنہ اغلاط کی تعداد کئی سو تک اور پہنچتی''۔ {دیباچہ البشیر الکامل، ص:۲۹}

مولانا ظہور احمد صاحب نے دار العلوم دیو بند کے درجہ علیا کے استاذ ہوتے ہوئے اتنی ساری غلطیاں کیسے کرڈالیں؟ سمجھ میں نہیں آتا عقلاً اس کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ صرف دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں: اولاً یہ کہ انھوں نے یہ کتاب علمی نقطہ نگاہ سے نہیں لکھا، اس لیے تحقیق و جستجو کی ضرورت نہیں محسوس کی، سرسری اور معمولی مطالعہ پر اکتفا کیا، ثانیاً اپنی آرام طلبی وتساہلی کے باعث یہ زحمت گوارا نہ کی کہ جو کتاب منظر عام پر آئے وہ ایسی ہو کہ اہل علم میں مقبول ہو بلکہ ان کے روبرو بظاہر ایک مقصد تھا وہ یہ کہ جب یہ کتاب منظر عام پر آئے گی تو

مدارس اسلامیہ کے طلبا اس کا مطالعہ کریں گے اور اس کو خوب خوب خریدیں گے جس سے ان کا کاروبار یا ان کی تجارت ترقی کرے گی اور بہت بارونق ہوگی، ظاہر ہے کہ جو کتاب تجارت کی خاطر لکھی جائے اس میں علم کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت نہیں پائی جاسکتی ہے۔

حضرت علامہ صدر العلما **علیہ الرحمۃ والرضوان** نے کم از کم جماعت اہل سنت کے طلبا و علما پر احسان عظیم کیا کہ نہایت مفصل و مدلل اور جامع شرح ''شرح ماۃ عامل'' کی لکھی اور دارالعلوم دیوبند کے صف اول کے استاذ مولانا ظہور احمد صاحب کی تالیف کی خامیوں پر دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی، تاکہ جماعت کے اہل دانش اور کوتاہ نظر طلبہ دیوبند کی کتاب پڑھ کر غلط روی و گمراہی کے دلدل میں گرفتار نہ ہوجائیں، یہ آپ کا اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ جب تک آسمان پر ستاروں کی انجمن اور زمین پر دریاؤں کی طغیانی اور روانی برقرار رہے گی اس وقت تک آپ کے فیضان علمی سے جماعت کے اہل علم اپنی علمی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

یہ ہے میرا تبصرہ بلفظ دیگر حقیر نذرانہ عقیدت صرف علم نحو میں ان کے کمال علمی کے سلسلہ میں، لیکن میں اپنی علمی بصیرت اور دیگر شواہد کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ آفتاب ہند کو علوم اسلامیہ میں سے کوئی ایسا علم نہیں ہے جس میں مکمل مہارت نہ رہی ہو، منطق و فلسفہ، علم کلام، فقہ و اصول فقہ، حدیث و تفسیر کو انہوں نے تقریبا پینتالیس سال تک پڑھایا تھا، علم حدیث میں ان کے مطالعہ کی وسعت ان کی دیدہ وری و رمز شناسی لائق فخر ہے۔

چنانچہ اپنی جماعت کے شارح بخاری حضرت مولانا مفتی شریف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی بارگاہ بلند میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''**بشیر القاری شرح بخاری**'' استاذی، صدر العلما علامہ غلام جیلانی میرٹھی قدس سرہ کی مایہ ناز شرح ہے، عربی، فارسی اردو کسی بھی زبان میں بخاری کی اب تک کوئی شرح اتنی تحقیق و تفصیل سے نہیں لکھی گئی، اس میں حضرت نے تحقیق و تدقیق کا حق ادا کردیا، الفاظ

حدیث کی صرفی ،لغوی تحقیق ،جملوں کی نحوی ترکیب اور معانی و بیان اور بدیع وتکنیت کے ساتھ ساتھ معانی حدیث کے ہر ہر پہلو پر ایسی جامع کامل بحث ہے جسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ **"کم ترک الاولون للآخرین"**۔ ساتھ ہی ساتھ ہمہ دانی کا خصوصاً علم حدیث پر دعویٰ کرنے والی غلطیوں پر ایسی مضبوط گرفت فرمائی ہے جس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ،کوئی بھی عناد وتعصب سے ہٹ کر اگر اس شرح کا مطالعہ کرے تو اسے کہنا پڑے گا کہ حضرت مصنف دیگر علوم کی طرح علم حدیث کے بھی اپنے وقت کے امام ہیں ۔{مقدمہ نزہۃ القاری ،ص:۶،۷}

حضرت مفتی شریف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق پر مبنی ان چند جملوں کو میں ایک ''مختصر المعانی'' {حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ایجاز واختصار ہے ،حقائق ومعارف پر مشتمل گویا ایک متن ہے جس کو مختصر المعانی بطور تلمیح کہا گیا} متن تصور کرتا ہوں ،اگر اس کی شرح کی جائے یا اس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے تو اس حقیر پر تقصیر کے نزدیک یہ شرح وتفسیر پچاسوں صفحات پر مشتمل ہوسکتی ہے ،جس کے لیے اچھی خاصی مہلت درکار ہے ،اس لیے میں ''بشیر القاری'' کی روشنی میں ان حقائق وخصوصیات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کے باعث حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب مستطاب اتنی بلند پایہ ہے کہ اس عہد جدید میں علم حدیث وشرح حدیث میں اس کے ہم رتبہ کوئی دوسری کتاب نہیں ہے ، اور مصنف علام اسی کتاب کی تصنیف کے باعث اپنے معاصرین کے گروہ میں امتیازی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئے اور اکابر علماے اسلام کے نزدیک ان کی بلند پایہ شخصیت ایک نادر روزگار ہستی کی روپ میں نمایاں ہوئی۔

شارح بخاری حضرت مولانا مفتی شریف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ **''نزھۃ القاری''** میں **''بشیر القاری''** کے مصنف کے علمی مقام کی طرف محض اشارہ کیا

ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس کتاب سے خوب استفادہ کیا۔

اسی وجہ سے مقدمہ'' **نزهة القاری** '' اور دیباچہ'' **بشير القاری** '' میں بعض مقامات پر ایسی مماثلت نظر آتی ہے کہ استاد وشاگرد کے کلام میں لفظاً ومعناً کوئی زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا، فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنه** کے بعد صدر العلما اور مفتی شریف الحق **رحمهما اللّٰہ** وضع حدیث کی شناخت کے جو طریقے بیان کئے ہیں ان میں سے کوئی کمی یا زیادتی ان علماے اسلام کی تحریر میں نہیں پائی جاتی ہے، صاف لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان استاذ وشاگرد کا ماخذ فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنه** کا استخراج ہے، انہوں نے جو کچھ بیان کیا تھا اسی کو ان دونوں حضرات نے بھی بیان کیا ہے، اور اسی ترتیب کے ساتھ بغیر کسی کمی یا زیادتی کے تحریر کیا ہے، اس سے ان معاندین ومخالفین کی تردید ہوتی ہے، جن کی زبان یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتی ہے کہ علماے بریلوی کے مسالک و مذاہب کا استناد واستدلال موضوع وضعیف حدیثوں پر ہے، ان کے اس گمان باطل کی تردید یوں ہوتی ہے کہ مجدد اسلام فاضل بریلوی **رضی اللّٰہ عنه** نے جب وضع حدیث کے طریقوں کو بغیر کسی ابہام کے کھول کھول کر بیان کر دیا اور ان کے بعد یک زبان ہو کر جماعت کے مستند علما اس پر اتفاق کرتے ہیں تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نظریات ومسائل کی بنیاد احادیث موضوعہ پر ہے۔

پھر علماے اسلام نے جو کچھ لکھا اور بیان کیا اس پر عمل بھی کیا، حدیث صحیح، غیر صحیح، حدیث موضوع وضعیف کی چھان بین میں کوئی کوتاہی نہیں کی، رہ گیا واعظوں اور مقرروں کا معاملہ تو وہ ہمارے لئے کوئی سند نہیں ہیں، کیا کوئی شخص ثابت کر سکتا ہے کہ حضرت صدر العلما جیسی عظیم شخصیت نے اپنے دعوی کو حل کرنے کے لئے حدیث موضوع کا سہارا لیا ہو یا ان کے قلم سے ایسی لغزش وجود میں آئی ہو جو ان کی شان علم کے بالکل منافی ہو، یا واعظوں اور خطیبوں کی طرح اپنی محفل آرائی کے لیے تصنیفات میں ضعیف وموضوع احادیث کو بیان کر کے داد وتحسین وصول کی ہو، یہ وہ فاضل جلیل ہیں کہ جو بات کہتے ہیں علم وعرفان کی روشنی میں کہتے ہیں، اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث موضوع کی شناخت کے جو

طریقے انہوں نے بیان کیے ہیں اس سے کبھی صرف نظر نہ کیا ہوگا، بلکہ اپنے دعوی کے ثبوت میں جب کسی حدیث کو پیش کیا ہوگا تو انہوں نے جانچ پرکھ کر پیش کیا ہوگا، کیوں کہ قدرت الٰہی کی طرف سے ان کو ایسا ذہن ثاقب عطا ہوا تھا کہ وہ غلط باتوں کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتے تھے، اس سے میں یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ اجتہادی خطا ان سے ناممکن ہے بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صداقت کی جستجو میں ان کا ذہن بہت دور چلا جاتا تھا، جہاں تک منکرین حق کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

"ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"

شرح حدیث میں آپ کا اعلیٰ معیار:

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی حدیث متواتر" **انما الاعمال بالنیات**" کی شرح میں ایسے اعلی ذوق و بلند معیار کا مظاہرہ کیا کہ اس کی نظیر تلاش کرنا نہایت دشوار کام ہے، اس پر ہر حیثیت سے بحث کی ہے جس کا دائرہ تقریبا تینتالیس (۴۳) صفحات پر پھیلا ہوا ہے، وہ حدیث پاک یہ ہے:

"سمعت عمر بن الخطاب رضی الله تعالى عنه على المنبر يقول: سمعت رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم يقول: يا ايها الناس انما الاعمال بالنيات وانما لكل امرء ما نوى، فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او الى امراة ينكحها فهجرته الى ماهاجر اليه"۔ (صحيح البخاری۔كيف كان بدء الوحی الى رسول الله صلى الله عليه وسلم۔رقم الحديث:1)

ترجمہ: میں نے عمر بن خطاب **رضی اللہ عنہ** سے منبر پر کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: اے لوگو! اعمال نیت سے ہیں اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی، لہٰذا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے، اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو جس کو وہ حاصل کرے

یا عورت کی طرف جس سے وہ نکاح کرے تو اس کی ہجرت اس کی طرف ہے جس کی طرف ہجرت کی۔

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے بہت باریک بینی ونکتہ آفرینی سے اس حدیث پر بحث کی ہے، کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا کہ شرح و بیان میں کسی چیز کی کمی کا احساس پیدا ہو، علم نحو وصرف، علوم عربیہ، منطقیانہ وفلسفیانہ طرز استدلال میں ان کی اجتہادی شان اس طرح نظر آتی ہے کہ عقل حیلہ جو یہاں حیران وششدر رہ جاتی ہے، اس لئے حقیر اس حدیث کی شرح پر اگر اپنے خیلات کا اظہار کرنا چاہے تو اپنی کم علمی و بے مائیگی کے باعث اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اس کے باوجود خامہ فرسائی سے دسوں صفحات سیاہ کرسکتا ہے۔

اہل علم و ارباب دانش کے نزدیک آفتاب ہند کی جمیع علوم اسلامیہ میں مہارت و حذاقت مسلم ہے، مباحث علمیہ سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کے عالمانہ اسلوب بیان ، ان کے منطقیانہ وفلسفیانہ طرز استدلال پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، آپ فرماتے ہیں کہ:

> ''حدیث زیر بحث کے پہلے فقرہ ''**انما الاعمال بالنیات**'' سے یہ ثابت ہوا کہ اخروی ثواب صرف نیت پر موقوف ہے، اس کے بغیر آدمی ثواب سے محروم رہے گا، فقیر **غفرلہ** کی تحقیق سے یہ ظاہر ہوا کہ صدق نیت سے بھی انسان کو مولیٰ تعالیٰ ثواب سے سرفراز فرماتا ہے''۔

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ انسان کو اللہ تعالی محض اعمال صالحہ پر اجر وثواب کا مستحق نہیں بناتا ہے بلکہ حسن نیت اور اچھے ارادے پر بھی اس کو اجر وثواب عطا فرماتا ہے، چنانچہ صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو چند مثالیں پیش کر کے بیان فرمایا ہے تا کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ نقش کالحجر ہو جائے آپ رقمطراز ہیں کہ:

{الف} ''ایک شخص جس کو اللہ تعالی نے علم شریعت اور دنیاوی دولت دونوں

چیزیں عطا فرمائی ہیں تو وہ اپنی دولت کو مصارف خیر میں صرف کرتا ہے، دوسرا شخص اس کو دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالی اگر اسی طرح مجھ کو بھی علم اور مال مرحمت فرماتا تو میں بھی اسی طرح مال کو اعمال خیر میں خرچ کرتا بس وہ شخص اور دونوں ثواب میں برابر ہوئے۔

ایک وہ شخص ہے جس کو دنیوی دولت ملی اور علم دین سے محروم رہا تو وہ اپنی لاعلمی کے باعث دولت میں نامشروع طریقہ پر تصرف کرتا ہے، دوسرا شخص دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دولت عطا فرماتا تو میں بھی اسی طرح خرچ کرتا پس یہ اور وہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے حسن نیت اور فاسد ارادے کے اثرات و نتائج کے بارے میں جو مثال پیش کی ہے وہ خود ان کی اپنی طرف سے نہیں ہیں بلکہ حضور **صلی اللہ علیہ وسلم** کی حدیث میں وارد ہوئی ہے، اس سے یہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہوا کہ جس طرح سچی نیت، اچھے ارادے کا فائدہ انسان کو ملتا ہے اسی طرح بری نیت سے اس کو مضرت بھی پہنچتی ہے، اس لیے انسان پر لازم ہے کہ اپنی نیتوں میں خلوص پیدا کرے اور خیالات فاسدہ اور وساوس شیطانی اور برے ارادوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کرے۔

{ب} ۹ رہجری میں تیس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ نبی اکرم قیصر روم کے مقابلے کے لیے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اعلان عام کے باوجود کچھ صحابہ کرام عذر معقول کی بنا پر جہاد کے لیے نہ نکلے اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہ گئے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

''مدینہ منورہ میں کچھ لوگ رہ گئے جو اس سفر کے تمام اعمال میں بہ لحاظ ثواب ہمارے شریک ہیں، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ثواب میں کیسے شریک ہوں گے؟ حالاں کہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں، فرمایا: کچھ مجبوریاں تھیں جنھوں نے ہمارے ساتھ نہ آنے دیا، مگر صدق نیت کی بنا پر ثواب میں شریک ہوں گے۔ (بشیر القاری۔ص:۵۷)

جہاد کی راہ میں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا، گھر بار و اہل و عیال کو چھوڑ کر اعدائے

دین کے مقابلہ کے لیے جانا بڑی ہمت کا کام ہے، اس میں جواں مردی و بہادری سے اعلاے کلمۃ الحق کی خاطر کبھی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے، بھوکا پیاسا رہنا پڑتا ہے، یہ سب اعمال خیر مجاہدین اسلام جذبہ شوق شہادت سے سرشار ہوکر انجام دیتے ہیں، اس لئے خدائے رحیم وکریم ان کو اپنی رحمت بے پایاں سے اجر وثواب سے سربلند فرماتا ہے، لیکن وہ مسلمان جو اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور جہاد کے اعمال حسنہ میں شرکت نہ کریں وہ بھی مجاہدین اسلام کے مساوی اجر وثواب کے حقدار ہیں، عقلاً سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، یہی وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ تبوک میں نہ شریک ہونے والوں کو شریک ہونے والوں کے برابر ثواب کی خوشخبری سنائی تو صحابہ کرام جو آپ کے ہمراہ تھے حیرت واستعجاب میں پڑ گئے اور انہوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھروں میں بیٹھنے والے لوگ ثواب میں ہمارے برابر ہو گئے؟ جواب میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کچھ مجبوریاں تھیں جن کی بنا پر وہ ہمارے ساتھ سفر میں نہ آسکے وہ اپنی صدق نیت کے فوائد حاصل کریں گے۔

اس واقعہ کو بطور مثال پیش کر کے حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس دعویٰ کو مدلل ومبرہن کیا کہ انسان کو حسن نیت کا اجر ضرور ملتا ہے اگرچہ اس کے مطابق عمل صالح کا ظہور نہ ہو۔

{ج} حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے خوشبو کا استعمال نیت صادقہ سے کیا تو روز قیامت اس کی خوشبو مشک سے بہتر ہوگی اور جس نے نیت فاسدہ سے خوشبو کا استعمال کیا تو قیامت کے دن اس کی بدبو مردار سے بدتر ہوگی۔

ایک شخص نے خوشبو کا استعمال نماز پنجگانہ، نماز عیدین وجمعہ کی ادائیگی کی نیت سے کیا تو اس کی خوشبو اس دنیا میں دل ودماغ کو معطر رکھتی ہے اور اس کو سرور وانبساط محسوس ہوتا ہے اور آخرت میں اس کے حسن نیت کی بنا پر یہ خوشبو دوبالا ہوکر مشک کی خوشبو سے بہتر ہوگی، اسی طرح اگر کسی شخص نے بری نیت سے خوشبو کا استعمال کیا، مثلاً اپنے جنسی ذوق کی تسکین کے ارادے سے کیا اور اس کے پیش نظر یہ رہا کہ اپنی دلفریبی ومحبوبیت بڑھا کر محرمات شرعیہ کو

اپنی طرف مائل کرے گا تو اس دنیا میں اس نے اپنی خوشبو سے اپنے لباس کو ضرور معطر کرلیا اور اس سے یک گونہ سرور وراحت محسوس کی لیکن آخرت میں برے ارادے سے یہ خوشبو مردار کی بدبو سے بدتر ہوجائے گی جس سے وہ عذاب الیم میں گرفتار ہوجائے گا۔

ملاحظہ فرمایئے دو آدمیوں نے خوشبو استعمال کی، ایک نے حسن نیت اور اچھے ارادے سے، دوسرے نے بری نیت اور ذوق لطیف کو محض تسکین دینے کے لئے استعمال کیا ، دونوں کا عمل یکساں ہے مگر تفاوت نیت کے باعث قیامت میں ایک شخص اپنی ابدی حیات میں مسرور وشاداں رہے گا دوسرا شخص مردار سے بدتر بدبو سے گرفتار آلام ہوگا۔

اس حدیث پاک سے حضرت صدرالعلما رحمۃ اللہ علیہ نے بہت اچھی طرح حسن نیت کے فوائد وثمرات کیا مرتب ہوتے ہیں واضح کردیا، اور بری نیت اور فاسد ارادے کے کیا نقصانات اور کیا مضرتیں پہنچتی ہیں اس کے بیان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھا ، یہ سب حدیثیں ''**انما الاعمال بالنیات** '' والی حدیث کی بہترین شرح ہیں ،جس طرح سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے اسی طرح یہ بھی کہنا صحیح ہوگا کہ بعض احادیث مجمل حدیثوں کے ابہام واجمال کو دور کرتی ہیں، ان کی ایسی وضاحت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ ابہام کے پردہ میں چھپا نہیں رہتا ہے، غالباً اسی امر کی طرف ہمارے ممدوح مکرم نے ارباب علم کو مائل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اس میں اتنے کامیاب ہوئے کہ زبان قلم کو یارائے سخن نہیں کہ وہ اس کو مکمل طور سے بیان کرسکے۔

عالمانہ اسلوب بیان کی ایک جھلک:

اس حدیث پاک پر فیض الباری کے مصنف نے کمال علمی اور اپنی خودی کے اظہار کے لئے متکبرانہ انداز بیان میں بحث کرتے ہوئے ایسی فحش غلطی کرڈالی جو سراسر ضلالت و گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے، وہ بڑے طنطنہ کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ثم ما المراد بقوله ما نوی؟ هل المراد منه الغاية والثمرة او عين ما نوی؟ والا ظهر عندی هوالثانی فكل يجدفی آخرته عين عمله اوعين

ماينويه في دنياه'' (بشیر القاری: ۳۲)

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی (**مانوی**) سے کیا مراد ہے، کیا اس سے مراد غایت وثمرہ ہے؟ یا جس کی اس نے نیت کی؟ میرے نزدیک زیادہ ظاہر ثانی ہے، چنانچہ ہر شخص آخرت میں عین عمل پائے گا یا وہ چیز جس کی نیت دنیا میں کرتا رہا اس کا عین پائے گا۔

فیض الباری کے مصنف کو اپنی حدیث دانی پر فخر غرور نفس کی حد تک ہے، وہ خود فریبی کی مہلک بیماری میں مبتلا رہ کر اپنی بدذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ولهذه الدقيقة وردالجزاء بعين الفاظ الشرط والناس لمالم ينتقل اذهانهم اليه شمروا للجواب عن اتحاد الشرط والجزاء مع ان فی الحديث اذ انا من الله ورسوله الى من هاجر اليهما فی الدنيا انه يجد هجرته تلك بعينها في الآخرة و من هاجر الى دنيا او امراة لا يجدها الا تلك'' (ایضا)

اس باریک بات کی وجہ سے شرط کے الفاظ عین جزا ہیں اور لوگوں کا ذہن جب اس کی طرف منتقل نہیں ہوا تو انہوں نے شرط و جزا کے اتحاد کے جواب کے لیے بڑی جدوجہد کی حالاں کہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے حدیث میں اعلان ہے کہ جس نے اللہ اس کے رسول کی طرف دنیا میں ہجرت کی تو آخرت میں بعینہ اسی کو پائے گا، اور جس نے دنیا یا عورت کی طرف ہجرت کی تو وہ اسی کو پائے گا۔

اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کے لئے ہجرت ایک کارِثواب ہے، اس ہجرت کو آخرت میں پائے گا مصنف کے نزدیک اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کام کے اجر و ثواب کا حقدار ہوگا، وہ اس کی دلیل میں قرآن شریف کی آیت کریمہ کا ایک فقرہ پیش کرتے ہیں ''**ووجدوا ماعملوا حاضرا (الكهف:49)**'' لوگ اپنے اعمال کو حاضر پائیں گے، ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو انہوں نے کار خیر انجام دیئے اس کو اپنے روبرو حاضر پائیں گے، پھر نکتہ آفرینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسی حقیقت ہے کہ جس سے لوگ غافل ہو گئے اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس دار فانی میں اعمال ہیں اور آخرت میں اس کے

نتائج وثمرات، یہ ان کی غلط فہمی ہے جس کی وجہ سے مسئلہ تقدیر دشوار ہو گیا اور لوگوں کے سمجھ میں نہ آیا کہ جب اعمال اللہ کے قدرت دینے اور اس کی تقدیر سے وجود میں آتے ہیں، تو ان کے اوپر جزا کا مرتب ہونا ظاہر نہیں ہے۔

اس بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ دیوبند کے مولانا اس گمان فاسد میں مبتلا ہیں کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے وہی درست ہے اور متقدمین سے لے کر متاخرین تک جتنے شراح حدیث گزرے ہیں اس اہم نکتہ تک ان کی رسائی نہ ہو پائی، اس لیے طرح طرح کی تاویلوں اور توضیحوں کی وادی میں سرگشتہ پھرتے رہے، تاہم ان بیچاروں نے مسئلہ تقدیر کی گتھیوں کے سلجھانے میں اپنی ناکامی کا ثبوت دیا، اور ان پر یہ راز کھل نہ سکا کہ جب اللہ کی قدرت دینے اور اس کے مقدر کرنے سے اعمال ظاہر ہوتے ہیں تو ان پر سزا یا جزا کے کیا معنی ہیں اور میں نے اس کا حل پیش کر دیا۔

اس حدیث کے بارے میں اگر ان کی خامہ فرسائی کو ذہن میں رکھا جائے یا اس کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل امور ہمارے سامنے آتے ہیں، (الف) انسان دنیا میں جو کچھ کرے گا وہی اس کو آخرت میں ملے گا، اگر نیک کام کیا تو نیک کام ملے گا، برے کام کیے ہیں تو وہی برا کام ملے گا، یعنی اعمال کا بدلہ وصلہ وسزا نہیں ملے گی بلکہ نماز ملے گی، چوری ملے گی (ب) فیض الباری کے مصنف کے نزدیک یہ اتنی باریک بات ہے کہ علمائے اسلام اس کو نہ سمجھ سکے (ج) اور اس کے فہم سے قاصر رہنے کی وجہ سے علما اور محققین مسئلہ تقدیر میں الجھ گئے اور اس کا کوئی معقول حل نہ پیش کر سکے۔

حضرت علامہ صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہفوات واباطیل کا جواب اپنے عالمانہ اسلوب بیان سے دیا ہے، پہلے انہوں نے فیض الباری کے مصنف کی سوء فہمی اور ان کی بدذوقی کو اجاگر ایک حسین تمثیل کے ذریعہ کیا ہے، وہ رقم طراز ہیں کہ:

"فمثله كمثل الصفراوى وجد السكر مرا بفساد الذائقة فجعل يقول ان السكر مر فى نفس الامر وهذه حقيقة غفل عنها الناس الى الآن ولم يلتفت

الی فسادذوقه"{بشیرالقاری،ص:۳۳}

چنانچہ اس کی حالت تپ میں مبتلا آدمی کی طرح ہے جس نے شکر کو ذوق کے خراب ہونے کی وجہ سے تلخ محسوس کیا، پھر وہ کہنے لگا کہ واقعی شکر کڑوا ہوتا ہے، اس حقیقت سے لوگ اب تک غافل رہے اور اس نے یہ توجہ نہ کی کہ اس کا ذائقہ خراب ہے۔

حضرت صدرالعلما رحمۃ اللہ علیہ نے فیض الباری کے مصنف کا ردبلیغ فرمایا، آپ نے فرمایا کہ پہلی بات یہ ہے کہ ارشاد ربانی "**ووجدواماعملوا حاضراً**" کو عین اعمال کے وجدان پر جو دلیل پیش کی گئی ہے، وہ تفسیر کی طرف نہ رجوع کرنے اور غلط فہمی پر مبنی ہے، اس لئے کہ مراد وجدان عمل سے یہ ہے کہ نامہائے اعمال میں وہ لکھے رہیں گے، جن کو ان کے روبرو پیش کیا جائے گا، یا مراد اعمال کا بدلہ وجزا ہے، قاضی بیضاوی نے فرمایا "**مکتوبافی الصحف**" یعنی لوگ اپنے اعمال کو نامہائے اعمال میں لکھا ہوا پائیں گے، اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا کہ جو کچھ اس نے نہیں کیا ہے اس کو بھی لکھ دے یا اس کے عمل کی سزا میں زیادتی کر دے۔

اس تفسیر کو تفسیر ابوسعود میں بھی ذکر کیا گیا ہے، اور مولوی بدرعالم نے جو بکواس کی ہے مفسرین کرام میں سے شاید ہی کوئی اس کی طرف گیا ہو اور کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اساطین اسلام صاحبان عقل و دانش تھے اور یہ ایک قسم کا جنون ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر فیض الباری کے مؤلف کے قول کو تسلیم کرلیا جائے کہ اللہ اور رسول کی خوشنودی کی خاطر ہجرت کرنا اور اس پر آخرت میں عین ہجرت کا پانا مراد ہے تو اس دعویٰ پر دلیل "**ووجدواماعملواحاضراً**" کو پیش کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ **ماعملوا** (جو کچھ عمل کیا) سے مراد سیئات ہیں، اس لیے کہ آیت کریمہ کافروں اور مجرموں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ارشاد فرمایا گیا "**وضع الکتاب فتریٰ المجرمین مشفقین ممافیه**، الخ" پھر آیت کے آخر میں فرمایا گیا "**ووجدواماعملواحاضراً**" اس سے واضح ہوا کہ "**ماعملوا**" سے مراد سیئات ہیں، اس لیے اس آیت سے عین ہجرت

کے پالینے پر دلیل پیش کرنا درست نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عین اعمال کا آخرت میں پالینے کا کیا مفہوم ہے؟ کاش کہ سمجھ میں آنے والی بات ہوتی، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں وہ شخص نماز پڑھے گا جس نے دنیا میں نماز پڑھی، کیا وہ شخص زکوۃ دے گا جس نے دنیا میں زکوۃ ادا کی، اور روزہ رکھے گا جس نے دنیا میں روزہ رکھا، اور حج کرے گا جس نے یہاں حج کیا، اور عمرہ کرے گا جس نے یہاں عمرہ کیا، اسی طرح تمام حسنات کے بارے میں کہا جائے گا۔

اور کیا آخرت میں جھوٹ بولے گا جس نے دنیا میں جھوٹ بولا تھا، اور دنیا میں شراب پینے والا آخرت میں شراب پیے گا، دنیا میں بدکاری کرنے والا آخرت میں بدکاری کرے گا، جس نے دنیا میں چوری کی تھی وہ آخرت میں چوری کرے گا اور جس نے یہاں جوا کھیلا تھا وہاں بھی جوا کھیلے گا، ایسے ہی تمام سیئات کے بارے میں کہا جائے گا، اس صورت میں تو دار آخرت دار تکلیف وعصیان میں بدل جائے گا، اہل علم میں سے کوئی شخص اس نظریہ کا قائل نہیں ہے۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال مختلف شکلوں اور صورتوں میں بدل جائیں گے، نیکی کی شکل کچھ ہوگی، بدی کی صورت کچھ، اس بارے میں حدیث وارد ہوئی ہے، اور یہ اس لیے ہوگا کہ اعمال اعراض ہیں، جواہر نہیں، تو قیامت تک وہ باقی نہیں رہ سکتے، بلکہ ایک آن میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے آن میں فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں، یہی مسلک متکلمین کا ہے، جب یہ مطلب مراد لیا جائے تو عین ہونا باقی نہ رہے گا، جو مولانا بدر عالم کے افتخار کا دارومدار ہے، اور جس سے بڑے بڑے علما کی بارگاہ میں عیب جوئی کا جذبہ پیدا ہوا (**معاذ اللہ**) کہ میں نے ایک اہم نکتہ پیش کیا جہاں تک علمائے اسلام کے ذہنوں کی رسائی نہ ہو پائی۔

آفتاب ہند حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ نے فیض الباری کے مصنف کی گھیرا بندی اور ان کا چاروں طرف سے محاصرہ عالمانہ انداز میں اس طرح کیا کہ ان کے بچ نکلنے کی یا راہ فرار اختیار کرنے کی کوئی تدبیر نہ رہ گئی، علاوہ اس کے مؤلف مذکور نے ٹوٹی، پھوٹی یا ناقص عربی زبان استعمال کی تھی، لیکن ہمارے علامہ نے ان کے بالمقابل فصیح عربی زبان

استعمال کی اور متاخرین کا وہ طرز بیان اپنایا جس میں علمی استدلال کا پہلو نمایاں ہے کہ بحث کے جتنے گوشے ہوں یا جتنے احتمال ممکن ہوں سب کا حق ادا کیا جائے، اور کوئی ایسا پہلو نہ چھوڑا جائے جس میں قارئین کو اپنی تشنہ لبی کا احساس پیدا ہو، یہ علماے متاخرین کی خصوصیت تھی، عہد جدید میں تقریباً یہ مفقود ہو چکی ہے، اس سے حضرت صدر العلما رحمۃ اللہ علیہ ''آفتاب ہند'' کے اسلوب بیان کی ایک جھلک آپ دیکھ سکتے ہیں، ساتھ ہی ان کے علمی مقام کا ایک پیکر جمیل یا حسین مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے کہ جدھر دیکھو علم کا دریا بہہ رہا ہے اور اس کا سیلاب کسی طرح رکنے کا نام نہیں لیتا اور اس کا بہاؤ تھم نہیں سکتا جب تک کی گنگا و جمنا کی روانی باقی ہے۔

حضرت صوفی نظام الدین صاحب (علیہ الرحمہ) کے اوصافِ جمیلہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن وُدّاً (مریم:۹۶)

حضرت مولانا صوفی نظام الدین صاحب اپنی طبعی فروتنی و انکساری کی بنا پر پہلے بخاری شریف کا درس دینے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہوئے تھے، جب کہ دارالعلوم تنویر الاسلام امرڈوبھا بستی کے اراکین کی خواہش و تمنا یہ تھی کہ اس عظیم ادارہ میں قرآن حکیم کے بعد اصح الکتب صحیح البخاری کی تعلیم ہو، اس لئے ناظم اعلیٰ محترم جناب سیٹھ محمد حسن صاحب مرحوم نے مرشد برحق، اُستاذ العلما، حافظ ملت **نور اللہ مرقدہٗ** کی خدمت عالیہ میں ایک نیازمندانہ بلکہ عقیدت و نیاز سے لبریز ایک عریضہ ارسال کیا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

> ''حضور! ہم نیازمندوں کے اوپر کرم فرما کر ایک ایسے عالم دین کا انتظام فرمائیں کہ وہ یہاں تشریف لاکر بخاری شریف کا درس دیں، ایسے شیخ الحدیث صاحب کی تمام ممکنہ خدمات انجام دینے کے لئے ہم عقیدت مند آمادہ ہیں، جو کچھ حضور فرمائیں گے اس پر ہم لوگ عمل کریں گے''۔

جب یہ مکتوب حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں پہنچا تو آپ نے فوری طور پر راقم الحروف یعنی مقالہ نگار عبداللہ خان عزیزی کو ادارہ تنویر الاسلام بخاری شریف کا درس دینے کے لیے حکم صادر فرمایا کہ یہاں سے بلا کسی تاخیر کے آپ امرڈوبھا بستی جائیں، اور اپنے دست مبارک سے ایک نامۂ مبارک بھی لکھا، جس کو لے کر میں امرڈوبھا پہنچ گیا، میری آمد کی اطلاع جیسے ہی سیٹھ محمد حسن صاحب کو ہوئی وہ پہلی فرصت میں میرے پاس تشریف لائے اور

نہایت مسرت وشادمانی بلکہ حضور حافظ ملت کے ساتھ انتہائی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ حافظ ملت مجھ کو بہت نوازتے ہیں، اس لئے مجھ کو یقین کامل تھا کہ کسی نہ کسی شیخ الحدیث کا وہ انتظام ضرور فرمائیں گے، آپ کی تشریف آوری کی خبر سے نہ صرف ارکان ادارہ بلکہ سنی عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور ہم لوگوں کی دیرینہ آرزو وتمنا پوری ہوگئی، کتنی خوشی ہوئی اس کے اظہار و بیان کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، میں بہت جلد کمیٹی طلب کروں گا تاکہ ارکان ادارہ سے آپ کا تعارف باضابطہ طور سے ہوجائے، اس کمیٹی میں سر برآوردہ و دیندار لوگوں کے علاوہ تمام مدرسین وملازمین بھی شریک ہوں گے، چنانچہ کمیٹی ہنگامی طور سے طلب کی گئی، علمائے کرام واساتذۂ ذوی الاحترام اور قصبہ کے سنی عوام اس خصوصی اجتماع میں شریک ہوئے، میں بھی حضرت مولانا صوفی نظام الدین **زیدہ مجدہ** کے ہمراہ مجبوراً کمیٹی میں حاضر ہوا، کمیٹی کیا تھی خوشی ومسرت کے اظہار کے لئے پر ہجوم اجتماع تھا، سب لوگ ایک دوسرے کو بڑی مسرت سے دیکھ رہے تھے، اس تعارفی اجتماع میں کیا کیا باتیں ہوئیں وہ سب میرے ذہن کے نہاں خانہ میں محفوظ نہیں ہے، لیکن ایک بات یاد رکھنے کے لائق تھی، ذہن میں وہ اس قدر پیوست ہوگئی کہ اس کو اب تک فراموش نہیں کرسکا، گویا وہ نقش کالحجر ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت مولانا صوفی نظام الدین صاحب کمیٹی میں شروع سے آخر تک سر جھکائے ہوئے بیٹھے رہے، گویا وہ اپنے آپ کو ہر قسم کی سخن آرائی سے بڑی بے نیازی کے ساتھ محفوظ رکھے ہوئے تھے، وہ سب کے مسرت آمیز مکالمہ وگفتگو سے ضرور محظوظ ہو رہے تھے، کیوں کہ ان کے چہرے سے خشکی ویبوست کے بجائے بشاشت کے آثار نمایاں تھے، مسرت کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی تھیں، لیکن اپنی طرف سے کچھ بھی ارشاد نہیں فرمارہے تھے، مکمل ساکت وخاموش کو دیکھ کر میں نے حضرت موصوف سے مخاطب ہوکر عرض کیا کہ: جناب صوفی صاحب! آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیں، آپ کی زبان صداقت بیان سے کچھ سننے کی خواہش رکھتا ہوں، اس پر انہوں نے اپنی خاموشی توڑ دی اور میری طرف مخاطب ہوکر بڑی سنجیدگی سے ایسے جملے ارشاد فرمائے کہ میں ان کی سماعت سے دنگ رہ گیا، میری حیرانی حد سے زیادہ فزوں ہوگئی، انہوں نے فرمایا کہ دیکھیے مولانا! ابھی آپ نئے نئے تشریف لائے

ہیں، مکمل طور سے آپ کو میرے بارے میں واقفیت نہیں ہوگی، اس لیے آپ نے مجھ کو مخاطب فرما کر صوفی صاحب کہا، یقین کامل رکھتا ہوں کہ میں صوفی نہیں ہوں، اور آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ میرے بارے میں آئندہ یہ لفظ استعمال کرنے سے قطعاً احتراز کریں، آپ کا بڑا اکرم ہوگا۔

پھر جتنے دنوں تک میرا قیام امرڈوبھا میں رہا حضرت مولانا ممدوح کی ہدایت وتنبیہ پر ان کو مخاطب بنا کر صوفی صاحب کا لفظ استعمال نہیں کیا، حالاں کہ غائبانہ طور سے میں ان کو صوفی صاحب سمجھتا تھا، اور کہتا تھا، لیکن اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد جب اولیا کانفرنس ہو رہی ہے، جس میں علما و مشائخ کے علاوہ سربرآوردہ شخصیتیں تشریف لا رہی ہیں، میرے ذہن میں یہ بار بار خیال آ رہا ہے کہ صوفی صاحب کی مناسبت سے ہو رہی ہے، تو اس کی عقلی توجیہ کیا ہے کہ مولانا موصوف نے نہایت سختی کے ساتھ مجھ کو صوفی کا لفظ اپنے بارے میں استعمال کرنے سے منع فرما دیا تھا، عقلاً اس کی متعدد ومختلف توجیہیں ہو سکتی ہیں، لیکن میں ان سب سے صرف نظر کر کے برملا یہ ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کچھ اوصاف و خصوصیات ان کی ذات بابرکات میں ایسے موجود ہیں جن کی بنا پر ان کو صوفی صاحب کہنا میرے اپنے خیال میں ان کی شخصیت کو خوب خوب اجاگر کرنا ہے، وہ یہ ہیں:

(اولاً) حضرت مولانا موصوف کی رفاقت ومصاحبت کا مجھ کو کچھ دنوں تک شرف حاصل رہا، وہ خاموش طبیعت کے انسان ہیں، اور کاروبار دنیا اور اس کے مشاغل سے دور رہنے کے عادی نظر آئے، اس وقت متکلم شیریں کلام ہوتے ہیں جب کوئی شخص ان سے گفتگو کرنے کے لیے اصرار کرے، ورنہ ان کی زبان مبارک پر سکوت طاری رہتا ہے، یہ ایک ایسا وصف خصوصی ہے، جو ان کی ذات کو دوسروں سے ممتاز کر کے صوفیاے کرام کے گروہ میں ان کو داخل کر دیتا ہے۔

(ثانیاً) وہ دین و دیانت کے پابند ہیں، وہ اپنی زبان سے بڑے سے بڑے مخالف ومعاند کے لیے بھی نازیبا لفظ استعمال کرنا گوارہ نہیں کرتے، وہ اس مجلس سے گھبراتے

ہیں، جس میں لوگ غائبانہ طور سے ہجو و مذمت کسی دوسرے کی کرتے ہیں، بلکہ نپے تلے الفاظ میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں اور اگر صوفیاے کرام کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ یقین کامل پیدا ہوگا کہ وہ ہرزہ سرائی، لایعنی بات چیت، غیبت وحسد، حرص وطمع جیسے اوصاف ذمیمہ سے پاک ہوتے ہیں، ہمارے ممدوح مکرم بھی ان خصائل مذمومہ سے بالکل عاری ہیں، وہ اپنی زبان مبارک کو دوسرے لوگوں کے متعلق حاسدانہ جذبہ کے اظہار کے لئے استعمال نہیں کرتے، اور غیبت سے آلودہ کرنے سے بھی پاک وصاف رکھتے ہیں، اس لئے میرے نزدیک اس خصوصیت کی وجہ سے بھی صوفی کا لفظ ان کی ذات پر زیادہ موزوں و چسپاں ہے۔

(ثالثاً) وہ ایک عالم دین، بڑے اچھے واعظ ومقرر ہیں، اپنے وعظ وتقریر میں قرآن وحدیث سے اپنے مطالب عالیہ یا موضوع سخن کو خوب خوب مدلل ومبرہن کرتے ہیں، جب وہ کسی موضوع پر اپنے واعظانہ انداز سے بحث کا آغاز کرتے ہیں، تو وہ اپنی بحث میں منفرد نظر آتے ہیں، قرآن شریف کی آیات کو پیش کرتے وقت حوالہ ضرور دیتے ہیں، اور حوالے میں پارہ، سورہ، رکوع سب کچھ بیان کردیتے ہیں، اسی طرح مسلم، بخاری شریف کی حدیث پیش کرتے ہیں تو پارہ، باب، حدیث نمبر، صفحہ نمبر بیان کرتے چلے جاتے ہیں، مجھ کو پورے ہندوستان میں ایسا خطیب وواعظ نہیں ملا جو ان کی دشوار گزار راہ پر چل کر کامیاب رہا ہو، اور اپنے موضوع کلام کو تفصیلی حوالوں سے مزین وآراستہ کرتا ہو، لیکن ہمارے ممدوح مکرم کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی پوری تقریر وبیان میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتے جس میں کسی قسم کا استہزا ہو یا تمسخر ہو یا علمی معیار سے گرا ہوا ہو، یا بذلہ سنجی سے ہنسا کر تمام مجمع کو لالہ زار بناتے ہوں، یا اپنے اوپر مصنوعی رقت طاری کر کے رلانے کا انداز اختیار کرتے ہوں، بلکہ وہ نہایت سنجیدگی ومتانت، وقار وتمکنت کے ساتھ ساتھ اپنا وعظ وبیان سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں، ان کے اس انداز تقریر سے بھی صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے، گو کہ عالمانہ شان نمایاں رہتی ہے، تاہم تصوف کی رنگینی بھی جلوہ بار ہوتی ہے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر اگر صوفی مولانا نظام الدین صاحب کو صوفی نہ کہا جائے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو کیا کہا جائے؟ کیا صرف پیر طریقت کہنے پر اکتفا کیا جائے؟ یا محض مفتی، عالم دین کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جائے؟ یہ سب کچھ اگر کہا جائے تو طبیعت کو سکون نہیں ملے گا، کیوں کہ سچائی و صداقت کی فطرت یہ ہے کہ جب تک اس کو نہ بولا جائے دل کو قرار و سکون حاصل نہیں ہوتا، اس لیے میرے اپنے خیال کے اعتبار سے جب مسلمانوں کی زبان پر بلکہ دین داروں کی زبانوں پر ان کے لیے یہ لفظ جاری و ساری ہے، تو مولانا ممدوح اب اگر بطور تواضع و فروتنی اپنی ذات بابرکات پر تقوی و احتیاط کی وجہ سے اس لفظ کے استعمال کو مستحسن نہ سمجھتے ہوں، تو یہ ان کی بڑائی اور نیکی ہے، لیکن انسانوں کی زبانوں پر پابندی لگانا نہایت دشوار کام ہے، اب تو مولانا موصوف کو جبراً وقہراً صوفی کا لفظ گوارا کرنا ہی پڑے گا، کیوں کہ ان کی ہر ادا سے اس پاک باز گروہ کے اطوار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، جن کو صوفیاے کرام کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے ارادت مندوں کا گروہ بھی ہندوستان کے طول و عرض کے مختلف طبقوں اور شہروں میں پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے، قلوب انسانی ان کے لئے مسخر ہو رہے ہیں، دلوں کا یہ جھکاؤ صرف اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملت اسلامیہ کے افراد میں وہ مقبول و محبوب ہیں، بلکہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ ان کی مقبولیت بارگاہ خداوندی میں بھی ہے، اور خدا کی بارگاہ میں وہی بندہ مقبول و محبوب ہوتا ہے جو ایمان کامل اور یقین کے ساتھ عمل کی راہوں میں تیز گام ہوتا ہے، چنانچہ خداے تعالیٰ قران حکیم میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

”ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا“۔

بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور اچھے اعمال بجا لائے، ان کے لیے رحمن محبت پیدا فرمادے گا۔

یعنی خداے تعالیٰ اپنا محبوب بندہ بنا کر بندوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دے گا، مشہور تابعی حضرت ربیع اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: **”یحبھم**

ویحببهم ''یعنی اللہ ان سے محبت کرے گا، اور ان کو لوگوں کا محبوب بنا دے گا، اس آیت کریمہ کی تفسیر صرف آثار سلف سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کی تفسیر حدیث پاک میں بھی آئی ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''**يعطيٰ المؤمن محبة في قلوب الابرار ومهابة في قلوب الفجار**''۔

اللہ تبارک وتعالی ایسے مومن کی وارفتگی نیکوں کے دلوں میں عطا فرماتا ہے، اور برے لوگوں کے دلوں میں ان کی ہیبت وجلال پیدا فرما دیتا ہے۔

بہت سے انسانوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اغراض ومقاصد کے تحت ان کی محبت کچھ لوگوں کے دلوں میں جاے گیر ہوتی ہے، مگر دنیوی جاہ وجلال، کروفر، شان وشکوہ کے بغیر بہت کم ایسا دیکھا جاتا ہے کہ مومن کی ہیبت کفار ومشرکین کے علاوہ بدکاروں وسیاہ کاروں کے دلوں میں بھی پائی جاتی ہو، البتہ جو حضرات اپنی پوری زندگی شریعت کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، ان کی ہیبت دلوں کے اندر پیدا ہوتی ہے، اگر مجھ کو اپنے موضوع سخن سے دور چلے جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس بارے میں بہت سے واقعات پیش کرکے اپنے دعوے پر ثبوت فراہم کرتا، اس لیے اس حدیث پاک کی صداقت سے انکار محض تعنت ومجادلہ ہے۔

''**ما اقبل عبدبقلبه الى الله الا اقبل الله بقلوب المومنين اليه**''۔(تفسیر طبری، ج ۱۸، ص: ۲۶۲)

کوئی بندہ اللہ کی طرف اپنا رخ نہیں کرتا، مگر خداے پاک اپنے نیک بندوں کے دلوں کو اس کی طرف پھیر دیتا ہے۔

ان آثار واحادیث کی روشنی میں میں استدلال کرسکتا ہوں کہ حضرت مولانا صوفی نظام الدین صاحب کی طرف مومن بندوں کے دلوں کا جو جھکاؤ ورجحان ہے، اور ان کے ساتھ جو گہری عقیدت ونیازمندی ہے، وہ اس دعویٰ کی واضح دلیل ہے کہ یہ بارگاہ الٰہی کے مقبول بندے ہیں۔

حضرت کعب **رضی اللہ تعالی عنہ** سے نیک بندوں کی ثناے جمیل کے بارے

میں یہ مروی ہے کہ:

”واللہ مااستقرلعبد ثناءفي الارض حتیٰ یستقرله ثناءه في السماء“۔

کسی نیک بندے کا تذکرۂ جمیل روے زمین پر برقرار نہیں ہوتا، یہاں تک کہ آسمان میں اس کی تعریف وثنا قائم ہو۔

میں اپنی حقیقت پسند نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ حضرت مولانا صوفی نظام الدین صاحب کی ثناے جمیل چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اور جتنے عقیدت مندو نیازمند ہیں اپنی پیشانی ان کی بارگاہ میں جھکائے ہوئے ہیں، اور ہرطرف صوفی صاحب، صوفی صاحب کی صداے دلنواز بلند ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس زمین کی حد بندیوں کو تجاوز کر کے ملاءاعلیٰ میں یعنی فرشتوں کے مقدس گروہ میں ان کے اوصاف جمیلہ کے بارے میں نغمہ سرائی وزمزمہ سنجی جاری ہے۔

میں اس موقعہ پر اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ بعض ذہنوں میں یہ آتا ہے کہ کسی نیک آدمی کی نیکی و پارسائی یا کسی صوفئ باصفا کی طہارت باطنی کے ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے خوارق عادت کا ظہور ہوا ہو، اور اس کی کرامتیں محسوس طور سے دیکھی جائیں، بلکہ بعض سمجھ دار اس سلسلہ میں اپنی حدوں سے آگے بڑھ کر کرامتوں کی ایک مکمل داستان تصنیف کر لیتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ بزرگی وولایت کو اس کے بغیر تسلیم نہیں کیا جاسکتا، اور اگر چہ ہمارے متکلمین نے **کرامات الاولیاء حق** کے عقیدے پر عمدہ بحثیں کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر اللہ کے نیک بندوں سے محیر العقول واقعات کا ظہور ہوا اور ان کی طرف سے خوارق عادات کا صدور ہو نیز اس کی سچی شہادت مل جائے تو محض اس کے لیے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عالم مادی اور کائنات میں علت ومعلول کا سلسلہ جاری ہے، سبب کے بغیر مسبب کا وجود نہیں ہوتا، علت کے بغیر معلول نہیں پایا جاسکتا، بلاشبہ ہمارے متکلمین کی یہ علمی کاوشیں مومن کے دل میں ایمان وایقان کی شمعیں روشن کرتی

ہیں، آگاہی حق اور حقیقت شناسی میں بڑی مدد ملتی ہے، تاہم قرآن مجید کی روشنی میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کسی نیک بندہ کے نیکی کا پیمانہ اور اس کی عظمت و بڑائی کا معیار مادی کرامتوں پر محدود قرار دینا حد سے زیادہ تجاوز کرنا ہے، قرآن حکیم نے حضرات انبیائے کرام **علیھم السلام** کو مخاطب کر کے سچائی اور صداقت کا جو پیغام بنی نوع انسان کو دیا ہے، اس میں ارشاد فرمایا گیا:

"یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا انی بما تعملون علیم"۔ **(مومنون:۵۱)**

اے پیغمبرو! (**علیھم السلام**) پاک چیزوں سے کھاؤ، اور نیک کام کرو جو کچھ تم عمل کرو گے، بے شک اس کو جان رہا ہوں۔

حضرات انبیائے کرام **علیھم السلام** کو ان کے عہدوں وزمانوں میں بنیادی عقائد کے علاوہ جو پیغام حق دیا گیا وہ یہ ہے کہ پاک اور جائز چیزوں کو کھاؤ، اور نیکی کی راہ میں گامزن رہو، اور صرف طیب اور جائز چیز کا کھانا نیکی کی راہ میں رواں دواں رہنا کسی ایک ہی پیغمبر کے لیے یہ حکم نہیں تھا، اور کسی ایک شریعت کے ساتھ یہ مختص نہیں تھا، بلکہ وہ جامع حکم ہے جو جملہ انبیا ورسل کو دیا گیا، اس لئے جو اللہ کا نیک بندہ حلال اور پاک روزی کھاتا اور نیک کاموں کو بجالاتا ہے، اور دنیا کے مزخرفات اور اس کی ظاہری آرائشوں سے دور رہ کر حرص وطمع، مادی منفعت سے اپنے کو علاحدہ کر کے انابت الی اللہ کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے، درحقیقت وہی نیک بندہ خدا کا دوست ہے، اور اس کا ولی ہے، خواہ اس کو صوفی کے لفظ سے تعبیر کیا جائے یا قطب وابدال کے الفاظ سے اس کی شخصیت کو اجاگر کیا جائے، اس کی کرامت وولایت میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا، میں اپنے علم کی رو سے اس حقیقت کے بیان کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ حضرت مولانا صوفی نظام الدین صاحب محض صوفی نہیں ہیں، بلکہ ایک عالم دین بھی ہیں، اور ایسے عالم باعمل ہیں جن کی اہم خصوصیت دنیا کے آرائش و جمال سے بیزار رہنے کی ہے، وہ ہمیشہ تقوی وطہارت، پرہیزگاری و دیانت کی

راہوں پر چلنے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں، اور جملہ اوصاف ذمیمہ، حسد، کینہ، بغض، عناد، بخل وغیرہ سے پاک وصاف رہتے ہیں، ان کی یہی سب سے بڑی عظمت اور سب سے بڑی کرامت بھی ہے کہ وہ خصائص محمودہ، اوصاف جمیلہ سے متصف ہیں، اس سے بڑھ کر کوئی دوسری کرامت نہیں ہوسکتی، ان کی عظمت و بلندی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ عظیم الشان معیار ہے، یہی وہ کسوٹی ہے جو کسی انسان کی عظمت کو پرکھنے کے لیے بہت کافی ہے، اس کے بعد دوسرے امور کی طرف نگاہ دوڑانے کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ مولائے کریم! محترم صوفی صاحب **مد فیضہ** کے حسنات سے اُمت مسلمہ کو خوب خوب مستفیض فرمائے، **آمین یارب العالمین**۔

قائد اہلِ سنت اپنے کردار و عمل کے آئینے میں

۞۞

فیصلۂ قدرتِ الٰہی:

عزیز سعید مولانا معین الحق سلمہ ربہ سے ۹ دسمبر ۲۰۰۳ء میں ممبئی میں ملاقات ہوئی، مختلف موضوعات پر تفصیلی تبادلۂ خیال ہوا۔ ان میں ہندو پاک کے تعلقات میں جو خوشگواری کے آثار نمایاں نظر آرہے ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ گفتگو بھی ہوئی کہ برِ صغیر کے دونوں ممالک کے سیاست داں اپنی تلخ کلامیوں و ہنگامہ خیز بیانوں کو ترک کر کے آپس میں روابط استوار کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں، فضائی سروس بحال ہو رہی ہے۔ اگر کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی اور ویزا وغیرہ کی سہولتیں حاصل ہو گئیں تو مارچ میں قائدِ اہلِ سنت حضرت شاہ صاحب کو دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کے معائینے کی دعوت دی جائے گی۔ وہ یہاں تشریف لا کر طلبہ و اساتذہ کو تعلیم و تعلم کے سلسلے میں جس لائحۂ عمل پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت دیں گے، ادارۂ علیمیہ کے تمام ارکان اس پر مستعدی کے ساتھ عمل کرنے کی جدو جہد کریں گے بلکہ اس راقم الحروف نے یہاں تک کہا تھا کہ علیمیہ کے تعلیمی ماحول میں مزید گرمی لائی جائے تا کہ جب حضرت شاہ صاحب تشریف لائیں تو وہاں سے علیمیہ کے اساتذہ و طلبہ کے بارے میں ان کا ذہن و فکر اتنا متاثر ہو کہ وہ اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار برملا ہر مجلس میں کریں، لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ ہم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کے خلاف قدرتِ الٰہی کا کچھ اور فیصلہ ہونے والا ہے۔

جب میں ممبئی سے سورت پہنچا تو وہاں ۱۱/دسمبر کو یہ اندوہ گیں خبر ملی کہ حضرت شاہ صاحب دارِ فانی سے دارِ جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وہ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو گئے۔ اس خبر وحشت اثر نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، میں بے حد متاثر ہوا۔ **انالله وانا اليه راجعون۔ ولله مااخذوله مااعطیٰ۔**

کسی کے وہم وخیال میں نہیں تھا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کو رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے قلم تھرا رہا ہے، اچانک داغِ مفارقت دے کر خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوجائیں گے۔ مولانا معین الحق علیمی سلمہ ربہ نے حال ہی میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ درازیِ عمر کے باوجود اپنے عزم وحوصلے کے اتنے بلند وبالا ہیں کہ اپنی صحت سے بے فکر ہوکر ملکی سرگرمیوں اور دینی اُمور کے انجام دینے میں مستعد رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سال حضرت شاہ صاحب نے اپنی مسجد میں پورے قرآنِ حکیم کو تراویح میں اپنی نغمہ بار آواز سے سنایا اور رمضانِ مقدس کے بیشتر حصے میں اپنے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت، عبادت وریاضت میں مصروف رہتے ہیں، الجھے ہوئے سیاسی معاملات کو بھی اپنی ناخنِ تدبیر سے سلجھاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب ایک جامع الصفات بزرگ:

یہ حقیقت ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک جامع الصفات بزرگ تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں واحد سنی عالمِ دین تھے جو نہ صرف حافظ وقاری تھے اور اسلامی علوم پر حاوی تھے بلکہ اپنی عالمانہ شان کے ساتھ عصرِ حاضر کی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے صحیح وقت میں قومِ مسلم کی رہنمائی کی۔ وہ سیاست کے اتار چڑھاؤ سے خوب واقف تھے، اس کی پرخار وادیوں سے طہارتِ نفس کے ساتھ بغیر کسی الجھاؤ کے صاف گزر جاتے تھے۔ ان کی ذاتِ والا صفات پر کسی شخص کو یہ الزام کرنے کی جراءت نہیں تھی کہ انھوں نے عہدِ جدید کے سیاست دانوں کی طرح مکر وفریب، مبالغہ آرائی، غلط بیانی اور جھوٹے وعدے سے اپنی زبانِ پاک کو آلودہ کیا ہو۔ ان کا نظریہ تھا، بقول سر ڈاکٹر محمد اقبال، ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کہ سیاست کو دین سے علاحدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا ارشاد تھا کہ جدید دنیا میں حیرت انگیز انکشافات سے جو انقلابات پیدا ہوتے ہیں، ان کا مکمل طور سے جائزہ لے کر فروغِ دینِ اسلام کی راہیں ہموار کی جائیں۔ انھوں نے بڑے نازک وقت میں دنیا بھر کے

مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ان کی دوررس نگاہوں کے سامنے عیسائیت و یہودیت کی چال بازیاں وفریب کاریاں اورملتِ اسلامیہ کے ساتھ ان کی عداوت ودشمنی بالکل عیاں تھی۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ چہار جانب سے اسلام پر حملہ ہورہا ہے، اشتراکیت ومساوات کے نام پر اور اپنے خوشنما نظریات کی بنا پر اسلام کی بیخ کنی کررہی ہے۔عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دینِ حق سے انحراف کرکے حق پرستوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ان پر خوب واضح تھا کہ مکارانہ سیاست کے ماہر جھوٹے پروپیگنڈے میں یکتا یہودی مسلمانوں کو نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں اس لیے انھوں نے سب کے ساتھ پنجہ آزمائی کا عزمِ مصمم کیا۔تمام دشمنانِ اسلام سے مقابلہ کے لیے صف آرائی کی۔ان کو احساس تھا کہ مسلمانوں کی فرقہ بندیاں اور ان کا باہمی اختلاف ونزاع معمولی معمولی اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے سے دست وگریبان رہنا،ان کی تباہی وبربادی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔وہ قلق واضطراب میں مبتلا ہوجاتے تھے جب یہ دیکھتے تھے کہ مسلمان ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں اوران پر ہرطرف سے حملہ ہورہا ہے۔

مصالحانہ روش:

غالباً اسی وجہ سے انھوں نے سیاسی میدان میں عقائد ونظریات کے اختلاف کے باوجود مختلف فرقوں اور گروہوں کے درمیان مصالحانہ روش اختیار کی اور کلمہ پڑھنے والوں میں یک گونہ سیاسی اتحاد پیدا کرنے کی جہد وسعی میں لگ گئے کیوں کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر اس اجتہاد سے بھی صرفِ نظر کرلیا جائے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ معاندینِ اسلام جو قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے سرے سے منکر ہیں، نیز یہ تبلیغ کرتے پھرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہی کی دلدل میں گرفتار کرتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑے فساد کی جڑ قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے، معاذ اللہ! اس کتاب میں حرب وجنگ کے علاوہ کسی اہم مسئلے پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔اس میں صرف یہ تلقین ملتی ہے کہ ہمیشہ لڑتے بھڑتے رہو، قتل وخون ریزی کرتے رہو، خود مرو اور دوسروں کو مار کر جامِ شہادت نوش کرتے رہو، اپنی دہشت پسندانہ کارروائیوں سے امنِ عالم کو تہ وبالا کرتے رہو، **معاذ اللّٰہ، ثم معاذ اللّٰہ**۔

اس سرتا سر جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب صرف اس سے نہیں ہوسکتا کہ کسی سے بھی مصالحانہ روش اختیار نہ کی جائے، خواہ وہ ان غلط خیالات کے زائل کرنے میں ہمارا ہم نوا ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی غیر دانش مندانہ حکمتِ عملی سے سوائے تباہی و بربادی کو دعوت دینے سے کچھ حاصل نہیں۔

شاہ صاحب گمراہ فرقوں کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے:

اس لیے حضرت قائدِ اہلِ سنت **علیہ الرحمۃ والرضوان** نے اسلامی فرقوں کے درمیان سیاسی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ اس کے خوشگوار نتائج و ثمرات بھی حاصل ہوئے۔ انھوں نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ مملکتِ خداداد پاکستان کے فوجی آمروں اور ڈکٹیٹروں کے لیے صف بندی ضروری خیال کی کیوں کہ ایک طرف فوجی آمریت جو دشمنانِ اسلام کے ساتھ اپنی دوستی کا ہاتھ دراز کر رہی تھی۔ ایسے آمروں کو اپنے آمرانہ نظام کی بھلائی اس میں نظر آ رہی تھی کہ اعدائے دینِ اسلام کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر پھرتے رہیں۔ دوسری طرف وہ بدطینت لوگ اپنی سوچی سمجھی تدبیروں کے ذریعے بڑی چابک دستی و چالاکی سے قوم مسلم کو نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں اگر کسی سنی عالمِ دین کی اس نکتے پر نظر پڑی تو وہ حضرت قائدِ اہلِ سنت حضرت شاہ احمد نورانی **رحمۃ اللہ علیہ** کی ذات والا صفات ہے۔ یہ بات سرتا سر غلط ہے کہ اسلام کے نام پر جو گمراہ فرقے پیدا ہوئے، وہ ان کے سامنے سرنگوں ہو گئے بلکہ صداقت یہ ہے کہ ان سے بلند بالا رہتے ہوئے ان کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کی خدمت کا ایک راستہ تلاش کیا۔

عصرِ حاضر کے ایک بہت بڑے نباض:

اس سلسلے میں آپ کی ذاتِ اقدس پر کافی نکتہ چینیاں کی گئیں اور آپ کو بے حد مطعون کیا گیا۔ آپ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کیے گئے جس سے کچھ بھولے بھالے مسلمانوں

کے ذہنوں میں نفرت و بیزاری پیدا ہوئی اور کچھ لوگ آپ کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود آپ کی عالمی تحریک کے ہم نوا نہ بن سکے۔ چنانچہ گزشتہ سال جب میں عمرہ کے لیے گیا، نماز پڑھنے کے بعد مسجدِ حرام سے واپس ہوا تو ایک پاکستانی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کس ملک سے آئے ہیں اور کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے کہا میں بھارت کا رہنے والا ہوں ،اس کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع فیض آباد سے آیا ہوں۔ پھر وہ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں متواتر سوالات کرنے لگا۔ میں نے مصلحتاً ان کے جواب سے گریز کیا اور یہ دریافت کیا کہ جناب کس ملک کے رہنے والے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں، کراچی کا رہنے والا ہوں۔ جیسے ہی انھوں نے کراچی کا نام لیا، حضرت شاہ صاحب کا چہرہ مہرہ بلکہ ان کا پیکرِ مجسم میرے ذہن کے پردوں پر مرتسم ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سوال کیا کہ کیا آپ قائدِ اہلِ سنت حضرت شاہ احمد نورانی صاحب **مدظلہ العالی (رحمۃ اللّٰہ علیہ)** کو جانتے ہیں تو انھوں نے جواب میں کہا: خوب اچھی طرح جانتا ہوں ،وہ ایک زبردست عالمِ دین ہیں، نہایت شریف طبیعت کے ہیں، صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند ہیں، دین ودیانت میں ان کے جیسے کم لوگ ہوں گے، نیکی و پارسائی ان کی فطرت میں داخل ہے، بہت شگفتہ گفتگو کرتے ہیں ، شیریں کلام وخوش آواز ہیں، کراچی جیسے بڑے شہر میں خدا جانے کتنے حفاظ وقرا ہوں گے جو خوش الحانی کے ساتھ قرآن شریف پڑھتے ہوں گے لیکن جس خوش آوازی سے نورانی میاں قرآن شریف پڑھتے ہیں، ان کی تعداد قلیل ہوگی۔ وہ جس وقت سلام عربی لب ولہجے میں پڑھتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے ، بڑا کیف پیدا ہوتا ہے، سننے والا وجد میں آجاتا ہے، ان کی تمام باتیں بڑی بھلی اور پیاری لگتی ہیں لیکن ایک بات کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ وہ سیاست داں ہیں، یہ ہم لوگوں کو بہت ناپسندیدہ ہے۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں لیکن ان کے اس عمل سے ہم ضرور اختلاف کرتے ہیں۔

ایک پاکستانی بھائی کے اس بیان سے (اور وہ بھی بیان کہاں دیا؟ حرم شریف میں دیا، مسجد حرام کے سامنے دیا) میں سوچ میں پڑ گیا کہ کراچی کا رہنے والا یہ مسلمان حضرت شاہ

صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس قدر متاثر کہ میرے روبرو ان کے فضائل ومناقب صاف لفظوں میں بیان کرتا رہا لیکن اس کے دل میں ایک کھٹک بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک سیاست داں ہیں، گویا اس کے بقول وہ "شجرِ ممنوعہ" کے قریب تھے۔ ان کا تعلق ہرکس وناکس سے تھا، ان کی عظیم شخصیت پر یہ ایک دھبہ تھا لیکن اس راقم الحروف کے نزدیک ان کی شخصیت کے اندر اس قدر اِنجلا پایا جاتا تھا، بالفاظِ دیگر ان کی ذاتِ والا صفات اتنی روشن وتابناک تھی کہ ان کی ہستی کے قائل ومعترف وہ لوگ بھی ہوئے جو ان سے عقیدے میں اختلاف رکھتے تھے اور آپ نے ان سے مصالحانہ روش اس لیے اختیار کی کہ آپ عصرِ حاضر کے بہت بڑے نباض تھے۔ آپ روشن خیال ہی نہیں تھے بلکہ روشن ضمیر بھی تھے۔

معاندانہ پروپیگنڈے کی لہریں:

اس لیے قوم وملت کا درد آپ کو مجبور کر رہا تھا کہ تشدد وتعصب چھوڑ کر تھوڑی دیر نرم پالیسی اختیار کریں تاکہ جو لوگ دشمنانِ اسلام کے خلاف ان کو تعاون دے سکیں، وہ سیاسی سفر میں ان کے ساتھ رہیں اور وہ امیرِ کارواں بن کر سب کو ہدایت دیتے رہیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سنی جماعت کے بہت سے ایسے قابلِ احترام مشائخ وعلماے دین ہیں جنھوں نے حضرت شاہ صاحب سے اختلاف کیا اور میں تھوڑی دیر کے لیے مان لیتا ہوں کہ ان کا اختلاف نفس کی خاطر نہیں تھا بلکہ دین ودیانت کی بنا پر تھا لیکن میں یہ عرض کرنے کی جراءت ضرور کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مصلحتِ وقت کے مطابق اپنا راہِ عمل متعین کیا تھا اور اس سیاست کا دامن انھوں نے نہیں چھوڑا جو صداقت پر مبنی تھی جس کے بارے میں اسلام کا دامن وسیع تر نظر آرہا ہے۔ حکمت ودانائی کی بنا پر یا مصلحتِ وقت کے تقاضوں کے مطابق بڑے سے بڑے دشمن سے اسلام مصالحت کی اجازت دیتا ہے اس لیے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سیاسی میدان میں قدم رکھا جو نظامِ مصطفیٰ کے قیام کے لیے تھا اور اپنی پوری زندگی اس میں صرف کردی۔ ان کی حیاتِ پاک میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں پایا گیا۔ وہ ایسے مسافر نہیں تھے جس کو اپنی منزلِ

مقصود کا پتہ ونشان معلوم نہ ہو۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ جس راہ پر وہ رواں دواں ہیں اس کے لیے لازم ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں وگروہوں کے اختلافِ عقائد کے باوجود سیاسی پلیٹ فارم پر یک گونہ اتحاد پیدا کیا جائے ورنہ مخالفانہ، معاندانہ پروپیگنڈے کی لہریں ایسی اٹھ رہی ہیں کہ جن کے مقابلے کے لیے انفرادی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی تنکا سمندر کی ہیبت ناک لہروں سے مقابلہ کرنے کے لیے ہو۔

پیروانِ اسلام کے لیے مشعل راہ:

دنیا بھر کے دانش مند وہوش مند جو ملتِ اسلامیہ سے ہمدردی رکھنے والے ہوں، وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں اور ان کی حکمت عملیوں کو تاابد سراہتے رہیں گے اوران کی یاد سے اپنے دلوں میں ہوش مندی کی شمع جلاتے رہیں گے۔ وہ اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے، اللہ کے حضور اپنے کارناموں کے ساتھ پہنچ گئے۔ اب ہم نورانی کے نورانی چہرے کو نہیں دیکھ سکتے لیکن ان کا اخلاص، ان کی دیانت، دینِ اسلام پر ان کے فدا ہونے کا جذبہ، قرآنِ حکیم کے ساتھ ان کا شغف اور دل کا گہرا لگاؤ، امتِ مسلمہ کے لیے ان کا سوز وگداز، ان کی نغمہ بار آواز، ان کی صداقت وراستی، ان کی تواضع وفروتنی، ان کی دانش مندانہ روش اور حکمتِ عملی، ان کے مکارمِ اخلاق، ان کے متعلق ان سب عنوانوں پر مستقبل کا مؤرخ اپنی جودتِ فکر کا مظاہرہ کرے گا اور سب پر اپنے قلم کی جولانی وروانی دکھائے گا جو دینِ اسلام کے شیدائیوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

حضرت شاہ صاحب حرصِ دنیا سے بے نیاز:

ہمارے علاقے کے مشہور دارالعلوم فضلِ رحمانیہ میں دس سال کے طویل عرصے تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے والے حضرت مولانا قاری رضاء المصطفیٰ صاحب فرزندِ بلند اقبال صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ ترکِ وطن کر کے کراچی تشریف لے گئے، وہاں ایک بڑی مسجد کے امام وخطیب مقرر ہوئے۔ ایک مرتبہ وہ کئی سال ہوئے، اپنے وطن اصلی

گھوسی تشریف لائے پھر مبارک پور الجامعۃ الاشرفیہ میں رونق افروز ہوئے۔ان کے استقبال کے لیے اساتذہ وطلبہ کا ایک شاندار جلسہ ہوا۔انھوں نے استقبالیہ تقریر میں فرمایا: کہ ہندوستان میں علما بالخصوص سنی علما سیاست سے کنارہ کشی میں اپنی عافیت تصور کرتے ہیں بلکہ اس کو''شجر ممنوعہ'' خیال کرتے ہیں لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں علمائے کرام سیاست میں بھرپور حصہ لیتے ہیں،گروہِ علما میں بھی اعلیٰ درجے کے سیاست داں پائے جاتے ہیں۔دیکھیے حضرت شاہ نورانی میاں مدظلہ العالی ایک زبردست عالمِ دین ہوتے ہوئے بھی وہ بلند کردار سیاست داں ہیں، وہ اتنے اونچے درجے کے رہنما ہیں کہ ان کے سامنے بڑے بڑے سیاسی قائد گھٹنے ٹیکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ بہت نیک خصلت انسان ہیں۔کراچی شہر میں اگر میں کسی عظیم ہستی سے متاثر ہوا تو وہ نورانی میاں ہیں۔وہ قومی خدمت کی راہ میں بڑے مخلص ہیں، وہ حرصِ دنیا سے بالکل پاک وصاف ہیں۔جب پاکستان کی قومی اسمبلی کراچی میں تھی تو اس کے ممبر تھے، وہ اس میں شرکت کے لیے پیدل جایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ ایک عقیدت مند نے ان کے علم میں لائے بغیر ایک گاڑی خریدی،نہایت اعلیٰ درجے کی کار، اس کو لے کر ان کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا اور اس کی کنجی ان کے حوالے کر کے عرض کیا کہ حضور! یہ گاڑی میں نے اپنی حلال کمائی سے خریدی ہے مجھ کو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ آپ قومی اسمبلی میں شرکت کے لیے پیدل جاتے ہیں لہٰذا یہ خوبصورت گاڑی آپ کی خدمت میں نذر پیش کر رہا ہوں۔آپ نے ایسے موقع پر جو کچھ بھی فرمایا، وہ معمولی درجے کے انسان کی بولی نہیں ہوسکتی۔اس سے قومِ مسلم کے لیے آپ کے درد و دکھ کا احساس ہوتا ہے۔آپ نے فرمایا کہ:

''میرے عزیز! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ، مجھے آپ معاف کردیں، میں یہ گاڑی قبول نہیں کرسکتا کیوں کہ جب میں پیدل پارلیمنٹ جاتا ہوں تو بہت سے حاجت مند راستے میں میرے منتظر رہتے ہیں، میں سب کی باتیں توجہ سے سنتا ہوں اور میری کوشش یہ

ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کی ضرورتیں پوری کروں۔ یہ موقع آئے دن مجھ کو میسر آتا رہتا ہے لیکن جب میں آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے اسمبلی چلا جاؤں گا تو بہت سے لوگ مجھ سے مایوس ہوں گے اور جن کو میرا تھوڑا بہت سہارا مل رہا ہے، وہ اپنے آپ کو بے آسرا خیال کریں گے اس لیے میرے عزیز! میرے نزدیک آپ کے خلوص ومحبت کی قدر و قیمت ہونے کے باوجود میں اپنے متعلقین کو محروم نہیں رکھنا چاہتا۔''

حضرت شاہ صاحب **رحمة الله عليه** کے یہ کلماتِ طیبات قلوبِ انسانی کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہیں مگر محض دلوں کی تسخیر کے لیے نہیں بلکہ ان کے یہ ارشادات، ان کی عظیم شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ان سے یہ بھی احساس اجاگر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ہنگاموں، میدانِ سیاست کے کارزار میں رہتے ہوئے بھی دنیا کے حرص وطمع سے ایک صاف ستھرے عظیم انسان تھے۔

حضرت شاہ صاحب کا اخلاص:

حضرت شاہ صاحب **رحمة الله عليه** پندرہ سال پیشتر ۲۰؍مئی ۱۹۸۹ء میں جمداشاہی کے نیازمندوں کی دعوت پر تشریف لائے، بڑا شاندار استقبال کا انتظام کیا گیا۔اس موقع پر ایک عظیم الشان جلسہ بھی ہوا، انھوں نے بڑی جان دار تقریر فرمائی۔ان کے مواعظِ حسنہ کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے حکومتِ ہند کا شکریہ بھی ادا کیا تھا کہ اس نے یہاں آنے کی اجازت دی۔ جلسے کے اختتام پر آپ نے عربی لب و لہجے میں ایسا سلام پڑھا کہ پورا مجمع وجد میں آ کر جھوم رہا تھا پھر نہایت رقت آمیز الفاظ میں دعائیں کیں امتِ مسلمہ کی خوش حالی کے لیے۔ جب آپ دعا کررہے تھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دردمند کے دل کی صدا ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر زبان پر آرہی ہے۔جمداشاہی کے نیازمندوں کے امن و عافیت، ادارۂ علیمیہ کی

تعمیر وترقی کے لیے اتنے رقت آمیز الفاظ میں آپ نے دعائیں کیں کہ خود آپ آبدیدہ تھے اور شرکاے اجلاس کے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔

جمداشاہی میں اجلاس کے بعد آپ کا قیام بہت مختصر رہا۔ روانگی کے وقت سیٹھ غلام مصطفی رضوی مرحوم نے (دارالعلوم علیمیہ کی طرف سے نہیں) بلکہ اپنی جیبِ خاص سے گیارہ ہزار روپے کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ آپ نے صاف لفظوں میں اس خطیر رقم کو لینے سے انکار کردیا۔ جب سیٹھ نے بہت اصرار کیا اور حد سے زیادہ اپنی نیازمندی کا اظہار کیا تو آپ نے محض ایک سو ایک روپے لے لیا اور باقی نذرانے کی رقم دارالعلوم علیمیہ کو مرحمت فرمادی۔

روانگی کے وقت تمام نیازمند و اخلاص کیش چشمِ پرنم تھے۔ سب کے قلوب جوشِ عقیدت سے لبریز تھے۔ سب کو دعائیں دیتے ہوئے جمداشاہی سے روانہ ہوئے اور بذریعہ ٹرین ممبئی پہنچ گئے۔ ممبئی میں دو تین دن قیام رہا، وہاں کے مشہور صنعت کار جناب محمد حسین الانہ مرحوم نے ایک خطیر رقم بطور نذر پیش کی لیکن جب سانتا کروز کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر مولانا معین الحق علیمی کے ہمراہ آئے اور وہاں سے پرواز کا وقت قریب آیا تو آپ نے وہ ساری رقم مولانا علیمی کے حوالے کرکے فرمایا کہ یہ دارالعلوم علیمیہ کے لیے میری طرف سے نذر ہے۔

اس طرزِ عمل سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا علیمی کے اس وسوسے کو دور فرمایا کہ کیا علت ہوئی کہ ایک جانب سیٹھ غلام مصطفی رضوی کا نذرانہ قابلِ قبول نہ ہوا اور دوسری جانب ممبئی کے ایک بڑے صنعت کار کی رقم کو قبول فرمالیا۔ آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ میں نے جو کچھ بھی قبول کیا، اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ دارالعلوم علیمیہ کے لیے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واضح کردیا کہ وہ حریص الدنیا عالمِ دین نہیں تھے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کا قلبی لگاؤ دارالعلوم علیمیہ سے کتنا گہرا تھا کیوں کہ ہندوستان سے جو کچھ نذر و نیاز ملا، وہ سب اپنی جیب کے حوالے نہیں کیا بلکہ ادارۂ علیمیہ کے حوالے کیا۔ علیمیہ کے ساتھ جو آپ کا ربط و تعلق تھا، اس کا اظہار ان کلماتِ طیبات سے بھی

ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے معائینے کے وقت تحریر فرمایا تھا:

"بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدلله رب العٰلمین،والصلوٰة والسلام علیٰ حبیبه سیدنا و حبیبنا و مولانا محمد رسول اللّٰہ ﷺ وآله وصحبه ومن والاہ۔

امابعد! دارالعلوم علیمیہ میں ۱۹۶۱ء کے بعد حاضری کی سعادت میسر ہوئی۔اس عرصے میں اس دارالعلوم نے حیرت انگیز ترقی کی۔احبابِ اہلِ سنت انتہائی مبارک باد کے قابل ہیں کہ انھوں نے مالی قربانی دے کر اس ادارے کو جن سے یہ منسوب ہے،ان کے نامِ نامی اسمِ گرامی کے شایانِ شان بنا دیا اور مزید ترقی کی جدوجہد جاری ہے۔والدِ ماجد حضرت مبلغِ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صاحب صدیقی مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی دعائیں اس ادارے کے ساتھ ہیں۔ان کی روحانی برکات سے ماشاءاللہ یہ مرکزِعلم تا قیامت تشنگانِ علم کو سیراب کرتا رہے گا۔

مولیٰ تعالیٰ مدرسے کے معاونین وسرپرست حضرات نیز مدرسین وطلبہ کو دینی ودنیوی برکات سے مالامال فرماتا رہے اور یہ چشمۂ علم وعرفان تاقیامت جاری وساری رہے۔آمین!

فقط۔شاہ احمد نورانی صدیقی

(نزیل جمداشاہی، ۱۴ شوال ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۸۹ء)

دارالعلوم علیمیہ سے گہری وابستگی:

آپ کے معائینے کی اس تحریر سے جانا جاسکتا ہے کہ ادارے سے کتنی گہری وابستگی رہی۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ ان کے والدِ بزرگوار حضرت مبلغِ اسلام علیہ الرحمہ والرضوان کی ذاتِ اقدس کی طرف بھارت جیسے وسیع وعریض ملک میں واحد ادارہ ہے اور یہی ان کی وابستگی ہے کہ راقم الحروف نے ادارۂ علیمیہ کی تعمیر وترقی کے سلسلے میں جو کچھ جدوجہد کی،اس کے پیشِ نظر میری قدرومنزلت کرتے رہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ

جس کاوشِ ذہنی کا اس ادارے کی ترقی میں مظاہرہ کیا، اس کو نہ صرف قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں خواہ وہ افریقی ممالک ہوں یا یورپی ممالک جہاں کہیں آپ کا دورہ ہوا، سب جگہ اپنے مریدین ومتاثرین کے روبرو مجھ جیسے حقیر و بے مایہ کو بہترین الفاظ سے سراہتے رہے اور میرے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار بے دریغ فرماتے رہے کیوں کہ ان کو یقین حاصل تھا کہ اس ادارے کی تعمیر وترقی میں تھوڑا بہت میرا بھی حصہ ہے۔اس بنا پر اپنی اعلیٰ ظرفی سے میرے اوپر بہت شفیق ومہربان تھے۔

حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** کا میری ذات کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔وہ بلند وبالا انسان تھے،ان کی شخصیت عالم گیر تھی۔وہ ایشیائی ممالک سے لے کر یورپی اور افریقی ممالک میں بھی بہت مقبول تھے۔ان کی شہرت ونا موری کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور میں ان کے روبرو ایک ذرۂ ناچیز، گمنام، کنج خمولی میں رہنے والا مدرس ہوں۔ درس وتدریس کے سوا میرا کوئی مشغلہ نہیں لیکن حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان سے جو بھی متعلق ہوا خواہ اس کا تعلق ادنیٰ درجے کا ہی کیوں نہ ہو، اپنی اعلیٰ ظرفی وبلند خیالی کی بنا پر اس کو بہت نوازتے تھے۔میرے اوپر بھی اپنے کرم ونوازش کی بارش فرمائی۔

راقم الحروف کے ساتھ خصوصی تعلق:

ابھی ابھی جمدا شاہی کے جس سفر کا تذکرہ ہوا، پہلی ملاقات میں مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں یورپ کے دورے پر گیا تھا، متعدد شہروں کے دورے کے بعد جب میں فرانس کے دارالسلطنت پیرس پہنچا تو وہاں ایک مرید نے تحفے میں گھڑی پیش کی، معاً آپ کا خیال آیا، اس کو میں نے آپ کے لیے محفوظ کر لیا اور گھڑی کے خوب صورت ڈبے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ لیجیے آپ کو نذر ہے۔اب تک یہ نادر ونایاب تحفہ حضرت شاہ صاحب کی یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو میری عجیب وغریب حالت ہو جاتی ہے اور آپ کی جدائی وفراق سے میں نہ صرف غم گین واداس ہو جاتا ہوں بلکہ بے قراری میں تڑپ اٹھتا ہوں۔

حضرت قاری یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تاثر:

حضرت شاہ صاحب رحمة الله عليه پاکستان کراچی کے رہنے والے نہیں تھے بلکہ ان کا وطن اصلی یا آبائی وطن بھارت کا شہر میرٹھ ہے۔ وہ یہاں سے ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے اور جب تک ہمارے ملک میں رہے، بچپن سے لے کر جوانی تک مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ ان کے یا ان کے پدرِ بزرگوار کے بارے میں مجھ کو کچھ معلومات حاصل نہ تھی البتہ قاری محمد یحییٰ صاحب رحمة الله عليه ان کے ہم سبق تھے۔ بعد میں وہ الجامعۃ الاشرفیہ کی نظامت کے عہدے پر فائز ہوئے، جب میں ادارۂ اشرفیہ میں بحیثیت مدرس رہا تو قاری صاحب رحمة الله عليه نے حضرت شاہ صاحب کے متعلق عہدِ طالبِ علمی میں اپنی رفاقت کو بیان کیا۔ بارہا انھوں نے فرمایا کہ وہ بچپن ہی سے نہایت خوش اخلاق، بلند خیال تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان دونوں شخصیتوں میں ایک وصف مشترک تھا، وہ یہ کہ دونوں بڑھاپے کی منزل کو پہنچنے کے باوجود نہایت خوش الحان قاری تھے۔ ان کی آوازوں میں وہی کشش رہی جو جوانی میں تھی ۔ یہ جملہ معترضہ کچھ طویل ہو گیا۔ مجھ کو یہ بتانا تھا کہ حضرت قاری یحییٰ صاحب رحمة الله عليه کی زبانِ مبارک سے حضرت شاہ صاحب رحمة الله عليه کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ پھر جب میں دارالعلوم علیمیہ میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے آیا تو وہاں ان سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ان کو نہایت خوش اخلاق، بلند خیال، عالی ظرف، دور اندیش انسان پایا اور مجھ کو یہ یقین حاصل ہوا کہ ان کی ذاتِ اقدس میں قیادت کے جوہر نمایاں ہیں۔ پھر ان سے تعلقات استوار ہوئے اور ان سے خط و کتابت ہوئی یا ٹیلیفون پر ان سے گفتگو ہوئی تو ان کے ہر ہر لفظ سے خلوص و محبت کی جھلک میں نے محسوس کی۔ چنانچہ میں نے دارالعلوم علیمیہ سے ایک خط ان کی خدمتِ عالیہ میں حاضر کیا تو انھوں نے اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا۔ اس مکتوبِ گرامی کو پڑھ کر یہ جانا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے کریم النفس انسان تھے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

گرامیِ قدر محترم جناب حضرت علامہ عبداللہ خان عزیزی صاحب **دامت برکاتهم**

السلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته

امید ہے کہ مزاجِ گرامی مع الخیر ہوں گے۔ گرامی نامہ ملا، یادفرمائی کا شکریہ۔ یورپ کے تبلیغی دورے کی وجہ سے نومبر میں انڈیا کا پروگرام نہ بن سکا، **ان شاء اللّٰه** اولین فرصت میں آنے کی سعی کروں گا۔

جامعہ علیمیہ کے لیے آپ کی کاوشیں وخدمات نا قابلِ فراموش اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور دارین میں اس کا اجر عطا فرمائے، **آمین! بجاہ سید المرسلین صلی اللّٰه علیه وسلم**۔

جامعہ کے طلبہ کو بغداد بھیجنے میں آپ نے جو کچھ کیا ہے، وہ صدقۂ جاریہ ہے۔ **ان شاء اللّٰه** آپ اس کے اجر سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔ جو طلبہ بغداد شریف میں زیرِ تعلیم ہیں، ان کے انتظامات کے سلسلے میں بات چیت ہو چکی ہے، آپ فکر نہ فرمائیں، **ان شاء اللّٰه** وہ تعلیم جاری رکھیں گے۔

مولانا معراج الحق سلمہ چار سالہ کورس پورا کرنے کے بعد واپس آئیں تو آپ ان سے ان کی علمی استعداد کے مطابق کام لیں۔

میری رائے ہے کہ مولانا احمد رضا سلمہ کو اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے، انتظامات کے بارے میں آپ فکر مند نہ ہوں۔

احباب و پرسانِ حال کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام عرض ہے۔ آپ مجھ فقیر کو دعاے خیر میں یاد رکھیں۔ والسلام۔

فقیر شاہ احمد نورانی صدیقی غفرلہ

کراچی، ۲۶ شعبان ۱۴۱۸ھ/ ۲ دسمبر ۱۹۹۷ء

اللہ اللہ میری قسمت:

سالِ گزشتہ میں عمرہ ادا کرنے کے لیے حرمینِ طیبین حاضر ہوا۔ مدینہ منورہ سے فون پر گفتگو ہوئی تو اتنے حسین انداز میں مجھ سے بات کی کہ میں اس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ فرمایا کہ میری قسمت کی بلندی ہے کہ دیارِ پاکِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں آپ مجھ کو نہیں بھولے اور روضۂ پاک کے قریب ہی سے آپ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ مجھ کو بے حد مسرت وخوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ مدینہ منورہ ہی سے میں نے ایک تفصیلی خط لکھا۔ ایک پاکستانی کے بدست ان کی خدمتِ عالیہ میں ارسال کیا۔ عمرہ سے واپس آنے کے بعد میں نے دوبارہ فون کیا اور یہ دریافت کیا کہ حضرۃ المکرم کو میرا مراسلہ پہنچا کہ نہیں تو آپ نے فرمایا اللہ اللہ میری قسمت کہ آپ نے مجھ کو مدینہ منورہ سے اپنا مکتوب ارسال کیا اور جامعہ علیمیہ کی تعمیر وترقی کے سلسلے میں آپ نے ڈبل معلومات فراہم کیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دارالعلوم علیمیہ کا تذکرہ آتا تو وہ بہت مسرور وشادماں ہوتے تھے اور ادارے کی ترقی کے لیے بہت دعائیں کرتے تھے اور ان کی دعاؤں کے الفاظ سے خلوص کے جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خلوصِ نیت کی قدر:

حضرت شاہ صاحب **رحمة الله عليه** پاکستان کی سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ ان کی سیاست دین ودیانت سے جدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ محض سیاسی رہنما نہیں تھے بلکہ فی الواقع ان کی ذاتِ اقدس میں اسلامی قیادت کا جوہر پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں جتنے اسلامی ادارے ہیں، سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور سب کے بارے میں نہ صرف اچھے خیالات کا اظہار کرتے تھے بلکہ اپنے متوسلین ومریدین کو تمام سنی اداروں کی امداد وتعاون کی ترغیب دیتے تھے اور بڑے خوبصورت انداز میں اسلام کی خدمت کا جذبہ ابھارتے تھے۔ اس بارے میں ان کی نگاہ

بلند بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع بستی کے دارالعلوم علیمیہ پر پڑتی تھی کیوں کہ یہ ادارہ حضرت مبلغِ اسلام **علیہ الرحمۃ والرضوان** کی ایک علمی یادگار ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** نے دارالعلوم علیمیہ کے عہدِ صدارت میں مجھ کو اس بات کی ترغیب دی کہ آپ ادارے کے فارغین کو دنیا کے نامور دینی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آمادہ و تیار کریں۔ میں نے اپنی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خلوصِ نیت کی قدر ہے، پردۂ غیب سے وہ اسباب پیدا فرمائے گا کہ آپ دقت و پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے۔ بس آپ اپنی جدوجہد جلد ہی شروع کر دیجیے۔ جو کچھ تعاون میری طرف سے ممکن ہوگا میں **ان شاء اللہ** پیش کرتا رہوں گا۔ عرب ممالک کے جامعات میں سے خواہ مصر کا جامعہ ازہر ہو یا جامعہ صدام بغداد شریف ہو یا لیبیا کا جامعہ اسلامیہ ہو، جس جامعہ میں آپ اپنے طالب علموں کا داخلہ کروانا چاہیں گے میں اپنے اثر و رسوخ کو ضرور استعمال کروں گا۔ داخلے کے علاوہ اگر ممکن ہوا تو میں اسکالرشپ بھی دلواؤں گا۔

آپ کے حکم و ارشاد سے راقم الحروف کو بڑا حوصلہ ملا اور اس بارے میں جدوجہد شروع کر دی گئی اور جامعہ صدام للعلوم الاسلامیہ بغداد شریف میں طلبہ کو بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس سلسلے میں حقیر کو کافی محنت و کاوش کرنی پڑی لیکن حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ** کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے میں نے عزمِ مصمم کر لیا تھا۔

تمام دقت و پریشانیوں کے باوجود میرے پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی اور دو تین سالوں کے درمیان نصف درجن علیمیہ کے فارغین کو بغداد شریف حصولِ علم کے لیے بھیجا گیا۔ ہر موقع پر ان طلبہ کو حضرۃ المکرم کی طرف سے سہولتیں ملتی رہیں۔ اگر داخلے میں دشواری پیش آئی تو آپ نے ان دشواریوں پر قابو پانے کے لیے صرف زبانی تدبیر نہ بتائی بلکہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے داخلہ کروا کے جملہ سہولتیں فراہم کیں۔

بغداد شریف میں زیرِ تعلیم طلبہ کو تسلی آمیز نصیحت:

علیمیہ کے طلبہ کے بارے میں جو بغداد شریف میں زیرِ تعلیم رہے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کیا طرزِ عمل تھا اور ان پر کتنے شفیق و مہربان تھے اور ان کی دشواریوں میں ان کو کتنی تسلی و تشفی دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ بغداد شریف تشریف لے جاتے تو دارالعلوم علیمیہ کے بغداد شریف میں زیرِ تعلیم طلبہ سے ضرور ملاقات کرتے اور وہاں کی پابندیوں کی وجہ سے ان کو جو مشکلات پیش آتیں، اس پر فرماتے کہ آپ طالبانِ علومِ دینیہ ہیں، آپ لوگوں کو حضور غوثِ اعظم **رضی اللہ عنہ** کی سیرت و کردار کو اپنے پیشِ نظر ہمیشہ رکھنا چاہیے کیوں کہ آپ ان کی بارگاہ میں حاضر ہیں، انھوں نے اسلامی علوم کے لیے کتنی مشقتیں جھیلیں، اس زمانے میں آپ ان کا تصور نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ صاحب **علیہ الرحمہ** کی خدمات اور ان کی شخصیت کا جائزہ اس نیاز مند راقم الحروف نے مختلف پہلوؤں سے لیا۔ ان کے سیاسی کردار پر تفصیلاً بحث کی۔ ان کی زندگی کے حالات پر مختصر روشنی ڈالی گئی، ان کی دین و دیانت کا آئینہ پیش کیا گیا۔ اس صاف و شفاف آئینے میں ان کی عظیم شخصیت کی جلوہ گری خوب خوب دیکھی جا سکتی ہے۔

افسوس صد افسوس! مستقبل قریب میں ان کے جیسا قائد و رہنما ملنا بظاہر مشکل نظر آ رہا ہے۔ وہ اس دارِ فانی سے چلے گئے اور اپنے ساتھ ایک آباد دنیا لے کر چلے گئے۔ "مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ" کے وہ مصداق تھے۔ خدائے تعالیٰ امتِ مسلمہ کو ان کے چھوڑے ہوئے جادۂ مستقیم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁❁

قائدِ اہلِ سنت: ایک اسلامی مفکر و سیاست داں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسلامی تاریخ میں سَلَف سے خَلَف تک فقہا، محدثین، متکلمین ومفکرین، مجددین وائمۂ مجتہدین کا مقدس گروہ اپنے علم وعمل سے اولادِ آدم کی بھاری اکثریت کے ذہن وفکر کو متاثر کرنے میں نہایت کامیاب رہا۔ بجا طور پر مسلمان ان گروہِ اصفیا پر فخر کر سکتے ہیں۔ ان میں سیاست داں اور حکمراں بھی پیدا ہوئے جن کی سیاست اور حکمرانی کا دبدبہ دنیا کی ایک بڑی آبادی پر عرصۂ دراز تک قائم رہا اور یہ گنتی کے چند افراد نہیں تھے بلکہ ان کی فہرست بھی اچھی خاصی لمبی ہے لیکن ایسی شخصیت نایاب نہ سہی، عہدِ اسلامی میں کمیاب ضرور ہے جو اعلیٰ درجے کا مفکر، عظیم سیاست داں، خلوت کا عابد وزاہد اور جلوت کا سپاہی ومجاہد ہو، ان کی تعداد اقلِ قلیل ہے۔ ایسی جامع الاوصاف شخصیت جو جہاں بانی کے اسرار ورموز سے واقف ہو نے کے ساتھ ساتھ ایسا مومنِ کامل ہو جو فروغِ اسلام کا درد اپنے سینے میں پنہاں رکھتا ہو، سلفِ صالحین، ائمۂ مجتہدین کے علاوہ بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں جو تقویٰ اور پرہیز گاری میں اونچے مقام پر فائز ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات سے بھی گہرا ربط وتعلق رکھتے ہوں لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ احمد نورانی **رحمۃ اللہ علیہ** ایک ایسے عظیم قائد تھے جو نہ صرف دین ودنیا کے اسرار ورموز کے واقف تھے بلکہ حکمرانی کے اصول پر مکمل طور سے حاوی تھے۔ ان کی مخلصانہ ومجاہدانہ سرگرمیوں پر جب نظر پڑتی ہے تو بلا مبالغہ میں کہتا ہوں کہ وہ عبقری شخصیت کے حامل تھے۔ اتنے بڑے دین دار تھے کہ برِصغیر میں ان کے معاصرین میں تلاش وجستجو کے بعد ان کے ہم رتبہ کی تعداد نہایت مختصر نظر آتی ہے۔ لاریب وہ بہت بڑے سیاست داں تھے تاہم ان کی سیاست کذب وافترا، مکاری وعیاری، بے وفائی ودغابازی اور جھوٹے وعدوں سے یکسر پاک وصاف تھی۔

عصرِ حاضر میں بہت بڑا سیاست داں وہ شخص ہے جو روحانی اور اخلاقی قدروں سے بالکل عاری ہو، مکروفریب کا بدترین پیکر ہو لیکن میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ برِصغیر میں حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ** سے بڑھ کر مسلمانوں میں ایسا عالمِ دین پیدا نہ ہوا جو حکمرانی کے اصول سے مکمل طور پر واقف ہوتے ہوئے دین و دیانت کا پیکرِ جمیل ہو۔ وہ اتنا بڑا دین دار ہو کہ اس کی دین داری و دیانت داری پر فخر کیا جا سکے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** نہایت پاک نفس انسان تھے جن کی روحانی و اخلاقی قدریں بہت بلند و بالا تھیں۔ وہ عابد و زاہد بھی تھے۔

فروغِ اسلام کے لیے حضرت شاہ صاحب کی بے قراری:

حضرت مولانا قمر الزماں خان صاحب اعظمی (جنھوں نے حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کی قیادت میں ورلڈ اسلامک مشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کیے) کا بیان ہے کہ ہم دونوں کا قیام لندن کے ایک عظیم الشان ہوٹل میں تھا۔ ہمارے قیام کے لیے الگ الگ آرام دہ کمرے گیسٹ ہاؤس میں بک کرائے گئے تھے جن میں ہر قسم کی سہولتیں موجود تھیں۔ رات کے تین بجے جب کہ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کسی متنفس کی آواز نہیں آ رہی تھی، ہُو کا عالم تھا، میری قیام گاہ کے فون کی گھنٹی اچانک بجتی ہے، میں بیدار ہو جاتا ہوں، کچھ دیر کے بعد ریسیور اٹھا کر ''ہلو'' کہا تو دوسری جانب سے جواب میں ''**السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**'' کی صدائے دل نواز کانوں میں گونجتی ہے، میں نے پہچان لیا کہ حضرت شاہ احمد نورانی صاحب **مدظلہ العالی** ہم سے مخاطب ہیں، دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کیا پریشانی لاحق ہے کہ جناب شاہ صاحب نے اس وقت مجھ کو بیدار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور! خیریت ہے؟ رات کے سناٹے میں آپ نے کیسے اس حقیر کو یاد کیا؟ ارشاد ہوا کہ آپ بہت دیر تک سو چکے ہیں، یہ وقت قبولیت کا وقت ہے، بارگاہِ خداوندی میں عجز و نیازمندی کے ساتھ ہم کو اور آپ کو سر بہ سجود ہونا چاہیے، تہجد ادا کرنا چاہیے اور خدائے قدوس کی بارگاہ میں رقتِ قلبی کے ساتھ اپنے مقصدِ بلند (فروغِ

اسلام) کے لیے دعا کرنی چاہیے۔اگر ہم اس پر عمل پیرا رہے تو ضرور بارگاہِ ایزدی میں ہم لوگوں کی دعائیں مقبول ہوں گی۔

علامہ اعظمی صاحب کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** گوکہ سیاسی امور میں بھی اپنے کافی اوقات صرف کرتے تھے،استراحت کا موقع کم مل پاتا تھا،اپنے ناخنِ تدبر سے ملکی وسیاسی مسائل حل کرنے میں مصروف رہتے تھے تاہم وہ حضورِ اکرم نورِ مجسم **صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم** کی سیرتِ طیبہ پر عمل کرتے ہوئے نمازِ تہجد کے پابند تھے۔جب لوگ خوابِ غفلت کی نیند سوجاتے تھے تو وہ یادِ الٰہی میں اپنے عیش وآرام کو تج دیتے تھے۔عام طور سے سیاست کار ملکی مسائل میں اپنے اوقاتِ عزیز صرف کرتا ہے اور چند منٹ بھی خدا کی یاد میں اپنے کو مستعد و چوکس نہیں کرپاتا لیکن حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ** کا معمول نہ صرف اس کے برعکس تھا بلکہ نرالا تھا۔ان کے یہاں سیاست ودین داری میں کوئی بعد نہیں تھا،یہ دونوں پہلو بہ پہلو پائی جاتی تھیں۔حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ** اتنے دین دار اور پاک باز فطرت کے انسان تھے کہ وہ تمام امورِ سیاست پر اسلامی احکام وشرائع کی پابندی کو ترجیح دینے کے عادی تھے اور دینی امور میں ان کے پاے ثبات کی لغزش کی مثال ان کا کوئی بڑا سے بڑا معاند پیش کرنے سے عاجز رہے گا۔

جمد اشاہی میں حضرت شاہ صاحب کی آمد آمد:

حضرت شاہ صاحب **رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ** کا ورودِ مسعود وقدومِ میمنت لزوم تین مرتبہ جمد اشاہی کی چھوٹی آبادی میں ہوا۔وہی ایک چھوٹے سے گاؤں کو جو قصبہ بھی نہیں ہے،ہمیشہ یاد رکھتے تھے کیوں کہ اس آبادی کے لوگ ان کے اوپر اپنی جان ومال قربان کردینے میں اپنی سعادت تصور کرتے تھے،بہت خلوص وعقیدت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ایک چھوٹی سی آبادی میں اپنے نیازمندوں وعقیدت کیشوں کو سرفراز فرمانے کے لیے تین مرتبہ تشریف لائے۔پہلی بار ۱۹۶۱ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۹ء اور تیسری مرتبہ ۱۹۹۲ء

میں تشریف آوری ہوئی۔ان کی مجلس میں جمد اشاہی کے نیازمندوں کے علاوہ علماے دین کثیر تعداد میں شریک رہتے ۔ وہ اپنے متعلقین اور مریدین سے بڑے شگفتہ انداز میں نہایت خلوص کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ان کی گفتگو سے لوگ بے حد متاثر ہوتے تھے۔دین کے ساتھ گہری وابستگی کی وہ تلقین فرماتے تھے۔ان کے کلام کا محور یہ ہوتا تھا کہ اگر مسلمانوں کو دنیا میں اپنی شناخت قائم و برقرار رکھنا ہے،اپنی قوت وسطوت کا لوہا منوانا ہے تو ان پر لازم ہے کہ پہلے اپنے عمل و کردار کو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔

وہ قرآن شریف کے بہت عمدہ حافظ تھے۔جس وقت وہ قرآنِ حکیم کی تلاوت اپنی خوش آوازی کے ساتھ فرماتے تھے تو ہر طبقے کے لوگوں پر محویت طاری ہوجاتی تھی۔احبارِ یہود سے متعلق جو آیتیں اتری تھیں، وہ ان کو پڑھ کر سناتے اور ان کے معانی ومفاہیم کی ایسی تفسیر بیان فرماتے کہ ہر عالم وعامی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔وہ ایسے خوش آواز ،شیریں کلام تھے کہ سامعین کے قلوب میں ان کی ایک ایک بات پیوست ہوجاتی تھی۔ان کی گفتگو میں قوتِ تاثیر اتنی زیادہ تھی کہ ان کے پُرکشش نورانی چہرے کو دیکھ کر اور ان کے کلام کو سن کر چھوٹا بڑا ہر شخص وجد میں آجاتا تھا۔

ان کی مجلس میں شرکت کا موقع اس حقیر کو بھی ملا ہے۔میں پہلی ہی ملاقات میں ان کا نیازمند ہوگیا تھا۔وہ جب پند ووعظ فرماتے تھے تو نماز باجماعت کی بھی بڑے حسین انداز میں سامعین کو ہدایت فرماتے تھے۔وہ خود نماز باجماعت کے اتنے پابند تھے کہ سفر وحضر میں ان کی نماز باجماعت بالعموم کبھی بھی متروک نہ ہوتی کیوں کہ جدھر وہ رخ کرتے تھے،ایک جمِ غفیر ان کے پاس آجاتا تھا اور وہ سب سے یہی کہتے تھے کہ نماز جیسی عبادتِ الٰہی سے بندے کو وہ سعادتِ کبریٰ ملتی ہے کہ دوسری عبادت میں ویسی نہیں مل پاتی ہے کیوں کہ بندہ خدا کے قریب پہنچ جاتا ہے، وہ خدا کو تو نہیں دیکھ سکتا تاہم اس عبادتِ الٰہی سے اس کو تقرب حاصل ہوجاتا ہے۔

چنانچہ جب تیسری اورآخری مرتبہ ۱۹۹۲ء میں آپ کا قدومِ میمنت لزوم جمداشاہی میں ہوا تو آپ کی قیام گاہ نورانی جامع مسجد سے قدرے فاصلے پر تھی۔تین چار بجے کی درمیانی شب میں بیدار ہوکرتہجد کی ادائیگی کے بعد بڑی نیازمندی وعاجزی کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں دعافرماتے۔پھرجب صبح صادق کی روشن کرنیں اُفق مشرق میں نمودار ہوجاتیں تونورانی جامع مسجد کے لیے روانہ ہوجاتے۔نگاہیں نیچی کیے ہوئے بڑے وقاروتمکنت کے ساتھ چلاکرتے تھے۔اگرکوئی بندۂ خدا راستے میں ملتا تو اپنی پرکشش نگاہوں کواس کے اوپرڈال کرارشادفرماتے کہ کاش نماز کی قدرو قیمت کالوگوں میں احساس پیدا ہوتا تو ان کے اندرنیک کاموں کا بڑاجذبہ ابھرتا کیوں کہ نماز ہی وہ عملِ صالح ہے جو بندوں کو نیک کام کرنے کے لیے ابھارتی ہے۔نماز ہی وہ عبادت ہے جوابنِ آدم کے دلوں میں خدا کے انواروتجلیات کے سمیٹ لینے کا ذریعہ بنتی ہے۔وہ مسجد جاتے ہوئے بھی نہایت حکمت ودانائی کے ساتھ جوملتااس کونماز کی تلقین فرماتے تھے۔

یہ سب باتیں اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ آپ کا دلِ پاک یادِالٰہی سے کسی حالت میں غافل نہیں رہتا تھا،خواہ وہ کتنے ہی معاملات میں الجھے ہوئے ہوں یاسیاست کے اتار چڑھاؤ میں پڑے ہوئے ہوں یاسفرمیں ہوں یاحضرمیں،وعظ وتقریر کی محفل ہو،یانجی نشست گاہ،ہرحالت میں ان کی دین داری ان کوآمادہ رکھتی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے اپنے دل کومنوروتاباں رکھیں۔صاف لفظوں میں کہاجاسکتا ہے کہ ظاہری اعضاوجوارح کسی طرف مائل رہتے ہوں لیکن ان کا باطن خدا کی طرف میلان رکھتا تھاجواللہ والوں کی صحیح پہچان ہے۔میں ان کی مادی کرامتوں کوتونہیں بیان کرسکتا کیوں کہ یہ وہی بیان کرسکتے ہیں جن کا تعلق ان کے ساتھ بہت گہرارہاہواورجن کوان کی مصاحبت کا موقع ملا ہو۔مجھ کوتو چند گھنٹوں کے لیےان کے دیدار کا موقع ملا۔البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ ان کی طبیعت کارجحان ومیلان ہرحالت میں خدائے قدوس کی طرف رہتا تھا۔

جمعیت علماے پاکستان کی صدارت:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اہلِ سنت و جماعت کے ایک عالمِ دین تھے جن کے یہاں اغیار کے ساتھ اکل وشرب بھی جائز نہیں، جن کے یہاں دوسرے دعوے دارانِ اسلام سے مصافحہ ومعانقہ جائز نہیں بلکہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی ممنوع ہے۔ پھر شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ کیسے گوارہ کرلیا، کیا وہ صلح کلی قسم کے سیاست داں تھے؟ کیا ان کے نزدیک تمام فرقہاے باطلہ سے ربط وتعلق اتنی گہرائی کے ساتھ رکھنے میں کوئی قباحتِ شرعیہ نہیں تھی؟ کیا ان کی روشن خیالی کے روبرو یہ سب باتیں روپوش ہوچکی تھیں؟ اور کیا سیاست کے زعم میں حقیقت کا دامن ان کے دستِ اقدس سے چھوٹ گیا تھا؟

یہ سب کچھ نہیں تھا۔ درحقیقت انھوں نے حکمت ودانائی کی باتیں قرآنِ حکیم سے سیکھی تھیں۔ ان کے ذہنِ مبارک میں یہ بات تھی کہ بڑے سے بڑا معاند اپنے مقاصدِ بلند میں کسی لچک کے بغیر ممد ومعاون ثابت ہوتا ہو تو اس سے سیاسی مفاہمت پیدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کے ذہنِ ثاقب میں یہ بات تھی کہ ہمارا بلند مقصد پاکستان میں نظامِ مصطفی قائم کرنا ہے، اس کے قیام میں اگر کوئی ہمارا دست وباز و بنے تو مصلحتِ وقت کے تقاضے کے مطابق اس کو ساتھ لے کر چلنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مزید یہ کہ وہ یہودیت ونصرانیت کی دسیسہ کاریوں اور اس کی تفریق بین المذاہب کی چال بازیوں سے خوب واقف تھے اس لیے وہ سوچتے تھے کہ امتِ مسلمہ ایسے بحرانی دور سے گزر رہی ہے کہ دنیا کے ہر حصے کی اسلام دشمن طاقتیں اسلام ومسلمانوں کا صفایا کرنا چاہتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نکتہ چینی کرنے والے حضرات ایسے مواقع پہ جو ایسی باتیں اٹھاتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے محدود علاقہ ہوتا ہے یا ان کے روبرو ایک شہر یا ایک قصبہ ہوتا ہے، وہ اسی کو سمجھ لیتے ہیں کہ ساری دنیا اسی میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کرۂ ارض کے ہر حصے پر جہاں جہاں مسلمان پائے جاتے ہیں، نگاہ ڈال کر ہم کو ایک لائحۂ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ میں کہہ سکتا ہوں یہ ضعیف البصر لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں۔

میری یہ طویل وضاحت ان نکتہ آفرینوں کے لیے ہے جن کے ذہن وفکر میں وسعت نہیں پائی جاتی اور وہ ہر معاملے کو انتہا پسندی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ نہیں سمجھ پاتے کہ اسی ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش میں ایک تنظیم قائم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ الحاقی مدرسوں کے جتنے مدرسین وملازمین ہیں، ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی جائے، اس میں وہابی، دیوبندی، غیر مقلد، شیعہ، سنی سب شامل ہیں۔ کیا جتنے مدرسے والے اس تنظیم میں شامل ہیں، ان کے اوپر صلح کلی ہونے کا لیبل چسپاں کیا جا سکتا ہے؟ کیا اہلِ سنت وجماعت کے علما و مدرسین اس تنظیم کے رشتے میں منسلک نہیں ہیں؟ ان سب کے متعلق کوئی ناعاقبت اندیش مفتی یا انتہا پسند عالم یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ جتنے سنی علما شامل ہیں، وہ سب صلح کلیت کے دائرے میں محصور ہو گئے۔ عرصۂ دراز سے یہ تنظیم قائم ہے، اس کی پچاسوں نشستیں ہو چکی ہوں گی جن میں اپنی جماعت کے علما بھی شریک ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مل بیٹھ کر مشترک مقصد کے حصول کے لیے اپنی صدا بلند کرتے ہیں۔

ہندوستان کے صوبۂ اتر پردیش کے الحاقی مدرسے محدود دائرے میں رہ کر اپنا ایک پلیٹ فارم بنائے ہوئے ہیں مگر آج تک کسی مفتی یا فاضل نے جراءت نہیں کی کہ ان کے اوپر صلح کلیت جیسے نظریے کے حامل ہونے کا فتویٰ صادر کرے۔ یہ ایسا اس لیے ہوا کہ سب جانتے ہیں کہ اس میں مدارس کے لوگ شامل ہیں، سب کے سب اپنے موقف، اپنے اپنے نظریہ، اپنے اپنے بنیادی عقائد پر قائم ہیں اس لیے ان کے اوپر صلح کلیت کے لیبل کو چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ صلح کل وہ شخص ہے جو تمام مذاہب وملل کو یکساں تصور کرے اور اپنے مخصوص عقائد پر جما نہ رہے بلکہ اس سے منحرف ہو جائے یا اس میں تصلّب نہ رہے۔ رہ گیا وہ شخص جو دوسرے فرقوں والوں سے تعلق محض مشترکہ مفاد کے لیے رکھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عقائد پر جما رہے اور اپنے دین ودیانت پر آنچ نہ آنے دے تو بلاشبہ ایسا شخص صلح کلی نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی وسعتِ فکر:

اس لیے میں کہتا ہوں کہ شاہ صاحب **رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ** کے متعلق جو کم نظر

اس قسم کے اعتراض کا اظہار برملا کرتے ہیں وہ محدود دائرے کے لوگ ہیں، ان کی فکر ونظر میں وسعت نہیں پائی جاتی ہے۔ اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ اپنی جماعت کے بعض سر برآوردہ و معظّمین بھی اس معاملے میں حضرت شاہ صاحب **رحمة اللّٰه تعالىٰ عليه** سے اختلاف رکھتے ہیں۔ میں ایسے معظمین کی بارگاہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ایک ہی جماعت کے یا ایک ہی مسلک کے ماننے والے اہل فکر کی رائے میں اختلاف نہ رہا ہو۔ میں ایسے سر برآوردہ حضرات کے اختلاف رائے کو ان کی نیک نیتی پر محمول کرتے ہوئے ان کے اجتہاد کی قدر کرتا ہوں مگر حضرت شاہ **رحمة اللّٰه تعالىٰ عليه** کی ذاتِ والا صفات بہت بلند و بالا ہے۔ انھوں نے تمام جماعتوں کی سر براہی قبول فرما کر اپنے مسلک کو بلند و بالا رکھنے کی جدوجہد کی۔ بھارت میں جمعیۃ علماے ہند پائی جا رہی ہے، اگر تمام دیو بندی، وہابی، غیر مقلد، شیعہ وغیرہ اس جمعیۃ کے کارکن ہوتے ہوئے مشترکہ مقصد کے لیے جدوجہد کریں اور اس کی صدارت وقیادت کی ذمے داری کسی سنی عالم دین کے کندھوں پر رکھ دی جائے اور وہ سنی عالم دین اس بارگراں کو برداشت کرنے کی نہ صرف صلاحیت رکھتا ہو بلکہ اپنی حکمت عملی سے سنی جماعت کو سرخرو رکھنے کی کوشش کرتا ہو تو اس کی قدر کریں گے۔

میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب **رحمة اللّٰه عليه** نے جمعیۃ علماے پاکستان کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ اپنی جماعت کو بلند و بالا رکھا بلکہ عالمی پیمانے پر دعوتِ اسلام کا پروگرام مرتب کیا اس لیے ان کی ذاتِ والا صفات کے بارے میں صلح کلیت وغیرہ جیسے نازیبا الفاظ موزوں نہیں ہیں بلکہ لائقِ اعتنا نہیں ہیں۔ اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت اپنی جماعت کو پیش کرنا چاہیے تھا کیوں کہ وہ ایسے اپنے مسلک وموقف پر جمے رہے۔ اس قدر متصلب وٹھوس رہے کہ اس سے ان کی ذاتِ والا صفات میں کبھی بھی کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر وہ کسی جلسے میں شریک رہتے اور وہ جلسہ ان کی صدارت میں ہوتا تو بحیثیتِ صدر نہایت والہانہ انداز میں

صلوٰۃ وسلام کھڑے ہوکر پڑھتے ،ان کے اس عمل سے اس جلسے میں جتنے شرکا رہے خواہ وہ وہابی ہوں یا دیوبندی ،سنی ہوں یا شیعہ ،کسی بھی گروہ سے تعلق رکھنے والے ہوں ،سب نے بارگاہِ رسالت میں کھڑے ہوکر سلام پڑھا۔ یہ ان کے متصلب ہونے کی دلیلِ بین ہونے کے علاوہ اس بات کے لیے بھی برہانِ قاطع ہے کہ اپنی جماعت کو ہر معاملے میں وہ سرخرو رکھنا چاہتے تھے اور ان کے رعب ودبدبے کے سامنے سب کو جھکنا پڑتا تھا گو کہ یہ ظاہری جھکاؤ کیوں نہ رہا ہو۔اس ظاہری جھکاؤ سے بھی یہ پیغام جارہا تھا کہ سب کو اس صلوٰۃ وسلام والے مسلک کی پیروی کرنا چاہیے۔

ایک عظیم سیاست داں:

اب تک جو میں نے طویل بحث کی ہے ،ان کی عالمانہ حیثیت ،ان کا تقویٰ وطہارت،ان کی دیانت ودین داری،ان کے اخلاصِ نیت اور اسلامی فکر کی برتری کے بارے میں ہے۔اب ایک نگاہ ان کی سیاسی قیادت پر ڈالتے چلیے کہ وہ کتنے بڑے سیاست داں تھے اور کاروبارِ سیاست میں وہ کتنے بے لوث تھے۔وہ دنیا پرستوں کی طرح سیاست داں نہیں تھے،وہ اتنے عظیم سیاست داں تھے کہ پاکستان کے بڑے بڑے سیاسی قائدین ان کی بارگاہِ بلند میں اپنی نیازمندانہ پیشانی کو خم رکھتے تھے بلکہ ملک کے مہمات مسائل میں مشورہ لینا باعثِ فخر تصور کرتے تھے اور جن سیاست دانوں نے ان کی رائے سے مستفید ہونے کی کوشش نہیں کی، ان کے فرمان پر عمل نہیں کیا تو انھوں نے پاکستانی قوم کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اس کو ذلت وخواری تک پہنچادیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا ،مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے سیاست داں تقسیمِ ہند کی مخالفت کررہے تھے جن میں کانگریسی لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد پیش پیش تھے۔اس بحث سے قطعِ نظر کہ تقسیمِ ہند کا نتیجہ بڑا ہولناک نکلا،مولانا آزاد نے کتاب ’’ہماری آزادی‘‘میں پیشین گوئی کی تھی کہ پاکستان کے دونوں بازو مغربی ومشرقی متحد نہیں رہ سکتے کیوں کہ مشرقی ومغربی پاکستان کی زبان ،ان کا تمدنی ومعاشرتی نظام اور دونوں

کی اقتصادی ومعاشی حالات میں نمایاں فرق تھا۔ پھر ان میں اس قدر فاصلہ تھا کہ اس وسیع وعریض بُعد کو کسی قدرِ مشترک کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا، سوائے دین اسلام کے اس میں کوئی قدرِ مشترک نہیں پائی جارہی تھی اور سیاسی رہنما کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ زبان سے دینِ اسلام کا نعرہ بلند کرتے ہیں لیکن اپنے مفاد، اپنی حکمرانی و ناموری کے مقابلے میں اسلام کو کوئی حیثیت نہیں دیتے ہیں۔ یہ رہنما اسلام کو تو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں لیکن فروغِ دینِ اسلام کے لیے کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ اپنی نفس پرستی اور بوالہوسی کے لیے صوبائی عصبیت کا جذبہ ابھارنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ تقسیمِ ہند کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ''جے بنگلہ'' کا نعرہ لگنا شروع ہوگیا اور صوبائی عصبیت کی ایسی لہریں اٹھیں کہ ان کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بنگلہ دیش جو اس زمانے میں مشرقی پاکستان کہلاتا تھا، اس میں مغربی پاکستان والوں سے مفاد پرستوں نے منافرت و عناد کا جذبہ ابھارنے میں زبردست کامیابی حاصل کرلی کیوں کہ ان سیاسی قائدین کے نزدیک اقتدار حاصل کرنا، خواہ وہ کسی طریقے سے ہو، قتل وخون ریزی کے ذریعے ہو یا آپس میں لڑانے کے سبب ہو، بڑی کامیابی کی دلیل تھی۔ ہزاروں انسان کٹ مرجائیں، ان کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی کیوں کہ ایسے سیاسی رہنما دین و دیانت سے عاری ہوتے ہیں، دنیا پرست و مفاد پرست ہوتے ہیں، ان میں انسانیت کا درد و خلوص وللّٰہیت کا جذبہ نہیں پایا جاتا لیکن مملکتِ پاکستان میں تنہا شاہ احمد نورانی **علیه الرحمه** وہ بلند پایہ سیاست داں تھے جو اسلام کے قدرِ مشترک کو پاکستان کے مختلف صوبوں میں فروغ دینے کی انتھک کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک اقتدار کی کرسی، حکومت کا تختِ شاہی کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

ان کی خواہش وتمنا تھی کہ جب پاکستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے جو توحید و خدا پرستی کے قائل ہیں، نیز نظامِ مصطفی سے وابستہ رہنے میں اپنی سعادت تصور کرتے ہیں تو کسی طرح سے **حبل الله المتين** کے رشتے میں منسلک کر کے ان کو متحد کیا جا سکتا ہے۔ زبانیں مختلف تھیں، صوبے مختلف تھے لیکن اسلام ایک تھا۔ اس کی

مضبوط رسّی تھامے رہنے کی برابر وہ ہدایت فرماتے رہے لیکن سیاسی مفکرین نے (جن کے نزدیک حکومت واقتدار ہی سب سے بڑی کامیابی تھی) ان کی ایک بات بھی نہیں چلنے دی۔ چنانچہ جب مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے انتخاب میں زبردست کامیابی حاصل کرلی اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرلی تو اصولی طور پر یہ ہونا چاہیے تھا کہ زمامِ حکومت شیخ مجیب الرحمن کے حوالے کردی جاتی لیکن اس وقت کے فوجی حکمراں جنرل یحییٰ خان نے محض اپنے اقتدار کی کرسی بچانے کے لیے قومی اسمبلی میں اکثریت کے باوجود شیخ مجیب الرحمن کو حکومت بنانے کی دعوت نہ دی تو اس کے بعد شیخ کے رفقا نے خوب خوب صوبائی عصبیت ولسانی عصبیت بنگالی مسلمانوں میں ابھارااور وہ اتنے ابھر گئے کہ اسلام کو انھوں نے پسِ پشت ڈال دیا۔ حالاں کہ وہ بھی ایک اچھے مسلمان کہلاتے تھے۔ ایسے بحرانی دور میں حضرت شاہ صاحب **علیه الرحمه** نے اپنی قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کارنامہ انجام دینے کی کوشش کی، وہ تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مذاکرات کے ذریعے تمام متنازع مسائل کے حل کرنے کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتے تھے اس لیے انھوں نے شیخ مجیب الرحمن سے ملاقات کرکے ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا۔ موجودہ نازک صورت حال میں ملک کی نیّا پار لگانے میں آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، اس کے سمجھانے بجھانے سے وہ ملک کو متحد رکھنے کے لیے آمادہ ہوگئے تھے لیکن جنرل یحییٰ خان نے جو اقتدار وشراب دونوں کے نشے میں ہمیشہ مخمور رہتے تھے، حضرت شاہ صاحب کے مشورے پر عمل کرنے سے صاف انکار کردیا۔ بالآخر اتنی بڑی تباہی آئی جس کے تصور ہی سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔ مشرقی پاکستان بعنوان بنگلہ دیش الگ ہوگیا، ہزاروں مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوگئے۔ یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ کوئی قوی دلیل نہیں مل رہی ہے جس کی بنیاد پر

دعویٰ کیا جاسکے کہ اگر حضرت شاہ صاحب کے مشورے کو مان لیا جاتا تو بنگلہ دیش کبھی بھی وجود میں نہیں آتا تاہم یہ عین ممکن تھا کہ اگر ان کی صائب رائے پر عمل کیا جاتا تو اتنی جلد بنگلہ دیش نہ بنتا، البتہ ان کی حیاتِ طیبہ کے بعد بنگلہ دیش کا وجود میں آنا قرینِ قیاس تھا۔

یہ ہے حضرت شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت جس کا جائزہ قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک عالمِ دین کے لیے لازم وضروری ہے کہ جب وہ سیاست کی خاردار وادی میں اقدام کرے تو کرسیِ اقتدار اس کا مطمحِ نظر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو فروغِ دینِ اسلام کے لیے کام کرنا چاہیے، مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے تگ ودو ہونی چاہیے، ان کی زندگی کو اسلام کے دستورِ حیات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جیسا کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے ملک پاکستان میں نظامِ مصطفی کے قیام کے لیے اپنی ساری قوت صرف کرڈالی۔ انھوں نے سیاست کو ایک واسطہ تصور کیا تھا، وہ اقتدار کو اس لیے نہیں حاصل کرنا چاہتے تھے کہ خلقِ خدا کی گردنوں پر مسلط ہوجائیں اور اپنے جھوٹے وعدوں سے ان کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیں وہ سیاست کو ایک ایسا ذریعہ تصور کرتے تھے جو ان کے مقصدِ بلند کے لیے ممد ومعاون ثابت ہو۔ لہٰذا ان کے تبصرہ نگار کا یہ دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے:

> ”مولانا شاہ احمد نورانی کو کچھ لوگ محض ایک سیاست داں خیال کرتے ہیں جب کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صرف ایک مولوی ہیں، لیکن ان کی زندگی کے شب وروز کا اگر جائزہ لیا جائے تو حقیقت عیاں ہوکر نگاہوں کے سامنے آتی ہے کہ وہ سچے عاشقِ رسول ہیں، ان کی زندگی کا ہر گوشہ سیرتِ نبوی کا آئینہ دار ہے، وہ آج بھی جمعرات وپیر کو باقاعدگی کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں۔ ۷۳ برس کی پیرانہ سالی کے باوجود ۶۴ برس سے تراویح پڑھاتے ہیں، وہ شب زندہ دار عابد ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص عشقِ نبی کے رنگ میں

رنگ جائے، وہ تہجد میں ڈھائی پارے قرآنِ حکیم پڑھتے ہیں۔“

(ایک عالم ایک سیاست داں:ص ۳۷)

سیاست و دیانت میں بالعموم ایک گونہ تضاد پایا جاتا ہے۔اگر کوئی اعلیٰ درجے کا سیاست داں ہے،تو دیانت وتقویٰ اس کا شعار زندگی نہیں ہوتا اور اگر کوئی شخص تقویٰ وطہارت نفسی میں اونچے مقام پر فائز ہوتا ہےتو وہ سیاست کے پیچ وخم سے واقف نہیں ہوتا لیکن میں انشراحِ صدر کے ساتھ یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کرتا کہ ایشیائی ممالک میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ واحد عبقری شخصیت ہیں کہ سیاست ان کے قدمِ نازکو بوسہ دیتی ہے۔پھراس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ان کی دینداری ودیانت داری اتنی بلند ہے کہ سیرتِ نبویہ **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کی پیروی ان کا شعارِ زندگی تھا۔مصر کے سرکردہ رہنماؤں کے متعلق بڑے زور وشور سے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی رہنما ہوتے ہوئے بھی دین دار تھے لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلے میں ”اخوان المسلمین“ کے قائدین ایک ذرۂ ناچیز کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیاست میں قدم رکھا تو ان کے جذبۂ عشقِ رسول میں کسی قسم کا کوئی انحطاط وتنزل نہیں پیدا ہوا۔یہ محبتِ رسول صرف برِصغیر کے عالمِ دین کے حصے میں آئی۔

دعوت وتبلیغ کے قرآنی اصول پر شاہ صاحب کا عمل:

اپنی جماعت کے خطبا ومقررین بلاشبہ وعظ وتقریر، دعوت وتبلیغ میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ان کی شعلہ بار تقریر دلوں کو گرماتی ہے لیکن چونکہ دعوت وتبلیغ کے قرآنی اصول پر عام طور سے عمل نہیں کیا جاتا ہے اس لیے ان کے پند ووعظ نہ صرف یہ کہ بے سود ہوتے ہیں بلکہ بسااوقات خسارے کا باعث بنتے ہیں اور بجائے اس کے کہ جماعت کا دائرہ وسیع ہو،تنگ ومحدود ہوتا نظر آرہا ہے۔کتنا افسوس ناک المیہ ہے کہ جس عقیدے ونظریے کے ہم قائل ہیں، اس کے ماننے والے روز بروز گھٹتے جارہے ہیں اور ہم مگن ہیں کہ عظیم الشان کارنامہ انجام دے رہے ہیں اور ہماری تحریروں سے بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے۔اگر ان کے وجوہ کا جائزہ لیا

جائے تو سب سے بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قرآنِ حکیم نے دعوت وتبلیغ کے جو اصول بیان کیے ہیں، جب جب اس کی خلاف ورزی کی گئی تو زبردست خسارہ ہوا ہے۔ دعوت وتبلیغ کے تین بنیادی اصول ہیں:

(۱) ایک داعیِ حق کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی حکمتِ عملی پر اپنے مشن کو جاری رکھے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ (النحل:۱۲۵)

ترجمہ: اے حبیب! اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلایئے اور بحث ونزاع ایسے طریقے پر کیجیے جو اچھا ہو، تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں۔

قرآنِ حکیم نے جس حکمتِ عملی و پند وموعظت کی نصیحت فرمائی، انھیں پر عمل پیرا ہو کر حضرت مبلغِ اسلام کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت وتبلیغ کا ایسا فریضہ انجام دیا جو اپنی ذات میں کائنات تھا۔ مجھ پر انتہا درجے کی شفقت ونظرِ عنایت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نہ صرف اپنے محسن بلکہ ملتِ اسلامیہ کے عظیم مجاہد کی شان میں گلہائے عقیدت پیش کروں۔

آپ کی وفاتِ حسرت آیات پر انتہائی صدمے کا اظہار کرتے ہوئے حضرت علامہ غلام رسول سعیدی صاحب فرماتے ہیں:

> ”آہ! ایک دور تھا جو گزر گیا، ایک باب تھا جو بند ہو گیا۔ یقینا وہ راستے آپ کو یاد کرتے ہوں گے جہاں سے آپ کا رزق آتا ہے اور آپ کے اعمالِ صالحہ اللہ کی راہ میں پیش کیے جاتے تھے۔ تمام عمر عظمتِ ناموسِ رسالت کا جھنڈا تھامے رکھا اور گرنے نہیں دیا“۔
> (تجدید واحیاے دین کا جہان: ص ۱۱۷)

مشہور عالمِ دین غزالیِ دوراں حضرت علامہ مولانا سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ہزاروں کے اجتماع میں فرمایا:

''مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی عالمِ اسلام کے قائد ہیں۔ ان کا وجود اللہ کی رحمت ہے، وہ متقی و پرہیز گار اور جید عالمِ دین ہیں۔ ان کی قیادت و رہنمائی ہی میں اہلِ سنت کا فائدہ ہے۔ میں احمد سعید کاظمی مولانا کے تمام فیصلوں کا پابند ہوں، میں ان کو اللہ تعالیٰ کا ولی سمجھتا ہوں۔ وہ میرے قائد ہیں، میں ان کا ایک رکن ہوں۔ ان کی مخالفت گناہ اور ان کی قیادت اللہ کی رحمت ہے''۔ (تجدید و احیائے دین کا جہان: ص ۱۲۶)

اور یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ آپ نے کبھی بھی ایسا مجادلہ نہیں کیا جو باعثِ نفرت اور بے زاری ہو بلکہ اپنی شیریں کلامی، اپنی نصیحت آمیز گفتگو سے عوام، پڑھے لکھے لوگوں کے قلوب کو بھی خوب خوب متاثر کیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جماعتِ اہلِ سنت کے سرکردہ افراد ہی آپ کی شخصیت سے متاثر ہوئے ہوں بلکہ سچائی یہ ہے کہ آپ کی حکمتِ عملی و وعظ و پند سے اغیار بھی آپ کی بارگاہ میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ اگر آپ نے قرآنِ حکیم کی حکمت پر عمل نہ فرمایا ہوتا تو ایسے لوگ جو نظری طور سے آپ کے مخالف تھے، وہ قطعاً آپ کو اپنا پیشوا اور رہبر تسلیم نہ کرتے۔ اس سچائی سے کون انکار کرسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی ایسی پراثر شخصیت تھی کہ وہ لوگ جو دیوبند و ندوہ کی فضیلت کی ڈگری لیے پھرتے تھے اور جن کو اپنی ہمہ دانی کا زعمِ باطل تھا، وہ بھی آپ کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کیے نظر آتے ہیں۔ کیا مجادلہ آرائی کے غیر مناسب طریقے سے، مجلسِ مناظرہ کے منعقد کرنے یا اشتعال سے لبریز تقریروں سے وہ متاثر ہوئے تھے؟ ایسے وعظ و پند تو قلوبِ انسانی کو متاثر کرنے کے بجائے ان میں عناد و نفرت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور یہ جذبہ وہ چیز ہے جو تبلیغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ اس کو دور کرنا اور اچھی نصیحت سے لوگوں کو مائل کرنا ہر داعیِ حق کے لیے ضروری

ہے۔اس پر مکمل طور سے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے عمل کیا تھا۔انھوں نے بغض وعناد کی ساری دیواریں مسمار کردی تھیں۔نفرت و بے زاری کے طریقے پر عمل کرنے کے بجائے حکمت وموعظت سے قلوبِ انسانی کو مسخر کیا تھا۔اپنی قیادت کا وہ جوہر قوم وملت کے سامنے پیش کیا تھا جس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی ہے۔اسی وجہ سے بجا طور سے آپ کو''قائدِ اہلِ سنت'' کے لقب سے یاد کیا گیااس لیے کہ قائد کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنوں اور غیروں سب پر گہری نظر ڈالے،اپنے جوہرِ بلاغت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مقتضاے حال اور مقتضاے زمانہ کے مطابق اپنا مشن جاری رکھے ورنہ ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر قائد اپنی جدوجہد،اپنی جگر کاوی،اپنی جگر سوزی ،اپنی محنت وجانفشانی کے ذریعے کسی مادی منفعت کا خواستگار نہ ہو،دنیا کی تمام آلائشوں وخواہشوں سے مستغنی ہوکر رضاے حق کے لیے اور خدمتِ خلق کی خاطر فروغِ اسلام کا کام کرے۔قرآنِ حکیم نے انبیاے کرام کی زبانِ اقدس سے نکلے ہوئے کلماتِ طیبات کی حکایت کی ہے:﴿اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ **(سورۂ یونس: ۷۲)**

میرا اجر صرف اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا کہ اس کے اطاعت گزاروں میں سے رہوں۔

سورۂ ہود میں فرمایا گیا ہے:﴿اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ **(سورۂ ہود: ۵۱)**

میرا اجر صرف اس ذات کے ذمۂ کرم پر ہے،جس نے مجھ کو پیدا کیا،تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

اس آیتِ کریمہ میں حضرت ہود **علیہ السلام** کی زبانِ مبارک سے جو اعلان کیا گیا،اس کی بلاغت لائقِ توجہ ہے۔فرمایا گیا جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو زندگی اور معیشت اس کے ذمۂ کرم پر ہے،اس لیے دعوتِ حق کے صلے میں بندگانِ خدا سے

اجر و مزدوری کا طلب گار ہونا عقل کے خلاف ہے۔سورۂ شعرا میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الشعراء:180)

میں تم سے اس دعوت پر کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں۔ میرا اجر تو جہانوں کے پروردگار کے ذمہ کرم پر ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس اصول پر مکمل طور سے عمل کیا، وہ بڑے زبردست عالم و فاضل تھے۔ دنیا والوں کے مادی فائدے سے بالکل بے نیاز رہ کر زندگی گزاری اور تاحیات اسلام کی خدمت کا نمایاں فریضہ انجام دیا۔ وہ حرص و طمع سے بالکل بے نیاز رہے۔اگر وہ اپنے پاس اس دارِفانی کے مال و دولت کے جمع کرنے کا ارادہ فرماتے تو وہ کروڑوں کے مالک ہوتے۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں ان کا قیام تھا لیکن کسی عظیم الشان بلڈنگ میں نہیں رہتے تھے بلکہ مولانا معین الحق علیمی کا بیان ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ یہی وہ بات ہے جو ان کی بےلوثی و بےنفسی کی وجہ سے تمام معاصر مبلغین و قائدین سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ برصغیر کے مقررین و خطبا کو اگر آپ غور سے دیکھیں یا ان کے رہن سہن کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ ان کے اندر شانِ استغنا نہیں پائی جاتی لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ کا اگر مطالعہ کریں تو آپ کو ان کے بارے میں یہ یقینِ کامل ہوگا کہ ان کی ذاتِ بابرکات میں شانِ استغنا ان کا وصفِ خصوصی ہے۔ میں طوالت کے خوف سے ایسے نظائر و شواہد سے صرفِ نظر کرتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حرصِ دنیا سے بالکل بےزار تھے۔اس بنا پر کوئی عقل مند آدمی ان کو موردِ الزام نہیں قرار دے سکتا کہ ان کی ساری تگ و دو، ان کا جہدِ مسلسل دنیا کے لیے تھا۔

(۳) تیسرا اصول یہ ہے کہ کوئی داعیِ حق اپنی دعوت و تبلیغ میں کامیابی و کامرانی کی منزل طے نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے دل میں خلقِ خدا کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا

جذبہ موجزن نہ ہواور اس کی غلط کاریوں اور گمراہیوں سے قلق واضطراب میں مبتلا نہ ہوجاتا ہو۔آپ اگر قرآن وحدیث کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ حضورصلی اللہ علیہ وسلم ہدایت ورہبری کے معاملے میں انسانیت کے سچے بہی خواہ و ہمدرد تھے۔رات رات بھر اسی غم میں ڈوبے رہتے تھے۔خدائے قدوس کی بارگاہ میں اپنی پیشانی جھکا کر دعا کرتے تھے کہ گمراہ انسان کو ہدایت پر لگادے۔اس غم میں اتنا گھل گئے تھے کہ قرآنِ حکیم نے آپ کے متعلق یہ ارشادفرمایا کہ:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾(الکھف:٦)

تو ممکن ہے آپ ان کے پیچھے غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرڈالیں گے،اگر وہ قرآنِ مقدس پر ایمان نہ لائیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عاشقِ رسول و نائب رسول تھے۔وہ سیرتِ نبوی کی پیروی کو اپنا سرمایۂ افتخار تصور کرتے تھے۔تہجد کی نماز ان کے اوپر فرض نہیں تھی لیکن وہ اسے پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔وہ رات کی تنہائی وسناٹے میں بڑے درد وکرب کے ساتھ دعا کرتے تھے۔ان کی دعا اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتی کہ دنیا میں ان کو ترقی عطا فرمائے۔ان کی دعا کا خاص محور قوم وملت کی فلاح وبہبود تھی۔ان کی آنکھیں اس وقت نم ناک ہوجاتیں تھیں یعنی انتہائی رقیق القلب ہوجاتے تھے،جب ملتِ اسلامیہ کے عروج وارتقا کے لیے دعا کرتے تھے۔وہ اس فکر میں ڈوبے رہتے تھے کہ جس قوم نے دنیا کو جہاں بانی کا درس دیا تھا وہی قوم آج ذلت وخواری کے عمیق غار میں پڑگئی ہے۔وہ دعا فرماتے تھے کہ اے رب ذوالجلال!اس قوم کو سربلندی عطا فرما،اس کو عقل ودانش سے سرفراز فرما۔وہ خود ارشادفرماتے ہیں:

”آج احقر بڑے ادب واحترام، بصد عجزونیاز چند گزارشات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ہمارے لوگوں کی ایسی

حالت ہے کہ اس نے میرے جیسے کتنے حسّاس لوگوں کو تڑپا رکھا ہے۔‘‘

یہ چند جملے جو آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، اس سے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جس ذاتِ اقدس کے وہ عاشق وشیدا تھے، جس پر اپنی جان کو نثار کرنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسی کے آئینۂ سیرت میں دیکھ رہے تھے کہ اس وقت تک کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا جا سکتا جب تک کہ قوم وملت کی خیر خواہی، اپنے پرائے سے ہمدردی کا جذبہ خانۂ قلب میں مستتر نہ ہو۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ انسانیت کی خیر خواہی کے جذبے سے سرشار ہو کر دعوتِ حق کا پیغام تمام انسانوں کو پہنچاتے تھے۔ یہی ان کا خلوص ہے، یہی ان کا جذبۂ دروں ہے جو ہمیشہ ان کو بے قرار رکھتا تھا۔ کبھی بھی ان کے دل بے قرار کو قرار نہیں آیا۔ یہ باریک نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے خلوص سے انھوں نے ایک بڑی جمعیت کو راہِ راست پر لگانے کی کوشش کی اور اسی خیال میں ہمیشہ سرگرداں و پریشاں رہتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے متعلق الفاظ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کی عظیم شخصیت کا جائزہ لینے میں کوئی جانب داری کا پہلو میرے سامنے نہیں تھا۔ میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ اس دنیا میں خصوصاً برِ صغیر ہند و پاک میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ابھری جس کے اندر یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہو کہ اپنے پرائے سب کو اپنی قوتِ تاثیر سے صحیح راستہ پر گامزن کرنا اپنا دینی واخلاقی فریضہ تصور کرتا ہو۔ صرف ان کی ذات تنہا تھی جو اپنی جماعت اور اغیار دونوں کے لیے لائحۂ عمل بن سکتی تھی۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو ایسا ذوقِ سلیم عطا فرمائے کہ جب ہم قوم وملت کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائیں تو ہمارے سامنے قرآنِ حکیم کے اصول وسیرتِ نبوی کا دستور ہو اور ہم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح دینِ اسلام کی خدمت کے لیے تڑپتے رہیں۔ آمین!

کاش! قومِ مسلم ان کے نقشِ پا کو سینے سے لگاتی تو وہ کامیابی وکامرانی کے بہت سے منازل طے کر لیتی۔

❁❁

حسان الہند مفتی رجب علی رحمۃ اللہ علیہ

عالم نحریر، فاضل شہیر، حضرت مولانا مفتی رجب علی **رحمة الله عليه** سے میں عہد طالب علمی سے واقف ہوں، جب کہ میں تلشی پور کے مشہور ادارہ انوار العلوم میں زیر تعلیم تھا، وہ برابر وہاں کے سالانہ اجلاس میں ہر سال مدعو کیے جاتے تھے۔

سلطان المناظرین حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب **رحمة الله عليه** مدرسہ انوار العلوم کے ناظم اعلیٰ تھے،ان کے زیر اہتمام نہایت نظم وضبط و باقاعدگی سے سالانہ اجلاس ہوتے تھے، بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نظم نذرانہ عقیدت پیش کرنے والوں میں سب سے زیادہ محبوب ومقبول حضرت مولانا مفتی رجب علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے ،کیوں کہ وہ نعت شریف اپنے مخصوص لہجہ، انوکھے انداز میں جب پڑھتے تھے تو سامعین پر کیف وسرور طاری ہوجاتا تھا،اپنی ترنم ریزی ونغمہ سرائی سے ان کو مدہوش و بے خود بنادیتے تھے، پورے مجمع پر سناٹا طاری ہوجاتا تھا،صرف داد وتحسین کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

خوش الحان اور سریلی آواز میں نعت شریف پڑھنے والے شعرائے کرام کے تعارف کے وقت عندلیب گلشن رسالت،بلبل باغ مدینہ،طوطی نغمہ سرا وغیرہ الفاظ سے ان کی عزت افزائی کی جاتی ہے،اور فی الواقع جو شعرائے کرام نعتیہ کلام سے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں، وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کی عزت وتوقیر کی جائے،کس کو نہیں معلوم کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابت **رضی الله عنه** کو ان کی نعتیہ شاعری پر بہت نوازتے تھے،اور ان کے لیے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منبر شریف پر بیٹھ کر نعتیہ کلام پڑھنے کی تلقین وفرمائش فرماتے تھے،لیکن ساری نوازشیں والقاب وآداب ان شعرائے کرام کے لیے ہونا چاہیے جن میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جذبہ صادق پایا جائے، جو نیکوکاری و پرہیزگاری کے وصف سے متصف ہوں،اس لیے میری نظر میں حضرت مولانا مفتی رجب علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات پر عندلیب گلشن

رسالت وغیرہ معزز لقب خوب خوب چسپاں ہیں، وہ صرف نعت خواں شاعر نہیں تھے بلکہ اسلام کے شرائع واحکام کے پابند، تقویٰ و پرہیزگاری کے زیور سے آراستہ صف اول کے عالم دین تھے، اگرچہ نعت خوانی میں ان کو امتیاز کا درجہ حاصل تھا، کیوں کہ جب وہ اپنے پردرد الفاظ میں نعت شریف پڑھتے تھے، تو سننے والے پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، اور وہ رقیق القلب ہو کر مست و بے خود ہوجاتا تھا، لیکن یہ ان کی شخصیت کا ایک مستحسن وروشن پہلو ہے، ان کی ذات بابرکت کو اسی ایک دائرہ میں محصور رکھنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی، بلکہ وہ اچھے خطیب ومقرر، اعلیٰ درجہ کے فقیہ ومفتی، قرآن حکیم اوراحادیث کریمہ پر گہری نظر رکھنے والے عالم دین ہونے کے علاوہ مکارم اخلاق سے بھی متصف تھے، وہ نہایت سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے، لیکن ان کی سادگی بہت دل ربا تھی، ان میں بناوٹ، تصنع کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

ادھر ان سے میری ملاقات بہت کم رہی، ممبئی میں دوتین مرتبہ ان کی زیارت سے مشرف ہوا، اور جب بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی تو میں ان سے بے حد متاثر ہوتا تھا، تین چار سال پہلے کا واقعہ ہے کہ میں مصطفیٰ بازار میں مقیم تھا، میرے شاگرد رشید، مولانا معین الحق علیمی صاحب (علیہ الرحمہ) نے علی الصباح مجھ کو یہ اطلاع دی کہ رات میں منشی ماسٹر رجب علی صاحب کا انتقال پرملال ہوگیا، ادھر سے جنازہ گزرے گا، ناریل واڑی قبرستان میں ان کو سپرد خاک کیا جائے گا، آپ بھی ان کی نماز جنازہ ودعاے مغفرت میں شرکت فرمائیں ، کیوں کہ مرحوم آپ سے قلبی لگاؤ رکھتے تھے، جنازہ کے ساتھ جب قبرستان میں مسجد کے سامنے پہونچا تو وہاں سفید پوش کرتا و پائجامہ میں ملبوس ایک بزرگ کو دیکھا، نہایت سادہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے، لیکن چہرے بشرے سے وقار وسنجیدگی اورنورانیت ٹپک رہی تھی، وہ بالکل خاموش عام آدمی کی طرح ایک طرف کھڑے تھے، ان کے ہمراہ نیازمندوں اورارادت مندوں کا کوئی گروہ نہیں تھا، وہ اس وقت کسی سے گفتگو کرنے کے روادار نہیں تھے ، ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ کسی اوردنیا کی سیر کررہے ہیں، غالباً وہ اس شہر خموشاں سے عبرت حاصل کررہے تھے، جس کے سبب ان کے دل میں خشیتِ الٰہی وخوف آخرت طاری تھا، حقیر

راقم الحروف نے مولانا علیمی سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں جو تفکر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں، مولانا موصوف نے کہا کہ حضرت کیا آپ ان کو نہیں پہچانتے ہیں؟ یہ ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے عالم دین، حضرت مولانا مفتی رجب علی صاحب ہیں، مصطفیٰ بازار کی بڑی مسجد میں عرصہ تک خطیب وامام رہے، اب بھی اس محلہ میں ان سے عقیدت ومحبت رکھنے والے اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور ممبئی شہر میں ان کا حلقہ ارادت وسیع ہے، ان کے مریدین ومتوصلین مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مولانا علیمی صاحب کے تعارف سے میں حیرت واستعجاب میں پڑ گیا کیوں کہ میں سوچنے لگا کہ ایک بلند رتبہ عالم دین اس سادگی سے استغراق کے عالم میں قبرستان میں موجود ہے، ان کو تو کوئی عالم دین کیا ایک معمولی انسان بھی تصور کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوگا، لیکن ان کی نیکوکاری ودینداری، تواضع وفروتنی کی شہرت میں نے بہت پہلے سے سنی تھی، اور یہ غور کرنے پر مجبور ہو گیا کہ دلکش وضع وقطع اور دیدہ زیب لباس فاخرہ ظاہر بیں نگاہوں میں قبولیت کا سبب بنتا ہے، اور کبھی انسان تھوڑا بہت مرعوب بھی ہو جاتا ہے اور کچھ لوگوں کے دلوں میں جھکاؤ پیدا ہوتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ انسان کی عظمت وبڑائی، اس کی سربلندی وسرفرازی کا راز اس کے مکارم اخلاق، اس کے دین ودیانت اور دین اسلام کی ترقی وفروغ میں اس کی جدوجہد میں مضمر ہے، اور اس کے بہترین نمونہ حضرت مولانا مفتی رجب علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، اگر ان کی ساری خوبیوں کو فراموش کر دیا جائے اور آخرت کے کام آنے والے ان کے تمام اعمال صالحہ سے صرف نظر کر لیا جائے جب بھی ان کے مرتبہ کے بلندی کے لیے جذبۂ عشق نبی سے شرسار ہو کر ان کی نعمت گوئی بہت کافی ووافی ہے، اور کون سی ایسی خوبی تھی جو اس پیکر اخلاص وعالم باعمل میں نہیں پائی جاتی تھی جو مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہو، ان کی ایک ایک خوبی یاد آتی ہے تو دل میں سوز وگداز پیدا ہوتی ہے، دعا ہے کہ مولائے کریم ملت اسلامیہ کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور ان کے روحانی فیوض وبرکات سے ہم سب کو مالامال فرمائے، نیز ان کے مراتب ودرجات بلند فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

حضور حافظ ملت کا ایک نامور تلمیذ رشید

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى، وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ“ (الشوری: ۲۳)۔

آل رسول کی عظمت:

تم فرمادو اس پر (تبلیغ رسالت پر) تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت کی محبت اور جو نیک کام کرے ہم اس کے لیے اور خوبی بڑھائیں گے بیشک اللہ بخشنے والا قدر فرمانے والا ہے۔

مشہور مفسر قرآن حضرت العلام صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت واجب ہوئی تو سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کس قدر محبت فرض ہوگی۔ آیت کریمہ کا معنٰی یہ ہے کہ میں ہدایت وارشاد پر کچھ اجرت نہیں چاہتا، لیکن قرابت کے جو حقوق تم پر واجب ہیں ان کا لحاظ کرو، اور میرے قرابت والے تمہارے بھی قرابتی ہیں، انہیں ایذا نہ دو، حضرت سعید بن جبیر **رضی اللہ عنہ** سے مروی ہے کہ قرابت والوں سے مراد حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل پاک ہیں۔

میں نے جب اس آیت کریمہ پر غور کیا اور اس کے سبب نزول کو بھی پڑھا پھر حضرت سعید ابن جبیر کی روایت پر میری نظر پڑی تو میرا دل آل پاک کے احترام اور ان کی محبت وعقیدت کے جذبہ سے لبریز ہوگیا، اور میری آنکھوں سے حجابات اٹھنے کے بعد شدت

کے ساتھ میرے اوپر یہ احساس طاری ہوا کہ جو خاندانی شرافت، علومرتبت حضرات سادات کرام کو حاصل ہے وہ دنیا میں کسی مسلمان کو میسر نہیں آ سکتا، ان کی عظمت شان کا یہ عالم ہے کہ وحی الٰہی نے ان کی قرابت کا لحاظ و پاس امت مسلمہ پر لازم گردانا، لیکن دل میں یہ خیال آیا کہ اس عالم رنگ و بو میں خدا جانے کتنے آل رسول پائے جاتے ہوں گے، جو اسلام کے شرائع و احکام کی پابندی نہیں کرتے، کتنے ایسے سادات کرام ہیں جن کا دامن قدس تقویٰ و پرہیز گاری کے رنگ سے رنگین نظر نہیں آتا، وہ صوم وصلوٰۃ کے بھی پابند نہیں رہتے، پھر کیا ایسے سادات کرام کا احترام اوران کی تعظیم وتوقیر، ان کے ساتھ خلوص ومحبت کے ساتھ پیش آنا، ہمارے اوپر لازم ہے؟ یہ وسوسہ صرف میرے ذہن کی پیداوار نہیں ہے، خدا جانے کتنے لوگوں کے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات آتے رہتے ہوں گے۔

ایک شبہہ کاازالہ:

اس طرح کے وسوسہ اور خیال سے میں اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اور میرے نہاں خانہ قلب میں یہ بات جاے گیر رہتی ہے کہ آیت کریمہ کی روشنی میں آل رسول کا پاس ولحاظ رکھنا اوران کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آنا، ہر حالت میں ضروری ہے، کیوں کہ ان کو آل رسول ہونے کے ناطے جو سیادت حاصل ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے، البتہ دوسرا شخص جو خاندان رسالت سے تعلق نہ رکھتا ہو وہ اپنی پرہیز گاری و نیکوکاری، اپنی دیانت و دینداری کے سبب، شرافت اور عزت کے اعلیٰ معیار پر پہنچ سکتا ہے، غالباً اس میں کسی کو کلام نہیں ہوگا۔

اس موقع پر یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد پاک رسالت میں حضور **علیہ الصلوٰۃ والسلام** کے جو قرابت دار پائے جاتے تھے، ان کی محبت کی تلقین وہدایت آیت کریمہ میں ہے، کیوں کہ سبب نزول کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ انہیں کے بارے میں آیت کریمہ نازل ہوئی ہے۔

اس شبہہ کا ازالہ یوں ہو جاتا ہے کہ اس قسم کا استدلال محض وہم وسفسطہ ہے، کیوں کہ سبب نزول اگر چہ خاص ہوتا ہم اس کا حکم زمان ومکان کے قید سے بلند وبالا ہوتا ہے، اس لیے میرا یہ دعویٰ صداقت پر مبنی ہے، کہ آل رسول کسی زمانے میں پائے جائیں، اور کسی ملک میں سکونت پذیر ہوں، آیت کریمہ کے ارشاد کے مطابق امت مسلمہ کو ان کی تعظیم وتوقیر میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ سادات کرام اپنی خاندانی وجاہت وشرافت کے باعث دوسرے مسلمانوں سے ممتاز ومنفرد مقام رکھتے ہیں، ان کی ذات بابرکات یا ان کے جسم اطہر میں سیادت کا خون جوروان دواں رہتا ہے، اگر اس پر کسی شفیق مربی یا مہربان استاد کی شفقت وعنایت سے ان کو تربیت حاصل ہوجائے، تو یہ سونے پر سہاگے کا کام دے گا۔

حضرت سید صاحب کی وارفتگی:

پیر طریقت عالم نبیل حضرت مولانا سید کمیل اشرف صاحب مدظلہ العالی کو جو خاندانی شرافت حاصل ہے اس کی رو سے ان کی شخصیت بلند وارفع مقام پر فائز ہے، لیکن ان کے عمل وکردار کی بلندی کا جو گوہر آبدار ان کی ذات میں جگمگا رہا ہے، وہ حضرت حافظ ملت محدث مراد آبادی کی تربیت اور ان کی شفقت وعنایت کا نتیجہ کہنے میں میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کرتا، دارالعلوم اشرفیہ کے دوران تعلیم وہ حافظ ملت **نوراللہ مرقدہٗ** کے عزیز ترین تلامذہ میں سے تھے، ان کی شخصیت کے نکھارنے میں بہت کچھ آپ کی تربیت کا اثر ہوا، وہ اپنے عہد طالب علمی میں ایک مومن پارسا ''ایک پیر دانا'' کے ہمراہ سفر وحضر میں رہے، وہ ہر وقت ان کی شہزادگی کا خیال رکھتا ہے۔

حضرت حافظ ملت **علیہ الرحمہ والرضوان** کو حیرت انگیز قوت تسخیر حاصل تھی، جو ان کی صحبت میں رہتا تھا وہ اس کے دل ودماغ پر اس قدر چھا جاتے تھے کہ وہ سمجھنے لگتا تھا کہ حضرت کی شفقت وعنایت، پیار ومحبت کا جو سایہ میرے اوپر ہے، دوسرے نیازمندوں پر نہیں ہوسکتا، اس حقیر پر تقصیر کو بھی حضرت کی قدم بوسی اور آپ کے زیر سایہ کافی دنوں تک

رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے، اس نا کارہ پر یہی احساس طاری رہتا تھا کہ عصر حاضر کا یہ پیکرِ علم وعمل جس کی دانش گاہ عظیم سے کتنے مفکر پیدا ہوئے، کتنے محدث وجود میں آئے، کتنے متکلم ومورخ نے اپنے علم وفن کا مظاہرہ کیا، کتنے خطیب ومقرر اپنی تقریر ووعظ کے ذریعہ زمانے سے اپنی عظمت کا لوہا منوا لیا، کتنے ادیب وصحافی اپنے ادب وصحافت کی قوت سے بڑی شہرت وناموری حاصل کی، کتنے درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے والے ایسے ہیں جنھوں نے آپ کے نقش پا کو اپنے سینہ سے لگایا، اور مراحل حیات میں بہت کامیاب وکامران رہے، میں کہاں ایسے اہل علم اور فضلاے روزگار کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے لائق ہوں، لیکن میں بھی اپنی عقیدت مندی اور خوش فہمی سے سے یا سادہ لوحی سے حضور حافظ ملت کی حیات پاک تک نہیں بلکہ اس دار فانی سے رحلت فرمانے کے بعد اب تک اس خیال میں مگن رہتا ہوں کہ مرشد برحق نے اپنے ایک نیاز مند کسان زادہ کو اس بلندی تک پہنچا دیا جس پر وہ جتنا بھی ناز کرے کم ہے اور مستقل میرے ذہن میں یہ خیال جما رہتا ہے کہ حضور حافظ ملت **علیہ الرحمۃ والرضوان** کے نوازشات وعنایات کی بارش اس ذرہ ناچیز پر بہت زیادہ رہی۔

پھر ہمارے ممدوح مکرم پیر طریقت حضرت مولانا سید کمیل اشرف صاحب پر کتنی نوازشیں اور کرم فرمائیاں ہوئیں ہوں گیں، ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ جس خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں ان سے گہرے روابط اور خود سید صاحب کے خصائل حمیدہ کے بنا پر ان کی تعلیم وتربیت کی طرف حضرت حافظ ملت خصوصی توجہ مبذول فرماتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ سیادت کے مرتبہ پر فائز ہونے اور اپنے ارادت مندوں میں نہایت محبوب ومقبول ہونے کے باوجود جب حضور حافظ ملت کا تذکرہ جمیل ان کے روبرو کیا جاتا ہے تو ان پر بے خودی اور وارفتگی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے، کہ وہ جھوم جھوم جاتے ہیں اور خود اپنی زبان فیض ترجمان سے آپ کے اخلاق عالیہ، آپ کے اوصاف کریمہ، آپ کی خلوت وجلوت، آپ کے زندگی کے واقعات، آپ کے عادت واطوار اس خوش اسلوبی سے بیان

کرتے ہیں کہ دوسروں سے ایسا اظہار عقیدت کم دیکھنے میں آیا، معلوم ہوتا ہے کہ ایک تلمیذ رشید اپنے استاد کریم کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے، بلکہ حضور حافظ ملت کے صاحبزادے جب ان سے ملاقات کرنے کے لیے تشریف لاتے ہیں تو اپنے مخدوم زادہ کے ساتھ ایسی عزت وتوقیر کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ جس کی مثال معاصرین میں نایاب ہے، اور اپنی مسند پر اپنے ساتھ بیٹھانے میں سید صاحب کوئی عارنہیں محسوس کرتے، جب تک عزیز ملت، مخدوم زادۂ محترم ان کے یہاں رہتے ہیں سید صاحب ان کی تعریف وتوصیف اور ان کی ذات سے اپنا ربط وتعلق اس اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ دوسرا سن کر حیران رہ جاتا ہے، بڑی فراخدلی اور دریا دلی سے اپنے مریدین کے حلقہ میں ان کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ میرے مخدوم زادہ ہیں، میرے استاد کامل کے فرزند بلند اقبال ہیں، یعنی ان کو بڑی عزت و وقار کا مقام عطا فرماتے ہیں، اور ان کے ساتھ نہایت فروتنی اور انکساری کے ساتھ پیش آنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے، حافظ ملت سے وابستگی اور انتہائی عقیدت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے اس طرز عمل کا اظہار برابر کرتے رہتے ہیں، اور جب بھی حضور حافظ ملت **نور اللہ مرقدہٗ** کا تذکرہ جمیل کسی نہج سے آجاتا ہے تو ان کے روحانی فیض کو خوب خوب اجاگر کرتے ہیں، اس سلسلہ کے ایک واقعہ کو میں کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا تھا وہ یہ ہے کہ:

سید صاحب کی حکیمانہ تقریر کا اقتباس

ایک مرتبہ حضرت سید صاحب **مدظلہ العالی** نے ''المدینہ مسجد'' میں بہت عمدہ تقریر فرمائی اور اپنے سلسلہ وعظ کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ کائنات ہستی ایک مسلسل نظام فطرت پر قائم ہے، جس کا ہر درجہ دوسرے درجہ سے بلند ہے، اور کائنات کی یہ ترتیب مشاہدہ سے جانی جاسکتی ہے، پہلے جمادات کو لو، نہ اس میں حرکت ہے نہ نمو، احساس ہے نہ ارادہ، نطق ہے نہ ادراک کلیات کی قوت، اس کے بعد نباتات کا درجہ آتا ہے، جس میں حرکت ونمو پائی جاتی ہے، اس میں بڑھنے پھولنے پھلنے کے قویٰ موجود ہیں، لیکن ان میں

احساس نہیں ہے،اور ارادہ ہے نہ قوت ادراک، بلکہ وہ فطرت کے نظام کے ساتھ ایسے مربوط ہیں کہ زمین سے اپنی غذا حاصل کر سکتے ہیں، وہ بڑھتے بھی ہیں ،مگر دوسرے قویٰ جن سے احساس کا سر چشمہ ابلتا ہے، یا جن سے ارادہ پیدا ہوتا ہے، یا جن سے ادراک کی صلاحیت ابھرتی ہے وہ ان سے بالکل عاری نظر آرہے ہیں،اس سے آگے بڑھیے تو حیوانات کا درجہ ہے، ان میں وہ تمام خواص و اوصاف پائے جاتے ہیں جو نباتات میں ہوتے ہیں،ان کے سوا ان میں قوت ارادی ہے اور احساس کا جوہر بھی پایا جاتا ہے،اس سے آگے چلیں،تو انسان پر آپ کی نظر پڑے گی ،اس میں سب کچھ ہوتے ہوئے ایسی قوتیں ودیعت کردی گئیں ہیں، جو جمادات ونباتات وحیوانات میں نہیں پائی جاسکتی ہیں، وہ اپنی فکر سے ایسا کارنامہ انجام دے سکتا ہے، کہ ساری خلقت کی اشیا نہیں انجام دے سکتیں، وہ کلیات سے نتائج اخذ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، یہ تمام مخلوقات ایسی ہیں جن میں درجہ بدرجہ ترقی پائی جارہی ہے،اور یہ ترقی اتنے اعلیٰ معیار کی ہے کہ غور وفکر سے عقل انسانی حیران وششدر رہ جاتی ہے،اور اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اس کائنات کا اگر کوئی مرکزی نقطہ ہے تو وہ انسان ہے، پھر انسانوں میں غور کرو تو بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ مناظر قدرت کو دیکھ کر وہ کچھ بھی متاثر نہیں ہوتے ، کتنی ایسی چیزیں ان کے پاس سے گزر جاتی ہیں، جن میں اگر وہ غور وفکر کرتے تو ان کو درس عبرت ملتا، ان کے برخلاف کچھ دوسرے انسان ایسے ہیں، جو معمولی واقعات وحادثات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتے ہیں، کوئی فلسفی اور دانشور ہوتا ہے،کوئی زمان ومکان کی وسعتوں میں اپنی فکری جولانی سے بہت بلندی پر پہنچ جاتا ہے، پھر جب عام انسانوں کی یہ بات ہے تو خدائے قدوس کے وہ مخصوص بندے جن کا آئینہ قلب صاف وشفاف ہوتا ہے، جو براہ راست عالم قدس سے تعلق رکھتے ہیں، جو اس زمین پر بیٹھے بیٹھے عالم لاہوت کی چیزوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، ان کی عظمت وبڑائی کا ادراک عام لوگ کیسے کر سکتے ہیں؟ عام لوگوں کی بات چھوڑیئے جو اپنی عقل ودانش سے اس عالم سفلی میں بڑے بڑے انکشاف کا مظاہرہ کرتے ہیں، کیا ان کا فہم وادراک ان خدا کے نیک بندوں کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ،معلوم ہوا کہ انبیائے کرام **علیہم السلام**

اور خدا کے دوسرے نیک بندے جس اعلیٰ مقام پر فائز رہتے ہیں، وہاں تک رسائی بڑے بڑے عقلا اور حکما کی بھی نہیں ہوسکتی، اس لیے حضرات انبیا **علیھم السلام** کے معجزات اور اولیاے کرام کی کرامات خوارق عادت اگر عقل انسانی کی گرفت میں نہ آئیں اور ان کی مادی توجیہ دشوار ہو تو ان کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضور حافظ ملت کا روحانی تصرف:

حضرت سید صاحب کی تقریر کا یہ اقتباس میں نے اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے اور قدرے طویل ہو گیا ہے، انہوں نے جس عالمانہ انداز سے اپنے سامعین سے خطاب کیا تھا، وہ قابل رشک تھا، اور تفہیم اتنی نرالی تھی کہ اپنی حکمت کی باتوں کو یا فلسفیانہ مسئلہ کو اس طرح سمجھا دیا، کہ لوگوں پر ان کے وعظ سے کیف طاری تھا، تقریر کے اختتام کے بعد میں نے سید صاحب سے کہا کہ ماشاءاللہ آپ نے بڑی عالمانہ تقریر فرمائی، نہایت دقیق بات کو آپ نے اس انداز سے سمجھا دیا کہ سامعین پر کیف و وجد طاری تھا، میرے ان کلمات کے اظہار پر سید صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اگر چہ بہت مختصر تھا، تاہم دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی صدا تھی، جو دل و دماغ کو متاثر کرنے والی تھی، اور میں نہیں سمجھ پا رہا تھا، کہ ایک ایسی عظیم ہستی جس کو ہر قسم کی وجاہتیں حاصل ہیں، اتنا منکسر المزاج اور بلند خیال انسان ہے، انہوں نے فرمایا کہ جب میں تقریر کے لئے ممبر پر بیٹھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا، کہ میں خالی الذہن ہوں، میں اتنے بڑے مجمع کے روبرو کیا بیان کر پاؤں گا، اچانک حضور حافظ ملت **رحمۃ اللہ علیہ** کی طرف ''صرف ہمت'' کیا اور اپنی توجہ مبذول کی، حضرۃ الاستاذ کو دل ہی دل میں خوب یاد کیا، اور وہ یاد ایسی تھی کہ اس میں استعانت کا پہلو غالب تھا، پھر میری اتنی کامیاب تقریر ہوئی، کہ میں خود حیرت میں مبتلا ہوں، میں وعظ و تقریر کا عادی نہیں رہ گیا، اب احباب کی طرف سے اگر اصرار ہوتا ہے، تو مجبوراً منبر پر بیٹھ جاتا ہوں، پھر بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہوں کہ کیسے میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کامیاب ہوں گا، لیکن آج استاد کامل حضرت حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** کے روحانی فیض کا یہ عالم تھا، کہ اگر موقع ملتا تو میں اپنی

وعظ کو طول دے سکتا تھا، یہ استاد کا روحانی تصرف تھا، کہ میں مسلسل تقریر کر رہا تھا، اور میرے ذہن میں مضامین عالیہ کی کمی نہیں تھی، بلکہ مطالب عالیہ کی آمد کا تسلسل سیل رواں کی طرح جاری تھا۔

سید صاحب کا عظیم الشان کارنامہ:

پیر طریقت سید کمیل اشرف صاحب **مدظلہ العالی** کے اس ارشاد عالی سے جانا جا سکتا ہے، کہ بلند رتبہ ہونے کے باوجود اپنے اُستاد کی گہری عقیدت و نیاز مندی سے اپنے دل و دماغ کو روشن و مستنیر رکھتے ہیں، یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ استاد کریم کی دعاؤں کی برکت سے سید صاحب نے اپنے عہد طالب علمی ہی سے شہرت و ناموری کا وہ عالی مقام حاصل کیا، کہ ان کا وعظ و بیان سماعت فرما کر حافظ ملت اور دیگر اساتذہ ان کو داد و تحسین سے نوازتے تھے، اور اس گوہر گراں مایہ کے بڑے قدر شناس تھے۔

۱۹۵۲ء میں حضرت علامہ مولانا عبد المصطفیٰ صاحب اعظمی **رحمۃ اللہ علیہ** مختلف وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی شہرہ آفاق درس گاہ دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم کو خیر آباد کہہ کر احمد آباد تشریف لے گئے، حضرت اعظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، وہ تحریر و تقریر، درس و تدریس میں یکساں مہارت رکھتے تھے، وہ تفہیم کے ''شہنشاہ اکبر'' تھے، مسائل پیچیدہ کو بھی بڑے سلیقہ اور عمدہ طریقے سے سمجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ منطق و فلسفہ، علم کلام اور فقہ اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، وہ ایسا وعظ فرماتے تھے کہ سامعین ان کے مواعظ حسنہ سے جھومتے رہتے تھے، وہ ہنسانے پر آمادہ ہو جاتے تو پورا مجمع لالہ زار ہو جاتا، اور رلانے کا ارادہ کر لیتے تو جلسہ گاہ میں لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگتے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجلس وعظ نہیں ہے، بلکہ ''ماتم کدہ ایران'' ہے یا لکھنو کی مجلس ''عزا''، کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو جاتی تھیں، دارالعلوم اشرفیہ کے طلبا بھی ان کے گرویدہ تھے، اور عوام و خواص بھی ان کے شیدا و فریفتہ تھے، ظاہر ہے کہ ایسی مختلف الجہات ہستی کے چلے جانے سے دارالعلوم اشرفیہ میں بڑا خلا محسوس کیا

گیا، وہ خود اکیلے نہیں گئے تھے، بلکہ ان کے ساتھ طلبا کا ایک جم غفیر بھی گیا تھا، دورۂ حدیث کے تمام طلبہ احمد آباد چلے گئے، پھر عوام میں انتشار اور ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی، جامع مسجد ''مبارک شاہ'' ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے، اس میں ہر جمعہ کو کئی ہزار مسلمان نماز ادا کرتے ہیں، حضرت اعظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے واعظانہ بیان اور اپنی سحر آفریں تقریر سے لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھے، اس لئے نہ صرف دارالعلوم اشرفیہ میں ان کا خلا محسوس کیا گیا، بلکہ قصبہ مبارکپور کے عوام وخواص میں میں کھلبلی مچ گئی، اور جامع مسجد کے مصلیوں میں بھی ان کی کمی کا شدید احساس پیدا ہوا۔

حضور حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** مبارک پور کے تمام دینی معاملات کے ذمہ دار تھے، اس اتھل پتھل کے زمانہ میں انہوں نے جن مشکل حالات کا سامنا کیا ہوگا ان کو الفاظ کا جامہ پہنانا دشوار کام ہے، طلبا کی تعداد گھٹی، دورہ حدیث کے طلبا اشرفیہ کو چھوڑ کر احمد آباد چلے گئے، اس حادثہ کا اثر دل ودماغ پر رہا ہوگا، پھر جامع مسجد کے مقتدیوں اور مصلیوں پر ہیجانی کیفیت طاری ہوئی، اس سے بھی حضرت حافظ ملت مضطرب ہوئے ہوں گے، لوگوں کا یہ احساس کہ مسجد سونی ہوگئی، اس کا کوئی ایسا خطیب ومقرر نہیں جو حضرت اعظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی سحر آفریں اور رقت آمیز تقریر کر سکے، اس کا بھی تدارک کسی نہ کسی نہج سے ضروری تھا، حضرت حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** نے ان تمام باتوں کو خوب اچھی طرح سے محسوس کیا، اور ایسے افسوس ناک اور بحرانی دور میں ایک طالب علم نے جو ابھی نو عمر تھا، جس کو سن شعور کو پہنچے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا، مبارک پور والے جن کے بارے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ خاندان اشرفیہ کے چشم وچراغ ہیں، ایسے ہیجان انگیز حالت میں اس نے بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، وہ طالب علم کون تھا؟ وہ وہی تھا جس کو اس وقت لوگ ''کمیل میاں'' کہا کرتے تھے، اور آج کل کے زمانہ میں وہ بہت کچھ ہیں، ان کو سب کچھ کہا جا سکتا ہے، پیر طریقت کا لفظ ان پر صحیح چسپاں ہے، رہبر شریعت کا لفظ اگر ان کے لئے موزوں نہیں ہوگا پھر کس کے لیے مناسب ہوگا، اس طالب علم کے جوہر کو حافظ ملت جیسی مردم

شناس شخصیت نے پہچان لیا تھا، کیوں کہ وہ مردم شناسی میں اپنی مثال آپ تھے، آپ نے سید صاحب سے ارشاد فرمایا:

''آپ جامع مسجد میں کچھ دیر تقریر کر دیا کریں، کیوں کہ حضرت اعظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے تشریف لے گئے، اس وقت آپ سے زیادہ موزوں میری نگاہ میں کوئی نہیں ہے، آپ کے کلام میں تاثیر ہے، آپ اپنے خطیبانہ انداز سے مبارکپور کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوں گے''

جناب سید صاحب نے عرض کیا:

''کہ حضور اعظمی صاحب جیسا واعظ وخطیب ہنسانے اور رلانے دونوں کی صلاحیت رکھنے والا مقرر میں نہیں ہوں، وہ کہاں اور میں کہاں وہ اپنے وقت کے ایک علامہ اور میں ایک نوآموز طالب علم ان کی جگہ کیسے پر کرسکتا ہوں، لیکن حضرت کا حکم ہے، تو اس سے سرتابی کی مجال نہیں، حضور کی دعاؤں کی ضرورت ہے، اپنا دست شفقت وعنایت میرے سر پر پھیر دیں میں **ان شاء اللہ العزیز** کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہوں گا''

حضرت حافظ ملت نور اللہ مرقدہ نے اپنے دست مبارک کو سید صاحب کے سر پر پھیرا اور بہت بہت دعائیں دیں، اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کی شان میں اچھے الفاظ استعمال کر کے اپنی نوازش فرمائی، پھر سید صاحب مستعد ہو گئے، اور جامع مسجد میں ہر جمعہ کو اپنے زوردار خطاب سے سامعین کے دلوں کو گرمایا، اور اتنی دل آویز اور دل پسند تقریر کی کہ مقتدیوں نے ان کے رخ تاباں کو دیکھ کر اور ان کا وعظ سن کر راحت وسرور حاصل کیا، اور عرصہ تک ان کی خطابت اور زور بیانی کا تذکرہ عوام کی زبانوں پر جاری رہا، خلاصہ یہ کہ مبارکپور کا پرفتن ماحول پرامن ہو گیا۔

حضرت سید صاحب کی کمال دانش مندی

حضرت سید صاحب نے اپنی خداداد صلاحیت اور استاد مکرم نیز اپنے خاندان کے بزرگوں کی دعاؤں سے میدان خطابت میں اپنے عہد طالب علمی ہی میں پورے ملک سے اپنا لوہا منوالیا تھا، اور اس وقت ان کی تقریر کا غلغلہ بلند تھا، وہ جوان نہیں بلکہ نوجوانی کی منزل میں ابھی قدم رکھا تھا، یعنی آغاز شباب ہی سے میدان تقریر میں انہوں نے بڑی شہرت ونا موری حاصل کی، اور دور دراز علاقوں تک حضرت حافظ ملت اور بعض دوسرے اساتذہ کے ہمراہ تقریر کے لئے جاتے تھے، ان کو اس میدان میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، شاید ہی ان کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب ہوئی، عارف شیراز نے کیا خوب کہا ہے:

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر ولطف سخن خدا داد ست

خداداد لطف سخن سے بڑا اونچا مقام حاصل کیا، تاہم استاد کامل کی یاد سے اپنے دل ودماغ کو ہمیشہ معمور وآباد رکھتے ہیں، ان کا یہ وصف خصوصی ہے، جن میں ان کا شریک وسہیم بہت کم لوگ ہوں گے، اسی خصوصیت اور اپنی کمال دانشمندی کی وجہ سے جب دارالعلوم اشرفیہ کے انتظام کاروں اور اشرفیوں میں بڑا افسوس ناک اختلاف ونزاع برپا ہوا، تو جناب سید صاحب نے زبردست ہوش مندی کا مظاہرہ کیا، ایک طرف استاد کامل کی ذات بابرکات تھی، جس سے وہ بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے، دوسری جانب ان ہی کے خاندان کے معظمین تھے، جو حضرت حافظ ملت رحمة الله علیه جیسی بلند قامت شخصیت سے صرف نظر کرنا چاہتے تھے، لیکن اپنی اعتدال پسندی بلکہ اپنے اعلی درجہ کی سوجھ بوجھ کے باعث افراط و تفریط کی راہ چھوڑ کر ایک ایسی روش اختیار کی کہ استاذ کریم کی عظمت بھی محفوظ رہے اور خاندان کے وہ حضرات بھی نالاں نہ ہوں جو آپ سے ہمنوائی دیکھنا چاہتے تھے، یہ اشرفیوں اور اشرفیہ والوں میں جو اختلاف پیدا ہوا زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہا، اس کی طبعی موت واقع ہونے والی تھی جو واقع ہو کر رہی، اور اٹھائیس تیس سال کا عرصہ گزر گیا کہ وہ لوگوں کے دلوں

سے ایسا محو ہو گیا کہ شاید باید کچھ نا عاقبت اندیش ہوں جو ان نزاعی معاملات سے سروکار رکھتے ہوں، لیکن ابھی تین چار سال کا عرصہ گزرا کہ جماعت اہلسنت میں اشرفی، رضوی کے اختلاف کا زبردست طوفان آیا، بڑے سنجیدہ فکرو دماغ کے لوگ اس کی طوفانی لہروں سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے، جماعت کے افراد میں آویزشیں برپا ہو گئیں، فتنوں کی بارش ہر کوچہ و گلی میں پہنچ کر رہی، کتابوں پر کتابیں لکھی جا رہی تھیں، پوسٹر پر پوسٹر شائع کیے جا رہے تھے، اور کچھ مدعیان علم ''درون خانہ'' کے اختلاف میں قلم کی جولانی و روانی دکھا رہے تھے، حتیٰ کہ صرف ایک مسئلہ پر کہ ''کملی'' مصغر ہے یا مکبر، پھر تصغیر کے لیے اہانت لازم ہے یا نہیں ،نصف درجن سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر آئیں ،اور لوگ گروپ بندیوں کے ایسے شکار ہوئے کہ ان کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی کہ یہ مجادلہ آرائی اور محاذ آرائی جماعت کے لئے زہرِ ہلاہل ہے، پہلے بعض اشرفیوں کی طرف سے ایسی کتابیں لکھی گئیں، جن میں تحقیق و جستجو کا نادر معیار پیش کیا گیا، اور علمی حد تک بحث و تمحیص محدود نہ رہی، بلکہ ابتذال پسندی کا یہ ثبوت فراہم کیا گیا کہ جماعت کے بعض سرکردہ افراد و شخصیات پر حملہ کیا گیا، اور یہ افسانہ نگاری کی گئی کہ ان کی ذات اور خانگی زندگی جو عوام کی نگاہوں سے اوجھل تھی، اس کو منظر عام پر لانے کو کار ثواب کیا گیا، پھر کیا ہوا جو لوگ رضویت کے دعویدار تھے انہوں نے بھی اپنے اشہب قلم کو تیز گام کیا، اور ایسی ایسی تحریریں وجود میں آئیں، اور ایسی ایسی کتابیں لکھی گئیں کہ سب و شتم، گالی گلوج کے انبار کے سوا کچھ نہ تھیں، ایک طرف یہ دعویٰ تھا کہ ہم مسلک رضویت کی حمایت اور تائید میں کمر بستہ و مستعد ہیں، اس راہ میں جو کانٹے آئیں گے، ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا، اور اشرفیوں میں خواہ کوئی کتنا ہی بلند قامت ہو اس کی دل آزاری ان کے نزدیک ہر حالت میں ایک عظیم الشان کارنامہ تھا، دوسری طرف مجدد اسلام امام احمد رضا فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** کی وہ ذات بابرکات جن کی امامت اور تجدیدی کارناموں پر سواد اعظم کا اتفاق تھا، ان کو بھی خاطر میں نہیں لایا گیا، اور ان کے فتاویٰ کو محض اس ''حسن نیت'' سے پڑھا جانے لگا کہ ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو منظر عام پر لا کر قابلیت سے زیادہ اپنی سفاہت کا مظاہرہ کیا گیا، اور دونوں طرف سے ایسی ایسی نازیبا حرکتیں کی

گئیں، جو کسی حالت میں عزت و شرافت کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں، اور ذلت و رسوائی کا وہ کارنامہ انجام دیا گیا، کہ عامی بھی حیرت و استعجاب میں پڑ گیا، اگر مجدد اسلام امام احمد رضا فاضل بریلوی **رضی اللّٰه عنه** کو کچھ شرافت مآبوں یعنی شرافت پسندوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، اور ان کی تصنیفات میں کیڑے نکالنا شروع کیا، تو کچھ ''کم نظر'' ''ارباب قلم'' نے اشرفی مشائخ کو اپنی تند و تیز تنقید سے ملامت کا نشانہ بنایا، حتیٰ کہ حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ جن کی بزرگی اور دینداری، جن کا تقوی وطہارت، جن کی ولایت و کرامت اہل سنت کے علما کی نگاہوں میں مسلم تھی، ان کی ذات ستودہ صفات کے خلاف ایسی ایسی سطحی ولا یعنی باتیں اور ہرزہ سرائیاں کی گئیں، بلکہ سب شتم کا بازار گرم کیا گیا، کہ **الامان والحفیظ**۔

حوادثات کی طوفانی آندھیاں:

یہ سب ''خوش گوار فریضہ'' انجام دینے والے اپنی جماعت ہی کے افراد تھے، پھر بعض واعظوں اور مقرروں کو ان کے وعظ و تقریر کا ایک نیا اور نادر موضوع فراہم ہو گیا، جنہوں نے اپنے شعلہ بیانیوں اور اشتغال انگریزیوں سے تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی، دونوں طرف کے اساطین اسلام کو ان سمجھداروں نے خوب خوب گھسیٹا، ایسے طوفانی حالات میں کون تھا جو اپنے دامن کو بچا سکتا تھا، وہی شخص ان ہنگاموں سے دور رہ سکتا تھا جس کی فطرت سلیم ہو، اور اعتدال پسندی کی راہ پر لگا ہو، ہمارے ممدوح مکرم حضرت مولانا سید کمیل اشرف صاحب **زید مجدھم** خانوادہ اشرفیہ کے چشم و چراغ ہیں، ان کے بزرگوں کی مذمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھا گیا، ایسے پرفتن حالات میں اپنی زبان مبارک کو غیر مناسب الفاظ سے آلودہ نہیں کیا، حالاں کہ خاندان کے تندمزاجوں کی صرف خواہش ہی نہیں تھی بلکہ ان کا دباؤ تھا کہ ان حالات میں صرف تماشائی ہی کیوں ہیں، کیوں نہیں وہ ''غازیوں اورمجاہدوں'' کی طرح میدان کارزار میں کود پڑتے، مگر یہ سید صاحب کی سلیم الطبعی اوراعتدال پسندی تھی، بلکہ ان کی قوت برداشت کا کرشمہ تھا، کہ بہت کچھ تماشا دکھایا جارہا تھا، اور ہر طرح کی بے ہودہ باتیں کی جارہی تھیں اور ان تک سب کچھ پہنچایا جاتا تھا، لیکن انہوں

نے ان تمام مناقشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا، اور حضرت سید صاحب اس طوفان بلا خیز میں اشرفیوں کو یہ تلقین و ہدایت کر رہے تھے کہ ایسے جھگڑوں میں ہم لوگوں کو الجھنا نہیں چاہیے، کہنے والے کہہ کر گزر جائیں گے، ان کے خرافات وہفوات کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا، بالآخر نتیجہ وہی نکلا، جسے سید صاحب موصوف اپنی دوررس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، کہ یہ گروپ بندی کا اختلاف ونزاع بھی دم توڑ کر رہ گیا، اوراب اس کی آواز کم ہی سنائی دے رہی ہے اور جماعت اعتدال کی راہ پر گامزن ہے، سنجیدہ فکراوراہل بصیرت کے نزدیک اب نہ کوئی صرف رضوی ہے اور نہ کوئی محض اشرفی، بلکہ سب رضوی ہیں اور سب اشرفی، یعنی ان میں سے کوئی گروہ باطل عقائد ونظریات کا حامل نہیں ہے، خواہ براہ راست اشرفی ہواور بالواسطہ رضوی، اورخواہ براہ راست رضوی ہو بالواسطہ شرفی، سب جماعت اہلسنت کے افراد ہیں، حوادثات کی طوفان خیز آندھیاں چلیں، تھوڑے دنوں تک دل و دماغ میں انتشار کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں، کچھ لوگ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں بھی لگے ہوئے تھے، مگر ایک سید کی بات پوری ہوکر رہی، کہ یہ سب ایک وقتی ہنگامے ہیں، شوروگل ہے، غوغہ آرائی ہے، تھوڑا بہت جماعت کونقصان پہنچنے کا خطرہ ضرور ہے، کیوں کہ منکرین حق اوراغیار کو اپنی جماعت پر انگلیاں اٹھانے کا موقع ملے گا، تاہم فتنوں کی یہ موسلہ دھار بارش ضرور رکے گی، اور جماعت کی شیرازہ بندی میں بہت کم خلل واقع ہوگا، ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور جماعت مکمل بکھراؤ کا شکار نہ ہوئی، اوراپنے مومنانہ فراست سے دیکھ رہے تھے، کہ جاہ پرست ودنیا پرست عناصر تھوڑے دنوں تک مستفید ہوسکتے ہیں، پھر حقائق ان کو مجبور کردیں گے کہ وہ صحیح سمت میں آکر اپنی ناشائستہ حرکتوں سے باز آجائیں۔

باران رحمت کا بادل:

سید صاحب کی یہ تمام سنجیدہ باتیں میں نے مختلف مجلسوں میں سنیں، ان کی سماعت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا، کہ ان کی عظمت و بڑائی کا راز ان کی اعلیٰ درجہ کی سمجھداری

وہوشمندی اوران کی اعتدال پسندی میں مضمر ہے،اس لیے وہ نہ صرف اپنے حلقہ ارادت میں بلکہ دوسرے اہل دانش میں بھی نہایت عزت ووقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ،اعلیٰ تعلیم یافتہ وکلاو بیرسٹرز ،سائنسداں وسیاست داں ،ڈاکٹرو پروفیسر اور دیگر اہل علم ان کی تعظیم توقیر میں اپنی سعادت تصور کرتے ہیں، میری نگاہوں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ اونچے طبقہ کے لوگ بھی ان کی دعاؤں سے مطمئن رہتے ہیں، اوران کے روحانی فیض سے متاثر نظر آرہے ہیں، اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ حافظ ملت **نوراللہ مرقدہ** کے تلمیذ رشید ہیں، بلکہ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے، کہ برصغیر ہندو پاک میں جن علما مشائخ کے باران رحمت کا بادل جھوم کر برسا،ان میں ہمارے سید صاحب کے خاندان کے مشائخ اونچے مقام پر نظر آتے ہیں، ان کو اپنے بزرگوں سے بھی بڑا روحانی فیض حاصل ہوا تھا،ان کے پدر بزرگوار حضرت مخدوم ثانی **رحمۃ اللہ علیہ** کے بارے میں حضور حافظ ملت اور شیخ العلما کی شہادت ہے کہ وہ ولی کامل تھے،اس لئے ان کی دعاؤں میں تاثیر پیدا ہوئی، ان کے نقوش اورتعویذات بڑے حیرت انگیز طور سے مریضوں کی شفایابی اور خستہ حالوں کی خوش حالی کے سلسلہ میں بہت سودمند ثابت ہوئے۔

چنانچہ حاجی عبدالستار بھائی جو بمبئ کے اعلی درجہ کے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، وہ حاجی علی ٹرسٹ کے صدر بھی ہیں، جب بیمار پڑے، تو بمبئ کے امراض قلب کے ڈاکٹروں نے یہ مشورہ دیا کہ آپ کی بیماری کا علاج صرف آپریشن ہے، آپریشن کا لفظ دل ودماغ کو خوب خوفزدہ کر دیتا ہے، اور انسان اُمید وبیم کی حالت میں گرفتار ہوجاتا ہے، ایسے خوف و ہراس کے عالم میں پیر طریقت حضرت سید صاحب **مدظلہ العالی** کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں،اورعرض کرتے ہیں، بڑی مشکل گھڑی آن پڑی، ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عمل جراحی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے، آپ نے اپنے خصوصی پیرایہ بیان سے حاجی صاحب کو بڑی تسلی دی، اوران کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ضرور آپریشن کروالیں، **ان شاءاللہ** آپ اسپتال سے شفایاب ہو کر نکلیں گے، سید صاحب

کے تسلی آمیز کلمات سے ان کو بڑا سہارا ملا، اور ایک گونہ آپریشن کا خوف ان کے دل سے زائل ہو گیا، پھر وہ بمبئی کے مشہور اسپتال ''ہندوجہ'' میں داخل ہو گئے۔

سید صاحب کو اطلاع دی گئی کی آٹھ دس گھنٹہ میں حاجی صاحب موصوف کا آپریشن ہونے والا ہے، ان کی عیادت کے لیے سید صاحب کے ہمراہ میں بھی گیا، وہاں جا کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ حاجی عبدالستار بھائی اپنے بستر علالت پر دراز ہیں، اور ان کی بوڑھی ماں اور کنبہ کے بہت سے افراد موجود ہیں، ہم لوگوں کے پہنچنے سے ان کے کنبہ کے افراد میں بالخصوص ان کی والدہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، سب کے چہرے سے بشاشت کے آثار نمایاں ہو گئے، سب سے پہلے سید صاحب نے ان کی والدہ صاحبہ سے مخاطب ہو کر کے تسلی آمیز کلمات ارشاد فرمائے، پھر حاجی صاحب موصوف کی صحت یابی کے لیے پر خلوص دعائیں کیں، میں نے اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے چہرہ پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی، اب ان کے چہرے سے ''توکل علی اللہ'' کے علاوہ اطمینان وسکون کے جھلکیاں محسوس کی جا سکتی تھیں، سید صاحب نے ان کو ایک تعویذ بھی عنایت فرمایا، جو ان کے سرہانے آویزاں کر دیا گیا، اس نقش کے بارے میں بارہا کا یہ تجربہ بتایا جاتا ہے کہ جس مریض کے سرہانے اس کو لٹکا دیا جائے اس کو راحت ملتی ہے، ذہنی سکون میسر آتا ہے، اور وہ شفایاب ہو کر اسپتال سے نکلتا ہے، اگر میری شہادت معتبر ہو تو میں اس کی گواہی دے سکتا ہوں۔

ڈاکٹر راول کی نیازمندی:

جب میرا آپریشن اسماعیلیہ اسپتال میں ہونے والا تھا، تو اسپتال جانے سے تین چار روز پہلے میں سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا، میری حالت عجیب وغریب تھی، زبان قلم کو یارائے سخن نہیں کہ اس کو بیان کر سکے، میرا دل بیٹھا جا رہا تھا، کمزور دل کا انسان ہوں، آپریشن کے نام ہی سے میں لرزاں وترساں تھا، انتہائی کرب وبے چینی کے عالم میں اسپتال میں میرا داخلہ ہوا، سید صاحب بنفس نفیس وہاں تشریف لائے، جناب ڈاکٹر راول صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، جو آپریشن کے سینئر ڈاکٹر تھے، سید صاحب نے میرا تعارف ڈاکٹر

صاحب سے نہایت حسین الفاظ میں کرائے، ڈاکٹر راول خود حضرت کے نیاز مند و معتقد تھے، انہوں نے عرض کیا: آپ دعائیں پڑھ کر میرے ہاتھوں پر دم کر دیجئے، سید صاحب نے آیت شفا پڑھی اور ان کے دونوں ہاتھوں پر دم کیا، پھر وہاں سے سیدھے میرے وارڈ میں تشریف لائے، میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا، ان کو دیکھتے ہی اس سے اترنے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے یہ حکم دیا کہ آپ آرام سے بیٹھے رہیں، میں بھی تھوڑی دیر کے لئے اسی بیڈ پر بیٹھتا ہوں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے آپ کے بارے میں بہت کچھ کہہ دیا ہے، **ان شاء اللّٰہ** آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی، آپ کا آپریشن کامیاب ہوگا، مولوی محمد اسلم سلمہ کو یہ حکم دیا کہ یہ تعویذ میں لکھ کر لایا ہوں، اس کو مولانا کے سرہانے آویزاں کر دو، بہرحال میں نے سید صاحب سے دعا کی درخواست کی، میری تسلی کے لئے کافی دیر تک میرے ہمراہ تشریف فرما رہے، اور مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے، گویا انہوں نے میرے اضطراب اور بے چینی کو بھانپ لیا تھا، کہ اس وقت ان کو ذہنی سکون حاصل نہیں ہے، اس لیے وہ اپنی گفتگو ، شیریں کلامی سے مجھ کو بہلا کر میرے ذہن کو صحیح سمت میں لانے کی تدبیر کر رہے تھے، اس طرح نفسیاتی علاج سے ذہنی انتشار کو دور کرنا چاہتے تھے۔

پھر وہاں سے حضرت سید صاحب اپنے دولت کدہ پر تشریف لے گئے، اور میں اپنی چارپائی پر دراز ہو گیا، شام کا اندھیرا چھا گیا، اور مولوی محمد اسلم سلمہ نے میرے سرہانے اس نقش کو آویزاں کر دیا، یہ سید صاب کی کرامت اور اس نقش کی برکت تھی بلکہ ان کا روحانی فیض تھا کہ مجھ کو ذہنی سکون حاصل ہو گیا، اور میں گہری نیند سو گیا، حالانکہ میری یہ عجیب و غریب حالت ہے کہ اگر کچھ ذہنی دباؤ اور اعصابی تناؤ ہو اور کسی معاملہ کی وجہ سے میں الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں تو میری نیند بالکل غائب ہو جاتی ہے، اور پوری رات بے چینی سے کروٹ بدلتے بدلتے گزرتی ہے، مگر یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا، آپریشن ہونے والا ہے، جس کا تصور ہی مضطرب و بے قرار کرنے کے لیے کافی تھا، مجھ کو نیند نہیں آنی چاہیے تھی، اور میں خواب غفلت میں سو رہا تھا، اسی اثنا میں اسماعیلیہ اسپتال کے مشہور ڈاکٹر ''ویرانی'' اپنے جونیر

ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ میرے بیڈ کے قریب تشریف لائے، تاکہ میرے حالات کا جائزہ لیں، اور جانچ وتحقیق کے بعد رپورٹ تیار کریں، الیکٹرک آٹو گرام کی مشین اور بلیڈ پریشر ناپنے والی مشین خدا جانے کتنے اوراوزار مشین ان کے جونیر ڈاکٹر اوراسپتال کے کارکن لے کرآئے تھے، جب ڈاکٹر صاحب نے مجھ کودیکھا کہ گہری نیند سور ہے ہیں تو ان کو ایک گونہ حیرت ہوئی، اور انہوں نے اپنے کارکنوں سے فرمایا کہ ان کو آرام وراحت سے سونے دیجئے، صبح ان کا چیک اپ کرکے پھر رپورٹ تیار کی جائے گی۔

ڈاکٹر ویرانی کی حیرانی:

میرا معمول ہے کہ اگر میں سو جاؤں تو رات میں کئی مرتبہ پیشاب کے لئے بیدار ہونا پڑتا ہے، لیکن اس رات میں اتنی گہری نیند سے سویا کہ ایک مرتبہ بھی نہیں اٹھا، جب صبح کا اجالا ہوا، اور پرندے فضائے آسمانی میں چہچہانے لگے، تو میں خواب غفلت سے بیدار ہوا، میں بہت خوش وخرم تھا، مجھ کو بڑی راحت ملی، میرے ذہن وفکر پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا، ابھی دوڈھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر ویرانی صاحب اپنے جونیئر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ مسکراتے ہوئے میرے پاس تشریف لائے، اور انہوں نے کہا کہ مولانا! رات میں آپ بہت گہری نیند سو گئے تھے، میں آپ کا معاینہ اور جانچ کرنے کے لئے آیا تھا، آپ کو آرام کرتے ہوئے دیکھ کر آپ کو جگایا نہیں، اور ہم سب لوگ واپس ہو گئے، گویا ان کو تعجب تھا کہ کسی دوا کے استعمال کے بغیر ایسی حالت میں کوئی مریض نہیں سوتا ہے، یہ کمزور دل کے انسان کیسے سو گئے، لیکن ان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرے سرہانے ایک ایسا نقش لگا ہوا ہے، جو نہ صرف صحت بخشنے والا ہے، بلکہ دل و دماغ کو راحت پہونچانے والا بھی ہے، اس لئے ان کو حیرانی ہوئی، اس نقش کے متعلق جب سے میرا عقیدہ ہے کہ جس مریض کے سرہانے آویزاں کردیا جائے گا، اس کو بڑا فائدہ پہنچے گا، یہ میرے لئے بھی سودمند ہوا اور اسی سے مجھ کو تجربہ ہوا، اور حاجی عبدالستار بھائی کو بھی بہت مفید ثابت ہوا، چنانچہ ان کے دل کا آپریشن ہوا، اور میرا بھی آپریشن پروسیٹڈ کا ہوا، اور ہم دونوں حضرت سید صاحب کی دعا اور ان کی

کرامت سے نیز ان کے نقش کی برکت سے اسپتال سے صحت یاب ہوکر نکلے۔ **فللہ الحمد علی ذالک۔**

اس موقع پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ دعا تعویذ، جھاڑ پھونک اور نقوش سے جو کچھ فائدہ ہوتا ہے، وہ محض اتفاق کی بات ہوتی ہے، حقائق وواقعات کی روشنی میں اگر ان کا صحیح جائزہ لیا جائے تو یہ یقین ہوگا کہ وہ اثرات نہیں پیدا کر سکتے جو دواؤں سے ظاہر ہوتے ہیں، ان میں انقلاب حالت کے لیے کوئی چیز نظر نہیں آتی، دوائیں ایسی ہوتی ہیں کہ ماہرین ادویہ ان کے خصائص واثرات سے مکمل طور سے واقف ہوکر ان کو تیار کرتے ہیں، تعویذ ونقوش کاغذ پر مرقوم کچھ تحریریں ہوتی ہیں، ان کے متعلق کیسے یقین کیا جائے کہ مریض اس سے صحت یاب ہوتے ہیں، میں ایسے مادہ پرستوں سے حکمت کی وہ بات کہنا چاہتا ہوں جس کو ولی کامل، خدا پرست، حکیم نکتہ داں نے کہا تھا، ایک مرتبہ حافظ ملت **علیہ الرحمہ** نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کائنات کے اندر غور کرو، بلندی سے پستی کی طرف نگاہ دوڑاؤ، قوی الہیکل، عظیم الجثہ اشیا کو دیکھو اور حقیر سے حقیر چیز پر بھی نگاہ ڈالو، ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصیت، کچھ نہ کچھ اثر ضرور رکھتی ہے، ہر شخص کو اس کا یقین ہے، گھاس کا ایک تنکا بھی تاثیر سے خالی نہیں، گھاس پھوس، جڑی بوٹیوں کے فوائد و نقصانات سے کوئی انکار نہیں کرتا ، پھر اللہ کے کلام ،رسول کے ارشادات، اور بزرگوں کے اقوال کے تاثیر سے کیسے انکار کر دیا جاتا ہے، اس سے بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے اپنے عقیدہ کے بموجب یہ بات میں بے دریغ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تعویذات ونقوش میں ضرور ایسی خاصیت ہوتی ہے جس میں فوائد مضمر ہوتے ہیں، آدمی اگر مریض ہو تو وہ صحتیابی کی طرف جلد مائل ہوجاتا ہے، اور اس کے دل بے قرار کو قرار و راحت ملتی ہے، لیکن اس کے ادراک کے لئے ''عاقل حیلہ جو'' نہیں بلکہ عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

حافظ ملت کے ایک جاں نثار تلمیذ رشید

❁❁

تشنگان علوم اسلامیہ کا جم غفیر:

وہ (حضرت علامہ حافظ عبد الروف بلیاوی صاحب **علیہ الرحمہ**) طالب علموں کے سوالات کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں فرماتے، بلکہ وہ اس فکر میں ڈوب جاتے تھے کہ طالب علم آخر کس وجہ سے خلجان ذہنی میں مبتلا ہو گیا، اور کون سی وہ بات ہے کہ شبہات میں گرفتار کر کے سوالات کے لیے مجبور کر رہی ہے، تاکہ اس کے مطابق اس کے شکوک واوہام کا ازالہ فرمائیں، وہ بڑی توجہ اور اِنہماک سے تلامذہ کی باتوں کو سنتے تھے، بعض اوقات طلبہ بے سوچے سمجھے ایسی لایعنی باتیں کرتے ہیں کہ ان کی طرف اساتذہ کرام عام طور سے توجہ نہیں دیتے، اور ان پر طلبہ کی نہ صرف سرزنش کرتے ہیں، بلکہ ان کی بے علمی اور بے جا جسارت کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوسری مرتبہ زبان کھولنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، مگر ہمارے استاذ مکرم حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان ہی نرالی تھی، وہ اس قسم کی باتوں کو بھی سنتے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے، وہ کسی حالت میں بھی سوالوں کے انبار سے ذہنی الجھن میں گرفتار نہیں ہوتے تھے، اور نہ ایسے طالب علموں کی تحقیر کرتے تھے، بلکہ انتہائی فراخ دلی اوراعلیٰ ظرفی سے تلامذہ کے حوصلوں کو بلند کرنے کی تدبیر اختیار فرماتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ان کے اردگرد تشنگان علوم اسلامیہ کا جم غفیر اکٹھا رہتا تھا، اور ہر طالب علم کی خواہش ہوتی تھی، کہ ہماری زیادہ سے زیادہ کتابیں یا کم ازکم اہم کتابیں ان کے زیر تدریس رہیں۔

سادہ زندگی:

وہ ایسی سادہ زندگی گزارتے تھے کہ مبارکپور کے عوام نہیں سمجھ پاتے تھے کہ یہ بھی دارالعلوم کے استاذ ہیں، بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ مولوی صاحب طویل مدت گزر جانے کے بعد

اب بھی اشرفیہ میں زیر تعلیم ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ آپ اپنا جھولا لیے ہوئے سودا سلف خرید نے کے لیے تشریف لے گئے، تو ایک سیٹھ نے دریافت کیا کہ مولوی صاحب آپ کب تک پڑھتے رہیں گے، پندرہ سال سے کم عرصہ نہیں ہوا کہ بازار میں آپ کو گشت لگاتے اور دارالعلوم میں داخل ہوتے میں دیکھ رہا ہوں، کیا اب تک آپ کی تعلیم کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، آپ نے متانت وسنجیدگی سے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں آپ کے مبارکپور میں زندگی بھر پڑھتا رہوں گا، ان کا منشا یہ تھا کہ میری زندگی تعلیم و تعلم میں گزرے گی، لیکن گرہت صاحب نے (سیٹھ) اس معنٰی خیز جملہ کا یہ مطلب نکالا کہ وہ تاحیات تعلیم حاصل کرتے رہیں گے، یعنی اساتذہ کے سامنے زانوے تلمیذ تہہ کرتے رہیں گے، حالاں کہ ایک طویل مدت تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہوئے گزر گئی تھی، اس برجستہ جواب پر سیٹھ کو بڑی حیرانی ہوئی اوراس نے کہا کہ میاں بوڑھے ہوجاؤ گے اس وقت تک پڑھتے رہو گے، اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ یہ دارالعلوم اشرفیہ کے ایسے استاذ ہیں جن کے تدبر وحسن کارکردگی اور مساعیٔ جمیلہ سے اشرفیہ کے رگوں میں زندگی وحرارت کا خون دوڑ رہا ہے، جن کی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہے کہ عظیم المرتبت ادارہ برصغیر میں آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ومنور ہے اور جن کے ناخن تدبر سے بڑے بڑے مسائل حل ہورہے ہیں، اور بالآخر زمانے نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ نحیف وناتواں انسان، ہڈیوں کا ڈھانچہ، انتہائی سادگی کے ساتھ زندگی گزارنے والا مفکر دارالعلوم اشرفیہ کو الجامعۃ الاشرفیہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوا، اس مقام پر پہنچنے کے بعد کسی خوش عقیدہ کو یہ خیال آسکتا ہے کہ دارالعلوم اشرفیہ کو فروغ بخش کر مجوزہ عربی یونیورسٹی میں بدلنے والے صرف ''حافظ ملت'' ہیں، اس خصوص میں کسی دوسرے کی جدوجہد اور کاوش ذہنی کا کچھ زیادہ دخل نہیں ہے، صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعاون وامداد یا نشرواشاعت بہت سے حضرات کی طرف سے ہوئی، لیکن کوئی شخص خواہ کتنے اونچے مقام پر فائز ہو اس کو عربی یونیورسٹی کا بانی نہیں کہا جاسکتا، پھر کیسے یہ کہہ دیا گیا کہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب نے اپنے عمل وکردار اور حسن اخلاق سے دارالعلوم اشرفیہ کو الجامعۃ الاشرفیہ کی شکل میں بدل دیا۔

الجامعۃ الاشرفیہ کے منصوبہ ساز:

بلاشبہہ مجوزہ عربی یونیورسٹی یعنی الجامعۃ الاشرفیہ کے بانی اور الجامعہ الاشرفیہ کو عروج و ارتقا کی منزلوں تک گامزن رکھنے والے ''حافظ ملت'' تھے، لیکن ان کے کچھ ایسے مخلص کارکن اور دانشمند تلامذہ تھے جو ان کے دست و بازو ثابت ہوئے، ایسے حضرات میں مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت اعلیٰ مقام رکھتے تھے، انہوں نے عربی یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا، اور اس کے نقش ونگار بنائے۔ اور اپنی منزل مقصود کی طرف عزم وحوصلہ کے ساتھ رواں دواں ہوئے، اور اس کی تحریک میں اتنی دور نکل گئے کہ کتنے لوگ ان سے پیچھے رہ کر ان کی گرد راہ دیکھتے رہے، البتہ اس تحریک کے سالار کارواں حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ تھے، اس قافلے کے جتنے ارکان وافراد تھے سب کی نگاہ میں ان کی قائدانہ حیثیت مسلم تھی، لیکن اس قافلے میں عمل وتحریک کی روح پھونکنے والے مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہ اپنے استاد کریم کے نقش پا کو ہمیشہ دیکھتے تھے۔

۱۴رشوال المکرم ۱۳۹۱ھ بروز جمعہ مبارکہ مطابق ۳؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو ان کا انتقال پر ملال ہوا، اس کے بعد میری ملاقات حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** سے بانسی کے روڈ ویز اسٹیشن پر ہوئی، اس زمانے میں براؤں شریف احقر تدریس کا فریضہ انجام دے رہا تھا، میں خود بانسی حضرت کے استقبال کے لیے بس اسٹیشن تک آیا، آپ ایک بس پر سوار تھے، میری نگاہ ان پر پڑی، میں نے یہ منظر دیکھا کہ سر جھکائے ہوئے بھیڑ بھاڑ میں دست مبارک میں اپنی اٹیچی لیے ہوئے بس سے اتر رہے ہیں، بڑی تیزی کے ساتھ میں بس کے دروازے پر پہنچ گیا اور عوام کی بھیڑ سے بے نیاز ہو کر اندر گھس گیا، اٹیچی اپنے ہاتھ میں لے لی، اور سہارا دے کر آہستہ آہستہ نیچے اتارا، خلاف توقع آج مغموم واداس پایا، چہرۂ انور سے غم واندوہ کے آثار نمایاں تھے، میں سخت حیرت واستعجاب میں پڑ گیا کہ بالعموم جب کبھی آپ کے استقبال کے لیے کسی جگہ حاضر ہوتا تھا، اور مجھ سے ملاقات ہوتی تھی تو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس خادم حقیر کی طرف لپکتے تھے، میں نے یہ حالت دیکھ کر عرض کیا کہ

حضور کیا پریشانی لاحق ہے؟ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آپ پر رنج والم کی کیفیت طاری ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا عبدالرؤف صاحب مجھ سے پہلے اس دنیا سے چلے گئے، ان کے ناگہانی انتقال نے مجھ کو اور زیادہ بوڑھا بنا دیا، وہ بھلائے نہیں بھولتے، ہمہ وقت ذہن وخیال میں ان کا تصور آتا رہتا ہے، ان کی خدمات جب مجھے یاد آتی ہیں تو میں بے چین وبے قرار ہو جاتا ہوں، ان کا خلوص کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، وہ ادارۂ اشرفیہ کے لیے ایک نعمت کبریٰ تھے، انہوں نے اس ادارہ کی ترقی میں بڑی زبردست قربانی پیش کی، دارالعلوم اشرفیہ کو اپنی محنت وجانفشانی سے علم وفن کی دولت سے مالا مال کیا، پھر مجوزہ عربی یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا، آج جب کہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو مجھ کو بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میں اتنا ضعیف وناتواں اس بڑی ذمہ داری کو اکیلے کیسے سنبھال سکتا ہوں، وہ میرے دست راست تھے، کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا تھا کہ اب مجھ کو اتنے بڑے منصوبے کے لیے جدوجہد نہیں کرنا چاہیے، قریب تھا کہ میں سپر انداز ہو جاتا، تائید خداوندی نے میری یاوری کی اور ذہن میں یہ آیا کہ یہ دنیا آنی اور جانی ہے، یہاں آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس لئے مولانا عبدالرؤف رحمۃ اللہ علیہ کے اس دار فانی سے رحلت فرمانے کے بعد دین کا جو بڑا کام میں نے شروع کیا ہے، اس سے دست کش نہیں ہونا چاہیے، پھر میں نے کمر ہمت باندھ لیا ور اپنے احباب ومخلصین کو ساتھ لے کر منزل مقصود کی طرف چل پڑا۔

حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ کے اس مفصل بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ دارالعلوم اشرفیہ کو الجامعۃ الاشرفیہ میں تبدیل کرنے کا منصوبہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب نے تیار کیا تھا، اور انہیں کے نقوش وخطوط پر تحریک جامعہ کا قافلہ بڑے ہنگامہ خیز دور میں ہر قسم کے مصائب وآفات جھیلنے کے لیے مستعد وآمادہ ہو گیا، اور اس قافلے کے سالار کارواں اگرچہ حافظ ملت نور اللہ مرقدہ تھے اور ان کے نقش قدم پر اعوان وانصار چلنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، لیکن ان کے دست راست جان نثار سپاہی مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ثابت ہوئے۔

ارباب دانش کے مرجع:

لذید بود حکایت دراز تر گفتیم

استاذ مکرم مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اہل دانش، ارباب علم کے مرجع تھے، بڑے بڑے علمائے کرام مسائل میں ان کی طرف رجوع فرماتے تھے، اوران کی بار گاہ میں حاضر ہوکراپنی علمی پیاس بجھاتے تھے، ان کے ساتھ مباحث علمیہ میں اہل بصیرت کو بڑا لطف آتا تھا، وہ کبھی بھی ایسے بحث ومباحثہ سے ذہنی دباؤ محسوس نہیں کرتے تھے، اور بے دریغ اپنا قیمتی وقت صرف کردیتے تھے، کوئی شخص ان سے کتنی لمبی بحث چھیڑ دے اور جان بوجھ کران کو تنگ کرنے کی کوشش کرے یا نیک نیتی سے کسی الجھے ہوئے مسئلہ کو سمجھانا چاہے تو وہ تنگ دل نہیں ہوتے تھے، نہ اس کو برا سمجھتے تھے۔

۱۹۷۱ء میں ماہ شعبان ۱۳۹۱ھ کو حضرۃ الاستاذ کو میں نے براؤں شریف دارالعلوم فیض الرسول میں سالانہ امتحان کے موقع پر مدعو کیا، تشریف آوری سے قبل کچھ طبیعت ناساز ہوگئی، جب براؤں شریف آئے تو ان کے چہرہ بشرہ سے نہ صرف علالت کا احساس ہوا بلکہ نقاہت وکمزوری بھی میں نے محسوس کیا، وہ مجھ کو بہت ہی سست نظر آرہے تھے، چہرہ مبارک اترا ہوا تھا، میں نے مزاج پرسی کرتے ہوئے دریافت کیا کہ حضرۃ المکرم میں آپ کو لاغر وکمزور پارہا ہوں، کیا کچھ آپ کی طبیعت ناساز ہے، یا کسی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں ،فرمایا کہ مجھ کو کئی دنوں سے پیچش کی سخت شکایت ہے، جس کے سبب میں کمزور ہوگیا ہوں ، میں نے فوراً ایک مقامی ڈاکٹر کو طلب کرکے معاینہ کروایا، پیچش کی شکایت کے علاوہ معمولی حرارت بھی تھی اور شکم مبارک میں ہلکا ہلکا درد بھی ہورہا تھا، ڈاکٹر صاحب نے ان تمام امراض کی دوا دے کر پرہیز کی سخت ہدایت کی، ابھی دواؤں کے استعمال کے دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ مولانا بدرالدین صاحب **علیہ الرحمۃ والرضوان** صدرالمدرسین دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف اپنے ہاتھ میں منطق کی کتاب ''مرقات'' لیے حاضر خدمت عالیہ

ہوئے، اورانھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس کتاب کے شروع میں لفظ ''حکم'' آیا ہے اور کئی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے میں مجھ کو دشواری پیش آرہی ہے، حضرۃ الاستاذ نے ارشاد فرمایا کہ یہ لفظ اہل علم کے عرف میں متعدد ومختلف معانی میں مستعمل ہوا ہے، ارباب اصول فقہ کے نزدیک حکم شرعی وجوب وغیرہ کے معنی میں استعمال کیا گیا، اور منطقیوں کی اصطلاح میں چار معنوں میں استعمال ہوا ہے، (۱) محکوم علیہ (۲) نسبت تامہ خبریہ (۳) قضیہ (۴) اذعان وتصدیق۔

چنانچہ حضرۃ الاستاذ نے منطق کی شہرہ آفاق ومعرکۂ آراء کتاب ''حمداللہ'' کا حوالہ دیا کہ تصدیقات کی بحث میں حکم تصدیق کے معنیٰ میں آیا ہے، اس پر حمداللہ سندیلوی نے متصل بحث کی ہے، اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''ملا حسن'' لکھنوی نے حکم کو ایک مقام پر تصدیق کے مرادف وہم معنیٰ قرار دیا ہے، حضرۃ الاستاذ منطق اعلیٰ کی ان عظیم المرتبت کتابوں کے حوالہ سے مولانا بدرالدین صاحب کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ جب تک اس کے تمام معانی کا احاطہ نہ کرلیا جائے اور اس کے محل استعمال پر گہری نظر نہ ڈالی جائے اس وقت تک خلط مبحث ہوتا ہے جو خلجان ذہنی کا سبب بنتا ہے، اس لیے آپ کو اس لفظ کے تمام معانی کو محفوظ کر کے موارد استعمال پر غور وفکر کرنا چاہیے، کیوں کہ اسی ''مرقات'' میں حکم کبھی نسبت تامہ خبریہ کے معنیٰ میں لایا گیا ہے، اور دوسرے معانی میں بھی مستعمل ہوا ہے، لیکن مولانا بدرالدین صاحب کو خدا جانے کیوں ذہنی سکون نہیں مل رہا تھا اور وہ بہت دیر تک حضرت کے زیر وزبر اپنے معارضات بلفظ دیگر اپنے شبہات پیش کرتے رہے، اسی بحث و مباحثہ میں تقریبا دو گھنٹے کا وقت گزر گیا اور میں تشویش میں پڑ گیا کہ اتنی نقاہت وکمزوری کی حالت میں مولانا بدرالدین صاحب نے مسائل منطقیہ کو چھیڑ دیا ہے اور اپنے حسب عادت بحث وتکرار میں لگے ہوئے ہیں، جب کہ ان کو اس حالت میں احتراز کرنا چاہیے تھا اور آرام کا موقع دینا چاہیے تھا مگر مولانا مرحوم دھن کے پکے تھے، اور اپنی تحقیق وجستجو میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اسی لیے انہوں نے حضرۃ الاستاذ کی حالت کا جائزہ نہیں لیا اور کافی دیر

تک ان سے لپٹے رہے، لیکن آپ کچھ بھی کبیدہ خاطر نہ ہوئے، بلکہ ان کے شبہات کے ازالہ کے لیے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کو سمجھاتے رہے، جب میں نے یہ محسوس کیا کہ آرام وراحت نہ ملنے کے سبب کہیں حضرت کی طبیعت اور زیادہ ناساز نہ ہوجائے تو میں نے دخل درمعقولات کیا، مولانا بدرالدین صاحب سے مخاطب ہوکر کچھ کھردرے الفاظ میں میں نے کہا کہ حضرت استاذ کریم آپ کو بہت دیر سے سمجھا رہے ہیں، حالانکہ ان کی طبیعت ناساز ہے، آپ ان مسائل اور اپنے شکوک وشبہات کو دوسرے وقت کے لئے ملتوی رکھیں، اور حضرت کو آرام کرنے کا موقع مرحمت فرمائیں تو وہ خاموش ہو گئے اور میری طرف ندامت سے دیکھنے لگے۔

اسی واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا عبدالرؤف صاحب افہام وتفہیم کی خاطر کتنی مشقتیں برداشت کر لیتے تھے، اورحرف شکایت اپنی زبان مبارک پر نہیں لاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اونچے درجہ کے علماے کرام بھی اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے ان کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور وہ ان کو تسلی بخش جواب دیتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا کتنا ہی قیمتی وقت صرف ہوجائے اس کی فکر نہیں کرتے تھے۔

مبارک پور والوں کی وکالت:

حضرت حافظ ملت **نوراللہ مرقدہ** جتنی توجہ ودھیان سے مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معروضات کو سماعت فرماتے تھے اوران سے متاثر ہوکر اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرماتے تھے کسی دوسرے کو اس کا شرف حاصل نہیں ہوا، ۱۹۷۰ء میں حضرت **علیہ الرحمۃ والرضوان** نے اشرفیہ اور مبارکپور کو خیر باد کہنے کا عزمِ مصمم کرلیا تھا، کیوں کہ کچھ لوگ عربی یونیورسٹی کی تحریک میں روڑے اٹکا رہے تھے، اور طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے، مخالفین ومعاندین کی طرف سے فتنہ وفساد پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، جیسے ہی آپ نے اپنے ارادے کا اظہار کیا، مبارکپور میں ہنگامہ برپا ہوگیا، ایسی ہیجان انگیز حالت میں شورش برپا ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا، مردوں، عورتوں اور بچوں سب

نے مل کر یہ عہد و پیمان کیا کہ حافظ ملت کو کسی قیمت پر مبارک پور سے جانے نہیں دیا جائے گا، خواہ اس کے واسطے کتنی بڑی قربانی پیش کرنی پڑے، مگر یہ سب پر واضح تھا کہ آپ جب کسی کام کا عزم مصمم کر لیتے ہیں تو اپنے عزم و ارادے میں بہت اٹل رہتے ہیں، اس لیے باشندگان مبارکپور میں سے کچھ نیازمندوں کو یہ گمان پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ رکنے والے نہیں ہیں، اوران کے اس گمان کی تقویت اس سے ملی کہ مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بلرام پور شہر کا سفر کیا تاکہ وہاں کے حالات کا صحیح جائزہ لے کر مبارکپور کے بجائے وہیں مجوزہ عربی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے ، یہ سب کچھ بعض احباب و نیازمندوں کے اشارہ پر ہو رہا تھا، بلکہ ''حافظ ملت'' نے بھی اس کی منظوری دے دی تھی، تاہم ان کے جانثار سپاہی مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات بہت کھٹکتی تھی کہ جس آبادی کو آپ نے اپنے فیض سے تقریباً چالیس سال تک نوازا ہے، جہاں رہ کر علم و دانش کے ایک قلعہ کی بنیاد ڈھوس کی ہے، اس کو خیر باد کہہ کر دوسری جگہ چلے جائیں، ادھر آبادی کے عقیدت کیش اور نیازمند اپنی بے چینی و بے قراری کے اظہار کے لئے مولانا **علیہ الرحمۃ والرضوان** کی خدمت عالیہ میں برابر حاضر ہوتے تھے اوران سے عرض کرتے تھے کہ ہم نیازمندوں کا آخری سہارا آپ ہی ہیں، اگر آپ چاہ لیں تو حافظ ملت مبارکپور کے چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیں گے، اس لیے ایک دن اصحاب الرائے کا وفد لے کر حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے ، اور مودبانہ الفاظ میں عوام و خواص کی جانب سے یہ معروضہ پیش کیا کہ حضور آپ اس آبادی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے ، مبارک پور کے جانثار آپ کی روانگی کے وقت سر دھڑ کی بازی لگا کر آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے، اتنے پر زور و موثر انداز میں مبارکپور والوں کی وکالت کی اور ارکان وفد نے اس کی تائید کی کہ آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہیں قیام کرنے کا وعدہ فرما لیا، جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تو ہر طرف خوشیوں، مسرتوں سے مبارکپور کے عوام و خواص جھومنے لگے، اس موقع پر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ بالفرض اگر وہاں سے رخت سفر باندھ کر چلے گئے ہوتے تو نہ صرف یہ نیازمندوں کا قصبہ آپ کے

فیضان رحمت سے محروم ہوجاتا بلکہ بعض دانشوروں کے خیال کے بموجب کسی دوسری جگہ علم و دانش کا ایسا شہر آباد نہ ہوتا، اگرچہ آپ کی روحانیت سے یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ جنگل میں بھی منگل کا سماں پیدا ہوجاتا اور آپ کے خلوص نیت کا یہ نتیجہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ بنجر زمین میں بھی علم ودانش کا گلستاں آباد ہے۔

مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پر خلوص شخصیت تھی، جنھوں نے کسی طرح آقائے نعمت کو منالیا، ورنہ کوئی دوسرا اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا تھا، انھیں کی ذات بابرکات تھی کہ حافظ ملت نہ صرف ان کا اثر قبول فرماتے تھے بلکہ بسا اوقات ان کے مچل جانے سے اپنے عزم مصمم کو بدل دیتے تھے ،ان کے انتقال پر ملال کے بعد بارہا بحرالعلوم حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) یہ فرماتے تھے کہ اب حضرت کو منانے والا کوئی نہیں رہ گیا، بڑا خلا یہ محسوس کررہا ہوں کہ ہم ایسی عظیم المرتبت ہستی سے محروم ہوگئے جو ہمارے لیے ہر مشکل گھڑی میں سہارا بنتی تھی۔

سنی دارالاشاعت کی نظامت:

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک استاذ کامل کی حیثیت سے بحث وتمحیص میں اوقات عزیز صرف کرتے تھے، وہ کوئی وقت بے کار وضائع نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ سوچتے تھے کہ دین کے کاموں میں ہمیشہ لگا رہنا ایک بڑی عبادت سے کم نہیں ہے، مطالعۂ کتب کے علاوہ ان کے بہت سے مشاغل اور ذمہ داریاں تھیں، جن میں وہ صبح سے شام تک دن رات کے چوبیس گھنٹے میں سے ضروریات زندگی کی مختصر مدت کو چھوڑ کر منہمک رہتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے اپنی صحت وتندرستی کا بھی خیال نہیں رکھا، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کے سہارے زندگی گزارتے رہے، ان کے ذمہ ادارۂ اشرفیہ کی کوئی ذمہ داری سپرد کی جاتی تو وہ انکار نہ کرتے تھے، اور نہ یہ فرماتے تھے کہ اب میں زیادہ بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔

بیسویں صدی کے چھٹے عشرہ کے اواخر میں جب دارالعلوم اشرفیہ کے اساتذۂ کرام اورارباب بصیرت نے یہ سوچا کہ حضور مفتئ اعظم رحمۃ اللہ علیہ ابھی باحیات ہیں، ہم لوگوں کو ان کی بارگاہ میں عرض کرنا چاہیے کہ غیر مطبوعہ فتاویٰ رضویہ کی طباعت واشاعت کی اجازت مرحمت فرمائیں، تو اس میں آگے آگے مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، چنانچہ حضور مفتئ اعظم ہند کی بارگاہ عالی میں بڑے مودبانہ انداز میں یہ عرض کیا گیا کہ حضور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کا کوئی انتظام ہوا؟'' آپ نے فرمایا: تم لوگوں کے سوا کس سے اس کی توقع ہوسکتی ہے'' اس کرامت آثار جملہ نے دلوں میں ہمت اورعزائم میں استواری پیدا کی، دارالعلوم اشرفیہ کے اساتذۂ کرام فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کے لیے دوڑ دھوپ میں لگ گئے، اورسنی دارالاشاعت کی بنیاد ڈالی گئی، اوراس کی نظامت کا بوجھ بھی مولانا عبدالرؤف صاحب کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا، انھوں نے اپنے خلوص وجذبۂ صادق کا ایسا مظاہرہ کیا کہ جماعت اہل سنت میں اس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی تھی، علماے اشرفیہ میں انھوں نے ایسی روح پھونک دی کہ یوپی، بہار وبنگال کے دور دراز علاقوں کا سفر کرکے بڑی مستعدی کے ساتھ سنی دارالاشاعت کے لیے سرمایہ فراہم کیا، پھرانھوں نے تیسری جلد کی اشاعت کا پروگرام مرتب کیا تو عظیم الشان کتاب کے مسودہ کو جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر پھیلا ہوا تھا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اصلاح وتصحیح کا سارا کام تنہا اپنے ذمہ لے لیا، کیوں کہ اس کتاب کا مسودہ ایسی مخدوش وخستہ حالت میں تھا کہ اگر مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا ظرف نگاہ، وسیع الفکر عالم دین تصحیح نہ کرتا اور کرم خوردہ عبارت کو اپنی طرف سے نہ جوڑتا تو اس میں بے شمار خامیاں رہ جاتیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ:

''البتہ نقطہ نقطہ، شوشہ شوشہ کی صحت کا خیال رکھا اور بھرپور کوشش کی گئی کہ کتاب صحیح اورعین مسودہ کے مطابق شائع ہو، پھر بھی کہیں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور بصیرت کی کمی ہوگی، اعلیٰ حضرت **رضی اللہ عنہ** کا دامن اس سے پاک ہوگا۔

استاذ مکرم کی شخصیت کی مکمل تصویر:

وہ سنی دارالاشاعت کے لیے وقف تھے اور انھوں نے فتاویٰ رضویہ کے سلسلے میں کیسی جگر کاوی اور دماغ سوزی کی، اس کو استاذ مکرم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت موثر وبلیغ بلکہ دردناک والم انگیز الفاظ میں بیان کیا، اس سے ان کی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے، ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایسی روشنی پڑتی ہے جدھر دیکھو رنگا رنگ نظر آتے ہیں، یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حضرت موصوف نے مختصر الفاظ میں ان کا جو تعارف کرایا ہے اگرچہ بظاہر چند سطروں کا مجموعہ ہے لیکن فی الواقع وہ ان کی شخصیت کا ایسا آئینہ ہے جس میں ان کی پوری زندگی دیکھی جاسکتی ہے، وہ رقم طراز ہیں کہ:

''بات اصل یہ کہ مولانا ایک فرض شناس اور محبت کرنے والے صاحب اہل وعیال آدمی تھے، پورے درس نظامیہ پر اعلیٰ درجہ کا استحضار رکھنے والے ایک غیر معمولی مدرس تھے ،عبقری صفت فقیہ تھے ، ہند و پاکستان میں چوٹی کے علماے اہل سنت میں شمار ہوتے تھے،اور ان سب سے بڑھ ایک مسلم قامت ،ایک انسان کامل اور ایک خاص بندہ خدا تھے،اس لئے ان کے انتقال پر پورے معاشرے کا اضطراب اور ایک وسیع خطہ زمین میں اس سانحہ کا سوگ منایا جانا ایک فطری امر تھا،اس لئے اہل وعیال ،عزیز واقربا ،حلقہ احباب اور عام متعلقین علما و مدرسین طلبا و معتقدین کے ساتھ ساتھ مختلف ادارے اور انجمنیں جیسے اہل سنت اشرفی دارالمطالعہ، دارالعلوم اشرفیہ اور ہندوستان کے بے شمار مدارس اور تنظیموں نے اس سانحے پر اپنے دلی دکھ کا اظہار کیا، اور ایصال ثواب کی مجلسیں قائم کیں۔

لیکن ان تمام سوگواروں کی بھیڑ میں ایک اور ادارہ بھی تھا جو کچھ نہ کرسکا، حالاں کہ مولانا اس کے سب کچھ تھے، اور وہ مولانا کا سب کچھ، میری مراد سنی دارالاشاعت مبارک پور اعظم گڑھ سے ہے، وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اور جن جن سے مولانا کا تعلق تھا، ادارہ ہو کہ انجمنیں ، مدرسہ ہو کہ شخصیتیں ان کا علیٰحدہ وجود بھی تھا اور سنی دارالاشاعت کو مولانا سے الگ کرکے سوچا ہی نہیں جاسکتا ،اس لئے مولانا کے بعد ''سنی دارالاشاعت'' خود بھی مرگیا، کون

رہ گیا تھا جو اس کی طرف سے مولانا کا سوگ مناتا، سب اپنی اپنی طرف سے مولانا کے غم میں مبتلا تھے، اور جہاں سے مولانا کے لیے بہت کچھ ہونا چاہئے تھا، وہاں سناٹا تھا، کون کرتا؟ مولانا ہوتے تو بہت کچھ ہوسکتا تھا، پر اب تو وہ خود ہی کفن اوڑھ کر سو گئے تھے، کسی نے سچ ہی کہا ہے۔

گوری سوئے سیج پر سو مکھ پر ڈارو کھیس ☆ چل خسرو گھر اپنے کہ سانجھ بھئی چھو دیس

آپ اس بات کو حیرت سے نہ سنیں، واقعہ یہی ہے کہ مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ سنی دارالاشاعت کی اسکیم بنانے والے تنہا تھے، اس کے بعد چندہ وصول کرنے میں وہی پیش پیش، بریلی شریف سے فتاویٰ کا مسودہ وہی لائے، مبیضہ انھوں نے کرایا، دونوں کا مقابلہ حرف بحرف انھوں نے ہی کیا، پریس والوں سے معاملہ انھیں کا کام تھا، کاپی، پروف، فہرست وعنوان کی تیاری، بار بار لکھنؤ جانا، حتی کہ کتاب بھی خود لانا اور یہاں طالب علموں کے ساتھ مل کر بنڈل ڈھونا، کس کس بات کو یاد کیا جائے، کتاب چھپ گئی تو لوگوں کو خطوط لکھنا، آرڈر بک کرانا، ان کے لئے پارسل سینا، اس کو بھیجنا کون سا کام تھا جو تنہا مولانا نے نہ کیا ہو اور اس خاموشی اور بے نیازی سے کہ نہ صلہ کی خواہش، نہ داد کی پرواہ، مرنے والے کی ایک ایک ادا یاد آکر خون کے آنسو رلاتی ہے، اور کیوں نہ ہو۔

جان کر من جملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مگر دنیا کا یہ حال ہے کہ:

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے محفل کی

مولانا عبدالرؤف صاحب **علیہ الرحمہ** اٹھ گئے، اقربا نے رو دھو کر صبر کرلیا، دوست، احباب، متعلقین وہم جنس فاتحہ خیر سے فرصت وفراغ پا کر اپنے اپنے مشغلوں میں مصروف ہوگئے، حد یہ کہ دارالعلوم اشرفیہ ''مولانا جس کی ریڑھ کی ہڈی تھے'' مولانا کی خالی

جگہ کی پرواہ کیے بغیر برابر آگے بڑھتا رہا۔

لیکن ایک سنی دارالاشاعت کی بے گور وکفن لاش البتہ پڑی رہی، ان کے جسم کو لوگوں نے دفن کر دیا لیکن یہ ادارہ جوان کی روحانیت کا ''روپ'' تھا، اس کی طرف توجہ نہ ہو سکی، حالاں کہ یہ وہ ادارہ تھا، جس کے لیے مولانا نے خود کو فنا کر دیا تھا۔

آخر اسی کو خیال آیا جو زندگی میں بھی مولانا کے سب سے زیادہ قریب تھا، ان کے جسم وجان بلکہ دین وایمان کے بعد سارے جہاں سے قریب یعنی آقائے نعمت، سراج امت ''حضور حافظ ملت'' **دام بالفضل**۔

حضرت بحر العلوم **مدظلہ العالی** نے استاذ مکرم مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ دینے والا ہے، جس ہستی نے سنی دارالاشاعت کے قیام اور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کے سلسلہ میں اپنے کو فنا کر دیا، وہی ادارہ اب دم توڑ رہا ہے، اس کی توسیع وترقی کے لیے کوئی جد وجہد نہیں ہو رہی ہے، حالاں کہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی علمی یادگار کو زندہ رکھ کر اس کے زیر اہتمام تصنیف وتالیف کا عظیم الشان پروگرام مرتب کیا جاتا، کیوں کہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ دارالعلوم اشرفیہ کی ریڑھ کی ہڈی تھے بلکہ گروہ علما میں صف اول کے عالم دین تھے، ان کی بارگاہ میں بہترین خراج عقیدت یہی تھا کہ اس ادارہ کو ان کی علمی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا جاتا، لیکن بدقسمتی سے اس کے برعکس ہچکیاں لے رہا ہے۔

آہ! مولانا فاروق احمد صاحب علیہ الرحمہ

مشرقی یوپی کی ایک مشہور درس گاہ (جو اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے) دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کے منیجر جناب مولانا فاروق احمد صاحب طویل علالت کے بعد سنیچر ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۵ جون ۱۹۸۵ء بوقت ۴ بجے شام اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔

انّاللّٰہ وانّاالیہ راجعون

دوسرے روز ۲۶ رمضان المبارک کو ان کا جسد خاکی سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا مرحوم ایک بزرگ ہستی حضرت شعیب الاولیا مولانا شاہ یار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند تھے، ان کی ولادت ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی، وہ بہت باوقار، معاملہ فہم، سنجیدہ، حلیم الطبع تھے، اور شریعت اسلامی کی پابندی تو ان کے پدر بزرگوار سے ورثہ میں ملی تھی، کیوں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک عابد و زاہد، خدارسیدہ، نہایت دین دار بزرگ تھے، احکام و شرائع کے ایسے پابند تھے کہ چالیس سال تک نماز با جماعت کی تکبیر اولیٰ نہیں چھوڑی تھی، ظاہر ہے ایسی ذات بابرکات کی تربیت کا مرحوم پر گہرا اثر تھا، آپ کی ابتدائی تعلیم ضلع بستی کے ایک گاؤں کے اسکول میں ہوئی تھی، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی آرزو تھی کہ صاحبزادہ بلند اقبال کو عالم دین بنائیں، چنانچہ اسی ضلع کے مشہور عالم دین، سلطان المناظرین، مولانا عتیق الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دولت کدے پر تشریف آوری کی زحمت دی، اور اپنے فرزند کو ان کے حوالے کیا، مولانا ممدوح نے کامل توجہ و انہماک کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر متوسطات تک کی تعلیم ہوئی، اور دستار بندی کی سعادت سے محروم رہے، تاہم اپنی جودت طبع، سلامت روی، انتظامی مہارت، حسن تدبر کی وجہ سے دین کے سچے خادم ثابت ہوئے۔

دارالعلوم فیض الرسول کا انتظام مولانا مرحوم نے ۱۹۵۶ء سے سنبھالا تھا اور اس کی

خدمت وترقی میں اپنی پوری زندگی صرف کردی، حتیٰ کہ وصال سے چندروز پہلے موذی بیماری کی کربناک حالت میں بھی دارالعلوم کو بار بار پوچھتے اوراس کے مالی استحکام کی تدبیریں بتاتے رہتے تھے۔

اس دنیاے فانی میں آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے، کتنے اچھے لوگ آئے اور چلے گئے، بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ رحلت کے بعدان کی یاد دلوں سے محونہیں ہوتی اوران کے عزیز واقارب ہی نہیں دوسرے لوگوں کوبھی ان کی یاد برابرآتی رہتی ہے، اوران کو یادکرکے غم واندوہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں، انھیں لوگوں میں مولانا فاروق احمد صاحب مرحوم بھی تھے جن کے انتقال پرملال کا اثران کے خاندان پر بہت گہرا پڑا تو اوراحباب بھی گریہ کناں رہے۔

وہ عمر میں اپنے دو بھائیوں سے اگرچہ چھوٹے تھے لیکن عملاً وہ تمام خاندان کے سرپرست تھے، ان کے برادرکلاں حضرت مولانا صدیق احمد صاحب نے (جوخلیفہ صاحب کے نام سے مشہور ہیں) ان کے انتقال پراپنے غم واندوہ کا اظہارکرتے ہوئے فرمایا کہ:

''میرے عزیز ترین بھائی منیجر صاحب اس دنیا سے جاچکے، وہ میرے بچوں کے لیے بڑا سہارا بنتے تھے، ان پر بہت شفقت ومہربان تھے، میں باہر دورے پر رہتا تھا، مجھ کو پتہ نہیں رہتا تھا کہ میری گھریلوضرورتیں کیا ہیں؟ وہ سب کی ضرورتیں پوری کرتے تھے، اپنی صحت کی بے اطمینانی کی وجہ سے مجھے یہ خیال آتا تھا کہ اگرمیں اس دنیا سے چلا گیا تو اپنے بال بچوں کی فکر سے آزاد ہوکر جاؤں گا، کیوں کہ منیجر صاحب کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑیں گے بلکہ سب پر اپنی شفقت ومحبت سے آرام وراحت کا سامان بہم پہونچائیں گے، میرا یہ عظیم الشان دارالعلوم جوان کے حسن تدبروکاوش سے مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرر ہاہے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی، کیوں کہ منیجر صاحب جیسا منتظم، باصلاحیت شخص میرے بعد اس کی ترقی میں کوشاں رہے گا، لیکن اب ان کے وصال کے بعدافکار وآلام سے گھرگیا ہوں، میں کس خیال میں تھا اورقدرت الٰہی کا کیا فیصلہ ہوا، اللہ تعالیٰ میری بے بسی اور بے چارگی پر رحم فرمائے، اور پردۂ غیب سے بہترین سبیل عطا فرمائے۔

ادارہ ماہنامہ اشرفیہ کے ارکان مولانا مرحوم کے سوگواروں میں اپنے کوشامل کرتے ہیں، اور بارگاہ خداوندی میں دعا کرتے ہیں کہ اپنی رحمت سے ان کی قبر کومنور فرمائے، اور ان کی لغزشوں کو معاف فرما کر جنت الفردوس میں بلند مقام اور پسماندگان کوصبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

سفرنامہ حجاز

۞۞

[زیرنظر سفرنامہ مضامین کا ایک طویل سلسلہ ہے جومختلف حیثیتوں سے بڑی افادیت و عظمت کا حامل ہے، اس کے آئینے میں حضرت علامہ شیخ القرآن صاحب **علیہ الرحمہ** کی شخصیت کے خدوخال اوران کے علمی کمال کے جلوے دیکھے جاسکتے ہیں، اس میں حج وزیارت کے ضروری مسائل بھی ہیں اور تاریخی وجغرافیائی اشارے بھی، سیاسی و مذہبی اداروں کی ناقص کارکردگی اور بدنظمی پر بھرپور تنقید بھی ہے اور حاجیوں اور زائروں کو پرخلوص ومفید مشورے بھی، لطف یہ ہے کہ زبان وادب کی لطافت، حلاوت، شگفتگی وشیرنی کہیں بھی پھیکی نہ پڑی، بلکہ بعض ترکیبوں کو پڑھ کر طبیعت جھوم اٹھتی ہے، ایک زائرحرم کے مشاہدات اوراس کے قلبی واردات واحساسات کی عکاسی منفرد اسلوب بیان میں اس شان سے ہوئی کہ گویا الفاظ وعبارات میں جان پڑ گئی اور وہ خود بھی قاری سے محوگفتگو ہیں، امید ہے کہ سفرشوق کی یہ روداد انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

واضح رہے کہ یہ ایک نہایت طویل مقالہ تھا جو متعدد قسطوں میں ماہ نامہ اشرفیہ میں شائع ہوا، افسوس کہ ساری قسطیں نہیں مل پائیں، چند ہی اقساط ملیں، جنہیں قارئین کی نذر کررہا ہوں۔ (مولف)

میری پست ہمتی:

الحمدلله وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

میرے سفرحج وزیارت کی داستان حیرت انگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی، ایک ناکارہ وروسیاہ جس کے دفتر اعمال میں نیکیوں کی تعداد کم ہی ہوگی وہ حرمین شریفین کی زیارت کو نکلا، اس کے پاس ظاہر کے اعتبار سے کوئی سبیل نظر نہیں آرہی تھی، لیکن رب قدیر کی کرم فرمائی تھی، اس نے بے شان وگمان اچانک اس کی سبیل پیدا فرمادی، قسمت کا ستارہ عروج پر ہوا کہ بلانے والے آقا نے اس انداز سے بلایا کہ اس کے روسیاہ غلام کو اس کا تصور بھی بظاہر بعید از قیاس تھا۔

جب اس مقدس سفر کے لیے روانگی ہوتی ہے تو احباب اور ادارہ علیمیہ کے علما و طلبہ انتہائی جوش عقیدت کے ساتھ نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت کی صداؤں سے فضا کو مترنم کرتے ہوئے رخصت کرتے ہیں، کتنے اساتذہ و متعلقین نیز جمدا شاہی کے احباب خصوصی کی آنکھیں پرنم تھیں، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان مخلصوں اور محبوبوں کو چند دنوں کی میری جدائی شاق گزر رہی ہے بلکہ ان کے نہاں خانہ قلب میں یہ بات مستتر ہے کہ دیار قدس سے میری واپسی کے امکانات کم ہی ہیں، غالباً میری صحت اور پست ہمتی کے پیش نظر اس لائق نہیں تصور کرتے تھے کہ پھر ان سے ملاقات ہوگی، میری حالت بھی عجیب تھی مجھ کو اپنی قسمت پر نازاں ہو کر مسرت و شادمانی سے جھوم اٹھنا چاہیے تھا لیکن میں تھا پژمردہ، اندوہگیں، اداس ،اس کے بجائے کہ میں سب کو تسلی دیتا خود ہی تسلی کا محتاج تھا، طرح طرح کے خیالات واوہام دل ناداں کو مضطرب، بے قرار کیے ہوئے تھے، غم اس کا نہیں تھا کہ وطن چھوٹ رہا ہے، عزیز و اقارب، دوست احباب جدا ہو رہے ہیں، بلکہ غم اس کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہاں واپس نہ آسکوں، حالاں کہ یہ سب شیطانی وساوس وخواطر تھے، بالفرض اگر چہ لوٹنے کے امکان زیادہ نہ تھے جب بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھ کو مسرور رہنا چاہیے تھا کہ میری بے علمی و روسیاہی کے باوجود ایسی پاک سرزمین ملنے والی ہے جہاں کتنے پاکوں کے پاک جسم زیر زمین آفتاب عالمتاب کی ضیاباریاں رکھتے ہیں، جہاں کتنے صلحاے امت اس پاک زمین کے نیچے اپنی روحانی تابانیوں سے مادی آفتاب کی ضوفشانیوں کو ماند کر سکتے ہیں، جہاں وہ سب کچھ نعمتیں فراہم ہیں جو اس دنیا میں نہیں مل سکتیں، وادی کشمیر کو لوگ اس کے گلہاے رنگا رنگ، حسین مناظر فطرت، اس کے آبشاروں اور پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں کی بنا پر جنت نظیر کہتے ہیں، لیکن اگر عرفان حقیقت کی چشم وا ہو جائے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیاے دوں کے پر فریب اور دلکش مظاہر فطرت ''وادی غیر ذی زرع'' کے مناظر روحانیت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

ایسے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے جانے والا اگر اپنے کو غمگین واداس پائے

یا اس کا دل جذب وشوق سے خالی ہو تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ابھی وہ یقین وعرفان کی اس منزل کو نہیں پہنچا جو ایک مومن کی شان ہے، مومن کامل کا رتبہ تو یہ ہے کہ اپنی دنیا جہان کی نعمتیں لٹاتا ہوا بلکہ اپنا سرمایہ حیات قربان کرتا ہوا اس ولولۂ شوق اور جذب ومستی کے عالم میں حرمین طیبین کی زیارت کو نکلے کہ حیات فانی کے چند لمحات کی فکر اس کے واہمہ میں نہ آئے اور یہاں تو اس ناکارہ کی یہ حالت تھی کہ یہ اوہام ووساوس کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا، زبان کو یارائے سخن نہ تھا کہ اپنے متعلقین واحباب کو تسلی دے کر ان کے غم واندوہ کو دور کرتا۔

اس بزدلانہ حالت یا پست ہمتی کے عالم میں دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی سے ۱۰/ذی القعدہ ۱۴۰۹ھ بروز جمعرات بوقت ۸/بجے دن یہ مبارک سفر شروع ہوتا ہے، پروگرام کے مطابق سپر فاسٹ ٹرین (لکھنؤ) سے عروس البلاد ممبئی جانا تھا، جیپ، منی بس سے لکھنؤ تک کا سفر ہوا، استاذ کریم حضرت العلام مولانا شفیع صاحب قبلہ اعظمی **مدظله العالی**، برادر عزیز ماسٹر حمید اللہ خان صاحب، مولانا امید علی صاحب صدیقی، مولانا فروغ احمد صاحب اعظمی، مولوی معراج الحق قادری، حافظ محمد نصیر صاحب عزیزی دیگر احباب دارالعلوم کے علاوہ چند طلبا لکھنؤ تک ساتھ رہے، میرے مخلص دوست مولانا محمد حنیف صاحب قادری نے ہمارے قافلے کے حجاج کرام کے آرام وآسائش کے لیے ایک روز قبل لکھنؤ پہنچ کر مسلم مسافر خانہ میں دو کمرے بک کرا لیے تھے، تاکہ چار چھ گھنٹے آرام سے گزر جائیں، جب ہم لوگ چار بجے شام مسلم مسافر خانہ کے صحن میں پہنچے تو حج کمیٹی والوں کا بورڈ لگا ہوا دیکھا، ہم نے سوچا کہ حج کمیٹی کے لوگ بڑے کریم النفس ہیں کہ صوبہ اتر پردیش کے حجاج کرام کی سہولت کی خاطر ایک دفتر قائم کیے ہوئے ہیں، گوکہ یہاں قیام چند گھنٹوں تک رہے گا تاہم حج کے سلسلہ میں بہت کچھ معلومات فراہم ہو جائیں گی، لیکن بڑا افسوس ہوا کہ بورڈ لگا ہوا ہے اور وہاں کوئی کارکن نہیں ہے، گویا حج کمیٹی کا صرف ایک اشتہار تھا، بڑی مایوسی کی بات یہ کہ حج کمیٹی والے حکومت کے سارے انتظامات اور جملہ سہولتوں پر نہ صرف پانی پھیر دیتے ہیں بلکہ حکومت کی بدنامی کا باعث ہوتے ہیں، کوئی ان سمجھ داروں سے

دریافت کرے کہ حجاج کرام کی آمدوروانگی کے وقت اگران کے ذمے کوئی خدمت متعلق نہیں ہے تو پھر اتنے لمبے چوڑے بورڈ کی کیا ضرورت ہے، کیا اس سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارا وجود برقرار ہے خواہ ہم سے کسی کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جس ٹرین سے ممبئی کے لئے روانگی ہونے والی ہے وہ صرف ۱۲ر گھنٹے لیٹ ہے، گویا ہمارے صبر وتحمل کا امتحان ابھی سے شروع ہو گیا تھا، اور یہ امتحان ہونا چاہیے تھا کہ حاجیوں کو جب خود اپنے ملک میں ایسی بدانتظامی کے برداشت کرنے کی قوت نہ ہو تو وہ دوسرے ملک میں صبر وتحمل کا مظاہرہ کیسے کر پائیں گے؟ وہ تو خیر ہوئی کہ متعلقین ومتوسلین کا اتنا بڑا قافلہ تھا ورنہ ہم لوگ عرب مقدس کی حرارت سے آشنا ہونے سے قبل اچھی خاصی حرارت میں یہیں مبتلا ہو جاتے اور حج کمیٹی والوں کے حق میں دعا نکل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو عقل سلیم کی دولت سے سرفراز فرمائے، اب ریلوے والوں کی بدانتظامی کے عذاب الیم سے رہائی کی دعا نکلی، کیوں کہ حجاج کرام کے پاس علاوہ دعا کے اور رہتا ہی کیا ہے، کوئی حاجی کتنا ہی آہ وفغاں کرے، کون سنتا ہے فغان حجاج۔

چار بجے شام سے دو بجے رات تک بڑی بے قراری کے ساتھ وقت گزرتا اگر کچھ مزاج شناس اپنے لطیفوں اور دقیقہ سنجیوں سے ہم لوگوں کا دل بہلانے کی کوشش نہ کرتے، خدا بھلا کرے محب مکرم مولانا قادری صاحب **زیدمجدھم** کا کہ وہ کام کی مشین ہیں، وہ ہمیشہ اپنے ساتھ کاموں کا ایک ڈھیر رکھتے ہیں، یہ مشین یہاں بھی کام دے رہی تھی، کوئی نہ کوئی خوش کن خبر گھنٹہ آدھا گھنٹہ بعد ضرور سناتے تھے، بلکہ یہاں مسلم مسافر خانے میں احباب کا ایک مجمع اکٹھا کر رکھا تھا، جو عملی و سیاسی مسائل پر مصروف گفتگو رہتا تھا، اور ہم حاجیوں کا کام قرآن شریف پڑھنا، اللہ اللہ کرنا تھا، لیکن ایسی مجلسوں میں عبادت کی طرف طبیعت کا میلان کسی خلوت نشین عابد وزاہد کا ہی ہوسکتا ہے، غرض اس طرح کی گفتگو اور بات چیت سے یک گونہ کوفت جو ٹرین کے لیٹ ہونے سے پیدا ہوگئی تھی دور ہو رہی تھی اور وہ گاڑی ہم لوگوں کے دل ودماغ پر ایسی مسلط تھی کہ:

بس کہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ☆ ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

کے مصداق جو گاڑی آتی ہوئی نظر آتی اس کے متعلق خیال ہوتا کہ شاید یہ ہماری گاڑی ہے، خدا خدا کر کے تقریباً دو بجے رات میں ممبئی جانے والی گاڑی ملی، عزیزوں اور مخلصوں نے چشم پرنم اور پرخلوص کے ساتھ ہم لوگوں کو الوداع کہا۔

ممبئی میں قیام:

۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ (بروز شنبہ) کو سپر فاسٹ ٹرین سے علی الصباح ممبئی عظمٰی پہنچے، ہمارے کرم فرما جناب الحاج سیٹھ غلام مصطفٰی صاحب رضوی نے ایک شاندار صاف ستھرے فلیٹ میں حجاج کرام کے قیام کا انتظام کیا تھا، بہت سے عزیز اور تلمیذ رشید کسی طرح تلاش کر کے ہم لوگوں کے فلیٹ میں جب تک ممبئی میں قیام تھا روزانہ ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے، ممبئی میں صرف چار روز تک قیام رہا، وہاں احباب کا ایک مجمع اکٹھا رہتا تھا، جتنے لوگ جوش عقیدت و محبت سے ملنے کے لیے آتے تھے میں ان کے سامنے عالمانہ شان کے ساتھ نمودار نہیں ہوتا تھا، حج و زیارت کے مسائل اور اس کے فضائل و مناسک کے برکات و حسنات سب کچھ ان کے سامنے مجھ کو بیان کرنا چاہیے تھا، لیکن حالت یہ تھی کہ زبان گنگ، چہرہ اداس، سب کچھ پڑھنے کے باوجود بھی بے علمی اور جہالت کا پتلا بنا ہوا تھا، اگر کوئی کچھ عرض و معروض کرنے کی جرأت کرتا تو میرے اوپر ایسی کیفیت طاری تھی کہ اس کے اخلاص و محبت کا جواب نہایت کھردرے الفاظ میں دیتا، چہرہ تو خشک و عبوس تھا ہی الفاظ میں اس کی جھلک نظر آتی تھی، کم خوابی بلکہ بے خوابی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا، ہمارے عزیزوں اور اخلاص کیشوں کو بڑی حیرانی تھی کہ عالم دین ہوتے ہوئے ان پر ایسی بے کیفی کی حالت طاری ہے جس کی کوئی مثال نہیں، یہ تو بالکل نڈھال ہو رہے ہیں اور حواس باختگی میں ان کی زبان سے چند کلمات خیر بھی نہیں نکل پا رہے ہیں، کیسے عالم ہیں جو موت سے اس قدر ڈر رہے ہیں؟ ہم میں سے کتنے جاہلوں نے حرمین شریفین کی زیارت کا شرف حاصل کیا، لیکن ان کے اوپر ایسی حالت طاری نہیں تھی، اور ان کی تو عجیب و غریب حالت ہے، کہ گویا

ان کو جبر واکراہ کے ساتھ موت کے منہ میں پہنچایا جا رہا ہے۔

احرام باندھنے کے وقت میری حالت:

سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے سارے اندازے اگر چہ مکمل طور سے صحیح نہ رہے ہوں لیکن اکثر غلط نہیں تھے، کیوں کہ ۲۰؍جون ۱۹۸۹ء کو احرام باندھنے کا وقت آیا تو میری حالت غیر ہو رہی تھی، کتابوں میں پڑھا پڑھایا تھا کہ احرام باندھنا گویا کفن کا لباس پہننا ہے، ظاہر ہے کہ مجھ جیسے کمزور دل کے لئے یہی تصور لرزہ براندام کر دینے کے لیے کافی تھا کہ کفن کے کچھ علامتی کپڑے حج وعمرہ کی نیت سے پہننا ضروری ہیں، اب وقت قریب آ گیا ہے کہ کفن دفن سب کچھ کا انتظام ہوگا، پھر حاجیوں کی طرف سے یہ آواز سنائی دی کہ مکہ معظّمہ پہنچ کر ایک ایک تھان کپڑا کفن کے واسطے خریدنا ہوگا، اب بھلا بتایئے کی زندہ رہنے کی کوئی سبیل باقی رہ گئی؟ اس کے بعد میری حالت کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو میری بزدلی یا نفسیاتی کیفیت سے واقف ہوں، کفن کا علامتی لباس (احرام) پہن کر شہر خموشاں یعنی ممبئ کی مشہور قبرستان میں اس لیے جانا ہوا کہ وہاں دارالعلوم علیمیہ کے محسن اعظم جناب سیٹھ شمس الحق صاحب علیمی مرحوم آرام فرما ہیں، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھ لیا جائے، ابھی تک کفن جیسا لباس تھا اب قبروں کی دنیا میں زندہ پہنچ گئے۔

میں اپنے قارئین سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر میرے ہمراہ حجاجِ کرام کا ایک قافلہ اور دیگر احباب نہ ہوتے تو میری کیا حالت ہوتی اس کو علام الغیوب ہی جانتا ہے کہ جو شخص خوف وہراس کی اس حالت میں ہو اس نے کیا فاتحہ پڑھا ہوگا؟ ایصال ثواب کے لیے کتنی آیتیں تلاوت کی ہوں گی؟ ایک غیر متحرک ہیولیٰ بنا کھڑا رہا، اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ علیمی صاحب مرحوم کے حق میں چند دعائیہ کلمات بھرائی ہوئی آواز میں نکل پڑے اور ان کے لیے بھی اپنے کو بہت سنبھالا تھا ورنہ ایک غیر متکلم مجسمہ کھڑا رہ کر تھوڑی دیر کے بعد خدا کے اس نیک بندے کی قبر سے بغیر کسی دعا درود کے واپس ہو جاتا۔

ایئر پورٹ کو روانگی:

ہمارے ہمراہیوں کو بڑی تمنا رہی ہوگی کہ فاتحہ خوانی رقت آمیز لہجے میں دیر تک ہوتی رہے، لیکن چند منٹوں میں شہر خموشاں سے واپسی ہوگئی، راستے میں کسی سے کوئی گفتگو نہ کر سکا، لرزاں ترساں عزیز سعید مولانا معین الحق صاحب علیمی سلمہ ربہ اور دیگر عزیزوں کے ہمراہ قیام گاہ پر آیا، چند ہی منٹ میں یہاں سے ایئر پورٹ کو روانگی ہونے والی تھی، جمد اشاہی کے سیکڑوں لوگ جیپوں اور ٹیکسیوں پر ہوائی اڈہ تک رخصت کرنے کے لیے ایک ہجوم کی شکل میں روانہ ہوئے، لیکن رہ رہ کر بہت سے لوگ میری اداسی، خاموشی اور چہرے کی خشکی کو دیکھ رہے تھے، میری ظاہری حالت سے میری اندرونی کیفیت کو بھانپ رہے تھے، کچھ پر مزاح لوگ ایسے تھے جو اپنی شیریں کلامی یا اپنی خوش طبعی سے اس زندہ جنازہ کو خوش کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، لیکن میں تھا **صمٌّ بکمٌ** سب کی باتیں بارگراں خاطر تھیں، کوئی بولے تو اسے بھی الجھن محسوس کر رہا تھا، چند منٹوں میں ''سانتا کروز'' کے ہوائی اڈے تک پہنچ گیا، ابھی تک خالص زندوں کا ساتھ تھا، اب ''مردہ نماز زندوں'' کا ساتھ ہو گیا، معلوم ہوتا تھا کوئی یار و غمگسار نہیں، میرے ساتھ جتنے لوگ تھے کسی کے چہرے پر شگفتگی نہیں پائی جا رہی تھی، بلکہ لوگ غمگین و اداس تھے۔

مطابق ۱۵ رذیقعدہ ۱۴۰۹ھ بروز سہ شنبہ ۸ ربجے شب میں احرام باندھا تھا، سر کے بال منڈوایا، ناخن ترشوایا، وضو اور غسل کیا، خوشبو لگایا، سلے ہوئے کپڑے اتار کر احرام کے دو کپڑے ایک بطور تہبند باندھا اور ایک چادر کی طرح اوڑھ لیا، پھر دو رکعت نماز بہ نیت احرام پڑھی، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد ''**قل یاایھاالکفرون**'' اور دوسری رکعت میں ''**قل ھواللہ احد**'' پڑھا، حسب طریقہ نماز پوری کر کے سلام پھیر دیا پھر یہ دعا پڑھی:

''اللھم انی ارید العمرۃ فیسرھا لی وتقبلھا منی، نویت العمرۃ مخلصالله تعالی''۔

اس کے بعد تلبیہ بلند آواز سے پڑھتے ہوئے سر سے کپڑے کو ہٹا دیا، اب احرام مکمل ہوگیا، چونکہ میں نے حج تمتع کا ارادہ کیا تھا، اس لئے پہلے عمرہ کا احرام ممبئی سے باندھا تھا، جو حضرات ہوائی جہاز سے سفر کریں ان کو ممبئی سے احرام باندھنا چاہیے۔

ایئرپورٹ کے اس حصہ میں جہاں مسافروں کو رخصت کرنے کے لیے عزیز واقارب جاتے ہیں، وہیں حجاج کرام سے آخری مصافحہ ومعانقہ ہوتا ہے، یہ منظر بڑا ہی دلدوز اور رقت آمیز ہوتا ہے، قریب قریب سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری رہتی ہیں، کتنے لوگوں کو میں نے دیکھا کہ اپنے خویش اقارب کی جدائی میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں، کوئی کتنے ہی سنگ دل ہو ایسے موقع پر اس کا دل بھر آتا ہے، بہرحال کافی وقت مصافحہ ومعانقہ میں صرف ہوا، عزیز سعید مولانا معین الحق علیمی صاحب، جناب مولانا بدرالحق صاحب، الحاج منشی محبت علی صاحب، جناب عتیق الرحمن صاحب جمداوی، جناب سیٹھ نسیم صاحب، اور دیگر مخلصین ایک ایک کرکے وداعی سلام اور مصافحہ کرتے ہیں، سب سے آخر میں جناب الحاج سیٹھ غلام مصطفی صاحب رضوی نے الودع پڑھا، نہیں بلکہ الوداع کیا، وہ بھی اس انداز میں کہ وہ معانقے کے وقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، ان پر بڑی رقت طاری تھی، گویا خلوص ومحبت کا دریا اس وقت موجزن تھا، اور میں تھا کہ آنکھیں خشک ہوچکی تھیں، کبھی کبھی بے معنی الفاظ بے اختیاری میں زبان سے نکل رہے تھے، اس موقع پر ذہن میں یہی آیا کہ ایسے ہی ایک وقت ہوگا، جب کہ اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف جانے والے کو رو روکر اعزہ رخصت کریں گے۔

ایک ایک کرکے غم واندوہ کی حالت میں چھوڑ کر بڑے تاسف وحسرت کے ساتھ جدا ہوگئے، کبھی کبھی میں اپنے احباب کو پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی تھا، اب ہم سب کو تھوڑی دیر میں ہوائی جہاز پر سوار ہونا تھا، کسٹم کے ایماندار لوگ ایک ایک کو ایسا چیک کر رہے تھے گویا ان کا سابقہ چوروں اور لیڈروں سے تھا، ان وحشیوں کو نہ کسی کی شخصیت کا پاس اور نہ کسی کی وجاہت کا لحاظ، وہ سب کو ایک ہی پیمانے سے ناپ رہے تھے، ان کے سنگ دلانہ سلوک کے لیے

جواز تھا، کیوں کہ بہت سے پارساؤں کی صورت میں غیر قانونی حرکتوں کے مرتکب لوگ بھی ہوتے ہیں، خدائے تعالیٰ کے فضل سے ہم لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں اور پیروں میں چلنے کی سکت نہیں ہے، پست ہمتی کی اسی حالت میں کسی طرح ہوائی جہاز پر پہنچ گیا، اخباروں میں ایک مرتبہ پڑھا تھا کہ ایک شخص ہوائی جہاز پر سوار ہوا، جہاز کے پرواز کرتے ہی اس کی روح بھی قفص عنصری سے پرواز کر گئی، معا اس کا خیال آ گیا، اب نہ پوچھئے کہ میری کیا حالت ہوئی؟ لیکن عاجز و کمزور بندوں کے لیے بھی قدرت الٰہی کی طرف سے سہارے کے کچھ سامان پیدا ہوتے ہیں، اپنی بے کسی اور بے بسی کو دور کرنے کے لئے یا یوں کہیے کہ اپنے دل کو صحیح سمت میں مائل کرنے کے لئے ایسے وقت میں سب سے بے نیاز ہو کر کلمہ اور درود شریف آنکھیں بند کر کے میں نے پڑھنا شروع کیا، ابھی درود شریف کا ورد کر ہی رہا تھا اور دل کو قدرے سکون مل رہا تھا کہ اچانک ہوائی جہاز کے اناؤنسر کی طرف سے یہ اعلان ہونے لگا کہ:

''بیمان کی اڑان میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں، جتنے یاتری سوار ہیں اپنی اپنی پیٹیاں لگا لیں اور انتر راشٹریہ نیم کے انوسار اپنی کرسی کے نیچے رکھی ہوئی جاکٹ کا پریوگ سیکھ لیں''

اس کے بعد اس جاکیٹ کے استعمال اور اس میں ہوا بھرنے کا طریقہ ایک ماہرانہ کرتب کے ساتھ ایک خاتون نے بتانا شروع کیا، مجھ کو تو پہلے حیرانی ہوئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اس خاتون نے بتایا کہ اگر اتفاقاً ہوائی جہاز کو کوئی فضائی حادثہ لاحق ہو جائے تو جاکٹ کو پہن کر نیچے چھلانگ لگا دینا چاہیے، اس سے زمین پر سلامتی کے ساتھ اتر جائیں گے، یہ احتیاطی تدبیر تھی جو ناگہانی حادثے کے وقت عمل میں لائی جا سکتی تھی، لیکن میرے خیال میں حجاج کرام کو اس کے بتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، اولاً تو اس لئے کہ جو لوگ حج و زیارت کے لئے جاتے ہیں، ان کی شجاعت و بہادری معلوم، ثانیاً اگر حادثہ پیش آ جائے تو اگرچہ حجاج

کرام حج وزیارت کی سعادتوں سے محروم ہوجائیں گے،لیکن اس کے اجروثواب کے ساتھ ساتھ وہ شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہوجائیں گے،بھلا ان باریکیوں کو ہوائی جہاز کے عملے کے لوگ سمجھ سکتے ہیں،ان کوتو اپنے ضابطے کی پابندی ضروری ہے،اس لیے وہ خالص ہندی بھاشامیں حجاج کرام کواپنی ہدایت واعلانات سے نوازتے ہیں،خواہ کوئی سمجھے یانہ سمجھے ،اپنے فریضے کے اداکرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں،اس قسم کا اعلان میرے لئے وحشت ناک اورخوفناک تھا،مگرخیال آیا کہ جس سواری پر ہم سوار ہیں اس پر ۲۷۲/افراداور پائے جاتے ہیں،سب کے ساتھ میرا بھی حشر ہوگا۔''مرگ انبوہ جشنے دارد''

مجھ جیسے نازک طبع پراس اعلان کا اچھا خاصا اثر ہوالیکن ذہنی تسکین کے لیے بہت کچھ سوچنے کی طرف تدریجاً مائل ہورہا تھا،یکا یک ہوائی جہاز میں جھٹکا ہوااوروہ پرواز کے لیے زمین پر رینگنے لگا،حجاج کرام میں سے کچھ لوگ بلند آواز سے زائرین حرم کوسواری کی دعا:''**سبحان الذي سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون**''۔پڑھنے کی تلقین کررہے تھے،اب وہ بلند آواز سے حجاج کرام کو پڑھانے لگے،میں تلبیہ کئی مرتبہ پڑھ چکا تھااوروہ کوئی مشکل دعا بھی نہیں ہے،میں بھی بلند آواز سے پڑھنے لگا،لیکن میری حالت کا اندازہ بہتر طور پراس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے پڑھنے میں ایک آدھ بار مجھے ایک صاحب نے لقمہ دیا،تلبیہ پڑھتے پڑھتے تھوڑا سا وقت گزرا تھا کہ ہوائی جہاز فضا میں بلند ہوگیا اوروہ بار بار ہچکولے کھارہا تھا،اوپر نیچے آرہا تھا،جیسے کوئی شخص جھولے میں بیٹھا ہوااپنے کومحسوس کرتا ہو،آپ یقین مانیے اس سے بھی میرے اوپر خوف طاری ہوا،جہاں کوئی نئی بات ہوئی اس سے میرے ہراس میں اضافہ ہورہا تھا،میری تسکین کا ذریعہ صرف درود شریف کا ورد تھا،اورکسی سے بات کرنے کے لیے طبیعت کا میلان نہیں ہورہا تھا،چند منٹوں میں جب ہوائی جہاز فضا میں بالکل برابر کی سطح پر ہوگیا تواس کے عملے کی ایک ٹولی نے کھانے وغیرہ کی ضیافت کی،کھانا کیا کھاتے،بمشکل حلق کے نیچے دو چار نوالے اتار لیا،پھر کھانا بھی ہمارے مزاج کے مطابق نہیں تھا،معلوم ہوتا تھا کہ جہاز کے عملے نے اپنے

متبرک مہمانوں کی ضیافت کے لیے بہت پہلے سے اہتمام کرلیا تھا، اسی لئے تو کھانا ٹھنڈا تھا، دیر کا پکا ہوا معلوم ہوتا تھا، گو کہ سڑا ہوا نہیں تھا، تھوڑا بہت کھا کر کرسی پر بجائے بیٹھنے کے دراز ہو گیا، اور بڑے اخلاص، نہایت نیازمندی اور خشوع خضوع کے ساتھ درود شریف پڑھ رہا تھا کہ رحمت الٰہی متوجہ ہو گئی اور نیند کا ایک جھونکا آیا، میں گہری نیند سے سو گیا، کئی دنوں کے بعد پہلی مرتبہ گہری نیند سے سویا تھا، مگر سویا کہاں تھا؟ نہ زمین پر نہ آسمان پر بلکہ زمین و آسمان کے بیچ عصر حاضر کے ''اڑن کھٹولہ'' پر۔

درود شریف کی برکت:

آدمی جب سوتا ہے تو اس کا خوف و ہراس، اس کا اضطراب و بے چینی، اس کی وحشت، رنج و الجھن کا مداوا ہو جاتا ہے، ظاہر پرستوں کی اس توجیہ میں کلام نہیں کیا جا سکتا، تاہم میں یہ کہنے کی ضرور جرأت کرتا ہوں کہ اگر خدائے تعالیٰ مجھ کو درود شریف پڑھنے کی توفیق نہ دیتا، تو خواب شیریں کی لذت سے میری روح آشنا نہ ہوتی، اس لئے میں یہی کہوں گا جو کچھ سکون میسر آیا، وہ رحمت والی بارگاہ میں ہدیۂ درود شریف نذر کرنے کی برکت سے ہے، میں گہری نیند میں تھا کہ ہوائی جہاز کے اناؤنسر نے بار بار یہ اعلان کیا کہ تمام یاتری جگ جائیں اور اپنی اپنی پیٹیاں کس لیں، اس وقت ہمارا بیمان (ہوائی جہاز) مسقط کے اوپر سے اڑ رہا ہے، تھوڑی دیر کے بعد ہم جدہ پہنچ جائیں گے، حجاج کرام اس اعلان سے بیدار ہو گئے، اور اپنی اپنی پیٹیاں کسنے لگے، ابھی آدھے گھنٹے کا وقت نہ گزرا ہوگا کہ ہوائی جہاز جدہ کے بالکل قریب پہنچ گیا، اس کی روشنیاں نظر آنے لگیں، مجھ کو بہت سکون مل گیا تھا، لیکن پھر دلِ ناداں دھک دھک کرنے لگا، وہمیات کے طلسم اور وساوس کے جال دل و دماغ پر چھانے لگے، کبھی یہ خیال آتا تھا کہ ہم ایسی زمین پر اترنے والے ہیں جس کا درجہ حرارت ہندوستان کے درجہ حرارت سے بہت مختلف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو جائے، کبھی سوچتا تھا کہ میں نپا تلا پرہیزی کھانے کا عادی ہوں، بدپرہیزی سے بیمار نہ پڑ جاؤں، اور اگر بیماری میں مبتلا ہو گیا تو اس اجنبی ملک میں مجھے علاج و معالجے کی کیا

سہولت ہوگی؟ ایک دو وسوسہ ہوتو اس کو بیان کیا جائے، یہاں تو وسوسوں کا طوفان اٹھ رہا تھا، جس سے میں متاثر ہورہا تھا، اور یہ تاثر آنی نہیں تھا، بلکہ دل ودماغ پر اس کا تسلط دیر تک باقی رہتا تھا، اور ان اوہام وخرافات میں میرا ذہن گرفتار تھا کہ ہمارا جہاز جدہ ایئرپورٹ پر اتر گیا۔

چند گھنٹوں تک جدہ میں قیام:

''دھنباد'' کے لفظ سے ہوائی جہاز کے عملہ نے ہم لوگوں کا شکریہ ادا کیا، جیسے ہی ہوائی جہاز زمین پر اترا اور اس کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز ختم ہوگئی، زائرین حرم کی بے صبری قابل دید تھی، سب لوگ ایک ہی ساتھ جہاز سے اترنے کی کوشش کررہے تھے، ان کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ ہم کس مقدس سرزمین پر اتر رہے ہیں، اس کے احترام کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی کو اذیت اپنی طرف سے نہ پہنچائی جائے، یہاں سب کو ایک دوسرے کی اذیت رسانی سے قطعی طور پر احتراز کرنا چاہیے تھا، لیکن سب کو یہی جلدی تھی کہ اتر کر مدینۃ الحجاج میں پہلے پہنچ جائیں، خواہ کسی کو چوٹ لگے یا خود ہی چوٹ کھا جائیں، اس کی پرواہ کیے بغیر: "**وکان الانسان عجولا**'' کے مکمل مصداق تھے، حالانکہ تھوڑے سے صبر وتحمل سے کام لینے کی ضرورت تھی، سب اپنی اپنی منزل تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے تھے۔

حج کے ارکان ومناسک کا اگر دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ حج میں بہت سے روحانی فوائد وحسنات کے سوا ضبط نفس کی تعلیم بھی ملتی ہے۔

کسٹم والوں کی بے دردی:

▪ اس بھیڑ بھاڑ میں بعض لوگوں کو کچھ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، بالآخر ہم لوگ ایک ایسی عمارت میں پہنچے، جہاں حاجیوں اور مسافروں کے بیٹھنے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کا معقول انتظام تھا، ۲۱/جون ۱۹۸۹ء کو ہمارا ہوائی جہاز جدہ ایئرپورٹ پر طلوع آفتاب سے غالباً ایک گھنٹہ پہلے اترا تھا، جلدی جلدی حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر

پہلی نمازِ فجر پڑھنے کا موقع اس مقدس سرزمین پر خدا کی رحمت بے پایاں سے ملا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد کاغذات کی جانچ پڑتال کا ایک مشکل مرحلہ پیش آیا، اس کے بعد کسٹم ہاؤس کے قریب جہاں ہم لوگوں کے سامان بکھرے پڑے تھے، اس کی تلاش ہوئی، یہاں نہ کوئی قلی نہ مددگار، اپنا سامان اٹھاؤ اور کسٹم کے افسر کے میز پر ایک ایک سامان رکھو، تمام سامانوں کی جانچ پڑتال اتنے وحشیانہ انداز میں کی جاتی ہے کہ **الامان والحفیظ** نہ کوئی رعایت ہوتی ہے نہ کوئی لحاظ، بستر ہو یا اٹیچی، خورد ونوش کی چیزیں ہوں یا استعمال کی دوسری اشیا، سب کو بڑی بے دردی کے ساتھ بکھیر دیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اگر جانچ پڑتال کا یہ طریقہ نہ اختیار کیا جائے تو بہت سے لوگ پارساؤں کی شکل وصورت میں غیر قانونی اشیا اپنے ساتھ لے جا کر تجارتی کاروبار شروع کر دیں گے، اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حجاج کرام کے جملہ سامانوں کا چیک ہونا ضروری ہے، ہاں اس کے طریقۂ کار میں مہذب طریقہ اختیار کرنا چاہیے، پھر ان نو وارد مسافروں کی مدد بھی ہونی چاہیے، ان کے سامانوں کو اس طرح بکھیرنا نہیں چاہیے کہ ان کے سمیٹنے اور اکٹھا کرنے میں حاجیوں کو اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کرنا پڑے، اتنے لمبے سفر کی صعوبتیں اور پھر حجاز مقدس میں قدم رکھتے ہی ان کو اعلیٰ اخلاق، انسانیت دوستی، اسلامی وقار، تہذیب وشرافت کی بجائے اگر بداخلاقی اور تہذیب سے گرے ہوئے طور وطریقے سے سامنا کرنا پڑے تو ہمارے ناظرین غور فرمائیں کہ ان کے ذہن وفکر میں کیا اثر مرتب ہوں گے؟ وہ تو سوچ کر آئے تھے کہ جہاں سے ہم کو مکارم اخلاق اور مساوات اسلامی کا درس ملا تھا، وہیں ہم کو ان کے خلاف کسی ایسے امر سے سابقہ نہیں پڑے گا جو اخلاق عالیہ کے خلاف ہو، تو حسن عقیدت کے تمام تانے بانے بکھر کر رہ جائیں گے، جب کہ ان کے ساتھ تہذیب سے گرا ہوا معیار پیش کیا جائے، میں تو یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کسٹم کے تمام کارکن خوش خلقی کے ساتھ پیش نہیں آتے بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن صاحب سے ہمارا سابقہ پڑا تھا وہ میرے اپنے خیال میں اخلاقی قدروں سے بالکل نابلد تھے، یا وہ ہم لوگوں کے ساتھ کسی اچھے سلوک کے روادار قانونی پابندیوں کی وجہ سے نہیں

تھے، ہمارے سامانوں کی چکنگ ایسی ہوئی کہ معمولی چیزوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا، سب کو بکھیر کر رکھ دیا گیا، تقریباً دو گھنٹے کا قیمتی وقت اس توڑ پھوڑ یا شکست وریخت میں گزر گیا، ایک تو میں خود ہی ملول خاطر تھا، معمولی معمولی باتوں پر افسردہ ہو جاتا تھا، دوسرے سعودی عربیہ کے ان مہمان نواز لوگوں کے شاندار استقبال سے بڑا بددل ہوا، تقریباً دن کے دس بج گئے ہوں گے، کہ ہم لوگوں کو ان انتہا پسندوں سے فرصت ملی، اور ہم سب مدینۃ الحجاج (مسافر خانہ) پہنچ گئے، ہمارے قارئین کرام یہ نہ سوچیں کہ ہم کو اب سکون مل گیا ہوگا، یہاں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ ہم نے جہانِ نو میں قدم رکھا ہے، یہاں کی زمین وآسمان، آب وہوا تمام چیزیں ہندوستان سے بالکل مختلف تھیں، یہاں کی فضاؤں میں بادلوں کو تیرتے ہوئے نہیں دیکھا ، دھوپ کی اتنی شدت تھی کہ آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی تھی، شدت حرارت اور دھوپ کی تیزی کی داستان پہلے سے سن چکا تھا، عین برسات کے موسم میں تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں، ذہن وفکر پر یہ مسلط تھا کہ ریگستان عرب آتش کدہ بنا رہتا ہے، تو خوف ودہشت میں کمی کیسے آسکتی تھی، بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ایسی سخت دھوپ والی زمین میں کہیں شدت تمازت و حرارت کا اثر میرے اوپر نہ پڑ جائے اور میں بیمار پڑ جاؤں، اگر کوئی مزاج شناس یا مصلحت اندیش یا میرے نفسیات کا واقف میرے قافلے میں ہوتا تو ممکن تھا اس کی تسلی اور تشفی سے یہاں پہنچنے کے بعد مجھ کو کچھ سکون میسر آجاتا، سکون قلب کے جتنے اسباب مادی ہو سکتے ہیں، ان سب کی توجیہ وتاویل میری عقل حیلہ جو ایسے انداز سے کرتی تھی کہ میری بے چینیوں میں اضافے کے سوا مجھ کو کچھ حاصل نہ ہوتا تھا، البتہ جدہ میں یہ ضرور ہوا کہ مدینۃ الحجاج (مسافر خانہ) میں میرے ذہن وفکر کے انجماد کو دور کرنے یا ایک ہی نقطے پر مرکوز نہ رہنے کے لیے اسباب پیدا ہوئے کہ بہت سے کام بذات خود انجام دینا پڑا تھا، ڈراف کا بنوانا، پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نکلنا، کھانے پینے کی چیزوں کے لئے دوسرے سے پوچھ گچھ کرنا، یہ سب امور ایسے تھے جو ذہن کو دوسرے وسائل سے پھیر کر تھوڑی سی جرات وہمت پیدا کرنے کے باعث ہوئے، یہاں نیا ملک، نئی جگہ، زبان الگ، طور طریقے جدا، بات چیت بالکل مختلف،

اس لیے فکر و اضطراب کے اسباب اگر دور ہو رہے تھے، تو اب نئے محرکات جنم لے رہے تھے، لیکن اس سے آپ یہ نہ تصور کریں کہ اپنے حیات ناپائیدار یا جانِ عزیز کے متعلق جو فکر و تشویش لاحق ہوگئی تھی، اس کا یکسر ازالہ ہوگیا، ان فکروں سے رہائی کے لئے ابھی منزل بہت دور تھی، ابھی تو پھونک پھونک کر، ڈر، سہم کر ہر جگہ قدم رکھتا تھا، کھانا لینے کے لئے گیا تو ڈرا، سہا، پانی کی تلاش میں نکلا تو گم ہو جانے کا خطرہ، ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ لگا رہتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی گھنے جنگل میں پہنچ گیا ہوں، جہاں خطرات زیادہ رہتے ہیں، آدمی کی فطرت ہے جب وہ سہم جائے تو اس کو ہر مقام پر خطرات ہی کا ہیولیٰ نظر آئے گا، مدینۃ الحجاج جیسی آرام دہ جگہ جہاں ہر چیز کی سہولتیں حاصل، ٹھنڈا پانی وافر مقدار میں دستیاب، ایئر کنڈیشن کی وجہ سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، استنجا خانے کی غیر معمولی سہولت، غرض کہ کوئی ایسی چیز نہیں جو لوازم زندگی سے تعلق رکھتی ہو وہ وہاں نہ مل پائے، ہزاروں انسان تحفظ جان کی فکر سے آزاد ہنستے بولتے نظر آرہے تھے، مگر ایک میں تھا کہ رحمت کی سرزمین میں زحمت کے احساس میں مبتلا تھا، نہ خدا کی ذات پر توکل نہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت پر اعتماد، بس اپنی منطقیانہ یا اپنے خودسرانہ ذہن پر اعتماد اور اس کے اعتبار سے سوچ و بچار اور ہر عالم میں پریشان و بدحال تھا، علم وفن کے دفتر، فلسفیانہ موشگافیاں، منطقیانہ نظر و فکر بجائے اس کے کہ سکون قلب عطا کرتے، ہر وقت ذہنی خلجان میں مبتلا رکھتے تھے، سب کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس مقدس سرزمین پر پہنچنے کے بعد ان کے اندر اضطراب و بے چینی کی کیفیت نہیں ہے، میں بھی کچھ ہلکا سکون محسوس کر رہا تھا، تاہم جس قیمتی سرمایے کی ضرورت تھی، وہ اب تک نہیں مل پایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کھانے پینے اور دیگر مشاغل میں جدہ کے ٹائم کے اعتبار سے تقریباً دن کے گیارہ بج چکے تھے، حج کمیٹی کے نمائندے یا کارکن معلم کے خدام ہم لوگوں کو مدد پہنچانے اور بس پر سامان لادنے کے لیے موجود ملے اور قلیوں نے "توفیق" بس پر سامان لاد دیے، میں نے بہت سے لوگوں سے اپنی نحوی عربی میں گفتگو کی مگر وہ میرا منہ تکتے رہے

، نہ ان کی بات میں سمجھتا تھا، نہ وہ میری بات سمجھتے تھے، جب اکثر حاجیوں کا سامان لد گیا، اور "**السائق**" صاحب بغیر کنڈیکٹر کے بس لے کر روانہ ہوئے تو میں حیرت کی نگاہوں سے تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

جدہ کا مختصر تعارف:

کتابوں میں پڑھا تھا کہ جدہ ایک بہت بڑا شہر ہے، حضرت عثمان غنی **رضی اللہ عنہ** نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسے بندرگاہ کی حیثیت سے پسند فرمایا تھا، جس کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہے، عمدہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں، تقریباً چار ہزار مکانات دومنزلہ سے لے کر ستائیس منزلہ تک بنے ہوئے ہیں، سرکاری اسپتال بکثرت بنائے گئے ہیں، چھوٹے بڑے ستر ملکوں کے سفارت خانے پائے جاتے ہیں، یعنی دنیا کا ایک متمدن اور بڑا ہی بار آور، "ہماہمی" اور "چہل پہل" والا شہر ہے، دن رات یہاں ہوائی جہاز اترتے رہتے ہیں، یہ خیال ہوا کہ اس متبرک اور مبارک شہر کی زیارت ہوگی، اوراس کی گلیوں اور کوچوں میں کچھ دیر کے لیے ٹہلیں گے، لیکن مدینۃ الحجاج میں چند گھنٹے قیام کے بعد جدہ شہر کی زیارت و سیاحت سے محروم ہو گئے، کیوں کہ یہاں سے بس سیدھے مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہو جاتی ہے، سڑکوں اور آبادیوں کو صاف ستھرا دیکھا، سڑکیں ایسی کہ نئی دلی کے سوا دوسرے شہروں میں نہیں دیکھی جاسکتیں۔

جب ہماری بس روانہ ہوگئی تو آس پاس کے علاقوں کے دیکھنے کی تمنا میں اپنی نگاہوں کو ادھر ادھر دوڑا رہا تھا، جنگلوں اور بیابانوں، پہاڑوں اور ریگزاروں کا ایک سلسلہ نظر آتا تھا، لیکن یہ جنگل و بیابان ہندوستان کی طرح نہیں تھے، جہاں اونچے اونچے درخت اور ہرے بھرے پودے نظر آتے ہیں، بلکہ قدرت الٰہی کی ان صنعت کاریوں سے بالکل عاری تھے، کہیں سبزہ زار اور اونچے درخت دکھائی نہ پڑے، صرف پتھروں اور بڑی بڑی چٹانوں کے پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا تھا، جہاں ہریالی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، میں ڈرا سہا تھا، اس کے باوجود قدرتی مناظر کے دیکھنے کا شوق بیدار رہا، ہمارے قافلے کے لوگ بلکہ

دوسرے حجاج بھی وقفہ وقفہ سے: ''**لبیک اللھم لبیک ، لا شریك لك لبیك ، ان الحمد والنعمة لك والملك لا شریك لك لبیک**''۔ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

تلبیہ کی سنت:

اور حالت احرام میں سنت یہی ہے کہ جب سواری پر ہو یا بلندی اور پستی یا نشیب وفراز سے جب سواری گزرے تو بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا چاہیے، میں بھی حجاج کرام کے ساتھ تلبیہ پڑھتا تھا، لیکن جب تلبیہ پڑھ کر فارغ ہوتا تھا تو میری متجسس نگاہیں پہاڑوں اور قلعوں سے ٹکراتی تھیں، ان کو دیکھ کر قدرے میرے دل کو سکون ملتا تھا، ذہن میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ یہی سنگلاخ سرزمین، یہی ریگستان عرب، یہی ریتوں کے تودے، یہی پہاڑوں کے بڑے بڑے چٹان، یہی بے آب و گیاہ سرزمین مقدس ہے، جس کے لئے مسلمان کے دل میں ایک ایسا جذبہ وشوق، ایسی تڑپ، ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے وجود کے تحفظ سے بے نیاز ہوتا ہے، اور اس کے دیدار سے ایسی لذت وسرور ملتی ہے کہ دنیا کی نعمتوں سے نہیں مل سکتی ہے، صاحبان ذوق لطیف کو گلستان بہار بڑا ہی پرفریب اور دلکش نظر آتا ہے، لیکن ارباب روح ومعانی کو گل و لالہ، سنبل وریحان کے چمنستانوں میں وہ حسن و جمال، زیبائی ورعنائی، وہ دلکشی ودلفریبی نظر نہیں آتی، جو اس بے آب و گیاہ ریگزاروں کے ذروں کی تابش، چٹانوں کی صلابت، پہاڑوں کی بلند چوٹی، وادیوں کے عمیق غاروں، صحرائے عرب کے سنگلاخ زمینوں میں دکھائی پڑتی ہے۔

میں حواس باختہ تھا، ہمیشہ اپنے کو قابو میں رکھنے کی تدبیریں سوچتا تھا، عرب مقدس کی سرزمین سے ہماری سواری گزر رہی تھی، اور میرے مردہ ضمیر میں زندگی کی حرارت دوڑ رہی تھی، بس کی تیز رفتاری کے ساتھ میرا کمزور دل بھی طاقت وتوانائی حاصل کر رہا تھا، میں نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا کہ ہزاروں ٹیکسیاں، گاڑیاں دامن کوہ میں کھڑی ہوئی ہیں، جہاں آبادیوں کا نام ونشان نہیں ہے، میں نے اپنے ہم سفروں میں سے بعض سے دریافت کیا کہ آبادی سے اتنی دوران ٹکسیوں اور گاڑیوں کو کیوں چھوڑا گیا ہے؟ کیا یہاں کوئی

کارخانہ ہے جس میں ان کی مرمت ہوگی؟ یا ان کی حالت اس قدر خستہ ہوگئی ہے کہ اب یہ استعمال کے قابل نہ رہ کر کباڑ کے دام میں فروخت ہوں گی، مجھ کو یہ بتایا گیا کہ آپ حجاز مقدس کو اپنے ہندوستان پر قیاس نہ کریں، یہاں جب گاڑیوں میں زیادہ خرابی پیدا ہوجاتی ہے یا یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہماری گاڑی ہمارے شایان شان نہیں رہ گئی تو ان کو پہاڑوں کے دامن میں لے جاکر کھڑا کر دیا جاتا ہے، اب ان کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی، نہ ان کی خرید وفروخت ہوتی، نہ ان کو کوئی دوسرے مصرف میں لانے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

مقام حدیبیہ میں میرے احساسات:

یہی سب مناظر دیکھتے دیکھتے مسافت طے ہو رہی تھی، ابھی ہمیں سفر کرتے ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزرے ہوں گے، کہ ایک ایسی وادی میں پہنچے، جہاں ایک بس ڈپو بنا ہوا تھا، اور بسوں کو سایے میں ٹھہرانے کے لیے پترے کی عمارتیں بنی ہوئی تھیں، جدید طرز کی دو چار بلڈنگیں تھیں، وہاں بس روک دی گئی، اور تقریباً آدھے گھنٹے تک رکی رہی، حجاج کرام بس سے اتر گئے، ان میں سے کوئی پانی کی تلاش میں جارہا تھا، کوئی اپنی حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا چاہتا تھا، کوئی پانی لاکر ہاتھ منہ دھو رہا تھا، یا وضو کر رہا تھا، لیکن اس بس کے تمام حجاج کرام یہ ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے کہ کسی سے دریافت کریں کہ یہ کون سا مقام ہے؟ نہ کوئی شخص کسی سے یہ پوچھ رہا تھا کہ یہاں بس روکنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب اپنے اپنے خیال میں مگن یا اپنی اپنی ضرورت میں مصروف تھے، ایک میں تھا کہ میرے دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا تھا کہ یہ کون سا مقام ہے؟ اسلامی تاریخ میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ یہاں سے منزل مقصود تک کا کیا فاصلہ ہے؟ پوچھوں تو کس سے پوچھوں، میرے سوال کا متحمل کون ہوگا، میرے تجسّس وجستجو کو کون خاطر میں لائے گا؟ میرے سوالوں کے معقول جواب کی اہلیت کس میں ہے؟ جذبہ تجسس ایک گونہ جنونی کیفیت کا نام ہے، جس انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو اس کے بے قرار دل کو قرار مل ہی نہیں سکتا، جب تک اس کے اندرونی احساسات کی تسکین کا سامان نا پیدا ہوجائے، بس سے اترا ہی نہیں، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ میں کود پڑا،

کچھ حبشی نژاد نوجوانوں کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا، میں ان کے پاس بڑی سرعت کے ساتھ گیا، ٹوٹی پھوٹی عربی میں گفتگو کی اور دریافت کیا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ ایک نوجوان نے بتایا یہ مقام ''حدیبیہ'' ہے، **اللہ اکبر!** جس وقت حدیبیہ کا لفظ کان میں پڑا گویا میرے ذہن کے تمام دریچے کھل گئے، اور میں خیالات کی دنیا میں ایسا محو ہو گیا کہ مجھ کو اپنی سواری کا احساس ، نہ اس کی روانگی کے وقت کا خیال، میں یہ سوچتا تھا کہ اسلامی تاریخ کا یہ وہی عظیم الشان مقام ہے، جہاں سے اسلامی فتوحات کا دروازہ کھولا گیا، نبی امی **فداہ ابی و امی** ﷺ نے اسی جگہ میں تین دن تک قیام فرمایا، اور اسی حدیبیہ کے مقام پر آپ کے دست مبارک سے پانی کا ایسا چشمہ جاری ہوا تھا کہ چودہ سو جانثار خود سیراب ہوئے، اور اپنی سواریوں کو بھی سیراب کیا، یہی وہ مقام ہے کہ جہاں صحابۂ کرام **رضی اللہ عنہم** کو کفار مکہ کی متحدہ قوت نے بیت اللہ الحرام کے عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، یہی وہ جگہ ہے جہاں سے حضرت عثمان غنی **رضی اللہ عنہ** صلح وصفائی کی بات کرنے کے لیے مکہ مکرمہ گئے تھے، اور ان کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ ان کو شہید کر دیا گیا، اس پر جلال نبوت کا یہ ظہور ہوا کہ رحمت عالم ﷺ نے اپنی بے پایاں رحمت کے باوجود ارشاد فرمایا کہ عثمان غنی کے قتل کا قصاص لیا جائے گا، اور شمع رسالت کے پروانوں نے آپ کے زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے ان الفاظ پر جوش ایمانی کے ساتھ لبیک کہا۔

سرفروشان اسلام نے آپ کے دست حق پرست پر یہ عہد و پیمان کیا کہ ہم اپنے جان کی بازی لگا کر عثمان غنی کے قتل کا بدلہ لیں گے، اسی مقام پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ **(الفتح:۱۸)**

خدا مسلمانوں سے راضی تھا، جب کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، خدا ان کے دلوں کے بھید سے آگاہ تھا، اس لیے ان پر ''سکینہ'' (تسلی) نازل فرمائی، اور جلد ہی فتح دے دی۔

یہی وہ مقدس جگہ تھی جہاں صحابۂ کرام کی حیرت افزا عقیدت کا منظر دیکھ کر عروہ ابن مسعود ثقفی نے قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ کا دربار دیکھا ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے ساتھ جیسی عقیدت و وارفتگی کہیں نہیں دیکھی، وہ بات کرتے ہیں تو ان کے عقیدت مند ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں اور سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتا، جب وضو کرتے ہیں تو ایسا ٹوٹ پڑتے ہیں کہ گویا جنگ وجدال ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر عروہ بن مسعود ثقفی کے دل پر عجیب وغریب اثر پڑا تھا، اور وہ حیران و ششدر رہ گئے تھے، یہی وہ حدیبیہ ہے جہاں مسلمانوں کو بظاہر دبتے ہوئے صلح نامہ کو تسلیم کرنا پڑا، اور اس صلح نامہ کے شرائط ظاہر بینوں کی نگاہ میں ایک طرفہ تھا، چنانچہ فاروق اعظم **رضی اللہ عنہ** جیسے پرجوش مجاہد بے تاب ہو جاتے ہیں، لیکن نگاہ نبوت دیکھ رہی تھی کہ صلح نامہ کا منظر کچھ بھی ہو، تاہم اس کا مستقبل اتنا شاندار ہے کہ اسلام کی کامیابی و کامرانی کا فتح باب اسی سے ہونے والا ہے۔

انسان کا طائر خیال بڑا برق رفتار و بلند پرواز ہوتا ہے، آن واحد میں حادثات و واقعات کی کڑیوں کو وہ جوڑتا جاتا ہے، جیسے ہی ''حدیبیہ'' کا لفظ کان کے پردے سے ٹکرایا یہ تمام اسلامی تاریخ کے واقعات ذہن کے نہاں خانہ میں سوئے ہوئے آناً فاناً بیدار ہو گئے، اور میں عالم استغراق ہی میں تھا کہ اچانک شور برپا ہو گیا کہ بس روانہ ہونے والی ہے، جلدی جلدی حجاج کرام اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں، کسی کو کیا خبر تھی کہ میں کس دنیا کی سیر کر رہا ہوں، میں تو چودہ سو برس پیشتر کے واقعات میں مستغرق تھا، یکا یک خیال کا طلسم ٹوٹا اور میں بس پر سوار ہو گیا، بس چل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میری قسمت کہاں کہ میرے دل غمگین کو ''تحت الشجر ۃ'' کا پرسکون سایہ میسر ہو سکے، لیکن کاش میں اس جگہ کو دیکھ لیتا یا کوئی شخص اس کا پتہ نشان بتا دیتا جہاں اسلام کے سرفروشوں نے اپنی جانبازی اور جانثاری کا عہد و پیمان کیا تھا، کاش کوئی شخص مجھے وہ کنواں بتا دیتا جس کا پانی خشک ہو گیا تھا، لیکن انگشت نبوت نے اپنے اعجاز سے چشمۂ شیریں جاری کر دیا تھا، کاش کوئی اہل بصیرت بتا دیتا وہ جگہ

جہاں سرکار کے لعاب دہن مبارک زمین پر گرنے کے بجائے آپ کے جانثاروں کے ہاتھوں پر گررہے تھے، اس زمین کے خطہ خطہ، اس مبارک جگہ کے ذرہ ذرہ کو اگر قدرت الٰہی گویائی عطا فرما دے تو وہ تمام واقعات کی بڑے حیرت انگیز طریقہ پر شہادت دیں گے، لیکن انسان کی زبان شہادت اس وقت گنگ تھی، اس لئے ایک محققانہ ذہن رکھنے والے یا عقیدت واخلاص کا دل رکھنے والے کے لئے ایسے وقت میں جب کہ اس کو رہبری کرنے والا کوئی نہ ہو بڑی مایوسیوں اور دل شکنیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حالانکہ یہ تاریخی مقام ایسا نہیں تھا کہ گھنٹہ آدھا گھنٹہ رہ کر عمارتوں اور پہاڑ کے ٹیلوں کو دیکھ لیا جائے، بلکہ اس مقام کے ایک ایک چپے کی جبیں سائی ذریعہ سعادت تھی، اور میں ایک قلب حزیں لے کر اس سعادت سے محروم اپنے خیالات کی دنیا سے واپس ہو کر اس مادی دنیا کے انسانوں کے بھیڑ میں یہاں سے روانہ ہو گیا۔

حدود حرم کے احکام:

ہمارے قارئین کرام پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ حدیبیہ میں پہنچتے ہی ہم حدود حرم میں داخل ہو گئے، حدود حرم کے بہت احکام وآداب ہیں جس کی پابندی ہر شخص پر لازم ہے، مکہ مکرمہ کے اردگرد پچاسوں میل مربع کا علاقہ حرم کہلاتا ہے۔

اس حرم مقدس میں کوئی شخص بغیر احرام کے داخل نہیں ہو سکتا، اور سب کے لئے ضروری ہے کہ حرم مقدس کی تعظیم وتکریم میں کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں، حدیث پاک میں سرکار **علیہ الصلوۃ والسلام** نے ارشاد فرمایا کہ:

''یہاں کی پڑی ہوئی چیزوں کو کوئی شخص اٹھا نہیں سکتا، اگرچہ یہاں کے خاردار جھاڑیوں سے کسی کا دامن الجھ جائے، اور اس کو یک گونہ تکلیف پہنچ جائے، تاہم اس کے کانٹوں کو کاٹا نہیں جائے گا، اس حرم پاک میں رہنے والے جانوروں کو متنفر نہیں کیا جائے گا''
(مشکوۃ:۱۲۶۵)

فقہائے کرام تشریح فرماتے ہیں کہ یہاں کی سخت دھوپ میں اگر کسی درخت کے سایہ میں ہرن بیٹھا ہوا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اپنے بیٹھنے کے لئے اس ہرن کو اس درخت کے سایہ سے اٹھا دے، حتیٰ کہ کوئی وحشی جانور حدود حرم کے باہر سے کسی کے ساتھ داخل ہو جائے، تو اس کو بھی اذیت نہیں دی جاسکتی، موذی جانوروں کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

احترام حرم کی حکمت بالغہ:

آپ غور فرمائیں کہ ایسی سرزمین مقدس میں جہاں انسانوں کا ادب واحترام تو بڑی بات ہے، جانوروں کا بھی ادب ولحاظ کرنا ہوگا، ایک ایسا انسان جو کسی ایسے ملک میں رہتا ہو جہاں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور لاچاروں کو کسی جرم کے بغیر تہ تیغ کیا جاتا ہو، جہاں انسانیت کے احترام کا جذبہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کو کیسا پاکیزہ درس مل رہا تھا کہ انسانوں کے لئے لازم ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ واحترام کا سلوک کریں، اور جانوروں کو ستانے سے احتراز کریں، اور اس کا احساس شدید ہوا کہ روئے زمین پر ایک ایسا امن و سلامتی والا علاقہ ہے جس میں وحشی جانوروں تک کا احترام ضروری ہے۔

دنیا کے مختلف حصوں میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کا قانون نافذ کیا جاتا ہے، اور اس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے، لیکن اس قانون کے نفاذ وعمل میں مادی واقتصادی پہلوؤں کو زیادہ پیش نظر رکھا جاتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بلکہ مختلف جگہوں میں بڑے خوشنما باغات و پارک ہوتے ہیں، اور ان کو صحت عامہ کے لیے مفید تر سمجھا جاتا ہے، آئے دن ان کی رونق وزیبائش میں محض تفریح طبع کے لیے اضافہ کی تدبیر کی جاتی ہے، پھر کیا حدود حرم میں جو اسلامی قانون نافذ کیا گیا اس میں بھی اقتصادی ومعاشی پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا، یا صحت عامہ کے افادے کے لیے اس قانون کا نفاذ ہے؟ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان میں سے کوئی بات نہیں ہوتی، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حکمت بالغہ کیا ہے؟ جس کی بنا پر ادب واحترام کی اتنی بڑی پابندی عائد کی گئی، اگر ذرا دقت نظر سے فکر کیا جائے تو آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہاں کی پابندیاں یا یہاں کے

ادب واحترام کا وسیع دائرہ محض اس لیے کہ اسلامی ریاست میں ایک ایسا پرامن خطہ ہونا چاہیے، جہاں پہنچ کر ہر شخص اپنے کو محفوظ و مامون تصور کرے، جہاں جانوروں کو یہ حیثیت حاصل ہو کہ ان سے کوئی بھی چھیڑ چھاڑ نہ کر سکے، جہاں پودوں اور گھاسوں کو بھی اپنی روئیدگی میں مکمل آزادی حاصل ہو، تاکہ دنیا کے کونے کونے سے جو انسان یہاں جمع ہوتے ہیں اور مختلف قومیتوں اور ملکوں کے ہوتے ہیں، جن کا رنگ و روپ جداگانہ ہوتا ہے، ان کو یہ درس حاصل ہو جائے کہ انسانیت کا احترام ہر حال میں لازم ہے، جانوروں کو ستانا، پودوں کو بے دردی کے ساتھ کاٹنا کوئی مناسب بات نہیں ہے، کیوں کہ وہ ایسے مقدس مقام سے واپس ہوتے ہیں جہاں بہت کچھ آداب، بہت کچھ احترام کے طریقے عملی طور سے ان کو سکھائے گئے ہیں، پھر ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ دنیا کے دوسرے علاقوں سے الگ اس کو ایک امتیازی شان عطا کرنا خدائے تعالیٰ کی منشا کے عین مطابق تھا۔

حدیبیہ سے مکہ معظمہ کے لئے روانگی:

بہر حال! اس حرم مقدس میں میری بس سبک روی سے چل رہی تھی، اور میں فکری اور ذہنی اعتبار سے بڑی کشمکش میں اپنے آپ کو مبتلا پا رہا تھا، کبھی یہ سوچتا تھا کہ ایک زمانہ وہ تھا جب سیکڑوں ہزاروں میل سے خدا کے نیک بندے پیدل چل کر حدود حرم میں داخل ہوتے تھے، تو بڑے حزم واحتیاط کے ساتھ چلتے تھے، ریل گاڑیوں کا سفر تھا نہ بسوں کا، لوگ ہوائی جہاز سے آتے تھے نہ ہیلی کاپٹروں سے، اونٹوں اور گھوڑوں یا خچروں کی سواری سے یہاں پہنچتے تھے، اور عصر حاضر میں زائرین حرم کے لیے جدید سواریوں کا انتظام ہے، پھر بھی ہم لوگوں کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بیس بائیس کلومیٹر پیدل چل کر ''بیت اللہ المکرم'' کی زیارت کرتے، عارفان حق نے تو اس سرزمین میں پیدل چل کر ''خانۂ خدا'' کی زیارت کیے، پھر بھی ان کو یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم ایسی مقدس زمین میں چل رہے ہیں جہاں نہیں معلوم کتنے خدا کے نیک بندے چلے ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پیدل چلنے میں بھی ادب واحترام کے خلاف کوئی عمل سرزد ہو جائے اور بدنصیبوں کے زمرے میں داخل ہو جاؤں، اور ایک ہم

لوگ ہیں کہ عملی ادب واحترام کا تو کیا معنی اپنے ذہن کو بھی جذبہ احترام سے کامل طور پر معمور نہیں کیے ہوئے تھے۔

مقام حدیبیہ سے مکہ مکرمہ صرف بائیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، اتنی معمولی مسافت کے طے کرنے میں کتنا وقت صرف ہوسکتا ہے، بیس پچیس منٹ میں اس بلد امین میں داخل ہونے والے تھے، لیکن جیسے جیسے بیت مکرم جہانوں کا قبلہ، دنیا کے تمام پاکباز انسانوں کا مرکز عقیدت، مسجد حرام قریب ہورہی تھی، میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہورہی تھی، کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ عالم خواب کی باتیں ہیں، ایک کم نصیب، ایک روسیاہ، عصیاں کاریوں سے آلودہ کہاں پہنچنے والا ہے، وہاں پہنچنے والا ہے جہاں خدا جانے کتنے نیک بندے، کتنے اولیاے کرام، کتنے اہل اللہ، کتنے صالحین وصدیقین بلکہ کتنے انبیاے کرام اس مقدس سرزمین پر ہم سے پہلے پہنچ چکے ہیں، جن کے دفتر اعمال میں نیکیوں کی سوغات تھی، اور یہاں اپنی یہ حالت تھی کہ نامۂ اعمال بالکل سادہ، روسیاہیوں اور سیاہ کاریوں اور ریاکاریوں کا مجموعہ تھا، یہ اگر نیکی کا کام کیا تو وہ بھی ریا ونمود کے لیے، کامل اخلاص وللّٰہیت کی نیت سے شاید ہی کوئی کام کیا ہوگا، اوراس پر طرہ یہ کہ ایسی بے ثبات زندگی کے لیے ڈرا سہار رہتا تھا، اتنا بھی نہیں سوچ پاتا تھا کہ خداے ذوالجلال کی بارگاہ میں حاضری ہورہی ہے، اس کی ذات پر اعتماد وتوکل ہونا چاہیے، اوراپنے آپ کو ہمیشہ انابت ورجوع الی اللہ کے سچے جذبہ کے ساتھ رکھنا چاہیے، مجھ کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ توفیق الٰہی سے میرے نصیبہ کو بلندی حاصل ہورہی ہے، نہ یہ کہ صرف اپنی ذات کی فکر، اپنی بیماری کا خیال، یہاں کے موسم کی عدم موافقت کا احساس ہمیشہ چھائے رہے، اوراسی خیال میں مبتلا رہا ہوں کہ میرے اندر اتنی طاقت وتوانائی کہاں کہ حج وعمرہ کے تمام ارکان وآداب، سنن ومستحبات مکمل طور سے ادا کر پاؤں گا، اسی طرح کے اچھے برے خیالات میں مستغرق ہوکر بس پر چلتا رہا، ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا ہوگا کہ مکہ مکرمہ کی آبادی کا حسین منظر نگاہوں کے سامنے تھا، اب نہ پوچھئے کہ میرے اوپر کیا کیفیت طاری ہوئی، اس مقدس گھر کی زیارت کا شرف حاصل ہونے

والا تھا، جو روے زمین پر سب سے پہلا گھر تھا، جس کی تعمیر سب سے پہلے عالم قدس کے فرشتوں کے ہاتھوں ہوئی، اور جس کی تعمیر میں لاتعداد انبیاے کرام **علیھم الصلوۃ والسلام** نے حصہ لیا ہوگا، اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم اور اللہ کے ذبیح حضرت اسماعیل **علیھما السلام** کے مبارک ہاتھوں سے جس کی تعمیر کے پتھروں کو چنا گیا تھا، اور انہوں نے یہ دعا کی تھی:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرۃ:۱۲۸۔۱۲۹)۔

اے پروردگار! ہم کو تو اپنے احکام کا فرماں بردار بنا، اور ہماری نسل سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمابردار ہو، ہمیں ہمارے عبادت کے طور طریقے بتا دے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما، بے شک تیری ہی ذات ہے جو اپنی رحمت سے درگزر کرنے والی ہے، اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں، اور اے پروردگار! تو اس بستی کے بسنے والوں میں سے اپنا ایک رسول بھیج جو انہیں میں سے ہو، وہ تیری آیتوں کو پڑھ کر لوگوں کو سنائے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اور ان کے دلوں کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے پاک وصاف کر دے، اور اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی ہے، سب پر غالب ہے۔

جو روے زمین پر ایسا مقدس گھر ہے جس کی عظمت و بڑائی کا خطبہ خود قرآن حکیم اور حدیث نبوی میں پڑھا گیا، جہاں ہزاروں فرشتے روز و شب طواف وزیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، عام انسانوں کی ظاہر بیں نگاہیں اگر چہ ان قدسیوں کو نہیں دیکھ سکتیں، لیکن اہل کشف کی نظروں سے وہ پوشیدہ نہیں ہوتے، ایک میں تھا کہ صرف اپنی ذات کا احساس اور صرف اس کے تحفظ کی فکر، عجیب وغریب حالت میں مکہ مکرمہ کی بلند و بالا عمارتوں،

اس کی صاف وستھری سڑکوں اور آنکھوں کو چکا چوندھ کرنے والی سورج کی شعاعوں کو دیکھ رہا تھا، میرے دل میں فرح وانبساط، مسرت وشادمانی کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا، ایک طرف خوش بختیوں کا حسین منظر تھا، دوسری جانب شیطانی وسوسے میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے، اوراسی طرح بس چلتی رہی، میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد کسی ایسی جگہ پر بس نہیں رکی جہاں تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچ سمجھ کر یا تیاری کر کے بیت اللہ المکرم کی طرف جایا جاتا، پہلی نظر تاب نظارہ کیسے لاسکتی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ پوری تیاری اور کامل اعتماد کے ساتھ بلکہ پیدل چل کر اس جلال و جبروت والے خدا کے گھر کی زیارت کی جاتی، جس پر انوار ورحمت کی بارش اور تجلیات ربانی کا نزول ہمہ دم ہوتا رہتا ہے، یہ انسان خاک کا پتلا اتنی بصیرت نہیں رکھتا یا اتنا روشن دماغ نہیں ہوتا جس کو کامل اذعان حاصل ہوجائے، کہ پتھروں کا یہ گھر اتنی بڑی عظمت والا ہے، جس سے بڑھ کر عظمت کسی گھر کو حاصل نہیں ہوسکتی، اگر یہ اذعان کامل ذہن انسانی میں پیدا ہوجائے تو اس کی سعادتوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی، لوگ کہتے ہیں کہ کرۂ ارضی کوئی پچیس ہزار میل کا ایک کرہ ہے، اگر خانۂ کعبہ سے سیدھے پچھم چل کر پھر پورب کی طرف واپس آجائے تو اس نے پچیس ہزار میل کی مسافت طے کر لی، اتنی لمبی چوڑی دنیا کے کونے کونے سے انسانوں کا جم غفیر، ان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر صرف پتھروں کی ایک عمارت کو دیکھنے کے لئے آتا ہے، اور اس کے ظاہری حسن کو دیکھ کر اپنے کوخوش کر لیتا ہے، خانۂ کعبہ کا ظاہری حسن واقعی قابل دید ہے، اس کے باوجود اس کی روحانیت کے جلوہ ہائے رنگا رنگ کے مقابلے میں صفحۂ ہستی پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ایسا پیکر نور پایا جاتا ہو، اصل یہ نہیں کہ کوئی عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہو یا مٹی کی، چاندی سونے کی بنی ہوئی ہو یا ہیرے وجواہرات سے مزین ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خانۂ کعبہ خواہ وہ مٹی سے بنا ہوتا یا پتھروں سے ہر حالت میں اس کی عظمت و بڑائی میں کلام نہ ہوتا، کیوں کہ وہ انوار و تجلیات ربانی کا مہبط ہے، یہی اس کی بزرگی اور بڑائی کی دلیل ہے۔

اس لیے اگر ہم لوگوں نے یہی سوچ لیا ہوتا کہ اتنی لمبی چوڑی دنیا میں مسلمان آباد

ہیں، کہیں وہ ایک جگہ نہیں پائے جاتے ،دنیا کے ساتوں براعظم کے مختلف علاقوں میں دور دراز مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن سب کی عقیدت و نیاز کی پیشانی عبادت الٰہی میں اس خانۂ کعبہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اس لئے تو اس عظمت والے گھر کی طرف کچھ پیدل چلنا چاہیے تھا، سواریوں پر تو چلتے ہی رہتے ہیں، اگر ایک آدھ فرلانگ یا ایک آدھ میل پیدل چل کر اس پیکر حسن و جمال یا اس جلال و جبروت والے گھر کا نظارہ کیا ہوتا تو کتنی اچھی بات ہوتی ،مگر ہماری بس چلتی رہی اور میں اسی سے اپنی نگاہوں کو ادھر ادھر دوڑا رہا تھا کہ اچانک مسجد حرام کے بلند مینارا اپنی نگاہوں کے سامنے تھے، بڑی خوبی و جمال کا یہ مینارہ نظر آیا، شوق اور وارفتگی میں سوچتا تھا کہ جلد ہی مسجد حرام پہنچ جائیں، لیکن ہماری بس مسجد حرام کا چکر لگاتی ہوئی ہمارے معلم جناب ''درویش رمضانی'' کے ہیڈ آفس کے قریب پہنچ گئی، میں نے خیال کیا ،غالباً ہم لوگوں کے قیام کا یہیں انتظام ہوگا، تھوڑی دیر کے بعد معلم موصوف کے کارندے ہمارا سامان اتارنے لگے ،اور ہم شدید دھوپ میں دوپہر کے وقت پندرہ بیس منٹ تک کھڑے رہے، اور سب کے سامان لب روڈ پڑے رہے، اس قیام کا ایک ایک منٹ میرے اوپر بھاری گزر رہا تھا، دوڑتا ہوا آفس گیا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی قیام گاہ کچھ فاصلے پر ہے، ایک ٹیکسی کے ذریعہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں تک پہنچا دیا جائے گا، جتنا بھی وقت گزرتا تھا بڑا بھاری گزرتا تھا، تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہم لوگوں کو ایک سامان کے حمل و نقل والی گاڑی پر بٹھایا گیا، اور اسی پر سب سامانوں کو لادا گیا، پھر یہ گاڑی مسجد حرام کے قریب سے گزرتی ہوئی ''فندق جیاد'' کے قریب ایک پہاڑی کے اوپر ایک عظیم الشان بلڈنگ کے سامنے رکی ،جلدی جلدی اس گاڑی سے اتر کر اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان لیتے ہوئے بلڈنگ کے اندر پہنچ گئے، باقی سامانوں کو ایک خادم نے کمرہ نمبر ۶ میں پہنچایا، اسی میں ہم لوگوں کے قیام کا انتظام تھا، اس وقت تقریباً دن کے دو بج چکے تھے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جلد اپنے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر مسجد حرام کی زیارت اور عمرہ کے ارکان کے ادا کرنے کے لیے نکل جاتے ،لیکن اس عمارت کے میر منشی نے ہم کو بتایا کہ آپ لوگ پہلی فرصت میں

ظہر کی نماز پڑھ لیں، پھر کھانا تناول فرمائیں تو عمرہ کے لیے جائیں، ابھی آپ کے معلم کا کوئی کارکن آپ حضرات کو عمرہ کرانے کے لیے یہاں آئے گا، اس وقت آپ معلم صاحب کے مہمان ہیں، تھوڑی دیر کے بعد معلم صاحب کا کوئی آدمی کھانا لے کر آئے گا، بھوک لگ چکی تھی، ہم لوگوں کے پاس سوائے ستو کے کچھ کھانے کی چیز نہیں تھی، اجنبی اور اس مقدس شہر میں بالکل اجنبی، ابھی قدم رکھا ہی تھا، کہاں کھانے کے لیے جاتے، اس لیے معلم صاحب کے کھانے کے انتظار میں اپنا وقت کاٹ رہے تھے، اور معلم صاحب کے کار پردازوں کا کوئی نشان نہیں تھا، میں بار بار اس عمارت کے میر منشی کے پاس جاتا تھا کہ آج ہی ہم لوگوں کو عمرہ ادا کر لینا ہے، کھانے کے انتظار میں بڑا وقت صرف ہو رہا ہے، ابھی تک ہم لوگوں کو مسجد حرام اور بیت اللہ المکرم کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا، یہ صاحب مجھ کو سادہ دل اور طبعاً شریف آدمی معلوم ہوتے تھے، ان کے سارے طور طریقے مجھ کو پسند تھے، لیکن رفیع الصوت (بلند آواز) تھے کہ جب یہ چیخ چیخ کر گفتگو کرتے تھے یا اپنے ملازم پر اپنا نادر شاہی حکم نافذ کرتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پوری بلڈنگ میں لاؤڈ اسپیکر کے دسوں ہارن فٹ کر دیے گئے ہیں، اس وقت مجھ کو بڑی وحشت ہوتی تھی کئی مرتبہ میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ اپنی صوت جلالی سے ہم لوگوں کا دل دہلا دیتے ہیں، ذرا آپ گفتگو کریں تو آپ کی آواز پست اور مدھم ہونی چاہیے، لیکن وہ بے چارے ایسی ہی گفتگو کے عادی تھے، اور زندگی کے تقریباً پچاس سالہ ایام گزار چکے تھے، اس لیے ان سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ اپنی صوت جلالی سے ہمارے اختلاج میں اضافہ کرنے سے باز آئیں گے، یہ بار بار ہم لوگوں کو کھانے کے لیے تسلی دیتے تھے، لیکن کھانے کا انتظام معلم کی طرف سے ابھی نہیں ہو پایا تھا، دن کے ساڑھے تین بج چکے تھے، ان کے آدمیوں کا کوئی پتہ نشان نہیں تھا، مجھ کو بڑی حیرانی تھی کہ یہ معلم الحجاج تھے نہ کہ معلم الملکوت، ان کو اپنے حاجیوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے تھا، بالآخر ہم لوگوں نے طے کر لیا کہ جو کچھ ستو وغیرہ موجود ہے اس پر قناعت کر لیا جائے، اور جس آستانۂ مقدس کی زیارت کے لئے ہم نے تقریباً چار ہزار میل کی مسافت طے

کی ہے، وہاں جلدی پہنچ کر عمرہ کر لینا چاہئے، چنانچہ ہمارے قافلہ والے بڑے اخلاص نیت اور اہتمام کے ساتھ وضو غسل کر کے اپنی بلڈنگ سے اتر کر ''فندق جیاد'' سے ہوتے ہوئے مسجد حرام کی طرف چل پڑے، میرے اپنے خیال میں ہماری قیام گاہ سے مسجد حرام زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی مسافت پر تھی، نگاہیں نیچی کیے آہستہ آہستہ مسجد کی طرف جارہے تھے، جس سے سرکار **علیہ السلام** کی معراج ہوئی تھی، اور اس کا تذکرہ قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾

(الاسراء ۱)

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے ایک حصّے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی برکت دی ہے، سیر کرائی، اس لیے کی کہ اسے اپنی نشانیاں دکھائیں، بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔

میرے دل میں اس آیت کا خیال آیا تو یہ احساس اجاگر ہوا کہ نبی امی **فداہ ابی وامی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج جسمانی کی جہاں سے ابتدا ہوئی وہیں آج ہمارے نصیبوں کی بلندی کی معراج ہے، بلفظ دیگر یوں کہیے کہ جہاں سرکار **علیہ الصلوۃ والسلام** کے معراج کی ابتدا ہوئی وہیں ہمارے نصیبوں کے معراج کی آخری منزل تھی، سب کو جوش مسرت میں وجد میں آنا چاہیے تھا، یہ سر سے چلنے کا مقام تھا، قدموں سے چلا جا رہا تھا، بلکہ بعض لوگوں کو دیکھا کہ حرم مقدس کی طرف برق رفتار گاڑیوں سے جا رہے تھے، ایک عاشق رسول ہندی نے کیا خوب کہا:

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

اس عشق رسول کے شعر کو اس کے جذبۂ عشق کی فراوانی پر محمول کیا جاسکتا ہے، مگر

میرے نزدیک اگر سچی ایمانی حرارت پیدا ہوجائے اور عشق رحمانی کے مرتبہ پر کوئی فائز ہو جائے تو چہرے اور پیشانی کو سکڑتا ہوا اس مقدس زمین پر چلنا واقعہ ہوسکتا ہے۔

مسجد حرام کی زیارت اور اس کے آداب:

ہم لوگ آہستہ آہستہ چل کر مسجد حرام کے قریب پہنچ گیے، فقہاے کرام نے مسجد حرام کے داخلہ کے جو آداب شمار کرائے ہیں، ان میں دعاؤں کے علاوہ باب السلام سے داخلہ کو مستحسن قرار دیا ہے، ہمارے قافلے کے ایک رکن حاجی عبداللطیف صاحب تھے، جو اس سے پہلے بھی حج وزیارت سے مشرف ہوچکے تھے، اس لیے باب السلام سے داخلہ میں کسی وقت کا انتظار نہیں کرنا پڑا، البتہ مجھ جیسے خطا کار وعصیاں کار کی حالت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ میں وفور شوق میں یہ چاہتا تھا کہ جلد ہی بیت عتیق کے طواف وزیارت سے مشرف ہوجاؤں، اور کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ جہاں کی حاضری کے لیے ضروری تھا کہ نیکیوں کی سوغات لے کر اس بلند آستانہ پر حاضری ہو اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ مسجد حرام کے در و دیوار سے کوئی ہاتف غیبی یہ صدا نہ دے دے کہ تمھارے کرتوت ہی کون اچھے تھے کہ تم یہاں اندر گھسے آتے ہو، نہ تمھارے دل میں طہارت و پاکیزگی پائی جاتی ہے اور نہ تم مومن کی شان توکل کے ساتھ یہاں آئے ہو، نہ تم کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بجا آوری کا کامل شوق ہے، تم تو دل حزیں لے کر یہاں پہنچے ہو، تمھارے اندر وہ فرح وانبساط نہیں پایا جاتا جو ایک عارف حق آگاہ کے دل میں پایا جاتا ہے، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس وقت میں نے ’’باب السلام‘‘ سے اپنے قدم کو آگے بڑھایا قدرت الٰہی کی طرف سے دل کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا اور بے ساختگی کے عالم میں بار بار یہ شعر میری زبان سے ادا ہو رہے تھے:

بہ طواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم نہ دادند
کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

زمزم شریف پینے کے بعد جب مطاف کعبہ کی طرف چلا تو اس وقت بھی میری زبان پر یہ شعر تھا، اس شعر کو گو کہ شاعرانہ تخیل کی بلند پردازی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، لیکن

واقعہ یہ ہے کہ میرے جذبۂ دروں کے بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر تعبیر نہیں مل سکتی۔

مطاف کعبہ میں داخلہ سے پہلے بیت اللہ المکرم پر جب میری نگاہیں پڑیں اور اس کے کالے غلاف سے میری آنکھیں دو چار ہوئیں، تو نہ پوچھیے میرے دل کو کتنا سکون ملا، یہی وہ مقدس گھر ہے، جس کے طواف کے لیے دنیا کے کونے کونے اور چپے چپے سے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے، دنیا کا کون سا ملک ہے جہاں سے اس چھوٹی سی مقدس عمارت کے طواف کے لیے لوگ نہ آتے ہوں، شاید ہی بد نصیبوں کا کوئی ایسا ملک ہو، جس کے تمام باشندے اس سعادت عظمیٰ سے محروم رہے ہوں۔

عمرہ کی ادائیگی:

میں نے جیسے ہی مطاف کعبہ میں قدم رکھ کر آگے بڑھنا چاہا میرے ذہن میں وہ واقعہ آیا، جس کو مشہور مفسر صاحب مدارک التنزیل نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''کہ حالت طواف میں ایک بزرگ نے ایک نوجوان سے پوچھا کہ تم کتنی دور کی مسافت طے کر کے آئے ہو، اس نوجوان نے بتایا کہ ایک سال کی مسافت طے کر کے آیا ہوں، اس بزرگ نے فرمایا: ''**انتم جیران البیت**'' تم لوگ خانۂ کعبہ کے پڑوسی ہو، اور میں تو جب چلا تھا بالکل جوان تھا، اور اس وقت ادھیڑ عمر کا ہو گیا ہوں۔

خیال کی برق رفتاری کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں اوراق در اوراق سیاہ کیے جا چکے ہیں، لیکن اس مادی دنیا میں چند ہی قدم کے چلنے کے یہ واقعات ہوتے ہیں، یہ واقعہ میرے ذہن میں تھا اور میں مطاف کعبہ میں قدم آگے بڑھاتا چل رہا تھا۔

فقہ اسلامی کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر کے کامل تیاری کے ساتھ آیا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ طواف کی ابتدا رکن حجر اسود کے روبرو سے ہوتی ہے، لیکن یہاں مجھ کو رکن حجر اسود کون ہے؟ اور اس کا مقابلہ کہاں سے ہوگا کیسے پتہ چلتا، اس اژدحام اور بھیڑ بھاڑ میں کوئی سیکڑوں کتابیں پڑھ کر آیا ہو، اور اس کے ذہن میں حرم مقدس، مطاف کعبہ، رکن عراقی و شامی

،رکن یمانی ورکن حجر اسود، حطیم کعبہ، مقام ابراہیم، سب کچھ کا نقشہ موجود ہو، تاہم اس کو واقعہ نفس الامری پر اتنے بھاری مجمع میں منطبق کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا، اسی وجہ سے جو علماے کرام حج وزیارت سے مشرف ہو چکے ہیں، اور انھوں نے مناسک حج پر کتابیں لکھی ہیں، انھوں نے بطور خاص اس پر تنبیہ وہدایت کی ہے کہ پہلی مرتبہ جب طواف وعمرہ کے لیے جائے تو کسی معلم یا رہبر کا ہونا ضروری ہے، ورنہ مسائل شرعیہ کے ازبر ہونے کے باوجود بہت سی غلطیوں کا امکان ہے، وہ تو کہیے اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے قافلے میں ایک حاجی صاحب پہلے سے حج کی سعادتوں سے مشرف ہو چکے تھے، بروقت ان کی رہبری سے رکن حجر اسود کے روبرو ہونے پھر وہیں سے طواف کی ابتدا کرنے میں سہولت ہوگئی، ورنہ مجھ کو تھوڑی دیر تک توقف کرنا ہی پڑتا، رکن حجر اسود کے بالکل سامنے پتھروں سے ایک خط مستقیم کھینچ دیا گیا ہے، اس پر قدم رکھ کر اپنا چہرہ حجر اسود کی طرف کر کے "بسم اللہ واللہ اکبر" پڑھ کر طواف کی ابتدا ہوئی، جہاں سے ابتدا ہوئی ہے، اسی خط پر چکر لگا کر پہونچنے کے بعد ایک طواف ہو جاتا ہے اور ایسے ہی سات چکر لگانے کے بعد طواف کعبہ کا رکن ادا ہو جاتا ہے۔

طواف کی دعائیں:

علماے اسلام نے مختلف مقامات کے لیے طواف کی حالت میں متعدد دعائیں لکھی ہیں، ان دعاؤں کو اسی وقت پڑھا جا سکتا ہے، جب پہلے سے خوب ازبر کر کے طواف کیا جائے، اور ایسا کم ہی ہو پاتا ہے، اس لیے میں نے بہت سے حجاج کرام کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں کتابچہ لیے ہوئے رکن شامی، رکن حجر اسود، رکن یمانی کی دعائیں پڑھتے ہیں، اور حطیم کعبہ کے پیچھے سے جب گزرتے ہیں تو وہاں کچھ دوسری دعائیں پڑھتے ہیں، اگر کسی حاجی کو یہ سب دعائیں یاد ہوں تو واقعی ان کا پڑھنا باعث خیر وبرکت ہے، لیکن میرے اپنے خیال میں کتابوں کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے سے تو بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم اور حدیث پاک کی جو دعائیں یاد ہوں، ان کو پڑھنا چاہیے، ورنہ بیشتر حاجیوں کے لیے ممکن

نہیں کہ اتنی لمبی لمبی دعائیں زبانی یاد کر کے پڑھ سکیں، بالفرض اگر کسی کو کوئی بھی دعا یاد نہ ہو تو اس کو درود شریف پڑھنے کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہیے، میں طواف کی حالت میں کچھ دعائیں یاد کر کے گیا تھا، ان کو پڑھنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن میری خاص دعائیں یہ تھیں: "**ربنالاتزغ قلوبنا بعد اذهديتناوهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب۔اللهم انى اسئلك العفووالعافية فى الدين والدنياء والآخرة**"۔ ان دونوں دعاؤں کے علاوہ جب رکن یمانی کے روبرو ہو کر رکن حجر اسود کی طرف چلتا تھا تو یہ دعا پڑھتا تھا:

"**ربنااٰتنا فى الدنيا حسنة وفى الآخرة حسنة وقنا عذاب النار و ادخلناالجنة مع الابرار ياعزيز! ياغفار! يارب العٰلمين!**"

بالعموم تمام حجاج کرام یہ دعا پڑھتے ہیں، اس دعا کے متعلق روایتوں میں آیا ہے، جب کوئی شخص یہ دعا پڑھتا ہے تو خدا کے فرشتے خصوصاً جبریل امین اس دعا پر "آمین" کہتے ہیں، یہ دعائیں پڑھتے پڑھاتے خانۂ کعبہ کے اردگرد چکر لگاتے رہنا چاہیے، سنت تو یہ ہے کہ پہلے کے تین چکروں میں سینہ تان کر بہادروں کی طرح کچھ تیز چلنا چاہیے، لیکن جب مطاف کعبہ بھرا ہوا ہو اور انسانوں کے ازدحام سے ایک جسم دوسرے جسم سے ٹکراتے ہوں تو ایسی سنت کے متروک ہونے کا بڑا امکان ہوتا ہے، اس سنت کی ادائیگی میں اگر کسی مسلمان کو اذیت پہونچ جائے تو یہ اچھی بات نہ ہوگی، اس بھیڑ بھاڑ میں ایک گھنٹہ سے زائد عرصے میں ہم لوگ طواف کعبہ سے فارغ ہو گئے، اور طواف سے فراغت کے بعد یہ ضروری ہے کہ دو رکعت نماز واجب الطواف پڑھی جائے اور اس دو رکعت نماز پڑھنے کے لیے مقام ابراہیم کے پیچھے مستحسن جگہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مطاف کعبہ کے اندر مقام ابراہیم ہے تو ایسی بھیڑ بھاڑ میں اس کے قریب نماز کی ادائیگی میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ وہی مقام ابراہیم ہے جس کو شیشے کے ایک قبہ میں نصب کیا گیا ہے، یعنی یہ وہ ہی پتھر ہے، جس پر حضرت خلیل اللہ

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھڑے ہوکر خانہ کعبہ کی تعمیر کی ،اس پتھر میں اپنی صلابت کے باوجود حضرت خلیل کے اعجاز سے آپ کے پائے مبارک کے گہرے نشانات پائے جاتے ہیں،اگرسوے ادبی نہ ہوتواس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ آپ کے دونوں قدم اس میں دھنسے ہوئے تھے،جس کے نشانات موجود ہیں،اسی مقام ابراہیم کے متعلق قرآن عزیز میں ارشاد فرمایا گیا:"وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى "(البقرۃ:۱۲۵)اس لیےسب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے قریب میں نماز ادا کرے، جب مجمع کم ہوتو اس کے قریب میں نماز ادا کی جاسکتی ہے،مگر جب مجمع کثیر اور مطاف بھرا ہوا ہوتو ایسی حالت میں مقام ابراہیم کے قریب میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کرنا بڑا مشکل کام ہے،اور ہم لوگ جس وقت طواف کرنے کے لیے گئے تھے،تو پورا مطاف حاجیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا،،اس لیے مقام ابراہیم کے پیچھے اس عمارت کے قریب جس میں چاہ زمزم کے پانی کی سپلائی کا انتظام ہے،دورکعت واجب الطواف ادا کرکے خدا کی بارگاہ میں نہایت عاجزی وزاری کے ساتھ دعائیں کیں،اپنے ذہن پرزور دے کر جتنے احباب یاد آتے تھے،سب کےحق میں دعائیں کرتا تھا ،دارالعلوم علیمیہ کے اساتذہ وطلبہ،میرے محسن جناب سیٹھ غلام مصطفی صاحب ،تلمیذرشید جناب مولانا معین الحق صاحب علیمی ،اپنے عقیدت کیش مولانا مفتی نظام الدین صاحب،عزیزسعید مولوی معراج الحق سلمہ،دونوں برادران ،ماسٹر مجیب اللہ وماسٹر حمیداللہ خان اوران کےسب بچوں کے لیے دعائیں کیں،سب کے حق میں یہی دعا کرتا تھا کہ اے خدائے برتر وتوانا!ان سب کوصراط مستقیم پر گامزن رکھ،اورصحت وسلامتی کے ساتھ عمل خیر کی توفیق مرحمت فرمااور دنیاوآخرت کی کامیابیوں سے ان کو کامیاب وبامراد بنا،اوراپنے اس مقدس گھر کی زیارت سے مالک ومولیٰ ان سب کومشرف فرما۔

والدین کے لیے خصوصی دعائیں:

اپنے والدین کریمین کا خیال ذہن پر چھا گیا تھااور ان کے حق میں "**اللھم اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب**" بار بار پڑھ کر دعا کرتا تھا،قرآن

عزیز کی یہ دعا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے کتنی بار پڑھی ہوگی، لیکن مقام ابراہیم کے پیچھے مطاف کعبہ میں آب زمزم کی سپلائی کی جگہ کے قریب پڑھنے میں جو رقت طاری ہورہی تھی ویسی رقت کبھی بھی نہیں پیدا ہوئی، عام طور پر جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں، ان کے معانی ومطالب کی طرف ذہن کم متوجہ ہوتا ہے، بلکہ یہ تصور چھائے رہتا ہے کہ یہ دعائیں حصول برکات کا ذریعہ ہیں، اوران سے دنیاوآخرت میں بڑے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں، لیکن جس وقت میں اس دعا کو پڑھ رہا تھا، اس وقت نہ صرف یہ کہ اس کے مفہوم ومطلب کا کامل ادراک حاصل تھا بلکہ اپنے والدین کریمین (اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین) کا تصور میرے دل ودماغ پر ایسا محیط ہوگیا تھا گویا ان کا چہرہ مہرہ، ان کی شکل وصورت، ان کی گفتار ورفتار، ان کا انداز گفتگو، ان کی شفقت وپیار کے اسلوب و ڈھنگ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے تھا، ان کا خیال آتے ہی معاً ذہن میں یہ بھی آیا کہ میری والدہ مکرمہ حج وزیارت کی سعادت عظمیٰ سے محروم ہوکر دارفانی سے دارجاودانی کی طرف رحلت فرما گئی تھیں، مگر میرے والد مکرم جناب الحاج محمد ابراہیم خان صاحب **علیه الرحمه والرضوان** حج وزیارت سے شرف یاب ہوگئے تھے، اس مقدس جگہ پر ان کی بھی حاضری ہوئی تھی، اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ان کی خوشیوں اور مسرتوں کا کیا عالم ہوتا، اور وہ سوچتے میرا وہ لخت جگر، میرا وہ نورنظر، میرے دل کا وہ قرار وسکون جس کی ادنیٰ تکلیف ناقابل برداشت ہوتی، وہی ان کا فرزند آج دیار حبیب **صلی اللّٰه علیه وسلم** کی زیارتوں سے فیض یاب ہورہا ہے۔

دعائیں تو بہت پڑھی جاتی ہیں اور میں بھی باربار دن رات کے چوبیس گھنٹے کی پنج وقتہ نمازوں میں پڑھتا رہتا ہوں، لیکن ان کے معنی کے ایسے ادراک سے ذہن خالی رہتا ہے، جس سے دل میں سوزوگداز پیدا ہو اور آدمی رقیق القلب ہوجائے اور آنکھیں پرنم ہوجائیں، ہاں آج کی دعا میری عام دعاؤں کے جیسی نہیں تھی، اس دعا سے دل کے اندر کتنا سوزوگداز پیدا ہوگیا تھا، کتنی رقت پیدا ہوگئی تھی، آنکھوں سے کتنے آنسو جاری ہورہے تھے

،کتنی محویت واستغراق طاری تھا،ان کے بیان کے لیے زبان وادب کا دامن تنگ ہے۔ایسا کیوں تھا؟ کیا میں ان دعاؤں کا مطلب نہیں سمجھتا تھا ؟اور رٹو طوطے کی طرح رٹا دیا گیا تھا،جس کو بار بار دہرالیا کرتا تھا،ایسانہیں تھا بلکہ جتنی دعائیں مجھ کو یاد ہیں،سب کے معانی ومطالب سے خوب اچھی طرح واقف ہوں، یہاں کچھ منظر ہی اور تھا،ایک طرف تو کعبۂ مقدسہ کا نظارۂ جمال تھا،دوسری جانب جلال الٰہی کا تصور غالب تھا،اس حالت میں سوچتا تھا کہ میرے والدین کریمین اس دنیاے دوں سے چلے گئے،خدا جانے ان سے کتنی فروگزاشتیں ہوئی ہوں گی،کتنی لغزشیں ان سے سرزد ہوئی ہوں گی،اگران کے حق میں بیت اللہ المکرم کے روبرو ان کا فرزند ہی گریہ وزاری،عاجزی وانکساری،کامل خشوع وخضوع کے ساتھ دعا نہ کرے تو خداے قدوس وجبار کی بارگاہ میں ان کی بخشش کی دعا کون کرے گا؟ پھر مجھ سے بڑھ کر کون روسیاہ ہوسکتا ہے کہ اس حدیث کے پڑھنے کے بعد جس میں حضور اکرم نور مجسم **صلی اللہ علیہ وسلم** نے ارشاد فرمایا ہو کہ ”انسان دنیا سے جب چلا جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے،ہاں تین قسم کے اشخاص ایسے ہیں،جن کی نیکیاں اور بھلائیاں جاری رہتی ہیں،ان میں سے ایک شخص وہ ہے،جو اپنے پسماندگان میں کوئی ولد صالح چھوڑ گیا ہو،جو اس کے حق میں دعائیں کرتا رہے“۔بھلا ایسا ممکن تھا کہ اس مقام مقدس میں اپنے ماں باپ کے لیے دعا نہ کرتا،جب کہ اس حدیث پاک کو اپنی زندگی میں خدا جانے کتنی بار پڑھا پڑھایا ہوگا،اس لیے اگر چہ میں اپنے متعلق اپنے ماں باپ کا ولد صالح ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تاہم اس مقدس جگہ میں یہ ضرور خیال آیا کہ زندگی بھر گو کہ میں ولد غیر صالح رہا لیکن آج میں بطور تحدیث نعمت ولد صالح ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہوں،اسی ایک جگہ بیٹھ کر خدا جانے کتنی بار میں نے ”**اللھم اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب**“ پڑھی ہوگی،ایسی حالت میں میرے اوپر ایسی سرمستی وکیف طاری تھا،یا میں محویت واستغراق کے عالم میں تھا کہ میرے ہمسفروں کو بار بار احساس ہوتا تھا کہ یہ مولانا کیا اسی جگہ بیٹھ کر دعا کرتے ہی رہیں گے؟ اس احساس کو نرمی کے انداز میں ظاہر بھی کیا اور

میں ہوش میں آکر سوچنے لگا کہ اب طواف کعبہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز کے بعد مجھ کو کہاں نماز پڑھنی چاہیے، کہاں دعائیں کرنی چاہیے، بیت اللہ المکرم کا دروازہ مجھ جیسے حقیر ذرۂ ناچیز کے لیے کھل نہیں سکتا، تو کم از کم اس کے روبرو دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے، ورنہ اس دروازے کے پاس کھڑے ہو کر دعا و مناجات کرنا چاہیے، اور اپنی سیاہ کاریوں اور لغزشوں کی معافی کا طلب گار ہونا چاہیے۔

بہر حال! دروازۂ کعبہ مقدسہ کے روبرو تھوڑی دیر کھڑے ہونے اور دعا کرنے کا موقع مل گیا، اس آستانہ پر جبیں سائی کا موقع نہ مل پایا، لیکن اپنے دونوں ہاتھوں سے اس آستانۂ مقدسہ کو پکڑ کر خوب خوب دعا کی۔

حطیم کعبہ میں نماز:

اللہ کی رحمت عامہ حقیر سے حقیر بندے کو محروم نہیں کرتی، اگر انبیاے کرام **علیہم السلام** اور اولیاے عظام **رضی اللہ عنہم** پر خدا کے انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے تو اس کے گنہ گار بندے بھی انھیں نیکوں کے صدقے میں خوب خوب نوازے جاتے ہیں، اگر بادشاہوں اور تاجوروں کو شکوہ سلطنت اور شاہی کروفر سے نوازا جاتا ہے تو گداگروں اور بے نواؤں کی سربلندی کے بھی اسباب فراہم کیے جاتے ہیں، خدا جانے کتنے نیک بندوں نے اندرون کعبہ نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہوگی اور کتنے بادشاہوں کے لیے خانۂ کعبہ کا دروازہ کھلا ہوگا، تو کیا قرب الٰہی کی سعادت انھیں تاجوروں اور نیکوکاروں کے لیے مخصوص ہے؟ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، خدا کی رحمت عامہ سب پر سایہ فگن ہے، اس کی رحمت کسی کو محروم نہیں کرتی، چنانچہ اپنے حقیر بندوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے، حضور اکرم **صلی اللہ علیہ وسلم** نے حضرت عائشہ صدیقہ **رضی اللہ عنہا** سے فرمایا تھا کہ اگر تمھاری قوم جلد ہی اسلام کی دولت سے مالا مال نہ ہوگئی ہوتی اور ان کے دلوں میں شکوک و اوہام پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں حطیم کو خانۂ کعبہ کی عمارت میں داخل کر دیتا، بلفظ دیگر خانہ کعبہ کی توسیع کر کے حطیم کو اس میں شامل کر دیتا۔ غرض اس میں نماز پڑھنا، دعا و مناجات کرنا، اپنے

گناہوں سے توبہ کرنا خانۂ کعبہ کے اندر عبادتوں کے مترادف وہم معنی ہے۔اس لیے دروازۂ کعبہ کی دعا سے فارغ ہوکر اس کوشش میں مصروف ہوگیا کہ کسی طرح حطیم میں دو رکعت نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوجائے ، کثرت ازدحام میں بھی احتیاط کو ملحوظ رکھ کر کہ (کسی کو) اذیت نہ پہنچ جائے، حطیم میں حاضر ہوگیا، ابھی تو کعبہ کے اردگرد گردش کررہا تھا اب گویا خانۂ کعبہ میں داخل ہوگیا، خدائے بے نیاز ہی جانتا ہے کہ کس لذت وسرور کے ساتھ اس میں نماز پڑھی اور کیسی محویت کی حالت میں اس میں دعائیں کیں، دو رکعت نماز پڑھنے کا موقع مل گیا اور اسی کو غنیمت تصور کیا، اس کے بعد حطیم کعبہ سے باہر نکلتے ہوئے بیت مکرم کی دیوار سے اپنے ہاتھوں کو مس کررہا تھا اور ان کو اپنے چہرے پر مل رہا تھا، گویا دیوار کعبہ کے تقدس سے اپنے ہاتھوں کو مشرف کرکے ان سے اپنے چہرے کی روسیاہی کو زائل کرنے کی کوشش کررہا تھا، اس طرح رکتے ٹھہرتے ، خانۂ خدا کی دیوار سے اپنے ہاتھ مس کرتے ہوئے اس کنوئیں کے پانی کے سپلائی کے نظام کی جگہ کی طرف چل پڑا، جس کو عام ہاتھوں نے نہیں کھودا تھا، بلکہ حضرت خلیل علیہ السلام کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی نرم ونازک ایڑیوں کی رگڑ سے وجود میں آیا، جب میں زمزم شریف سے سیرابی کے لیے چل رہا تھا تو میرے تصورات میں تاریخ کے وہ تمام واقعات گردش کررہے تھے جو چاہ زمزم کے متعلق تاریخ وسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

آب زمزم کا اعلیٰ انتظام:

ہمارے قارئین پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ بیر زمزم (زمزم کا کنواں) کعبہ معظّمہ کے دروازے کے سامنے چند گز کے فاصلے پر واقع ہے، اور اس سے کافی دوری پر آب زمزم کی سپلائی کے لیے بڑے اعلیٰ درجے کا انتظام ہے، تہ خانہ جیسی دو عمارتیں بنی ہوئی ہیں ، انھیں عمارتوں میں پائپ لائن سے آب زمزم شریف مشینوں کے ذریعہ لایا جاتا ہے ، یہاں پانی پہونچانے کا معقول انتظام کیا گیا ہے، ایک عمارت مستورات کے لیے مخصوص ہے، جس میں کوئی مرد داخل نہیں ہوسکتا، صرف خواتین اس عمارت میں داخل ہوکر زمزم

شریف سے مستفیض ہوسکتی ہیں، کیوں کہ سامنے پولیس والے پہرہ دیتے ہیں، دوسری عمارت مردوں کے لیے خاص ہے،اس میں کوئی عورت نہیں داخل ہوسکتی،سیکڑوں لوگ آب زمزم سے آسودہ ہوکراوراپنے جسم اورکپڑوں کوتر کرکےاس کےفرش کےاوپر جہاں جس کوجگہ مل گئی ،لیٹے ہوئےنظر آئے ،زمزم شریف کوپی کراوراپنے جسم اورکپڑےکوبھگوکر یہ دعا کرتا تھا کہ رب ذوالجلال تونے اس مبارک پانی میں شفارکھی ہے،اپنے اس حقیر بندےکوتمام جسمانی وروحانی بیماریوں سے شفاےکلی مرحمت فرما،اگر دل میں آلودگی ہوتواس طیب وطاہر پانی سے اس کودھل دے،اورجسمانی بیماریوں کا مجموعہ بنا ہوا ہوں،برسہا برس سے ان کا علاج کررہا ہوں،شفایاب ہوجاتا ہوں،پھر بیمار ہوجاتا ہوں،مکمل طور سے شفانہیں ملتی،اے مالک ومولیٰ !اےشافی مطلق !اس آب زمزم سےشفاےکلی عطافرما۔

یہ وہی زمزم شریف کا پانی ہے کہ اگرکسی زائرحرم سےتھوڑاسابطورتبرک مل جاتا ہے تواس کوخیروبرکت ،صحت وعافیت کا ذریعہ تصورکیا جاتا ہے،آج وہ آب زمزم کسی زائرحرم سےتھوڑاسانہیں مل رہاہے، بلکہ اس کی سپلائی کامکمل نظام میرےسامنے ہے،جتنا چاہوں پی سکتا ہوں اورجیسا چاہوں اپنے جسم کوتر کرسکتا ہوں،اس پرکوئی پابندی اورروک ٹوک نہیں ہے،اللہ اللہ !وہ چاہ زمزم جس کا پانی سیکڑوں سال سے حاجیوں اورزائروں کوسیراب کررہا ہے بلکہ بطورتبرک دنیا کےکونے کونے میں جس کو پہونچایا جارہاہے،اور پتہ نہیں کتنے لوگ اس سے اپنی جسمانی بیماری کا علاج کررہے ہیں،اس متبرک پانی کے چشمے کےقریب یہ عاصی بھی موجودہے،اس کےنصیبےکی بلندی کا کتنا نازک ونایاب موقع ہے۔

آیت صفاومروہ کی تفسیر:

میں آب زمزم سے آسودہ ہوکر بڑامسرورہورہا تھا،بڑاٹھنڈاپانی تھا،اوراس کے پیتے وقت اپنی نفسیات کےخلاف کسی خوف میں مبتلانہیں تھااورنہ میرےخیال میں یہ آتا ہے کہ میں بلغمی مزاج کا ہوں،کہیں ایسا نہ ہوکہ نزلہ وزکام کا شکارہوجاؤں،کیوں کہ میرے دل ودماغ پر یہ اعتقادحاوی تھا کہ نبی امی **فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم** کے

ارشاد کے مطابق اس میں شفا ہے،اور درحقیقت انسان کا اعتقاد ہی اس کو بہت سے وسوسے سے رہائی دے دیتا ہے، زم زم شریف کو پی کر اپنے کپڑے وجسم کو تر کر کے اب صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے کے لیے چل پڑا، درمیان سعی قرآن شریف کی آیت کریمہ: "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ، فمن حج البیت اواعتمر فلاجناح علیہ ان یطوف بھما ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم" (البقرۃ:۱۵۸)۔

مجھ کو ازبر تھی، زندگی میں سیکڑوں، ہزاروں بار اس آیت مبارکہ کو پڑھا پڑھایا ہوگا ،اوراس کے معنی ومفہوم پر غور وخوض کیا ہوگا، حج وزیارت کے فقہی مسائل کی طرف جو صریح اشارے مل رہے ہیں، ان کا استنباط فقہ کی کتابوں میں پڑھا پڑھایا ہوگا، کتنی تفسیروں میں اس آیت کریمہ کی تفسیر پڑھنے کا موقع ملا ہوگا، لیکن جیسی تفسیر اس آیت کریمہ کی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اس کے معانی ومطالب کا جیسا اذعان اس وقت حاصل ہورہا تھا، زندگی بھر میں پچاسوں صفحات کی ورق گردانی کے بعد حاصل نہ ہوا تھا، بار بار یہ خیال آتا تھا کہ دو پہاڑ گوکہ کتنے ہی متبرک ہوں تاہم وہ اللہ کے دین کے شعائر کیسے ہیں؟ آج شعائراللہ کی ایسی تفسیر دیکھ رہا تھا جس کی بنا پر ذہن کے کسی گوشے میں شک ووہم کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا، اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا کہ ہزاروں انسان اپنی بےخودی اور سرمستی میں صفا ومروہ پر چڑھ کر گڑگڑا گڑگڑا کر دعا ومناجات کررہے ہیں، یہاں کسی کو کسی سے تکلیف ہے نہ کسی کو کسی سے بغض وکینہ، کوئی کسی دوسرے سے اس ازدحام میں اذیت وکوفت محسوس نہیں کررہا ہے، اتنی بھیڑ بھاڑ میں سب اپنی ہی ذات میں مستغرق پائے گئے، اخوت اسلامی کے رشتے میں منسلک اس انداز سے نظر آئے کہ گویا عربی وعجمی، ہندوستانی وپاکستانی، جاپانی وملیشیائی، بلکہ دنیا کے مختلف ممالک کے کون کونے گوشے گوشے سے آئے ہوئے انسان معلوم ہورہا تھا کہ ایک دوسرے سے مودت ومحبت کا بڑا پاک جذبہ رکھتے ہیں، اوران دونوں پہاڑیوں پر حج وعمرہ کا ایک رکن لاکھوں انسان ادا کرنے کے بعد دعائیں کرتے ہیں، اس لیے اللہ کے دین کی یہ بڑی علامت ہے، جس کو آنکھوں سے دیکھ کر محسوس کیا۔

صفا ومروہ کی سعی:

میں اس تصور سے صفا ومروہ کی طرف گیا تھا کہ کسی خاص وادی میں دو اونچے اونچے پہاڑ ہوں گے، اوران کا درمیانی حصہ نشیبی ہوگا،لیکن جب زمزم شریف سے آسودگی کے بعدعمرہ کا ایک رکن ادا کرنے صفا کے قریب پہونچا تو یہ بات واضح ہوئی کہ یہاں کوئی میدان نہیں ہے جس میں دو پہاڑیاں واقع ہوں، بلکہ مسجد حرام سے متصل ایک اچھی خاصی لمبی عمارت ہے جس کے فرش کا ایک سرا اونچا ہے یوں ہی دوسرا سرا بھی، اور درمیانی حصہ نشیبی ہے جہاں سے سعی شروع کی جاتی ہے وہ بلند حصہ صفا ہے اور دوسرا بلند حصہ مروہ ہے۔صفا ومروہ کے درمیان سعی یوں کی جاتی ہے کہ صفا سے چل کر جب اس لمبی عمارت کے اس حصے تک پہنچتے ہیں جہاں کھمبوں میں ہرے راڈ جلتے ہیں وہاں سے دوڑتے ہوئے چلتے ہیں اور یہ دوڑ دوسرے کھمبوں کے ہرے راڈوں تک رہتی ہے اور باقی حصوں میں عام رفتار پر چلا جاتا ہے،صفا سے مروہ تک پہنچ جانا ایک سعی (چکر) ہوتی ہے، پھر مروہ سے صفا تک پہنچ جانا ایک سعی (چکر) ہوتی ہے ،خانۂ کعبہ کی طرح یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ مکمل گردش کے بعد ایک طواف کہلاتا ہو،اس طرح صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے کے بعد ہم خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرکے بہت دیر تک بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کے ساتھ اپنے گناہوں سے توبہ اور مغفرت کی دعائیں کرتے رہے، پھر مروہ سے متصل باب مروہ سے ہم لوگ باہر نکل آئے ،اب عمرہ کی ادائیگی مکمل ہوگئی،صرف حلق یا قصر باقی رہ گیا تھا اس کے بعد احرام اتارنا تھا۔

ہمارے قافلے کے ہمراہ خواتین بھی عمرہ کررہی تھیں،اس لیے میرا خیال یہ ہوا کہ مستورات کو قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے تاکہ وہ وہاں اطمینان وسکون کے ساتھ غسل وغیرہ سے فراغت کے بعد کھانے کے انتظام میں مصروف ہوجائیں اور ہم لوگ واپس آکر اپنے بال منڈوالیں لیکن اس رائے سے ایک حجن صاحبہ نے شدید اختلاف کیا،ان کی مرضی تھی کہ ہم سب ساتھ چلیں گے،ان کے اس اختلاف کی وجہ سے مروہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک چبوترے پر مستورات کو بٹھا کر ہم لوگ بال منڈوانے کے لیے چلے گئے،تو ایک پاکستانی

حجام نے بلا کر حجامت بنانے کے لیے کہا، چونکہ ہم لوگوں کو جلدی تھی اس لیے اس پاکستانی حجام کے ساتھ چل دیے، ''اشراف منزل'' کے قریب لے جا کر اس پاکستانی حجام نے ایک سڑک کے کنارے بٹھا کر اتنی تیزی کے ساتھ سر پر استرہ چلایا کہ معلوم ہورہا تھا کہ انسان کے سر پر استرہ نہیں چلارہا ہے، بلکہ کسی سبزہ زار میں کوئی گھسیارا گھاس چھیل رہا ہے، میرے اپنے اندازے کے مطابق صرف دس منٹ میں چار حاجیوں کے سر مونڈ ڈالے ہوں گے، اور ایک ایک حاجی سے پانچ پانچ ریال (۲۵/پچیس پچیس روپئے) طلب کیا، ہم سب نے بغیر کسی چوں وچرا کے پانچ پانچ ریال ادا کردیے، ریال کی قیمت ہم لوگوں کو معلوم تھی، اس لیے بعض حجاج کرام کو اتنی مہنگی حجامت طبعاً گراں گزری ہوگی، لیکن اس دیارقدس میں ایک مسلمان جہاد نفس کے لیے آتا ہے تو اس کو اپنے نفس کی شرارتوں سے ہوشیار رہنا چاہیے، اور اس کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، اگر کسی کے اوپر کوئی خرچ دوسرے کے طلب پر بھاری گزر رہا ہو تو اس کو اپنی ہوس زر پر محمول کرکے اپنے نفس ہی کو ملامت کرنا چاہیے، اس مقام مقدس کے احترام کا تقاضا یہی ہے۔

ایک غلطی کا ارتکاب:

بہرحال! حجامت بنوا کر ہم لوگ اس چبوترے کے پاس آئے، جس پر اپنے قافلے کی مستورات کو بٹھا گئے تھے، اور ساتھ میں وہ چابک دست حجام بھی اپنی قینچی ہاتھ میں لیے آیا، ابھی میں کسی فکر ہی میں تھا کہ اس حجام نے تمام عورتوں کے بال چوٹی پکڑ کر ایک ایک بالشت کاٹ ڈالا، مجھ کو سخت افسوس ہوا کہ عمرہ کی حالت میں ''باب مروہ'' کے قریب ''مسجد حرام'' سے متصل ایک ناجائز عمل کا ظہور ہوگیا، کیوں کہ شرعاً کسی غیر محرم کا کسی عورت کے بال کو کاٹنا خواہ وہ حالت احرام میں ہو، ناجائز وحرام ہے، اگرچہ بعض امور جو حالت احرام میں مباح ہوتے ہیں وہ حالت احرام کے علاوہ میں ناجائز ہوتے ہیں، مثلاً عورتوں کا غیر محرم کے سامنے چہرہ کھولنا قطعاً حرام ہے لیکن حالت احرام میں نہ صرف کھولنا جائز ہے بلکہ اگر چہرہ قصداً ڈھک لیا تو احرام کے خلاف امر ظاہر ہونے کی وجہ سے ''دم'' دینا لازم آتا ہے، تاہم یہ

قطعاً ناجائز ہے کہ کسی غیر محرم سے عورتوں کے بال کا کچھ حصہ کٹوایا جائے ،اس ناجائز عمل کا ظہور صرف ہماری غفلت ولا پرواہی ہی کی وجہ سے ہوا اور ایک خاتون کی بات پر غلط اعتماد کا باعث ہوا، وہ ایک مرتبہ حج کر چکی تھیں لیکن مسائل شرعیہ سے نابلد تھیں ،اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنی مقدس اور پاک جگہ میں ''**ناقصة العقل والدین**'' پر اعتماد کی وجہ سے ناجائز عمل کا ارتکاب ہوا،اس غلطی کے احساس سے مجھ کو سخت ندامت ہو رہی تھی لیکن توبہ واستغفار کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

جبل ابو قبیس:

اب ہم اپنے قیام گاہ کی طرف جو محلہ ''جیاد'' میں واقع تھی ،چل پڑے، مسجد حرام سے معمولی فاصلے پر جو عظیم الشان اسپتال ''المستشفی'' پایا جاتا ہے ،ابھی اس کو پار نہیں کر پائے تھے کہ ایک معزز حاجی صاحب نے اس ذرۂ ناچیز سے سوال کیا کہ وہ کون سا پہاڑ ہے، جس کے قریب حضور اکرم **صلی اللہ علیہ وسلم** نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ کیا تھا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا، اور ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان وہ پہاڑ ہو گیا تھا، اس محترم سائل کے سوال سے اچانک میرے ذہن میں تصورات کا ایک تسلسل قائم ہو گیا اور خیالات کی دنیا میں چودہ سو برس پیشتر کی اسلامی تاریخ کے حیرت انگیز واقعہ کی طرف مڑ گیا، اور یہ سوچنے لگا کہ ''انشقاق قمر'' کے واقعہ کی طرف صاف اشارہ قرآن کریم کی آیت کریمہ ''**اقتربت الساعة وانشق القمر**''(القمر:۱) میں موجود ہے، اور تاریخ وسیر کی کتابوں میں اس کی بہت کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے اور صحیح سند والی حدیث میں بھی اس کا تذکرہ پایا جاتا ہے، تاہم بعض عقل پرست انشقاق قمر کے معجزے میں اپنی موشگافیوں سے بہت کچھ شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں ،لیکن ایک مسلمان کو ان عقل پرستوں کے عقلی مباحث سے کیا سروکار، وہ تو جب یہاں پہنچتا ہے تو ایسے تاریخی معجزے کے محل وقوع کے بارے میں تجسس کرتا ہے اور تجسس ہی وہ چیز ہے ، جو علم میں اضافے کے لیے ذہن کے پردے پر سوالات کے انبار لگا دیتی ہے ،اس لیے اس محترم شخصیت کے سوال کا معقول

جواب اس کی تسلی کے لیے میری طرف سے ہونا چاہیے تھا، لیکن میں خود ہی ناواقف تھا، اس کو کیا بتاتا کہ کتابوں میں سب کچھ پڑھنے کے باوجود میری نارسائی اور بے علمی کی یہ حالت تھی کہ آج میں مکہ معظّمہ میں کسی حاجی صاحب کو ''جبل ابوقبیس'' کی نشاندہی نہیں کرسکتا تھا، میں نے بڑی انکساری سے ندامت کے ساتھ اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک دوسرے صاحب نے بتایا کہ مستشفیٰ کے بعد جو پہاڑ نظر آتا ہے، اور جس کو کاٹ کر ایک لمبی چوڑی سڑک بنائی گئی ہے اور اس کے اوپر ایک پل بنا ہوا ہے، اسی پہاڑ کا نام ''جبل ابو قبیس'' ہے، پھر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی بلند چوٹی پر چڑھ جاتے، چاند کے وہ دو ٹکڑے تو نظر نہیں آتے، لیکن مدینہ کے چاند کے تصور و مراقبہ میں کچھ عرصہ اپنا وقت گزارتے، یہ بھی کوئی کم عبادت نہیں، لیکن آہستہ آہستہ قیام گاہ کی طرف چلتے رہے، احساسات کا ہجوم آگے بڑھنے سے مانع نہیں ہورہا تھا، شام کا وقت ہوگیا تھا، آسمان پر کچھ بادل تیرتے ہوئے نظر آئے، تاہم دھوپ کی تمازت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، آج کھانے کا انتظام معلم صاحب کی طرف سے تھا، شدت بھوک کی وجہ سے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے قیام گاہ تک شام کے ۶ ربجے پہنچ چکے تھے، اور ابھی تک ہم لوگ ''معلم صاحب'' کی ضیافت سے محروم ہی تھے۔

معلم صاحب کی ضیافت:

اس بلڈنگ کے انتظام کار ''جناب عبداللطیف صاحب بنگلہ دیشی'' تھے، (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کھانے کے سلسلہ میں ان سے رابطہ پیدا کرنے پر معلوم ہوا کہ جلد ہی انتظام ہونے والا ہے، دن کے دو بجے سے لے کر مغرب کی نماز کے بعد تک اس ضیافت کے انتظار میں ہم لوگوں نے نہ اپنی طرف سے کھانے کا انتظام کیا اور نہ ہی کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا، نماز مغرب کے آدھا گھنٹہ کے بعد معلم صاحب کا ملازم کھانا لے کر آیا، شدت بھوک میں جیسا بھی کھانا میسر آجائے، وہی خوش ذائقہ اور لذیذ ہوجاتا ہے، اگر خوب بھوک لگی ہوئی ہو تو نمک روٹی بھی بہت لذیذ ہوجاتی ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ رمضانی صاحب کی طرف سے خشک چاول اور مچھلی سے ضیافت ہوئی، وہ اتنی بے لذت تھی کہ جب چاول میں

اس کا شوربا ملا کر زبان پر رکھا تو بڑی مشکل سے اس کو حلق کے نیچے اتارنے میں کامیاب ہوا، جناب عبداللطیف صاحب چونکہ بنگلہ دیش کے رہنے والے تھے، اس لیے یہ مچھلی خواہ کتنی ہی لذیذ رہی ہو، لیکن ہمارے قافلہ والے میں سے کسی کے حلق کے نیچے نہ اتری، اگر صرف میرا معاملہ ہوتا تو میں سوچتا کہ نفس کی شرارت اس مقام مقدس پر بھی باقی رہی، جہاں ہم سب کو قناعت کی روش اختیار کرنا چاہیے تھا، یہاں جو کچھ اور جتنا کچھ بھی میسر آتا، اسی پر اکتفا کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ یہی وہ مقدس جگہ ہے، جہاں نبی امی **صلی اللہ علیہ وسلم** نے فاقہ کشی اور عسرت کی زندگی گزاری تھی، اور شاید باید ہی لذیذ کھانا تناول فرمایا، جو کی روٹی اور کھجور جیسی چیزیں آپ کی مخصوص غذا رہیں، وہ بھی پوری فراخی وکشادگی کے ساتھ نہیں مل پاتی تھی، اس لیے سرکار کی زندگی پاک کا تصور کر کے ہم لوگوں کو عبرت حاصل کرنا چاہیے تھا اور یہاں ہم سبھی لوگ اس ضیافت سے مایوس تھے کہ بڑے انتظار کے بعد کھانا آیا بھی تو اس کی طرف طبیعت کا میلان ہی نہیں ہو رہا تھا، بالآخر طے پایا کہ کسی پاکستانی ہوٹل میں چل کر اپنے مزاج کے مطابق کھانا کھانا چاہیے، حاجیوں اور ججنوں کا قافلہ کھانے کے لیے نکلا چونکہ ہم لوگ ناواقف تھے، اس لیے ایسے ہوٹل کی تلاش میں ناکام رہے، جہاں ہندوستانی یا پاکستانی کھانا ملتا ہو، اور ایک عرب ہوٹل میں گھس گئے، جس میں قسم قسم کی سبزیاں، مرغ مسلّم، چاول روٹی مل رہے تھے، عربی مرغ مسلم کا پہلا سابقہ تھا، سب لوگوں نے یہی مرغ مسلّم کھانے کی فرمائش کی اور شوق سے کھایا، ایک میں تھا کہ اب بھی اپنے ذوق کے مطابق بالکل سادہ کھانا نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا تھا، ابھی سب کھانا کھا رہے تھے کہ موذن کی صدائے اذان بلند ہوئی اور یکا یک ہوٹل بند ہونا شروع ہو گیا، کیوں کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اگر کوئی شخص اذان کے بعد دوکان کھولے رکھے تو پولس والے اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آئیں گے، دوکانوں کا پھاٹک یا تو بند ہو جاتا ہے یا پھر ان کے اوپر پردہ لٹکا دیا جاتا ہے، نماز کے پابند مسجد کی طرف نماز ادا کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور بے نمازی لوگ اپنی دوکانوں میں ''پردہ نشین'' ہو جاتے ہیں۔

یہ انسان کی بڑی بدنصیبی ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے دور دراز مقامات سے مکۂ معظّمہ لوگ آتے ہیں، اور اس مقدس آبادی کے لوگوں ہی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بیت اللہ المکرم کے قرب و جوار میں رہتے ہوئے نماز کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں، ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ یکا یک ہوٹل کا دروازہ بند ہونے لگا، جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہوکر نماز عشا ادا کرنے کے لیے مسجد حرام کی طرف چل دیے، آج زندگی میں پہلی شب ہے کہ اس حقیر کی پیشانی نماز عشا میں مسجد حرام کے اندر جھکنے والی تھی، بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ خدا کی عبادت و بندگی میں مصروف تھا، پہلی جیسی بے کیفی آج کی نماز میں نہیں تھی، بلکہ بڑا سرور حاصل ہو رہا تھا، اگر قراءت شروع کی تو طبیعت یہی چاہ رہی تھی کہ یہ خوب لمبی ہوتی چلی جائے، جب رکوع میں گیا تو رکوع سے اٹھنا ایک قسم سے ناگوار ہو رہا تھا، سجدے میں پیشانی رکھ دی تو اندر سے روحانی صدا یہی آرہی تھی کہ پیشانی سجدے میں پڑی رہے۔

سعودی عربیہ کے وقت کے مطابق دس ساڑھے دس بجے رات میں نماز وعبادت سے فارغ ہوکر اپنی قیام گاہ میں پہونچنے کے ارادے سے مسجد حرام سے نکل آئے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آج کی پوری رات مسجد حرام میں گزر جائے، یہیں عبادت وریاضت، اوراد ووظائف میں مصروف رہیں، لیکن آرام پسند نفس سفر کی تکان کے باعث قیام گاہ جانے کے لیے مجبور کر رہا تھا، ساڑھے دس بجے رات کے بعد اپنی بلڈنگ میں پہونچ کر بلا کسی توقف کے سونے کے ارادے سے بستر پر دراز ہوگیا، کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر ایسی گہری نیند آئی کہ میں اس وقت بیدار ہوا جب مؤذن کی صدائے اذان سے فضائے مکہ معظّمہ ترنم ریز ہورہی تھی، آواز بازگشت سے سماں بندھ گیا تھا، ایک تو صبح صادق کا سہانا وقت، دوسرے مسجد حرام سے لحن داؤدی میں اذان گونج رہی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہیبت الٰہی یہاں کے درو دیوار پر طاری ہے، خدا کی عظمت و بڑائی، اس کے جلال و کبریائی کے ان کلمات اذان کو سن کر اپنے قافلہ والوں میں میں پہلا شخص تھا کہ آج مورخہ ۲۲/جون کو مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے وقت بیدار ہو رہا تھا، میری یہ پہلی رات اس بلد امین میں گزری تھی۔

امیدوں کا دامن:

حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر آداب وسنن کوملحوظ رکھ کر وضو کیا، پھر میں تنہا اپنی بلڈنگ سے نیچے روڈ پر آیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ انسانوں کا ایک سمندر مسجد حرام کی جانب رواں دواں ہے، جدھر دیکھیے اولاد آدم کا ازدحام ہے، سب ایک خانۂ خدا کی طرف چلے جارہے ہیں، نہ کوئی کسی سے بلند آواز سے باتیں کررہا ہے، نہ کہیں سے شوروشغب ہے، نہ لاؤڈ اسپیکروں کی بے ہنگم آوازیں، نہ ہی ریڈیو اور ٹرانجسٹر بج رہے ہیں، مجمع پر ایک سکوت کا عالم طاری ہے، ایسے وقت میں یہ ناکارہ بھی ''فندق جیاد'' سے آگے بڑھ رہا تھا کہ معاً ذہن میں یہ آیا کہ قرآن حکیم کے اندر ﴿يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۖ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا﴾ (طٰه:۱۰۸) ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب صور اسرافیل پھونکا جائے گا، تو داعی کی طرف لوگ اس انداز سے چلیں گے کہ ان کے پیروں کی آہٹ کے سوا کوئی آواز نہ ہوگی، خدا جانے صور اسرافیل کب پھونکا جائے گا، اور کب لوگ اپنی قبروں سے نکل کر داعی کی طرف چلیں گے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دل نواز نے دنیا کے گوشہ گوشہ کے انسانوں کے دلوں میں ایسا جوش وولولہ پیدا کردیا کہ ان کی پکار پر لبیک کہہ کر مکہ معظّمہ میں جمع ہوگئے ہیں اور سب بیت اللہ المکرم کی طرف چلے جارہے ہیں، کسی کے ہاتھ میں تسبیح ہے، کوئی اپنے بغل میں مصلیٰ دبائے ہوئے ہے، یہ ناکارہ بھی چل رہا تھا، اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی، نہ مصلیٰ، خالی ہاتھ جارہا تھا، امیدوں کا دامن پھیلائے ہوئے تھا، اور اس یقین کے ساتھ چل رہا تھا کہ توبہ وانابت کا یہ وہ مقدس مقام ہے، جہاں بڑے بڑے روسیاہوں کو منور ومصفی کیا جاتا ہے۔

ایک پاکستانی کی تنبیہ:

گوکہ میں پہلے چل چکا تھا تاہم مسجد حرام سے گزر کر مطاف کعبہ میں جگہ نہ حاصل کرسکا، بلکہ مسجد حرام کے ایک گوشہ میں پہلی نماز صبح ادا کی، پھر تلاوت قرآن حکیم میں

مصروف ہوگیا، میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک محترم حاجی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ جناب قرآن شریف کی تلاوت کے بعد کسی دوسری عبادت میں آپ نہ لگ جائیں ، بلکہ خانۂ کعبہ کا طواف کریں ، یہ شریف النفس حاجی صاحب ایک دین دار مہذب قسم کے پاکستانی تھے،ان کے اس ارشاد پر میری زبان سے یہ بات نکل گئی کہ نفل عبادت کا ثواب ایک لاکھ گنا یہاں ملتا ہے،آپ مجھ کو ایسی عبادت سے کیوں روک رہے ہیں؟انھوں نے برجستہ فرمایا کہ ثواب کتنا ہی ملتا ہو،لیکن طواف کی عبادت کہاں میسر آسکتی ہے، یہاں تو سب سے بڑی عبادت خانۂ کعبہ کا طواف ہے،اس لیے زیادہ سے زیادہ وقت طواف میں صرف کرنا چاہیے، یہ ان کی بات چونکہ مخلصانہ و برمحل تھی ،اس لیے دل میں بیٹھ گئی،اور میں فوراً رکن حجراسود کی طرف طواف کے لیے چل پڑا۔

آج ہمارا مکہ معظّمہ میں دوسرا دن تھا اور دوسرا طواف بھی،صبح کا وقت تھا،آفتاب عالم تاب افق مشرق سے نکل کر کچھ بلند ہوگیا تھا ،اس کی چمکیلی دھوپ مسجد حرام کے مناروں پر پڑ رہی تھی ،دھوپ میں وہ شدت نہیں پیدا ہوئی تھی ،جس کا احساس عام طور پر یہاں ہوتا ہے، بلکہ ایک طرح سے موسم خوشگوار تھا،ایسے وقت میں خانۂ کعبہ کا طواف کیف روحانی پیدا کررہا تھا ،طواف کعبہ وغیرہ سے فارغ ہوکر مسجد حرام سے نکل پڑا، نکلے کیوں؟ دن رات کے چوبیس گھنٹے یہیں گزرنا چاہیے تھا،خدا کی رحمتوں کے ہجوم سے باہر نکل آنا کوئی عقل مندی کی بات نہیں تھی،تاہم انسان کی مجبوری ہے کہ ایسے انوار وتجلیات کے مقام سے اس کو باہر آنا ہوتا ہے۔

ایک حیرت انگیز بات:

آج چونکہ مکہ معظّمہ میں دوسرا دن تھا،کھانے پینے کے سامانوں کو اکٹھا کرنا تھا تاکہ دوپہر سے قیام گاہ ہی پر کھانا پکنا شروع ہوجائے ،اس لیے پہلی بار اشیاے خوردونوش کی تلاش میں بازار نکلے، بازاروں کی رونق اوران کی صفائی ستھرائی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہی وہ عرب کے بدؤوں کا بازار ہے،جن کو عہد قدیم میں غیر متمدن شمار کیا جاتا تھا،تہذیب وتمدن کا اعلیٰ معیار بازاروں میں نظر آرہا تھا،کہیں گندگی وغلاظت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جارہی تھی

،تمام دوکانوں کو بڑے سلیقہ سے سجایا گیا تھا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ نظر آئی کہ وہ زبان اردو جو اپنے ہی وطن میں بے دخل کی جارہی ہے، یا جس کے مٹانے کے لیے مسلسل چالیس سال سے تدبیریں ہورہی ہیں، مکہ معظّمہ کی آبادی میں اجنبی نہیں رہ گئی، بہت سے ایسے افراد ملے، جن کو ہماری زبان کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی، بلکہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے، بعض ایسے لوگ بھی ملے جو ''عربی مبین'' کے سوا ''اردوے معلیٰ''میں بھی گفتگو کررہے تھے، البتہ وہ عربی النسل لوگ جو فصیح عربی میں گفتگو کرتے تھے، اوران کو زبان اردو سمجھ میں نہیں آتی تھی، ان سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا۔

قاری محمد مسلم خان کی تلاش:

ضروری اشیا کی خرید وفروخت کے بعد مجھ کو جناب قاری محمد مسلم خان صاحب سے ملاقات کا خیال آیا، اور اس فکر میں پڑ گیا کہ کسی طرح ان سے ملاقات کی کوئی تدبیر نکل آتی تو میرے لیے نہ صرف یہ کہ سہارا بنتے، بلکہ ان سے میری بہت کچھ ضروری باتیں پوری ہوجاتیں، یہ قاری صاحب موصوف بااخلاق، ہوش مند، دین دار، شریف النفس نوجوان ہیں، ان کا دولت کدہ اپنے ضلع کے مشہور شہر ''تلسی پور'' کے قریب ایک گاؤں ''سسہنا''میں ہے، یہ اپنے کاروبار یا ملازمت کے سلسلہ میں عام طور پر ''جدہ''میں مقیم رہتے ہیں۔

مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں ان کے بہت سے احباب ہیں، اس لیے ان کی آمدورفت ان دونوں مقدس شہروں میں ہوتی رہتی ہے، ان سے مجھ کو قلبی لگاؤ ہے، انھوں نے دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی ضلع بستی کو ایک عظیم الشان کتاب ''عمدۃ القاری شرح بخاری'' ڈیڑھ دو سال پہلے فراہم کی تھی۔

اس مبارک سفر میں میری خواہش یہ تھی کہ سعودیہ عربیہ سے کثیر تعداد میں کتابیں اپنے رفقاے سفر کے تعاون سے لے جاؤں گا، اس کے لیے ''ریال'' کی ضرورت تھی، اس وجہ سے میں جلد سے جلد قاری صاحب موصوف سے ملاقات کرکے اس کے انتظام کی طرف

ان کی توجہ مبذول کرانا چاہتا تھا اور مجھ کو یقین تھا کہ موصوف کو اگر مکہ معظّمہ میں میری قیام گاہ کا پتہ چل جائے تو وہ خود ہی تشریف لائیں گے، چونکہ الحاج مفتی حفیظ اللہ صاحب نے میری ڈائری میں جناب قاری محمد مسلم صاحب کا مکمل پتہ اوران کا فون نمبر نوٹ کر دیا تھا، اس لیے میں فون سے قاری صاحب کو اپنا پتہ اور اپنی قیام گاہ کا کمرہ نمبر بتلا دینا چاہتا تھا، تاکہ وہ خود ہی مجھ سے ملاقات کے لیے ہماری بلڈنگ میں تشریف لائیں۔

ہندوستان کی طرح سعودیہ عربیہ میں فون کا ناقص انتظام نہیں ہے کہ اگر کسی کے پاس فون کرنے کے لیے آپ ٹیلی فون آفس میں جائیں تو اوّلاً کارپوریٹر کی بدمزاجی اوراس کی بددماغی کا سامنا کرنا پڑے گا، ثانیاً: لائنیں انگیز یا خراب ملیں گی اور بہ مشکل تمام فون ہو پائے گا، بلکہ یہاں فون کا بڑے وسیع پیمانہ پر اعلیٰ انتظام پایا جاتا ہے، جابجا فون کی مشینیں لگادی گئی ہیں، ان کے اوپری حصہ پر کچھ اس ڈھنگ سے ''سکہ ریال'' رکھنے کی جگہ بنائی گئی ہے کہ اس کے اوپر ''ریال'' یا ''قرش'' رکھ دیا جاتا ہے، پھر دوسرے کے پاس ڈائل کیا جاتا ہے، جب نمبر مل جائے گا اور گفتگو شروع ہو جائے گی تو وہ ''سکہ ریال'' خود بخود اس مشین میں اندر گرنے لگتے ہیں۔

اگر چہ فون کرنے والوں کے اژدحام سے کبھی کبھار تھوڑی سی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے، تاہم فون کرنے میں کسی بڑی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے، میں نے ''جدہ'' جناب قاری محمد مسلم صاحب کے پاس فون کیا تھا تو معلوم ہوا کہ آج کل ان کا قیام مکہ معظّمہ میں ''اشرف منزل'' کی ایک دوکان پر ہے، یہ ''اشرف منزل'' ''مروہ'' کے قریب واقع ہے ،ایک عظیم الشان عمارت ہے ،اس میں پچاسوں دوکانیں ہوں گی ،سونا، چاندی، ہیرے ،جواہرات جیسی قیمتی اشیا کی دوکانیں اس میں پائی جاتی ہیں، ۲ / بجے دن سے ۵ / بجے شام تک چکر لگاتا رہا، مگر قاری صاحب موصوف سے ملاقات نہ ہو پائی، ان کی تلاش حسن نیت کے ساتھ تھی، خودغرضی یا محض اپنی مطلب برآری کے لیے نہیں تھی ، بلکہ دارالعلوم علیمیہ کو علمی ذخائر سے مالا مال کرنے میں قاری صاحب کا تعاون پیش نظر تھا۔

اس پاک اور مقدس شہر میں یہ گردش ''بیت اللہ المکرم'' کے قریب ضرور کچھ نہ کچھ

باعث اجر رہی ہوگی، تاہم بعد میں بہت پچھتایا کہ اس طرح گشت کرنے کے بجائے اگر اپنا قیمتی وقت طواف کعبہ میں صرف کیا ہوتا یا حطیم کعبہ میں گریہ وزاری کے ساتھ دعا کی ہوتی ، میزاب رحمت کے قریب کھڑے ہوکر اپنی آلودگیوں سے پاک وصاف ہونے کے لیے رب کعبہ کی رحمت کے لیے التجا کیا ہوتا، مقام ابراہیم میں خلوص کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی ہوتی تو بڑے اجر وثواب کا مستحق ہوا ہوتا، برکات وحسنات کا دفتر تیار کیا ہوتا، لیکن میری بڑی کمزوری یہ ہے کہ جب کسی چیز کا دھن سوار ہوتا ہے، یا مجھ کو کسی چیز کا شوق بیتاب کرتا ہے، تو اس سے بڑی خوبی وبھلائی سے میں یکسر غافل ہوجاتا ہوں، کہاں خانۂ کعبہ کا طواف اور کہاں ''اشرف منزل'' کی گردش، یہ ناکارہ اس کے فرق وامتیاز سے بھی غافل رہا۔

وارفتگی کا منظر:

الغرض قاری صاحب سے ملاقات میں ناکامی کے بعد مسجد حرام میں آخر عصر کی نماز ادا کی ، پھر طواف کعبہ میں مصروف ہوگیا، بیت عتیق کا طواف ایک ایسی عبادت ہے، جس میں وارفتگی کا عجیب وغریب منظر سامنے ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی حجر اسود کا بوسہ لینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانا چاہتا ہے، اور کوئی خانۂ کعبہ کے درودیوار سے لپٹ کر اپنی عصیاں کاری کو زائل کرنا چاہتا ہے، کتنے خدا کے نیک بندے ایسے ہوتے ہیں کہ مقام ابراہیم، حطیم، آستانۂ کعبہ کے پاس ایسا پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں اور ایسی گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ علم وآگہی، عرفان واعتقاد کا دعویٰ تو یہی ہے کہ ضرور ان کی دعائیں مقبول بارگاہ ایزدی ہوتی ہوں گی، میں کوئی سنگ دل انسان نہیں ہوں، میرے اوپر بھی یہ کیفیت طاری ہوتی تھی اور کبھی کبھی میں بھی رو رو کر خدا کی بارگاہ میں نیازمندانہ دعائیں کرتا تھا۔

طواف کعبہ سے فارغ ہوکر اپنی قیام گاہ کی طرف چل پڑا، راستہ میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بڑی سعادتوں اور برکتوں کے ساتھ نکلا، لیکن دکانوں اور عمارتوں کی چمک دمک اور ان کی دل فریبی ودل آویزی سے طبیعت کا میلان صرف عبادت وریاضت، ذکر الٰہی وتسبیح وتہلیل کی طرف نہیں رہتا تھا، بلکہ پہلی والی وجدانی کیفیت کا ازالہ ہوجاتا تھا اور میں ضرورت

کی چیزوں کے خریدنے میں منہمک ہوجاتا تھا، یہ میری بڑی بدنصیبی تھی کہ ایسی پاک ومقدس جگہ میں ہوائے نفس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

مژدۂ جاں فزا:

بہرحال بازاروں میں گھومتے پھرتے اپنی قیام گاہ پر پہونچا تو اس عظیم الشان عمارت کے انتظام کار جناب عبداللطیف صاحب نے یہ مژدۂ جاں فزا سنایا کہ آپ حضرات کے مدینہ منورہ کی حاضری کا پروگرام مرتب ہوگیا ہے، گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے:

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

آپ تمام لوگ پرسوں عصر کے وقت تک یہاں سے روانگی کی مکمل تیاری کرلیں، ان کی اس خوشخبری سے ہم لوگوں کو بڑی مسرت ہوئی۔

انھوں نے بتایا کہ پرسوں بعد نماز عصر اس بلڈنگ کے سامنے معلّم صاحب کی طرف سے ''توفیق بس'' کی ایک گاڑی آکر لگ جائے گی، ضرورت کے سامان، پانی کے برتن، معمولی بستر وغیرہ ساتھ میں رہنا ضروری ہے۔

آج ۲۴/ رجون ۱۹۸۹ء کی تاریخ تھی، انتظار کی گھڑیاں جلد ہی ختم ہونے والی تھیں، رات ہی سے تیاریوں میں لگ گئے تھے، حقیقت تو یہ ہے کہ دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ منورہ) کے شوق دیدار میں دل کے اندر تمنائیں لہریں لے رہی تھیں، رات بڑی کٹھن سی گزری، طرح طرح کے اندیشہائے دوردراز، اپنی بداعمالیوں کے برے نتائج کے احساس میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی بلند ومقدس بارگاہ میں حسن عقیدت واخلاص کی جبیں سائی اسی وقت لائق اعتنا ہوسکتی ہے، جب کہ آپ کے فرمان زریں پر عمل کرنے کی لگن رہی ہو، خیال آتا تھا کہ حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی غم گساری میں پوری رات گزار ڈالی ہے، وہ بھی اس مشقت کے ساتھ کہ ان کے پائے ناز میں ورم آگئے

تھے،ان کی بارگاہ قدس میں حاضری کے لیے روانگی ہونے والی ہے اور ہم جیسے محروموں کی یہ حالت کہ زندگی میں ذوق وشوق کے ساتھ ان کے احکام وفرامین پر عمل کرنے کی توفیق نہ ہوئی،فرائض وواجبات تو کسی طرح ادا ہو گئے،لیکن ان کی سنت کریمہ پر مکمل طور سے عمل کرنے کی طرف سہولت پسند طبیعت کا رجحان نہ ہوا، پھر زندگی میں کتنی فروگذاشتیں سرزد ہوئیں اور کتنی عصیاں کاریوں میں مبتلا رہا،ان کا تو کوئی شمار وقطار ہی نہیں،اس لیے بار بار شدت سے یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کی بارگاہ پاک میں کون سا منہ لے کر جائیں گے؟ انھوں نے تو میدان عمل میں ہم جیسے ناکارہ لوگوں کو رواں دواں رکھنے کے لیے بڑی اچھی تدبیریں بتائیں اور یہ درس دیا کہ اعلاے کلمۃ الحق کے واسطے جہاد کرنا اور خدا کی راہ میں جان کی بازی لگانا اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس سے زندگی جاوید ملتی ہے،اور یہاں اپنی یہ حالت تھی کہ عمل کے میدان میں بالکل کورے اور علم وفن کا دعوی محض تھا،اسلام کی سربلندی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے تھے،زندگی بھر ان کا کلمہ پڑھتے رہے،ان کے حیات آفریں ارشادات کا درس دیتے رہے،لیکن اخلاص وللّٰہیت کی کمی کے باعث اگر یہ سب قبول ہو گئے ہوں تو خدا کی رحمت وربوبیت کی کارفرمائی ہوگی،ورنہ جو کچھ میں نے کیا اور جتنا بھی کیا تھا،سب نفس پرستی کے لیے کیا تھا،یعنی دین پروری کے جذبے کا فقدان تھا،اس لیے اس یقین کے بعد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں،جو کچھ ان سے عرض ومعروض کیا جاتا ہے ،سب سنتے ہیں،اضطراب وبے چینی کی ایک گونہ کیفیت کا پیدا ہونا لازمی تھا،مگر کبھی کبھی خوش آئند خیالات وتصورات میری روح کو وجد میں لا رہے تھے اور میں بہت مسرور وشاداں ہو رہا تھا کہ چلو سب کچھ سہی،ناکارہ وسیاہ کار سہی،تاہم خانۂ کعبہ کے قریب ’’مقام ابراہیم‘‘ میں میں نے توبہ کر لی ہے اور خوب رو رو کے کی ہے،اس لیے ربِّ کعبہ کی بارگاہ میں ضرور میری توبہ قبول ہو گئی ہوگی اور میرے دفتر اعمال سے برائیوں اور روسیاہیوں کے اوراق دھل گئے ہوں گے،پھر اگر کچھ کسر باقی رہ گئی ہوگی تو شافع امم،رحمت عالم **صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم** کی رحمت بھری بارگاہ میں حاضری کے بعد وہ بھی پوری ہو جائے گی،یہ

احساسات خوشیوں اور مسرتوں کو اپنے ساتھ لاتے ہوئے مجھ کو وجد آفریں کیفیت میں مبتلا کردیتے تھے اور گویا میں دنیا و مافیہا سے بے خبر امیدوں اور تمناؤں کی دنیا میں سیر کررہا تھا، اس طرح رات کبھی سوتے، کبھی جاگتے، کبھی احساس ندامت سے گزر رہی تھی کہ میرے کانوں میں نغمۂ جلال جس کو ''اذان'' کہتے ہیں ترنم ریز ہو گیا، یعنی ابھی صبح صادق بھی نہ ہوئی تھی کہ بیت اللہ الحرام سے ساکت فضا میں صوت اذاں گونج اٹھی، میں اپنے بستر سے اٹھ پڑا، باوضو ہو کر مسجد حرام کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں یہ خیال آیا کہ آج کے فجر کی نماز مسجد حرام میں ممکن ہے، اس لیے کہ شام کو نماز عصر کے بعد یہاں سے مدینہ منورہ کے لیے روانگی ہو جائے گی، خدا ہی جانتا ہے کہ کیا حالات پیش آئیں، انسان کی زندگی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے، اس لیے کامل وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ پھر مسجد حرام میں حاضری نصیب ہوگی، آہستہ آہستہ اپنے خیالات کی دنیا میں سیر کرتے ہوئے مسجد حرام میں پہونچ گیا، اقامت کے بعد نماز شروع ہوئی، امام نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر سورہ ''القارعۃ'' کی تلاوت کی، اتنی خوش الحانی اور صوت جلالی میں یہ سورۂ کریمہ پڑھی گئی کہ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میری زندگی کا یہ شاذ و نادر واقعہ ہے کہ قرآن حکیم کی قراءت سے میرے اوپر ہیبت الٰہی کا نزول ہوا ہو، عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کے ائمہ نجدی ہوتے ہیں، اور نجدی وہابیوں نے اسلامی عقائد و اعمال میں کچھ ایسے لایعنی و من گھڑت عقائد و اعمال شامل کر لیے ہیں، جن کا تعلق اسلام سے دور کا بھی نہیں، ظاہر ہے کہ ایسے اماموں کے پیچھے نماز بحالت مجبوری نہایت انقباض و کراہت کے ساتھ صحیح العقیدہ سنی پڑھتے ہیں، تاہم قرآن حکیم کی اثر آفرینی جو مشہور و مسلم ہے اور جن سے بڑے سے بڑا سنگ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس کا ادنیٰ شائبہ میرے اوپر طاری ہوا، تو میرے اندر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ اس کے بیان کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں اور یہ تمنا رہی کہ کاش قرآن حکیم کی قراءت سے میرے اوپر ہمیشہ ایسی کیفیت طاری ہوتی رہے، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، دل میں بڑا سوز و گداز پیدا ہو گیا، گویا میرا جسم کانپتا رہا، اسی حالت میں

فجر کی نماز ادا کر کے بیت اللہ المکرم کے طواف کے لیے ''مطاف کعبہ'' میں پہنچ گیا۔

حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش:

صبح صادق کا سہانا وقت تھا، اتنی شدید گرمی نہیں تھی جس کا عام طور سے سابقہ ہوتا ہے اور آج یہ سوچ کر طواف کر رہا تھا کہ اس پتھر کو بوسہ دینے کی کوشش کروں گا، نیز جس کے بارے میں حضرت فاروق اعظم **رضی اللہ عنہ** نے ارشاد فرمایا تھا: ''کہ اے پتھر میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے لیکن اس لیے بوسہ دیتا ہوں کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجھے چوما تھا'' وہ پتھر کتنا نصیبہ ور ہے کہ اسلامی تاریخ کے طویل دور میں سنت نبوی کی اتباع و پیروی میں کتنے نیکوکاروں، پارساؤں، ابدال و قُطب، خدا کے نیک بندوں نے دور دراز کی مسافتیں طے کر کے اس کو بوسہ دیا، دنیا میں کتنے قیمتی ہیرے و جواہرات کے پتھر پائے جاتے ہیں اور وہ لاکھوں کروڑوں کی مالیت رکھتے ہیں، اور یہ کتنے تاجوروں کے تاج میں جوڑے گئے، مگر کیا عارفان حق آگاہ کی نظر میں ان پتھروں کی کوئی قدر و قیمت ہے؟ نہیں۔

جس والہانہ شوق و اخلاص سے ''حجر اسود'' کو بوسہ دیا جاتا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی، میں انتہائی عقیدت کے باوجود اپنی پست ہمتی اور کثرت ازدحام کی بنا پر اس پتھر کو بوسہ دینے کی سعادت سے محروم رہا، اور اپنے کو بہلاتا رہا کہ فقہ اسلامی کی کتابوں میں جہاں حج و زیارت کے احکام و مناسک بیان کئے گئے ہیں وہیں یہ بھی تصریح پائی جاتی ہے کہ اس سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادا میں خاص طور سے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کسی کو ایذا نہ پہنچے، یہ جزیہ بھی ''حجر اسود'' کے قریب تک پہنچ کر چومنے سے مانع تھا، کیوں کہ میں سوچتا تھا کہ اگرچہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں ''حجر اسود'' کو بوسہ دینا بڑی نیکی کا کام ہے، لیکن اس سے اہم اور ضروری یہ ہے کہ کسی مسلمان کی اذیت رسانی سے احتراز کیا جائے۔

طواف کعبہ کے بعد حسب معمول ''مقام ابراہیم'' کے پیچھے اور ''حطیم کعبہ'' میں نماز ادا کی اور خدا کی بارگاہ میں نہایت عاجزی و زاری کے عرض کی کہ خداوندا! تیری مقدس بارگاہ

میں حاضری کے بعد تیرے محبوب پاک کی بارگاہ میں حاضری کا وقت قریب آرہا ہے،تو ہی بہتر جانتا ہے کہ تیرے حبیب ﷺ کی نافرمانیاں میں نے کتنی کی ہیں، یہ ناکارہ اتنی عصیاں کاریوں کے باوجود حاضری کا شرف حاصل کرنے کے لائق نہیں ،اس کے تمام گناہوں اورخطاؤں کومعاف کرکے اس لائق بنادے کہ سب سے اونچی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل کرسکے، میں یہ دعا کرتا جاتا تھااور میرا دل اپنا بوجھ کچھ ہلکا سامحسوس کررہا تھا، غالباً گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا،اب اس میں بہت کچھ تخفیف ہوگئی تھی یااس سے رہائی حاصل کرنے کااحساس زیادہ اجاگر ہوگیا تھا۔

تقریبا آٹھ بجے صبح طواف اوردعاومناجات کے بعداپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگئے ،راستہ میں پولیس گاڑیوں کی ہیبت ناک آواز سے کچھ خوف طاری ہوا ، پھرخراماں خراماں اپنی قیام گاہ پرپہنچ گئے ،اپنے تمام ہمراہیوں کوموجود پایا،مستورات کودیکھا کہ آج معمول سے پہلے کھانا تیارکرنے میں مصروف ہوگئیں،اس لیے کہ ان کوبھی علم ہوگیا تھا کہ آج ہی شام بعدنمازعصرمدینہ منورہ کے لئے روانگی ہوجائے گی ،وہ بھی کھانے کے انتظام سے فراغت کے بعدنہادھوکر تیار ہونا چاہتی تھیں،مختصرسامان ساتھ لے جانے کے لئے سب حجاج کرام اپنے اپنے بستر باندھ رہے تھے، کچھ راشن اور کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ میں رکھ لی گئیں۔

سعودی عربیہ کےوقت مطابق دو بجے دن میں ہم لوگ ظہرکی نماز سے فارغ ہوگئے ،اپنے قافلہ کےعلاوہ کچھ دوسرے لوگ میرے پاس تشریف لائے ،انھوں نے مدینہ منورہ کی حاضری وزیارت کے آداب مجھ سے دریافت کیے، ہمارے ناظرین کرام یقین مانیں کہ مجھ کواپنے ذہن پرکامل اعتمادنہیں رہ گیا تھا، بلکہ جب کسی نے کوئی بات پوچھی تو مناسک حج کی کتابوں سے دیکھ کران کو بتاتا تھا، یہ مسئلہ اورمسائل بہت مرتبہ لوگوں نے مجھ سے دریافت کیے،سراج الائمہ،امام اعظم رضی اللہ عنہ کی طرح بطورانکسار''**لا ادری**''نہیں کہتا تھا، بلکہ کتابیں دیکھ کرمسائل بتاتا تھا،میرے رفقائے سفرمیں سے ایک صاحب کومیرے اس طریقہ پربڑی الجھن ہوئی اورانہوں نے کہہ ڈالا کہ یہ کیسے عالم دین ہیں کہ جب ان سے

کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو کتاب دیکھے بغیر نہیں بتاتے ہیں، گویا میرے اس رفیق سفر کے نزدیک عالم کی شان یہ ہے کہ زبانی مسائل بتاتا رہے، ان بیچارے کو کیا پتا تھا کہ کسی شخص کو احکام ومسائل کے سلسلہ میں اپنے اوپر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

غرض چونکہ آج شام کو ہمارے ہمراہ اس بلڈنگ کے بہت سے زائرین حرم مدینہ منورہ روانہ ہونے والے تھے ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر ضرورت ہے کہ ایسی معلومات میں اضافہ کیا جائے اسی لئے ان حجاج کرام کو کتابیں دیکھ کر آداب زیارت کی تفصیل بتائی، اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سفرنامہ میں بھی کچھ آداب ذکر دیے جائیں۔

بارگاہ رسالت مآب میں حاضری کے آداب:

(۱) حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی نیت سے زائر حرم سفر کرے اور اس بارے میں نجدیوں کے پروپیگنڈے سے ہرگز متاثر نہ ہو کہ ''سرکار کے روضۂ اقدس کی زیارت کی نیت سے سفر نہیں کرنا چاہیے'' بلکہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا چاہیے۔

(۲) زائر حرم کے لیے مستحسن یہ ہے کہ راستہ بھر درود شریف کے ورد میں اپنے تمام اوقات صرف کرے، اور ادھر ادھر کی باتوں میں اپنا قیمتی وقت صرف نہ کرے۔

(۳) جب حرم مدینہ منورہ نظر آئے تو اگر ممکن ہو تو کچھ پیدل چلے، اور جب وہاں پہنچ جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تصور میں ڈوب جائے۔

(۴) مسجد نبوی میں حاضری سے پہلے اپنی تمام ضروریات سے فارغ ہولے، اور اپنے کو اس حالت میں نہ رکھے جس سے دل بٹنے کا اندیشہ ہو۔

(۵) پہلے مسواک اور وضو کرے نیز بہتر یہ ہے کہ غسل کر کے سفید کپڑے پہن لے اور افضل یہ ہے کہ نئے کپڑے استعمال کرے اور خوشبو و سرمہ بھی لگائے۔

(۶) مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد آستانہ اقدس کی حاضری میں حتی الامکان دیر نہ کرے، اور اپنے دل میں ایسا سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ دل رونے کی طرف

مائل ہو جائے۔

(۷) جب مسجد نبوی کے دروازے پر حاضری ہو تو صلوٰۃ وسلام عرض کر کے تھوڑی دیر ٹھہر جائے جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاضری کی اجازت مانگ رہا ہو، پھر "بسم اللہ" کہہ کر دایاں پاؤں پہلے رکھ کر داخل ہو۔

(۸) نہایت مودبانہ انداز میں مسجد نبوی میں رہے، آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، دل سب کو غیر کے خیال سے پاک کر لے، مسجد نبوی کے نقش ونگار میں اپنے کو منہمک نہ کرے۔

(۹) مسجد نبوی میں بلند آواز سے ہرگز ہرگز کوئی بات نہ کرے۔

(۱۰) اگر کسی سے سلام وکلام ضروری ہو تو حتیٰ الامکان اس سے احتراز کی کوشش کرے، ورنہ ضرورت سے بات چیت میں مصروف رہے، پھر بھی دل سرکار ہی کی طرف مائل رہے۔

(۱۱) اور یقین رکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جسمانی حیات سے واقعۃً ایسے ہی زندہ ہیں جیسے وفات سے پہلے رہے۔

(۱۲) کمال ادب میں ڈوبے ہوئے، گردن جھکائے، نگاہ نیچی کیے، لرزتے کانپتے گناہوں کی ندامت سے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عفو وکرم کی امید رکھتے ہوئے مشرق کی طرف سے "مواجۂ عالیہ" میں حاضر ہو، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مزار پر انوار میں رو بہ قبلہ جلوہ فرما ہیں، اس سمت سے اس لئے حاضر ہو کہ حضور کی نگاہ بے کس پناہ اس کی طرف ہوگی۔

(۱۳) کمال ادب و ہیبت، خوف ورجا کے ساتھ حجرۂ مطہرہ سے کم از کم چار ہاتھ کے فاصلہ سے قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔

(۱۴) خبردار خبردار جالی شریف کو بوسہ دینے یا ہاتھ لگانے سے مکمل طور سے احتراز کرے کیوں کہ یہ خلاف ادب ہے، چار ہاتھ فاصلہ سے زیادہ قریب نہ جائے اسی کو بہت غنیمت جانیں کہ "مواجہۂ اقدس" میں جگہ مل گئی۔

(۱۵) نہایت ادب و وقار کے ساتھ آواز حزیں اور معتدل آواز میں نہ بہت بلند اور نہ بہت پست عرض کرے:

"السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته ،السلام عليك يا رسول الله ،السلام عليك يا خير خلق الله، السلام عليك يا شفيع المذنبين، السلام عليك وعلى آلك واصحابك وامتك اجمعين"

(۱۶) صلوٰۃ وسلام کی کثرت سے غافل نہ رہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے لیے اپنے والدین اپنے پیر واستاد، خویش واقارب یا دوست واحباب اور تمام مسلمانوں کے لئے شفاعت کی درخواست بار بار عرض کرے:

"**اسالك الشفاعة يا رسول الله**" جتنی بار ممکن ہو کہتا رہے۔

مدینہ منورہ کی حاضری کے آداب اور طور طریقہ کے بتانے میں کافی وقت صرف ہوا، کیوں کہ میں کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا، اور کوشش یہ کرتا تھا کہ ہمارے مخاطبین اپنے ذہنوں میں کچھ نہ کچھ ضرور محفوظ کرلیں، اسی اثنا میں موذن نے نماز عصر کی اذان پڑھی، میرے اپنے تجربہ کے مطابق مسجد حرام میں جس وقت اذان پڑھی جاتی ہے، اور عصر کی نماز ادا کی جاتی ہے، حنفی مسلک کی رو سے عصر کا وقت نہیں ہوتا ہے، بلکہ ظہر کا وقت برقرار رہتا ہے، یعنی اذان ونماز دونوں وقت سے پہلے ہوتی ہیں، اس لیے قصداً ہم لوگ عصر کی اذان پر مسجد حرام میں نہیں جاتے تھے، بلکہ جب چالیس پینتالیس منٹ گزر جاتا تو وہاں جاکر اپنی جماعت سے نماز پڑھتے تھے۔

بعض لوگوں کو یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اپنی جماعت الگ کرنے میں سعودی حکومت کی طرف سے کوئی عتاب نہ نازل ہوجائے، اس کے اہلکار کوئی نازیبا سلوک نہ کرنے لگیں، لیکن میری سمجھ سے یہ بات بھی بالاتر تھی کہ ہم لوگ حنفی ہیں ہماری نمازوں کے اوقات میں بڑا فرق ہے، پھر نجدیوں کے عقائد ہم سے مختلف، اس لیے اگر ہم لوگ اپنی نماز الگ ادا کریں تو اس سے ان کے قانون وامن میں کیا خلل واقع ہوگا، اور سعودی قانون کی خلاف ورزی کیسے

ہوگی، کوئی ایسی حرکت جو وہاں کے انتظام میں خلل انداز نہ ہو اس پر محاسبہ عقل میں آنے والی بات نہیں، یہاں تو سب کو اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق عبادتوں کے ادا کرنے میں مکمل آزادی ہونی چاہئے، کیوں کہ دنیا کے کونے کونے سے مسلمان حج وزیارت کے لیے آتے ہیں، جن کے عقائد واعمال میں بین فرق ہوتا ہے، کسی ایک عمل یا عقیدہ پر تمام حجاج کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، میری یہ بات بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتی تھی، کیوں کہ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہاں شخصی حکومت قائم ہے جو اپنے آمرانہ نظام کے لیے اسلام کا سہارا ڈھونڈھتی ہے، اس لیے حکومت کے کارپردازوں کی طرف سے متشددانہ ذہن کی بنا پر کسی عقلی ونقلی دلیل کے بغیر کبھی بھی تشدد کا ظہور ہوسکتا ہے، کیوں کہ ماضی میں ایسا ہوتا آیا ہے، اس دغدغہ کے باوجود کچھ حضرات اپنے مسلک وعقیدہ کے پابندی میں میرے ہمنوا ہوکر تاخیر سے عصر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد حرام گئے۔

ایک عاجز وناکارہ بندہ کے لئے جتنا خشوع وخضوع ممکن تھا اس نے اس کو ملحوظ رکھ کر نماز عصر ادا کی، اور آج کی دعا کا مرکز ومحور یہی تھا کہ اے رب کائنات، اے رب کعبہ! مالک ومولیٰ! صحت وسلامتی کے ساتھ حضور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی توفیق مرحمت فرما، تو اس ناتواں اور کمزور دل پر اپنے الطاف وعنایت کی بارش نازل فرما، یہ امیدوار کرم وبخشش ہے، اس کی خطاؤں گناہوں کو بخش کر اس کو اس لائق بنادے کہ تیرے محبوب کے روضۂ پاک کی زیارت کرسکے۔

اس دعا ودرود کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ کی طرف واپس آئے، ابھی تک بس نہیں آئی، جو زائرین کو مدینہ منورہ لے جانے والی تھی، شدت انتظار میں بڑی بے چینی ہو رہی تھی، گھنٹہ آدھا گھنٹہ وقت گزرا ہوگا کہ ''بس'' آکر لگ گئی، اور حجاج کرام بڑی عجلت میں اس پر سوار ہونے کے لیے دوڑ پڑے، اتنی جلدی مچائی گئی کہ بعض لوگ عورتوں سے بھی آگے سوار ہونے کے لیے تیز دوڑ رہے تھے، ان کی یہی کوشش رہی کہ ہم پہلے سوار ہوجائیں، خواہ اس سوار ہونے میں مستورات کو دھکا ہی کیوں نہ لگ جائے، حالانکہ تمام حجاج کرام پر یہ بات

واضح تھی کہ یہاں کی بسیں ہندوستان کی طرح نہیں ہوتیں، اور نہ ان میں یہ ہوتا کہ جتنی سیٹیں ہوں اس سے دوگنا یا تین گنا آدمیوں کو سامان کی طرح ٹھوس دیا جائے، بلکہ جتنی سیٹیں ہوں گی اتنے ہی لوگوں کو یہ بس مدینہ منورہ لے جائے گی، اور سیٹیں بھی نہایت آرام دہ وعمدہ ہوتی ہیں، بسوں کے اندر آگے پیچھے بیٹھنے میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا، اب یہ بات قصۂ پارینہ ہوگئی ہے، کہ پیچھے کی سیٹوں پر بیٹھنے والوں کا سر پہلے بس کی چھت سے ٹکراتا تھا، اب اس کا کوئی سوال ہی نہیں، معمولی سا جھٹکا پیچھے کی سیٹ والوں کو ضرور پہنچتا ہے، لیکن اس سے کوئی زیادہ اذیت اور تکلیف نہیں ہوتی، اگر کوئی شخص حج وزیارت کے لئے جائے اور معمولی سے ایثار سے کام نہ لے تو گویا وہ حج وزیارت کے ادنیٰ درس سے بھی ناواقف رہا، حاجیوں اور زائروں پر لازم ہے کہ اپنی بے صبری اور بے قراری سے دوسروں کی اذیت کا باعث نہ بنیں، یہ بات خاص طور سے ہندوستانی حاجیوں میں پائی جاتی ہے کہ خواہ مخواہ کے لیے اپنی عاجلانہ خصلت سے دوسروں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔

راقم الحروف ذرۂ ناچیز بھی عجلت پسند ہے، لیکن اپنی اس بری خصلت کے برخلاف قدرے وقار وسکون سے بس پر سوار ہوا، الحمدللہ اس کی وجہ سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچی، ورنہ میں نے دیکھا کہ ایذارسانی سے آگے بڑھ کر آپس میں تو تو میں میں کی نوبت آگئی، خیر کسی طرح سوار ہو جانے کے بعد بس ''فندق جیاد'' کی طرف آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور حاجیوں میں سے ایک صاحب نے جو ممبئی کے محلہ ''مدنپورہ'' کے رہنے والے تھے، یہ دعا بلند آواز سے پڑھی:

''سبحان الذي سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون''

پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اس کو مسخر فرمایا حالانکہ ہم لوگ اسے اپنا تابع فرمان نہیں بنا سکتے، اور بلاشبہ ہم لوگ اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

یہ صاحب نا صرف بلند آواز سے یہ دعا پڑھ رہے تھے بلکہ دوسرے حاجیوں کو بھی اس کے پڑھنے کی تلقین کر رہے تھے، اور میں چونکہ نسبتاً پست آواز تھا، ان کی جیسی بلند آواز

کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا تھا، ان کی تلقین کے بغیر یہ دعا پڑھ رہا تھا، کیوں کہ مجھ کو اچھی طرح سے علم تھا کہ سواری پر سوار ہونے کے وقت یہ دعا پڑھنا چاہیئے۔

''فندق جیاد'' سے کچھ ہی آگے بڑھ کر ''بس'' رک گئی، معلوم ہوا کہ یہاں سے بھی کچھ حجاج کرام اس بس پر سوار ہوں گے، اسی وجہ سے اس بس میں ان کی سیٹیں خالی تھیں، یہاں سے جب حجاج کرام بس پر سوار ہو گئے اور وہ چلنے لگی تو گھومتی پھرتی مسجد حرام سے ہوتی ہوئی مکہ معظّمہ کے اندر ہی ایک ایسے مقام پر رکی، جہاں ضروری کاغذات کی جانچ پڑتال ہونا تھا، ڈرائیور صاحب کاغذ کو خود ہی آفس میں لے جا کر چیک کروائے، نصف گھنٹہ سے زیادہ وقت کے بعد اس وقت تشریف لائے جب سورج افق کے نیچے جانے کے لیے اپنا رنگ بدل رہا تھا، یعنی بالکل ڈوبنے کے قریب تھا، مجھ کو نماز مغرب کے بارے میں کوئی فکر نہیں تھی، اس لیے کہ خیال تھا کہ سورج ڈوبنے کے بعد کہیں نہ کہیں کسی ایک جگہ پر بس رکے گی، جہاں سب کو با وضو ہو کر نماز پڑھنے کا موقع مل جائے گا، بس اپنی برق رفتاری کے ساتھ چلتی رہی، ابھی چار پانچ کلومیٹر کی مسافت نہیں طے کر پائی تھی کہ سورج ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر افق کے نیچے چلا گیا، اور طوفان میل کی طرح یہ سبک خرام بس چلتی رہی، تاریکیوں کی چادر لق ودق صحرا و بیابان پر چھا رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ ڈرائیور صاحب صرف ڈرائیور ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمان بھی ہیں، اور ان مسلمانوں کو لے کر اپنی بس پر چل رہے ہیں، جو دین داری کا درس کامل حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں، اس لیے وہ ضرور مغرب کا وقت ختم ہونے سے پہلے کہیں نہ کہیں اپنی بس روک کر حجاج کرام کو نماز پڑھنے کا موقع مرحمت فرمائیں گے، بس فراٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی اور بہت سے حاجی بس روک دیجیئے، بس روک دیجیئے کی آوازیں بلند کرتے رہے، کچھ لوگوں نے اسی مفہوم کو عربی زبان میں ادا کیا غالباً ڈرائیور صاحب سب کی اس ہنگامہ آرائی سنتے رہے، اور یہ بھی سمجھتے رہے کہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے واسطے ''بس'' روکنا چاہتے ہیں، لیکن ڈرائیور صاحب اپنی بدویانہ لاپرواہی کے ساتھ ''بس'' چلاتے رہے، پھر ایک ایسے لق ودق صحرا میں جا کر بس روک دی، جہاں کوئی عمارت تھی

، نہ کوئی بس اسٹینڈ، نہ پانی ملنے کا امکان تھا، مغرب کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا، جب تک ہم لوگ مکہ معظّمہ میں تھے نہیں سوچ سکتے تھے کہ یہ وہی عرب ہے جہاں ایک قطرہ آب کے لیے لوگ ترس جاتے تھے، جہاں پانی کا نام ونشان دور دور تک نہیں ملتا تھا، چونکہ وہاں پانی کی فراوانی تھی اور سپلائی کا بہترین انتظام تھا، دن رات کے چوبیس گھنٹے میں کبھی بھی پانی کی قلت کا احساس نہ ہوا، لیکن رات کی اس تاریکی میں یہ ضرور احساس ہوا کہ یہ وہی عرب کی سرزمین ہے جہاں پانی کی قلت کے باعث قافلہ والے پانی کے لیے ترس جایا کرتے تھے۔

آج کی رات میں" فان لم تجدوا ماءا فتیمموا صعیدا طیبا' ' (النساء:43)۔ پر خود عرب کی سرزمین میں عمل کیا، یعنی تیمم کر کے مغرب کی نماز ادا کی، یہاں میں نے دیکھا کہ وہ ممبئی والے حاجی صاحب خود امامت کے لیے بڑے مشتاق ہیں، ان کے متعلق یہ بات دل میں کھٹکنے لگی کہ آخر ان کو شوق امامت کیوں ہوا؟ میں نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا، اور زندگی کے کسی لمحہ میں مجھ کو امامت کا شوق نہ رہا کہ یہاں بھی اس کا اظہار ہوتا۔

تیمم کر کے نماز پڑھنے میں کوئی نقص یا خرابی نہیں پیدا ہوتی، کیوں کہ شریعت نے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کو وضو یا غسل کا قائم مقام بنا کر ہر قسم کی طہارت کے لئے اس کو کافی قرار دیا ہے، اس لیے ہم کو اس بات کا قلق نہ ہوا کہ عرب کی مقدس سرزمین میں باوضو ہو کر نماز نہیں پڑھی گئی، کیوں کہ شریعت ہر مرحلہ میں ہماری دستگیری ورہنمائی اس انداز سے کرتی ہے کہ ہم کو یسر وسہولت حاصل ہو جائے، ہاں افسوس اس پر ہو رہا ہے کہ حجاز مقدس کا وہ علاقہ جہاں اقامت صلاۃ کی دلکش صدا بلند ہوئی تھی، آج اسی سرزمین پر ہم نماز کی ادا میں کوتاہی کے مرتکب ہو گئے۔

نماز مغرب پڑھ لینے کے بعد یہاں سے بس روانہ ہو گئی، ہندوستانی بسوں کے اعتبار سے اس کی رفتار کچھ تیز ہی رہی، بسیں بہت زیادہ رفتار کے ساتھ نہیں چلتی ہیں، البتہ کاریں، ٹیکسیاں، جیپیں ان سب کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، کیوں کہ میں نے بہت سی کاروں کو دیکھا کہ ہماری گاڑی کو اپنی سرعت رفتاری سے پیچھے چھوڑ کر چند منٹوں کے اندر نگاہوں

سے اوجھل ہو جاتی تھیں، رات کی تاریکی میں ہماری بس چلتی رہی اور میں متجسس نگاہوں سے کبھی اپنے دائیں طرف کی کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور یہ بھی سوچتا تھا کہ کیا یہ وہی راستہ ہے جس سے مکہ والوں کے ظلم وتشدد سے تنگ آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت فرمایا تھا؟ کیا وہی صحرائے لق ودق اور پہاڑوں کے سلسلے ہیں، جن سے نبی امی **فداہ ابی وامی** اپنے یار غار کے ہمراہ آج سے چودہ سو برس پیشتر گزرے تھے، کن منازل ومراحل پر سرکار نے قیام فرمایا تھا، اور اپنی عبودیت کی مبارک پیشانی کن کن جگہوں پر رب قدیر کی بارگاہ میں زمین پر رکھی تھی؟ رات کی تاریکی میں کون تھا کہ کچھ مقامات کی نشاندہی کرتا، بلکہ اگر دن کا اجالا بھی ہوتا تو میرے اپنے خیال میں بس گزرتی چلی جاتی اور کوئی شخص نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گزرگاہوں کی تفصیل بتانے کے لائق نہ ہوتا، کیوں کہ ان تاریخی مقامات اور ان راستوں کی تفصیل وہی بتا سکتا تھا، جو علم تاریخ، اور علم جغرافیہ پر حاوی ہو، پھر اسی حیثیت سے یہاں کی سیر وسیاحت بھی کر رہا ہو۔

میں سامنے کی طرف دیکھتا تھا کہ بورڈوں کی تحریر سے کسی جگہ کا علم حاصل ہو جائے لیکن سوائے اس کے کہ جدہ اتنے کلومیٹر پر ہے کچھ پتہ نہ چل سکا، ادھر ادھر کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعض پہاڑی علاقے بقعۂ نور بنے ہوئے ہیں، اور یہ کون سی جگہ ہے؟ یا کون سی آبادی ہے؟ یا یہاں کون سا شہر ہے؟ پتہ نہ چلتا تھا، اور جب میں کسی سے پوچھتا تو نہ صرف اپنی لاعلمی ظاہر کرتا بلکہ اس کے سر پر میرا سوال ہی گراں گزرتا تھا، غالباً اس کے نزدیک یہ سوال ہی بے معنی اور عبث تھا، غرض ''بس'' چلتی رہی اور میں اپنے خیالات وتصورات کی وادیوں میں سرگشتہ رہا، اور میری تشنگی علم بجھانے کے لیے کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی تھی، میں سوچتا تھا کہ اس دن کے اجالے میں یہ سفر ہوا ہوتا تو کتنے ایسے پہاڑوں اور ٹیلوں کے حسین مناظر فطرت نگاہوں کے سامنے ہوتے جو قدرت الٰہی کی صناعی کی شہادت دیتے ہیں، اور کتنی ایسی وادیوں بیابانوں کے پرکیف مناظر سے لطف اندوز ہوا ہوتا، جو قدرت الٰہی کی گلکاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

زندگی کا یہ پہلا سفر تھا، اور وہ بھی سفر دیار حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف تھا، اس لیے میرے اوپر نیند کا غلبہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ غنودگی بھی طاری نہیں ہوتی تھی، لاحاصل تصورات وخیالات سے اپنے کو آزاد کرنے کے لیے درود شریف خوب پڑھتا تھا، کیوں کہ اس مبارک سفر میں ذکر حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کون سی چیز میرے لیے تسکین وسہارا بن سکتی تھی؟

یہ سفر رات میں تقریباً دس بجے تک جاری رہا، ایک وادی میں جہاں بس اسٹینڈ اور کئی ہوٹل تھے ہماری بس رک گئی، ہوٹلوں کے ملازمین ہم لوگوں کو اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف رغبت دلانے کے لیے دوڑ پڑے، وہ سب اردو میں گفتگو کر رہے تھے، پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ سب پاکستانی ہیں، اور یہاں بیشتر ہوٹل پاکستانیوں کے ہیں، اور ان پر ہندوستانی طرز کے کھانے ملتے ہیں، ہم لوگ بس سے اتر کر کھانے سے پہلے عشا کی نماز ادا کرنا چاہتے تھے، ایک ہوٹل کے بائیں جانب گزر کر آگے بڑھنے پر استنجا خانہ وغیرہ بنائے گئے تھے، وہیں پانی کا معقول انتظام تھا، تھوڑے سے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی، حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر وضو کر کے نماز قصر ادا کی گئی، گزشتہ اوراق میں ممبئی کے ایک صاحب کا میں نے تذکرہ کیا ہے، جو بظاہر دیندار معلوم ہوتے تھے، انھوں نے یہاں بھی شوق امامت میں بڑی عجلت سے کام لیا، اس لئے میں اب ان کے متعلق چوکنا ہو گیا تھا، اور اب ان کے بارے میں اچھے خیالات کے تانے بانے بکھیرنے شروع ہو گئے، کیوں کہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ بہت غالی قسم کے دیوبندی مکتب فکر کے نمائندہ تھے، اسی وجہ سے وہ امامت کے شوق میں آگے بڑھ جاتے تھے، چونکہ مجھ کو ان کے بارے میں احساس ہو گیا کہ یہ غلط عقیدے کے آدمی ہیں، اس لیے میں نے ان سے تعارض نہ کیا، لیکن ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں احتیاط کا پہلو مد نظر رکھتا تھا، اپنے چند ساتھیوں کو لے کر خود ہی ان کی امامت کی، نماز پڑھنے کے بعد میری دعا یہ تھی: ''کہ اے خدائے قدوس! پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سعادتوں اور برکتوں سے مجھے بہرہ ور کر اور میری تمام محرومیوں اور نامرادیوں کا مداوا فرما، یہاں کی دعا میں بھی تضرع وزاری جیسا عجز ونیاز، جیسا روحانی کیف واخلاص میں اپنے اندر

محسوس کر رہا تھا، ان کو کن الفاظ میں بیان کروں سمجھ میں نہیں آتا، بہت سارے اندرونی کیفیات و حالات ایسے ہوتے ہیں جن کے بیان کے لئے زبان و ادب کا دامن تنگ ہوتا ہے، صرف ان کی معمولی سی جھلکی دکھائی جا سکتی ہے۔

میں اپنے اندرونی احساسات کو بیان کرنے سے سخت قاصر ہوں، ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جیسا روحانی کیف وسرور اس سفر کی دعاؤں میں مل رہا تھا مجھ کو کبھی نصیب نہ ہوا۔

بہر حال دعا و مناجات کے بعد ہوٹل کی طرف آیا تا کہ جو کچھ کھانا موجود ہے اسے کھا لیا جائے، چونکہ ہمارے قافلے کے ساتھ مکہ معظّمہ سے کھانا آیا تھا، اس لیے ہوٹل سے کھانے کی ضرورت نہیں ہوئی، باہر ایک ریگزار پر بیٹھ کر ہمارے قافلے کے تمام ساتھی کھانے میں مصروف ہو گئے، کھانا کوئی بہت لذیذ پک کر نہیں آیا تھا، صرف روٹی اور آلو ٹماٹر کی سبزی تھی، ایک تو بھوک لگی تھی دوسرے یہاں کے معمولی کھانوں میں لذت کا احساس زیادہ ہوتا تھا، اس لئے ہم سبھوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا، اور چائے ہوٹل سے پی گئی، اس ہوٹل کے سامنے بہت اونچی اونچی چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں، پہلے سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں بس کافی دیر تک رکے گی، اس لئے ان چار پائیوں پر دراز ہو گئے، بہت سے لوگوں نے تھوڑی دیر تک سو بھی لیا، اور میں خیالات کی دنیا میں سیر کرتا ہوا جاگتا رہا، پھر اٹھ کر ہوٹل والے سے پوچھا کہ یہ کون سی وادی ہے، تو اس نے بتایا کہ یہ ''وادی قدیر'' ہے اس کا تذکرہ بخاری شریف کی حدیثوں میں کئی مقام پر آیا ہے، اپنے سوءِ حفظ کی وجہ سے میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ اس کا تذکرہ کس سیاق وسباق میں آیا ہے، اور نہ ہی میں یہ بتا سکتا ہوں کہ مکہ معظّمہ سے یہ وادی کتنے فاصلے پر ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی تاریخ میں اس کو ایک حیثیت حاصل ہے۔

ابھی میں ''وادی قدیر'' کے متعلق اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک آواز بلند ہوئی کہ اب بس روانہ ہونے والی ہے، رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے، ہم لوگ بس پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بس

کے جتنے مسافر ہیں سب پر نیند کا غلبہ ہے، میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ انسان کے کچھ ایسے لوازم ہیں کہ چاہے کتنی مبارک گھڑی ہو، خواہ کتنی باسعادت ساعت ہو، خواہ بابرکت سفر ہو ہر حالت میں وہ لوازم وخواص پیچھا نہیں چھوڑتے ،لوگ پوری زندگی سوکر آئے تھے، یہ رات ایسی رات نہیں تھی کہ اس کو سوکر گزاری جاتی ، بلکہ تسبیح وتہلیل ،اوراد وظائف اور درود شریف پڑھ کر گزارنا چاہیے تھا، نیز تصور حبیب ﷺ میں غرق ہونا چاہیے تھا، کتنی خوشیوں اور مسرتوں کی راتیں ہوتی ہیں، ان میں ہم کو نیند نہیں آتی ،اور رات بھر جاگ کر اپنی زندہ دلی یا خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر خوشی کی رات کون سی ہوسکتی تھی ،جس سے گزر کر وصال حبیب ﷺ تو حاصل نہ ہوتا ، ہاں دیار حبیب ﷺ کا وصال ضرور حاصل ہوجاتا ، پھر نیند کے آنے کا کیا سوال ؟ اسی لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ خوشیوں کے دوسرے مواقع پر کوئی روحانی برکت وسعادت حاصل نہیں ہوتی ، بلکہ عام طور پر شرعی حدود سے یک گونہ تجاوز ہوتا ہے، یہ مسرت وشادمانی کا مقام ،خیر وبرکت کی جگہ تھی، تو یہاں شیطان لوریاں دے دے کر سلا رہا تھا، اور وہاں شیطان جاگنے کے لیے اپنے کرتب دکھاتا ہے، میں اپنے بارے میں تو یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھ کو ذرہ برابر غنودگی نہیں آئی ، بلکہ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے رفقائے سفر سے نسبتاً زیادہ جاگتا ہوا سفر کر رہا تھا، اور میں یہ بھی کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ میرے اور ان کے خیالات اور احساسات میں بڑا فرق تھا، میں واقعات وحالات سے کوئی نہ کوئی درس حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، میں آن واحد میں تصورات کی دنیا میں بہت دور تک سیر کر جاتا تھا، اور اس سے متاثر بھی ہوتا تھا، اگر کوئی شخص میرے چہرے بشرے کو دیکھتا تو میرے تاثرات کو محسوس کرسکتا تھا، اس لئے میرے رفقائے سفر اور میری نیند میں واضح فرق تھا، وہ گہری نیند سے سوجاتے تھے، اور میری حالت یہ تھی کہ اگر پلک جھپک گئی تو پھر بیدار ہوجاتا تھا، اور سوچنے لگتا تھا کہ بس کی رفتار کے ساتھ میرا نصیبہ بھی عروج پر ہے، میری قسمت کا ستارہ بلندی پر ہے، اس مبارک سفر میں کم ازکم غفلت کی نیند مجھ کو نہیں آئی ، پوری زندگی غفلتوں اور کوتاہیوں میں گزرتی تھی ، آج یہ رات بھی

ایسی ہی غفلت میں گزرتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میری محرومی وشومی قسمت میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔

یہ خدائے تعالیٰ کا فضل واحسان ہی رہا کہ ''وادی قدیر'' سے روانگی کے بعد بس تیز رفتار کے ساتھ چلتی رہی اور میرا طائرِ فکر دیارِ حبیب ﷺ میں حاضری کے لئے بہت بلند پرواز اور برق رفتار ہو گیا تھا، میں کبھی مدینہ منورہ کی زیارت گاہوں کے خیالات میں منہمک ہو جاتا تھا، اور کبھی ذہن میں یہ آتا تھا کہ کعبہ کے کعبے کی زیارت ہو جانے کے بعد کاش میرے نصیبے کو یہ عروج حاصل ہوتا کہ ''بدر'' و ''حنین'' کے مقامات کی زیارت ہو جاتی، حالاں کہ اس کی امید کم ہی تھی، لیکن ''احد'' کی پہاڑیاں ''مسجد قبلتین''، ''مسجد قبا'' کی زیارت کا شرف حاصل ہونے کی امید ضرور تھی، طرح طرح کے خیالات ذہن کے پردوں پر آتے تھے، اور میں انھیں میں مستغرق رہتا، لیکن یہ استغراق ایسا نہیں تھا کہ دنیا و مافیہا کی چیزوں سے بالکل بے خبر تھا، بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک طرف اپنے سینے میں دیارِ حبیب ﷺ کی زیارت گاہوں کو لئے ہوئے تھا، دوسری جانب اپنی زبان سے درود شریف کا ورد بھی کرتا تھا، یعنی زبان ودل پوری طرح اس بس کے سفر میں ہم آہنگ تھے، ایسا نہیں تھا کہ دل کہیں رہا ہو اور زبان سے یادِ حبیب ہو رہی ہو، دائیں بائیں اور سامنے کی طرف دیکھتا جاتا تھا، بس ایک آدھ جگہ تھوڑی دیر کے لئے رکی، پھر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئی، جیسے جیسے شہرِ حبیب ﷺ قریب ہوتا جاتا تھا، دل کی دھڑکن بھی تیز تر ہوتی جاتی تھی، لیکن یہ دل کی دھڑکن کسی خوف و ہراس یا کسی بیماری کی وجہ سے تیز نہیں ہو رہی تھی، بلکہ حضور اکرم نورِ مجسم ﷺ کے آستانۂ قدس کی حاضری کے لیے انتہائی بے تابی کے باعث کچھ عجیب وغریب حالت پیدا ہو گئی تھی، اس کے سبب سے تیز ہو رہی تھی، عام طور پر دل کی رفتار اگر بڑھ جائے خواہ وہ کسی وجہ سے ہو اس کو بیماری کی علامت قرار دی جاتی ہے، لیکن یہ سرعتِ رفتار میرے نزدیک صحتِ روحانی اور خوش اعتقادی کی دلیلِ بین ہے، اس لیے میں اس پر نازاں تھا کہ خدائے تعالیٰ نے ایسی نعمت سے سرفراز فرمایا۔

بس چلتی چلتی صبح صادق سے کچھ پیشتر مدینہ منورہ کے قریب ''باب عنبریہ'' پہنچ گئی، یہ وہی مقام ہے جہاں لوگوں کے بیان کے مطابق حجاز ریلوے کا اسٹیشن تھا، مدینہ منورہ میں داخلہ کے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کو میں نے یاد کرلیا تھا، اور احتیاطا اس کو بار بار دہرایا بھی کرتا تھا، جب میں یہاں پہنچا تو یہ دعا پڑھی:

''بسم الله ما شاء الله لا قوة الا بالله ربي ادخلني مدخل صدق واخرجني مخرج صدق اللهم افتح لي ابواب رحمتك وارزقني من زيارة رسولك ﷺ ما رزقت اوليائك واهل طاعتك وانقذني من النار واغفر لي وارحمني ياخير المسؤل''۔

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، ماشاء اللہ، اللہ ہی کی مدد سے قوت ہے، اے میرے پروردگار! سچائی کے ساتھ مجھ کو داخل فرما، اور سچائی کے ساتھ مجھ کو باہر نکال، الٰہی! تو اپنی رحمت کے دروازے میرے اوپر کھول دے، اور اپنے رسول ﷺ کی زیارت مجھے نصیب فرما، جو اپنے محبوب اور فرمانبردار بندوں کے لیے نصیب فرما، اور مجھے جہنم سے نجات دے، مجھے بخش دے، اور میرے اوپر رحم فرما، اے بہترین داتا۔

مجھ کو اور میرے رفقاے سفر کو بڑی خوشی تھی کہ آج فجر کی نماز مسجد نبوی ﷺ میں ادا کرنے کا شرف حاصل ہوگا، لیکن بس اتنی دیر رکی رہی کہ صبح صادق کا اجالا ہو گیا اور یہیں ہم لوگ بس سے اتر کر قریب ہی کی ایک مسجد میں نماز فجر ادا کی، مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا موقع میسر نہ آیا، لیکن مدینۃ الرسول یا اس کے جوار میں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، پھر کافی دیر تک یہیں رکے رہے، صبح صادق کا اجالا ہی نہیں ہوا تھا، بلکہ آفتاب عالم تاب نے اپنی تیز شعاؤں کو شہر حبیب پر ڈالنا شروع کر دیا تھا، اس شعلۂ جوالہ کو کیا معلوم تھا کہ اس کی ساری تابانیاں وجلوہ افروزیاں آفتاب اسلام کی ضیا باری ونورانیوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، عرفی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اگر زورے ضمیر نقاب بر خیزد
بہ رنگ سایہ شود آفتاب لقمۂ نور

سورج کافی بلند ہو گیا تو بس روانہ ہوئی، شہر مدینہ کے کن کن سڑکوں اور محلوں سے گزری، کہاں کہاں چکر لگاتی رہی، مجھ جیسے مسافر کو کیا معلوم؟ مسجد نبوی کے تھوڑے سے فاصلہ پر''جنت البقیع'' سے پورب ایک گنجان آبادی میں ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے تقریباً دو بجے دن میں بس پہنچ گئی، سامانوں کو بس سے اتارا گیا، اور پر شکوہ عمارت'' قصرالدعیس'' کے صدر دروازہ پر ہم سب اپنا سامان لے کر پہنچ گئے، اس بلڈنگ پر بطور علامت ہندوستان کا''ترنگا جھنڈا''لہرارہا تھا۔

مکہ معظّمہ میں جب ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ حجاج کرام کے کمرے نمبر ڈال کر پہلے سے متعین کر دیئے گئے تھے، اوران کمروں میں فرش، ڈبل بستر، تکیہ، چادر وغیرہ کا معقول طریقہ پر انتظام کر دیا گیا تھا، لیکن مدینہ منورہ میں جس بلڈنگ میں ہم لوگوں کے قیام کا انتظام تھا، وہ اگرچہ بہت عظیم الشان عمارت تھی، اس کے تمام کمروں میں فون کا انتظام کیا گیا تھا، انگریزی طرز کے بیت الخلا بنے ہوئے تھے، ہر چند کمروں کے وسط میں ایک ہال کمرہ بھی تھا، تاہم حجاج کرام کی سہولت کے اعتبار سے یہاں کے انتظام و انصرام میں بہت کچھ خامیاں نظر آئیں، پہلی خامی تو یہ تھی کہ حجاج کرام کے کمرے نمبر ڈال کر متعین نہیں کیے گئے تھے، اس لئے تمام زائرین حرم اپنی اپنی سہولت کے پیش نظر بڑی بے تابی کے ساتھ کمرے میں گھسنے لگے، دوسری خامی یہ تھی کہ جب ہم لوگ پہنچے تھے، اس وقت تک فرش اور بستر وغیرہ کا انتظام اس انداز میں نہیں تھا کہ سب سلیقہ سے بچھا دیے گئے ہوں، بلکہ فرشوں، بستروں، تکیوں کا ایک ڈھیر ایک جگہ تھا، لوگ اپنی اپنی طرف سے لاکر اپنے پسند کے کمروں میں بچھاتے تھے، تیسری خامی یہ تھی کہ یہ عام طور سے ہندوستان کے حجاج کرام انگلش طرز کے بیت الخلا کے عادی نہیں ہوتے، اس لیے ان کی رہائش ایک ایسی عمارت میں جس میں اس قسم کا بیت الخلا ہو نہ صرف یہ کہ موزوں و مناسب نہیں تھا، بلکہ باعث کلفت و اذیت تھا، اسی وجہ سے ہمارے قافلہ کے حجاج کرام کو بہت کوفت میں مبتلا ہونا پڑا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بیت الخلا میں کیسے رفع حاجت کیا جا

سکتا ہے، اور اگر کسی طرح سے ان کو یہ بات سمجھا دی گئی، تو ان کو یہ اندیشہ لگ گیا تھا کہ اس پر تو بیت الخلا میں ہماری طہارت برقرار نہ رہے گی، اور نجاست سے کپڑے و جسم کے آلودہ ہونے کا خطرہ لگا رہے گا، اس کے باعث جسم کے نچلے حصہ کو رفع حاجت کے بعد یا تو باقاعدہ طور سے دھونا پڑے گا یا پھر غسل ہی کرنا پڑے گا، اس قسم کی باتیں حاجیوں سے تو کم سننے میں آئیں، البتہ اپنے قافلہ والوں سے زیادہ سننے میں آئیں، چنانچہ ہمارے قافلہ کے امیر جناب حاجی عبداللطیف صاحب جو تیسری بار حج و زیارت کے لیے آئے تھے، اپنی حجن صاحبہ کے مشورہ پر جناب منیجر احمد رضا کے ہمراہ ایک نئی قیام گاہ کی تلاش میں نکل پڑے، حالاں کہ اس قیام گاہ کے جملہ مصارف ہم لوگوں کی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا کے نمائندوں نے پہلے ہی سے ادا کر دیا تھا، جس کی واپسی کے امکانات نہیں تھے، اس عمارت کے انتظام کار ایک نوجوان آدمی تھے، جو زائرین سے فصیح اردو میں گفتگو کرتے تھے، غالباً وہ ہندوستان کے رہنے والے تھے، اور مدینہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے، انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے دوسری قیام گاہ میں جانے کی اجازت دے دی۔

(نوٹ: افسوس اس سفرنامے کی تمام قسطیں نہیں مل سکیں، جو کچھ ملا حاضر کر دیا گیا۔ مرتب)

شیخ القرآن رحمۃ اللہ علیہ: ایک یادگار انٹرویو

سوال: آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

جواب: میرے خاندان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، خود میرے والد مکرم الحاج محمد ابراہیم خان صاحب ناخواندہ تھے، اس لئے میرے خاندان میں تاریخ کے اندراج کا کوئی رجسٹر نہیں تھا، بایں سبب سن، دن اور مہینہ کی قید کے ساتھ میں اپنی تاریخ پیدائش بیان نہیں کرسکتا، البتہ سرکاری کاغذات میں میری تاریخ پیدائش ۱۵/نومبر ۱۹۳۵ء لکھی ہوئی ہے، لیکن میرے والد مکرم مرحوم بتاتے تھے کہ ہمارے گاؤں کے بجانب شمال ومغرب جو باندھ بنا ہوا ہے، جس سے گاؤں اور اس کے رقبے کی نالوں کے کٹاؤ سے حفاظت ہوتی ہے، جس سال یہ باندھ بنایا گیا ہے، اسی سال تمہاری تاریخ پیدائش ہے، اگر ریاست بلرامپور کے کاغذات کی چھان بین کی جائے تو اس سے ہمارے سن اور تاریخ پیدائش کا تعین یقینی طور سے ہو جائے گا، لیکن یہ مشکل ترین کام ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تاریخ پیدائش کا اندراج جو سرکاری کاغذات میں ہے اسی پر اکتفا کیا جائے، اس کے آگے کی تحقیق نہ ہو۔

سوال: اپنے خاندانی حالات بیان کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

جواب: میرا خاندان جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے پشت ہا پشت سے زراعت پیشہ رہا ہے، اور ریاست بلرامپور کے زراعت پیشہ لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک وہ گروہ جو اسامی کہلاتا تھا، اور دوسرا وہ گروہ جو ٹھیکے دار کے نام سے موسوم تھا، یہ ریاست اپنے وسیع رقبے کی اپنی تمام آراضیوں کو ٹھیکے داروں کو دے دیتی تھی، بعض ٹھیکہ داروں کے بیسوں گاؤں ہوتے تھے، جو غریب اسامیوں سے کاشت کرواتے تھے، اور زرعی پیداوار کا وافر حصہ ان سے وصول لیتے تھے، یہ کاشتکار بیچارے ہمیشہ مفلوک الحال رہا کرتے تھے۔

میرے آبا واجداد میں تقریباً سو سال پیشتر کچھ لوگ ٹھیکے دار تھے، جن کے ماتحت کئی گاؤں تھے، لیکن حوادث روزگار کی بنا پر پہلے میرے پردادا جناب جان محمد خان صاحب مرحوم ٹھیکیداری سے جبراً بے دخل کر دیے گئے، اور اسامیوں کے زمرے میں داخل ہو گئے، چنانچہ میرے دادا جناب الحاج تعلقدار خان صاحب ایک غریب کاشتکار ہو گئے، تاہم ان کے پاس کافی آراضی تھی، لیکن ریاست بلرامپور کا یہ المیہ تھا کہ انتظام کاروں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے کوئی بڑا سے بڑا کاشتکار خوشحال نہیں رہ سکتا تھا، اسی وجہ سے حاجی تعلقدار خان صاحب مرحوم کوئی خوشحال زندگی نہیں گزارتے تھے، البتہ ریاست کی طرف سے وہ گاؤں کے ''مکھیا'' مقرر کیے گئے تھے، اور تاحیات اسی نام سے وہ موسوم رہے۔

میرے والد صاحب **رحمة الله عليه** نے جب ہوش سنبھالا تو افلاس کے ماحول میں اپنے کو پایا چنانچہ انہوں نے نوعمری سے کاشتکاری کا پیشہ شروع کر دیا، چونکہ وہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، اور حاجی تعلقدار خان صاحب کچھ بے نیاز قسم کے واقع ہوئے تھے، اس لئے گھر کی تمام ذمہ داریاں صرف والد صاحب کے سرآ گئی تھی، بڑی محنت و کاوش سے انہوں نے گھریلو حالات سدھارنے اور اقتصادی و معاشی خوشحالی کے پیدا کرنے میں قدرے کامیابی حاصل کی، اس طرح مجموعی طور پر حالت میں سدھار پیدا ہوا، آہستہ آہستہ ان کی کوششوں سے خاندان کے لوگ تنگدستی و افلاس کی زندگی سے باہر نکلنے میں کچھ کامیاب ہوئے۔

سوال: کیا آپ کے والد مکرم نے کاشت کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ بھی اختیار کیا؟

جواب: جی ہاں انہوں نے اپنے آپ کو صرف کھیتی باڑی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے علاوہ عرصہ دراز تک غلے کی تجارت کا کاروبار بھی کیا، غلے کے بڑے بڑے تاجروں سے ان کے بڑے گہرے اور خوش گوار روابط تھے ورنہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کی کاشتکاری سے کوئی کنبہ خوشحال نہیں ہو پاتا تھا۔

سوال: آپ نے اپنے والد صاحب کے لئے ''الحاج'' کا لفظ استعمال فرمایا، کیا آپ بتا سکتے

ہیں کہ انہوں نے کس سن میں حرمین طیبین کی حج وزیارت سے اپنے آپ کو مشرف کیا، اسی طرح اپنے دادا کو بھی آپ نے ''الحاج'' کہا، اپنے ان دونوں بزرگوں کے بارے میں بتایئے کہ انہوں نے کس سن میں حج کیا تھا؟

جواب: میرے دادا جناب حاجی تعلقدار خان صاحب اور دادی صاحبہ ۱۹۵۱ء میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے تھے، اور میرے والد صاحب مرحوم میرے عہد طالب علمی ۱۹۵۳ء میں اس سعادت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوئے تھے، اپنے والدین کے حج کے دوسال بعد یہ کہہ کرا کیلے چلے گئے تھے کہ تمہاری والدہ تمہارے ساتھ حج کرنے کے لیے جائیں گی، لیکن بدقسمتی سے وہ محروم رہ گئیں۔

سوال: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی آبادی کے لوگوں اور دوسرے حضرات سے آپ کے والد صاحب کے تعلقات کیسے تھے؟

جواب: میرے والد صاحب مرحوم بڑے صبر وضبط کے آدمی تھے، وہ تعلقات میں کشیدگی سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتے تھے، اس لیے اگر ان کے مفاد یا عزت ووقار کے خلاف کسی سے کوئی بات سرزد ہو جاتی تھی تو اس پر بھی وہ صبر وتحمل کا دامن نہیں ہاتھ سے جانے دیتے تھے، اس بنا پر گاؤں کے جملہ افراد خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان سب سے ان کے روابط بڑے خوشگوار تھے، اس زمانے میں ہمارے علاقے کے لوگ قابل احترام شخصیتوں کو ''مہتو'' کے لفظ سے یاد کرتے تھے، حج کے ادا کرنے سے پہلے ان کو بھی اس لقب سے یاد کیا جاتا تھا، علاقے کے اہل ثروت اور رئیسوں سے بھی ان کے روابط تھے، غریبوں اور مفلسوں سے بھی چونکہ انہوں نے غربت وافلاس کی زندگی دیکھی تھی، اس لیے عوام وخواص میں قابل احترام ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنے دل میں تفوق وبرتری کا خیال نہیں لاتے تھے، بلکہ غریبوں کے ساتھ ویسے ہی سلوک روا رکھتے تھے جیسا کہ کسی امیر کبیر یا رئیس آدمی کے ساتھ پیش آتے تھے۔

سوال: جب آپ کے والد صاحب مرحوم اور آپ کے دادا مرحوم دونوں ناخواندہ تھے، تو

آپ کی تعلیم وتربیت کا انتظام خصوصاً ابتدائی تعلیم کا انتظام کیسے ہوا، آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میرے دادا نے مفلسانہ زندگی گزاری اور والد صاحب مرحوم جو کہ بعد میں خوشحال ہوئے تھے، تاہم ان کا بھی ابتدائی دور افلاس میں گزرا تھا، ان وجوہ کے پیش نظر بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپ کی ابتدائی تعلیم کے سوا اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیسے ہوا؟

جواب: یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور واقعی بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسے خاندانی ماحول میں جہاں ذہن وفکر کی نشوونما کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میری تعلیم کیسے ہوئی؟ یہ قدرت الٰہی کی کرشمہ سازیاں ہیں، یا خدائے قدوس کی بخشش وانعام ہے کہ میری تعلیم کا انتظام بچپن ہی سے مناسب طور پر ہوا، ابتدائی تعلیم ناظرہ قرآن مجید اور دینیات کی کتابیں گھر پر پڑھیں، ایک بوڑھے مولوی صاحب جن کا نام میاں عبدالرحیم تھا ابتدا میں قرآن حکیم کا ناظرہ پڑھایا، اور اردو کی معمولی کتابیں یہ میاں صاحب یا مولوی صاحب ہمارے گاؤں کے بجانب مشرق ''بجوا'' (گاؤں) کے رہنے والے تھے، ان کے لڑکے کا نام محمد ابراہیم صدیقی تھا کافی پڑھے لکھے تھے، ان سے بھی کچھ تعلیم ہوئی، پھر اس کے بعد ایک میاں صاحب جن کا نام محمد اسماعیل تھا جو موضع ''بڑھڑی'' کے رہنے والے تھے اور پابند صوم وصلوٰۃ ہونے کے اعتبار سے نیک معلوم ہوتے تھے، میرے دادا مرحوم نے میری تعلیم کے لئے ان کو اپنے گھر پر رکھا، اردو کی بہت سی دینی کتابیں میں نے ان سے پڑھیں، لیکن وہ مسلک کے اعتبار سے کٹر دیوبندی مکتب فکر کے آدمی تھے، اس وجہ سے وہ بات بات پر شرک و بدعت کا فتویٰ دیتے تھے، ان کی اس حرکت سے ایک مرتبہ دادا مرحوم ان کے اوپر سخت ناراض ہوئے بلکہ جوش غضب میں گھر سے باہر نکال دیا، اس طرح گھریلو تعلیم موقوف ہوگئی، اس کے بعد قصبہ ''پچپڑوا'' کے پرائمری اسکول میں میرا داخلہ ہوا، درجہ سوم تک اسی سرکاری پرائمری اسکول میں میری تعلیم ہوئی۔

سوال: پرائمری تعلیم کے بعد دینی تعلیم یعنی عربی و فارسی کی تعلیم کب شروع ہوئی، اور کن حالات میں شروع ہوئی؟

جواب: غالباً ہندوستان کی آزادی سے ایک سال پیشتر ۱۹۴۶ء میں عربی و فارسی کی تعلیم کی ابتدا ہوئی اور اس کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے، وہ یہ کہ ہمارے گاؤں کے جو ٹھیکے دار تھے وہ ''بشنپور ٹنٹنوا'' کے رہنے والے تھے، ان کا ناگہانی انتقال ہوگیا، ان کی حجن صاحبہ موجود تھیں، یہ نہایت دیندار خاتون تھیں، انہوں نے ضلع بستی و گونڈہ کے جید عالم دین حضرت علامہ مولانا الحاج عتیق الرحمن صاحب علیہ الرحمہ کو اپنے دولت کدے پر مولود پاک کے لیے مدعو کیا، اس جلسے میں ہمارے دادا صاحب مرحوم، میرے بڑے والد حاجی اکرم حسین صاحب عرف چھیدی خان مرحوم بھی شریک ہوئے، اور مجھ کو، میرے چچیرے بھائی حضرت مولانا عبدالرحیم خان صاحب عزیزی کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے، اسی زمانے میں تلسی پور کے ایک رئیس کبیر جناب حاجی رجب علی صاحب نے شہر میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھ دی تھی، اور تھوڑی سی زمین حاصل کرکے اس پر معمولی تعمیر کے بعد ابتدائی فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا تھا، اس مدرسے کا نام انوار العلوم رکھا گیا، اس میں حضرت مولانا الحاج عتیق الرحمن صاحب مرحوم بحیثیت ایک مدرس مقرر ہوئے، چونکہ مدرسہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا، طلبہ کی تعداد محدود و مختصر تھی، اس لیے حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اس جلسے میں علم دین کی فضیلت اور اس کے فوائد وثمرات پر بڑی موثر و دل پذیر و عام فہم تقریر فرمائی، اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر کسی گھر میں کوئی عالم دین باعمل پیدا ہوجائے یا کوئی حافظ وقاری پابند شرع ہو جائے تو میدان محشر میں عالم وحافظ وقاری اپنے خاندان کے افراد کی شفاعت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول فرما کر تمام لوگوں کو جنت میں داخل فرمائے گا، یہ تقریر بڑی موثر اور سوز وگداز سے لبریز تھی، جس کا اثر یہ ہوا کہ میرے دادا مرحوم اور میرے عم محترم جناب چھیدی خان مرحوم نے جلسے کے بعد مجھ کو اور میرے برادر مکرم عبدالرحیم خان عزیزی کو حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی خدمت عالیہ میں پیش کیا، اور یہ کہا کہ ان دونوں بچوں کو آپ کے حوالے کرتا ہوں یہ ''پچپڑوا'' کے پرائمری اسکول میں پڑھتے ہیں اب ان دونوں کی تعلیم آپ کے یہاں ہوگی، آپ کی خدمت میں رہ کر یہ دینی تعلیم حاصل کریں گے، چنانچہ

اس کے دو تین روز بعد عم محترم حاجی چھیدی خان مرحوم ''تلسی پور'' کے مدرسہ میں داخلہ کے لیے اپنے ہمراہ لے گئے، چوں کہ طلبہ کی تعداد مختصر تھی اور حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے پہلے ہی منظوری دے دی تھی، اس لیے داخلے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا، اور یہیں سے عربی وفارسی کی تعلیم کا باضابطہ آغاز ہوا۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ ''تلسی پور'' کا مدرسہ جو ''انوارالعلوم'' کے نام سے موسوم تھا اسی سے آپ کی دینی تعلیم کی ابتدا باقاعدہ ہوئی، کیا آپ بتا سکتے ہیں اس مدرسے میں عربی وفارسی کی بنیادی تعلیم کا نظم کیسا تھا؟ اور آپ وہاں کے طریقۂ تعلیم سے کس درجہ مطمئن تھے، وہاں آپ کو اجنبی ماحول میں پہنچ کر کیا تعلیم سے دل چسپی پیدا ہو رہی تھی؟

جواب: میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ مدرسہ بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا اور حضرت مولانا عتیق الرحمن صاحب مرحوم اس ادارے میں اکیلے مدرس تھے، اس لئے منظم طور پر تعلیم نہیں جا ری ہو پا رہی تھی، اور نہ ہی الگ الگ جماعتیں یا درجے تھے، بلکہ ہر طالب علم الگ الگ فارسی کی پہلی، دوسری، آمد نامہ، تسہیل المصادر وغیرہ پڑھتا تھا، بہت کم ایسے بچے تھے جو ایک ساتھ پڑھتے رہے حتیٰ کہ ایک ماہ کے آگے پیچھے داخلہ لینے والے فارسی کی پہلی وغیرہ آگے پیچھے پڑھتے تھے، تاہم اتنی بات خوب اچھی طرح سے یاد ہے کہ حضرت مولانا عتیق الرحمٰن مرحوم بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ پڑھاتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کو فارسی پڑھانے کا ذوق ہی نہیں تھا بلکہ ان کو مکمل مہارت حاصل تھی، اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طالب علم کو ایک سال، ڈیڑھ سال فارسی پڑھا دیتے تھے تو اس کے اندر فارسی کا اچھا خاصہ ذوق پیدا کر دیتے تھے، وہ فارسی کے قواعد و گرامر کے اتنے ماہر تھے کہ ہر سبق میں مصادر کے مشتقات وافعال کو از بر کرا دینا اپنا فریضہ تصور کرتے تھے، لیکن جیسے جیسے یہ ادارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا حضرت مولانا عتیق الرحمن صاحب علیہ الرحمہ نہ صرف یہ کہ انتظامی امور میں مصروف ہو گئے بلکہ ضلع گونڈہ وبستی کے دیہاتوں اور قصبوں اور شہروں میں ان کا تقریری دورہ شروع ہو گیا، اتنی مقبولیت ان کو حاصل ہوئی کہ وہ بلا ناغہ سفر میں رہنے

لگے، اس طرح انہوں نے اپنی تعلیمی مہارت سے طلبہ کو محروم کر دیا۔

سوال: آپ کے بیان سے یہ واضح ہوا کہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم درس و تدریس کو چھوڑ کر ادارے کی تعمیر و ترقی اور دعوت و تبلیغ کے کاموں میں لگ گئے اس سے واضح ہوا کہ دوسرے اساتذہ کا تقرر ہوا ہوگا، تو آپ اپنے ان اساتذہ کا تعارف کرائیے جنہوں نے اپنی تعلیم و تربیت سے ''تلسی پور'' کے اس مدرسے میں آپ کو فیضیاب کیا؟

جواب: مولانا عتیق الرحمن صاحب مرحوم تعلیم کے لئے وقت دینے سے معذور ہو گئے تو ہندوستان کے مشہور اور معروف خطیب حضرت مولانا عبدالحفیظ مفتی آگرہ کے بھائی جناب مولانا محمد علی صاحب کا اس مدرسے میں تقرر ہوا، واقعی یہ بڑی محنت و خلوص سے کام کرنے کے عادی تھے، لیکن ان کا طریقۂ تفہیم اتنا اچھا نہیں تھا کہ بچوں میں تعلیم کی طرف رغبت پیدا ہو، پھر وہ خالص دقیق اردو زبان میں گفتگو کرتے تھے، اور ہم جیسے دیہاتی بچوں کے لئے بسا اوقات ان کی باتیں نا قابل فہم ہوتی تھیں، اس لئے میرے تعلیم کے اوقات بہت بے ذوقی و بے کیفی کے ساتھ گزر رہے تھے، اور پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں پیدا ہو پا رہی تھی۔

اس مدرسے میں جب طلبہ کی تعداد رفتہ رفتہ زیادہ ہوگئی اور ایک ہی مدرس کے بس کا کام نہیں رہا کہ اتنے سارے بچوں کو باضابطگی کے ساتھ تعلیم دے سکے، تو حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ نے ''دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم'' مبارک پور کے شیخ الحدیث و صدر المدرسین حضرت علامہ و مولانا عبدالعزیز صاحب استاذ العلما کی خدمت عالیہ میں یہ درخواست پیش کی کہ ہمارے مدرسے میں پڑھانے کے لئے ایک باصلاحیت ذی استعداد عالم دین کا انتخاب فرمائیں، چنانچہ استاذ العلما نے (جو بعد میں حافظ ملت کے نام سے مشہور ہوئے) ایک عالم دین حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی مبارکپور کا انتخاب فرمایا، اس ادارے میں دو مدرس کام کرنے لگے، تدریسی نظام میں کچھ سدھار پیدا ہوا، اور احقر کو بھی پڑھنے لکھنے میں قدرے دلچسپی پیدا ہوئی، لیکن علم کا ایسا ذوق نہیں پیدا ہوا جو مجھ کو بے قرار رکھے، یہ ضرور ہوا کہ پہلی جیسی بے کیفی و بے رغبتی نہ رہی بلکہ شعور و احساس میں کچھ بیداری پیدا ہوئی۔

سوال: آپ کے بیان سے واضح ہوا کہ آپ کو بنیادی تعلیم میں دلچسپی نہیں تھی، بلکہ کسی طرح اپنے اوقات گزار رہے تھے، پھر ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ بنیادی تعلیم میں کمزوری کے باوجود علم کے میدان میں آپ کامیابیوں سے کیسے ہمکنار رہے، اس لئے کہ تجربے سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ جس کے اندر بنیادی تعلیم میں ذوق نہ پیدا ہو، اس کو بالآخر ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے؟

جواب: میری ابتدائی تعلیم میرے اپنے خیال میں اوقات گزاری کے علاوہ کچھ نہیں تھی، اور عربی گرامر وقواعد میں مجھ کو عبور تو کیا معنیٰ معمولی مسائل وقواعد بھی ازبر نہیں تھے، ترکیب نحوی و تحلیل صرفی میں بالکل ناکام تھا، حتیٰ کہ ترکیب نحوی کی مشہور کتاب ''شرح مائۃ عامل'' رٹو طوطے کی طرح ضرور رٹ لیا تھا لیکن سمجھ کر ایسا نہیں پڑھا تھا کہ دوسری کتابوں میں اپنے مشق کو جاری کر پاتا، اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ ترک تعلیم کا میں نے مکمل ارادہ کرلیا، چنانچہ تلسی پور سے گھر آکر تقریباً دو مہینے تک اپنے والدین کریمین کی سرزنش وتہدید کے باوجود بیٹھا رہا، ادھر انوار العلوم تعمیر وترقی کی راہ پر لگا ہوا تھا، بلکہ طلبہ کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، اور اس ادارے کی شہرت دور دور تک پہنچ رہی تھی، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب **علیه الرحمه** تعمیرات سے تھوڑا سا دم لینے کے بعد اس مدرسے کی تعلیم وترقی کی طرف متوجہ ہوئے، پھر انہوں نے حضور حافظ ملت **نور اللّٰه مرقده** سے رابطہ قائم کیا، آپ نے مولانا مرحوم کی درخواست پر ایک دوسرے استاذ، جید عالم دین، فاضل نحریر، عالم نبیل حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب **مدظله العالی (علیه الرحمه)** کو اس ادارے کی خدمت کے لیے مامورومتعین فرمایا، اپنے ہم سبق طلبہ سے ان کی تعریف وتوصیف سنی، یہ طلبہ ان کے طریقۂ تفہیم، طرز تعلیم، حسن اخلاق ان کے وعظ وتقریر میں مہارت پر رطب اللسان تھے، میرے دل میں ایک نیا داعیہ پیدا ہوا کہ جا کر انوار العلوم میں تعلیم شروع کردوں اور اپنی طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ انوار العلوم میں حاضر ہوا، داخلے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی، مولانا موصوف کے یہاں نحو کی مشہور کتاب ''ہدایۃ النحو'' پڑھی، زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ

میرے شعور واحساس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوا، واقعۃً استاذ گرامی مفتی عبدالمنان اعظمی صاحب کا طریقۂ تدریس بڑا نرالا تھا، ان کی شفقت وعنایت طلبہ پر بے پایاں تھی، اس لئے ذوق علم بہت بیدار رہا، اوراس کے علاوہ اس کتاب کے مصنف کے روحانی فیض کا بھی اثر رہا کہ مسلسل میں اس کتاب کے پڑھنے اورقواعدنحویہ کےاز برکرنے میں مصروف رہتا تھا، اسی ایک کتاب کے ساتھ دلچسپی سے دوسرے علوم وفنون میں بھی رغبت کا اضافہ ہوا۔

گوکہ مفتی عبدالمنان صاحب کے یہاں دو ہی کتابیں تھیں، لیکن منطق ابتدائی، علم صرف وادب کی کتابوں میں جہاں کہیں دشواری پیش آتی، یا جو کتاب سمجھ میں نہیں آتی تھی بلاتامل میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا، ایک ہی سال کی مدت میں نحو وصرف کے مسائل، منطق ابتدائی کے قواعد، فارسی کی مشہور کتاب ''یوسف وزلیخا'' وغیرہ میں کامل دستگاہ تو حاصل نہ ہوئی، لیکن ان کتابوں کے پڑھنے لکھنے کا ایسا شوق بیدار ہوا کہ میں اپنے تمام اوقات کوفضول چیزوں میں ضائع نہیں کرتا تھا، بلکہ کچھ نہ کچھ یاد کرتا تھا، یا اپنے ساتھیوں سے بحث وتکرار میں لگا رہتا تھا، اس طرح خداے پاک کا میرے اوپر احسان ہوا کہ میری بدذوقی کا ازالہ ہو گیا، نئے جوش و ولولے کے ساتھ علم کے مختلف میدانوں میں میری پیش رفت جاری رہی، اب جن کتابوں کا سبق پڑھتا تھااس کی تکرار جب تک اپنے ساتھیوں سے نہیں کر لیتا تھا مجھ کوقرار وسکون حاصل نہیں ہوتا تھا، میری محنت و جانفشانی دیکھ کراس ادارے کے تمام اساتذہ میرے اوپر شفیق ومہربان ثابت ہوئے، اور میری ہدایت ورہبری میں کوئی کسر نہیں اٹھارکھی، حضرت علامہ مولانا بحرالعلوم مفتی عبدالمنان صاحب کی تشریف آوری باعث رحمت ثابت ہوئی، اور میں دھیرے دھیرے کامیابی کی منزل طے کرنے لگا، اپنے اساتذہ کی تعظیم وتکریم میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کرتا تھا، غالباً اسی وجہ سے سب کی نگاہ میں سعادت منداچھا طالب علم ثابت ہوا۔

سوال: آپ کے بیان کے مطابق ناکامی کے بعد کامیابی کی منزل کی طرف آپ بڑھے، اور ذوق علم بیدار ہوا، کیا آپ اپنی کوئی ایسی کامیابی بتا سکتے ہیں، جس کو آپ کے اساتذہ اور

امتحان لینے والے علمانے خوب خوب سراہا ہو؟

جواب: زمانۂ طالب علمی کی کامیابی کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے، لیکن ایک ایسی کامیابی جس پر اس ذرۂ ناچیز کو اس صدی کے عظیم ترین بزرگ حضور حافظ ملت **نور اللّٰہ مرقدہ** نے خوب خوب سراہا تھا، بڑی حوصلہ افزائی فرمائی تھی، وہ یہ کہ علامہ جمال الدین ابن حاجب کی کتاب ''کافیہ'' (جو علم نحو میں ایک چیستان کی حیثیت رکھتی ہے) میں پڑھ رہا تھا، اور حضور حافظ ملت **علیہ الرحمہ** امتحان کے لیے مدعو کیے گئے، کافیہ کا امتحان حضرت ہی کے پاس رکھا گیا، میرے تمام شرکا میں میرا نام سرفہرست تھا، حضور حافظ ملت **نور اللّٰہ مرقدہ** کے حکم پر عبارت خوانی کے بعد ترجمہ کیا، مرفوعات کی بحث میں پہلے مرفوع یعنی فاعل کی تعریف کے بعد مطلب بیان کیا، حضرت نے فرمایا کہ آپ کہہ رہے ہو کہ فاعل اسے کہتے ہیں جس کی طرف فعل کی نسبت بطور قیام ہو اور جس پر فعل کو مقدم کیا گیا ہو، یعنی فاعل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سے پہلے فعل ہو، اگر فعل بعد میں آجائے، تو اس سے کیا خرابی پیدا ہوگئی، ''**زیدٌ ضرب**'' و ''**ضرب زیدٌ**'' میں کیا فرق ہے؟ فقیر نے بلا جھجک فوراً جواب عرض کیا کہ اگر اسم کے اوپر فعل کو مقدم نہ کیا جائے بلکہ اس سے مؤخر کر دیا جائے تو ایسی صورت میں فاعل اور مبتدا میں اشتباہ پیدا ہو جائے گا، یہ متعین کرنا دشوار ہوگا کہ یہ فاعل ہے یا مبتدا، اس لئے فاعل و مبتدا میں اشتباہ ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فاعل کی تعریف میں یہ قید لگائی جائے کہ فعل اس میں اسم پر مقدم ہو۔

اس برجستہ جواب سے حضور حافظ ملت **نور اللّٰہ مرقدہ** بہت خوش ہوئے، اور بہت بہت شاباشی دی، اور اپنے تلمیذ رشید حضرت مولانا عبد المنان صاحب کو ہدایت فرمائی کہ اس طالب علم کو خاص توجہ کے ساتھ پڑھایا جائے، جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ یہ طالب علم **ان شاء اللّٰہ العزیز** مستقبل میں علما کی صف میں ایک ممتاز مقام حاصل کرے گا۔

اس لیے میں اپنے علم وایقان کی روشنی میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ جو کچھ مجھ

کو جانا پہچانا جاتا ہے یا میری قدر ومنزلت کی جاتی ہے، یا علمی دنیا میں میری کچھ حیثیت متعین کی جاتی ہے یہ سب کچھ میرے اساتذۂ کرام کی محنت وکاوش اوران کی شفقتوں کی وجہ سے تو ہے ہی لیکن اس میں ایک بزرگ ہستی کی پیشگوئی کے بھی اثرات ہیں اوراس کی دعاؤں کا کرشمہ ہے۔

سوال: دورحاضر میں بالعموم طلبہ واساتذہ کا ربط وتعلق کمزور پڑ گیا اوران کی تعظیم وتوقیر میں طلبہ کی روش بدل گئی، لیکن آپ کے عہد طالب علمی میں آپ کے بیان سے عیاں ہے کہ طلبہ اساتذہ کے بڑے خدمت گزار ہوتے تھے، کوئی ایسا واقعہ پیش کریں جس سے اس زمانے کے طالب علموں کو عبرت حاصل ہو؟

جواب: بلاشبہ اس زمانے کے طالب علم اپنے اساتذۂ کرام کے بارے میں جو روش اختیار کرتے تھے، اوراس وقت کے طلبہ جو طریقہ اپنائے ہوئے ہیں ان دونوں میں نمایاں فرق محسوس کرتا ہوں، میرے عہد طالب علمی میں تمام طلبہ اپنے اساتذہ کے ساتھ نہایت مودبانہ طریقہ اختیار کرتے تھے، ان کو ہر حالت میں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے، ان کی ناراضگی اپنے لیے باعث محرومی سمجھتے تھے، اورایسی خدمت کرتے تھے جس کا خیال اس زمانے میں ذہن میں نہیں آتا۔

میرے استاذ کریم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب جب تلسی پور انوارالعلوم میں تشریف لائے تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی اورامراض شکم میں مبتلا ہوگئے، بلکہ ایک آدھ بار منہ سے بلغم میں خون کے کچھ آثار نظر آئے، وہ بہت متوحش ہوکر اداس رہنے لگے، اچھے ڈاکٹروں اورحکیموں سے معاینہ کروایا، جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ منہ سے خون آنا اور بلغم کے اجزاء میں خون کا شامل ہونا قطعی طور پر کسی بڑی بیماری ''ٹی بی'' وغیرہ کا پیش خیمہ نہیں ہے، یا اس کی علامت نہیں ہے، تو ان کو سکون وقرار حاصل ہوا، تاہم وہ بہت محتاط انداز میں رہنے لگے، اور کھانے پینے میں کافی احتیاط کرنے لگے، چونکہ اس زمانے میں عام طور پر کنویں کا پانی استعمال کیا جاتا تھا، اسی وجہ سے پانی

صاف ستھرا نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس میں ایسے اجزا شامل ہوتے تھے، جو صحت پر اثر انداز ہوتے تھے، یا ایسے کیڑے مکوڑے پائے جاتے تھے جو آدمی کو بیمار بنا دیتے تھے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی بہ نسبت اوسطا عمر کم ہوتی تھی، اس لئے انوار العلوم کے پاس جو کنواں تھا، اس کے پانی کے استعمال سے استاذ مکرم نے احتراز کا ارادہ ظاہر فرمایا، اور ہم لوگوں کو حکم دیا کہ تلسی پور ریلوے اسٹیشن پر جو پانی کی ٹنکی ہے، جس کا پانی پکا ہوا ہوتا تھا، اور بہت صاف ستھرا رہا کرتا تھا، اس کو میرے لئے لاؤ، چنانچہ مدرسہ اور اسٹیشن کا فاصلہ تقریبا چار فرلانگ تھا، اس کام کی انجام دہی کے لیے روزانہ کی ڈیوٹی احقر نے قبول کی، ہر روز شام کے وقت ایک مٹی کا گھڑا جس میں کافی مقدار میں پانی آتا تھا، لے کر اسٹیشن جاتا تھا، اور وہاں سے پانی لاتا تھا، اس کو استاذ مکرم استعمال کرتے تھے، اس پانی کے سوا کوئی دوسرا پانی نہیں پیتے تھے، میرے اس کام میں برادر مکرم حضرت مولانا عبد الرحیم عزیزی بھی شریک رہتے تھے، یہ فریضہ ہم لوگوں نے مستقلاً سال بھر تک انجام دیا، البتہ ہم لوگوں کی غیر حاضری کی صورت میں دوسرے طلبہ بھی پانی اسٹیشن سے لاتے تھے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ روز روز کا یہ کام بہت اذیت رساں ہے، اس کام میں بڑا وقت ضائع ہو جاتا ہے، اس لیے طبیعت میں اکتاہٹ کبھی نہ پیدا ہوئی بلکہ نہایت خوش دلی اور سعادت مندی کے ساتھ (اس بار گراں) کو برداشت کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، اور طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی دوسرا طالب علم میرے اس اچھے کام اور خدمت میں شریک نہ ہو۔

اسی ایک مثال سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ میرے عہد طالب علمی کے طلبہ اور آج کے طلبہ میں اساتذہ کے تعلق سے کتنا بڑا فرق پیدا ہو گیا، کہاں مسلسل ایک سال تک طویل فاصلے سے اپنے کندھے پر پانی لاد کر لانا، اور کہاں آج کے طلبہ جن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح استاذ کی نگاہوں سے بچ کر نکل جائیں تاکہ ان کے ذمہ کوئی خدمت مقرر نہ ہو۔

سوال: تلسی پور کے عہد طالب علمی میں اگر آپ کسی واقعے سے متاثر ہوئے ہوں یا کسی

عارضے کے سبب آپ کی تعلیم میں خلل واقع ہوا ہو تو اسے قدرے تفصیل سے بیان فرمائیں؟
جواب: یوں تو بہت سے معمولی و غیر معمولی واقعات پیش آئے، لیکن میرے نزدیک ایک طالب علم کی زندگی میں اس قسم کے واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے، میرے عہد طالب علمی میں ہندوستان پر آزادی کا سورج طلوع ہوا، لیکن یہ سورج اپنے جلو میں ملک کی تقسیم کو بھی ساتھ لایا، جس سے تباہیوں کے دل دہلانے والے مناظر سامنے آئے، میں سن شعور کو پہونچ چکا تھا، اخبارات بھی پڑھنے لگا تھا اس لیے فطری طور پر ملک کی آزادی کے خونی حادثات مجھ کو متاثر کر سکتے تھے، تاہم میں ان سے بے پروا ہو کر اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں تھا، میں ایک ایسا مسافر تھا، جو اپنے دُھن کا پکا ہو اور جس کو سیدھا راستہ مل گیا ہو، تو وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے دائیں بائیں کی کھائیوں سے بے نیاز ہو کر اپنی منزل مقصود کی طرف لپک رہا ہو، پس گویا میری بھی یہی حالت تھی، البتہ ایک ایسا حادثہ رونما ہوا کہ جب میں اس کو سوچتا ہوں تو شرم و ندامت سے پانی پانی ہو جاتا ہوں اور یہ سوچنے لگتا ہوں کہ دین و دیانت کے نام پر کبھی ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں، جن کا کوئی عقلی و شرعی جواز نہیں ہوتا۔

انوار العلوم کے قریب ایک غریب کلمہ گو رہتا تھا، جو مسلکاً دیوبندی مکتب فکر کا تھا، وہ اس ادارے کی زمینوں میں دخل اندازیاں کرتا تھا، ارکان ادارہ سے اس کا شدید اختلاف تھا، معاملے کو سُلجھانے کی پیہم کوشش کی گئی، لیکن عقیدے کے استحکام نے کسی فریق کے رویے میں لچک نہ پیدا ہونے دی، اگر انوار العلوم کے ارکان اپنی سنیت میں متصلب رہ کر اس ادارے کے مفاد کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے، تو دوسری جانب وہ دیوبندی اور اس کے ہم نوا اپنی ضد یا مدرسے کے مفاد کے خلاف ہنگامہ آرائی و سازش میں کسی طرح کی کمی نہیں کرتے تھے، بات بڑھتی جا رہی تھی، اس سے مدرسین و ملازمین متاثر ہو رہے تھے، طلبہ پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا، چونکہ یہ گروہ عام طور پر ناتجربہ کار، ذہن و فکر میں غیر معمولی بے اعتدال اور اپنے احساس و شعور میں حد سے زیادہ بے ہنگم واقع ہوتا ہے، اس لیے اس کا اشتعال میں آنا کبھی بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، کچھ مخصوص طلبہ نے

باہم مشورہ کیا کہ یہ دیوبندی آدمی ہمیشہ اپنے ہم نواؤں کے ساتھ شرارت پر آمادہ رہتا ہے ،اور کسی طرح معقولیت کی راہ نہیں اختیار کرتا ، مدرسہ والے معاملے کوسلجھانے میں ناکام ہوچکے ہیں ،اب ہم لوگوں کو کوئی سخت اقدام کرنا چاہیے ،ظاہر ہے کہ اس قسم کے اجتماعی کاموں میں طلبہ کو جب اوپر سے شہ مل جائے تو وہ اپنی قوت کا بھر پور مظاہرہ کرنا شروع کردیتے ہیں، چنانچہ ان ناعاقبت اندیشوں نے باہم مشورے سے یہ طے کیا کہ اس شر پسند آدمی کے گھر میں آگ لگادی جائے ، ایک بجے شب میں کافی مقدار میں کوئلے کی آگ تیار کی گئی اور اس شخص کے چھپر پر ایک نالائق وجری طالب علم نے لے جا کر رکھ دی، تھوڑی ہی دیر میں اس کا پورا گھر آتش کدہ بنا ہوا تھا، تیز ہوا چل رہی تھی ، شعلے بلند ہو رہے تھے، طلبہ بھی دکھانے کے لیے آگ بجھانے میں مصروف ہو چکے تھے، آگ کون بجھا رہا تھا ،سب لوگ خوامخواہ شوروغل برپا کیے ہوئے تھے، آناً فاناً وہ گھر خاکستر ہو گیا، وہ بے چارہ چیختا چلاتا رہا اور ہمارے مدرسے کے طلبہ اپنے اس غلط کارنامے پر فخر کر رہے تھے، لیکن اندر اندر سے میرا ضمیر مجھ کو سخت ملامت کر رہا تھا، اس لیے نہیں کہ میں اس کارستانی میں شریک تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ میرے علم میں یہ نازیبا حرکت آ گئی تھی ،اور میں اپنی بزدلی کی بنا پر ان نالائقوں کو روکنے میں یعنی اس قسم کی حرکت سے منع کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کاروائی نہیں کرسکا تھا، اس لیے کہ بیشتر شرکا اس عمل شر کو کار خیر تصور کرتے تھے، اور یہ میری نگاہ میں نہایت ناشائستہ حرکت تھی ، جو طالبان علوم دینیہ کے شایان شان نہیں تھی ، جو کچھ اختلاف ونزاع تھا، ادارے کی انتظامیہ اور اس دیوبندی کے درمیان تھا، اوّلاً تو طلبہ کو اس معاملے میں الجھنا نہیں چاہیے تھا، ثانیاً اگر وہ اس میں پڑ گئے تھے تو ان کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا، جو چوروں اور بدمعاشوں اور شر پسندوں کا کام ہے، اور اسلامی اصول کے بالکل خلاف ہے، یہ ایسا واقعہ تھا کہ اکثریت کی مخالفت کے ڈر سے اس کے خلاف میں اپنی آواز بلند نہیں کرسکتا تھا، مگر میں اس سے بے حد متاثر ہوا، میرا ضمیر مجھ کو مسلسل جھنجھوڑ رہا تھا، میں قطعاً اس کو درست نہیں تصور کرتا تھا کہ کسی سے عقیدے کے اختلاف کی بنا پر اتنی زیادتی روا رکھی جائے۔

ضابطے اورقانون کے مطابق حالات سے نپٹنے کے امکانات ہوں تو بھلاایسی حرکت کیوں کرروارکھی جاسکتی ہے، پھرمیں یہ بھی سوچتا تھا کہ ایک شرارت کا جواب اس سے بڑی شرارت یاظلم وجبر سےنہیں ہونا چاہیےتھا۔

مولانا غلام نبی صاحب آپ کےسوال میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کیا کسی وجہ سے آپ کی تعلیم میں خلل واقع ہوا؟ ہاں ضرورایک مرتبہ بہت دنوں تک اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا ،میں بیمار پڑ گیا، میری تعلیم کا نقصان ہی نہیں ہوا، بلکہ مایوسیوں کا شکار ہوگیا تھا،شدید بخار آیا،اس کے بعدنمونیہ ہوگیا،جس کے نتیجے میں بہت کمزور ہوگیا،اس کی اطلاع میرے گھر پر پہونچائی گئی ،میرے والدالحاج محمدابراہیم صاحب مرحوم کو جب اطلاع ملی تو وہ حواس باختہ ہوکرتلسی پورپہنچ گئے ،اورگھر پر کہرام مچ گیا،میرے دادامرحوم جب اسٹیشن پرآئے تو گاڑی روانہ ہوچکی تھی ،اس زمانے میں صبح کےوقت ایک گاڑی تلسی پورجاتی تھی ،اوربسیں نہیں چلتی تھیں،ان کی گاڑی چھوٹ گئی ،وہ پیدل چل کرپچیس چھبیس کلومیٹر کا راستہ طے کرکے نہایت پریشانی کے عالم میں تلسی پور پہونچے ،باہمی صلاح ومشورے سے یہ طے پایا کہ مجھ کو پچپڑ والے جاکرسرکاری اسپتال کے بڑے ڈاکٹرکودکھایا جائے جو بڑا تجربہ کار تھا،ڈاکٹر صاحب کانام عبدالغفارتھا، وہ سنی اورشریف النفس انسان تھے،بڑی توجہ سےانھوں نے میرا علاج ومعالجہ کیا، کئی روزتک اسپتال میں رہنا پڑا، جہاں میرے والدین کے علاوہ کنبے کے دوسرے افرادکی بھیڑلگی رہتی تھی ،الحمدللہ! میں صحت مند ہوا ،ایک مہینے سے زائدعرصہ تک نقاہت وکمزوری کی وجہ سے مدرسہ انوارالعلوم میں حاضر نہ ہوسکا،جس سے میری پڑھائی کا بڑانقصان ہوا، بلفظ دیگرمیری تعلیم میں خلل واقع ہوا، بالآخرمکمل صحت یابی کے بعدجب میں مدرسے میں حاضرہواتو میرے مشفق اساتذۂ کرام بہت خوش نظرآرہے تھے،انھوں نے یہ کرم فرمایا کہ میرے نقصان کی تلافی کردی ، میں بھی پوری تن دہی اورمحنت وجانفشانی سے اپنے خسارے کو پورا کرنے میں لگ گیا اورجلدہی تلافی مافات ہوگئی۔**فالحمدلله علیٰ ذالک۔**

سوال: تمام مدرسوں اور دینی اداروں میں طلبہ دو قسم کے ہوتے ہیں، کچھ طلبہ ایسے ہوتے ہیں جن کو پڑھنے لکھنے کا ذوق ہوتا ہے، ان کے برخلاف طلبہ کا ایک دوسرا طبقہ ایسا ہوتا ہے ،جن کو علم سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی ،آپ نے ایسے طلبہ کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کیا؟ قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: ایسے طلبہ جو پڑھنے لکھنے سے دل چسپی نہیں رکھتے ،ان کو دو خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے ،ایک ایسا گروہ جو بدذوق ہی نہیں ہوتا ، بلکہ شرپسند ہوتا ہے ، نہ خود پڑھتا ہے اور نہ دوسروں کو پڑھنے دیتا ہے، میں نے اپنے ذہن میں یہ سوچ رکھا تھا کہ اس گروپ کے طلبہ سے اختلاف ونزاع اگرچہ نہیں برپا کروں گا ،تاہم ان سے احتراز کی تدبیریں اختیار کروں گا، چنانچہ ایسے ہی ہوا، اس قسم کے طلبہ سے میں ہمیشہ اجتناب واحتراز کرتا تھا، حتی کہ ان کے ساتھ سیر وتفریح کے لیے بھی نہیں نکلتا تھا، کیوں کہ میں سوچتا تھا کہ ان کی مصاحبت بُرے نتائج کی حامل ہوتی ہے، اور یہ بھی میرے ذہن میں تھا کہ ان کی اصلاح کی ہر کوشش بے سود ہے۔

اور دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے، جو مختلف وجوہات کی بنا پر پڑھنے لکھنے میں کمزور ہوتا ہے، لیکن ان کے اندر سعید روح ہوتی ہے، حالات کے تقاضے نے ان کو مجبور محض بنا دیا ہے، اور وہ علم سے بے تعلق ہو گئے ،اگر وہ اسباب وعلل جو ان میں حصول علم سے بے رغبتی پیدا کرتے ہیں، زائل ہو جائیں تو ان کی طبیعت حصول علم کی طرف فوراً مائل ہو جائے گی ،ایسے طلبہ بعض اوقات ابتدائی درجات میں کتب فہمی سے عاجز رہتے ہیں، اور ان کو مسائل وقواعد از بر نہیں ہوتے ، یا گھریلو حالات ان کو دل جمعی کے ساتھ پڑھنے نہیں دیتے ، میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو طلبہ طبیعت کے اعتبار سے اچھے ہیں، ان کی مدد کی جائے ، میں اپنے سے نیچی جماعت والے بچوں کو تکرار کرا کر یا مسائل سمجھا کر اونچے درجے کے لیے تیار کرتا تھا، میں اس وقت ان کا نام بتانے کے موڈ میں نہیں ہوں ،جن کے ساتھ میں نے یہ حسن سلوک کیا، یا جن کو میں نے تعاون دیا۔ البتہ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میری جدوجہد سے کئی ایسی زندگیاں جو تباہی وبربادی کی منزل تک پہنچنے کے قریب تھیں، میں نے ان کو بچایا، وہ بے

چارے میرے احسان مند ثابت ہوئے ، بہرحال ایک اچھے طالب کی روش ایسی ہونی چاہیے کہ وہ ناعاقبت اندیشوں سے الگ تھلگ رہے اور جو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے کسی وجہ سے ناکام ہورہے ہوں ،ان کو کامیاب بنانے کی اپنی فکری کاوش جاری رکھے، میرا طریقۂ کار یہی تھا، میں امید کرتا ہوں کہ ذہن وفکر والے طلبہ اسی راہ پر گامزن رہیں گے۔

سوال: تلسی پور میں آپ کی مدت تعلیم کافی طویل تقریباً آٹھ سال رہی ،کیا اس عرصۂ دراز میں آپ کو وعظ وتقریر کا بھی شوق رہا اور کیا کوئی ایسی کامیاب تقریر کی ،جس سے عوام وخواص دونوں نے خوب پسند کیا ہو؟

جواب: انوارالعلوم کے عہد طالب علمی میں کبھی کبھی وعظ وتقریر کی طرف طبیعت کا میلان ضرور ہوا ،لیکن کوئی کامیاب مقرر نہ بن سکا،اس کی دو بنیادی وجہیں تھیں :ایک یہ کہ میری زبان میں کچھ ایسی لکنت تھی ،جو کامیاب مقرر بننے میں سدراہ ثابت ہوگئی تھی ،وہ لکنت **بفضله تعالیٰ** دعاے موسیٰ **(علیه السلام)**:"**رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدة من لسانی یفقهوا قولی**" (طٰہٰ:25) کے ورد سے اب تقریباً ختم ہوچکی ہے،اس کی ہدایت حافظ ملت **نوراللّٰہ مرقدہ** نے فرمائی تھی، پھر بھی زبان میں خاطر خواہ سلاست وروانی نہ پیدا ہوسکی ،اور کبھی کبھی ترسیل مطالب عالیہ میں میری زبان رک جایا کرتی ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آج جہالت کی بنا پر اپنی جماعت کا رجحان یہ ہے کہ وہ سطحی ، لایعنی ،اشتعال انگیز، جذبات میں ہیجان برپا کرنے والی تقریر ووعظ سے محظوظ ہوتے ہیں ،اور میں شروع ہی سے ایسی باتوں کی طرف اپنے ذہن وفکر کو مائل کرنے میں ناکام رہا، میری توجہ دقیق علمی مسائل، منطقیانہ استدلال ،فلسفیانہ موشگافیوں کی طرف رہی ،حتی کہ وہ روایتیں جو مولود پاک میں عام طور سے پڑھی اور سنائی جاتی ہیں ،اور باب فضائل میں ان کے استناد سے اہل علم نے روکا نہیں ہے ،ایسی روایتوں سے بھی میری طبیعت میل نہیں کھاتی ہے ،اور

وعظ وتقریر میں جب تک ملاحت ونمکینی نہ پیدا کی جائے ، یا محیرالعقول روایات نہ سنائی جائیں ، یا لایعنی نکتہ آفرینیاں نہ ہوں یا جذبات میں ہیجان برپا کرنے والی سیاسی سخن طرازیاں نہ ہوں ، اس وقت تک کامیابی کی منزل بہت دور رہتی ہے ، انھیں وجوہات کی بنا پر کچھ دنوں تک وعظ وتقریر کے میدان میں کوشش کرنے کے باوجود اس میں قطعی طور سے اپنے آپ کو ناکام محسوس کرتا تھا۔ البتہ عہد طالب علمی میں دو ایک کامیاب تقریریں ضرور کی ہیں۔

تلسی پور کے سالانہ اجلاس میں ایک عظیم الشان تقریر کی ، وہ بھی اپنے ذہن وفکر کی کاوش نہ تھی ، بلکہ رٹی رٹائی تھی ، مگر بہت پر مغز اور معنویت سے لبریز تھی ، جب میری تقریر پورے شباب پر ہوئی ، تو مدعو مقررین میں سے ایک بڑے درجے کے مقرر نے (جن کو میرے بعد تقریر کرنی تھی) **جزاک اللہ ، سبحان اللہ** کے اصطلاحی کلمات سے تقریر ختم کرنے پر زور دیا ، اور بڑی حسرت وافسوس کے ساتھ **و ما علینا الا البلاغ** قبل از وقت کہنا پڑا۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پیشہ ور مقررین بلفظ دیگر تقریر فروش حضرات کتنے عالی ظرف ہوتے ہیں کہ ایک طالب علم کی تقریری کامیابی پر انھیں اپنی ناکامی کا احساس سرعت کے ساتھ ستانے لگتا ہے۔

تلسی پور کے عظیم الشان جلسے میں قراءت خلف الامام ، آمین بالجہر ، رفع الیدین جیسے غیر مقلدین کے اہم اختلافی مسائل پر مناظرہ بھی کیا ہے ، یہ مناظرہ محض رسمی اور عوام کالانعام کے دکھاوے کے لیے تھا ، مناظرانہ سوال وجواب حضرت علامہ ومولانا محمد عتیق الرحمن صاحب قبلہ علیہ الرحمہ نے مرتب کیا تھا ، ہم لوگوں نے یاد کر کے از بر کر لیا تھا اور غیر مقلدین کی وکالت میرے سپرد کی گئی تھی ، اور احناف کے ترجمان میرے ایک رفیق درس جناب مولانا خلیل احمد صاحب نیپالی تھے ، جن کے کنبے کے بیشتر افراد غیر مقلد تھے ، اسٹیج پر ایک طرف مولانا خلیل صاحب کھڑے ہوئے اور دوسری جانب میں تھا ، تقریباً آدھے گھنٹے تک نہایت زوردار مناظرہ ہوا ، سامعین بہت محظوظ ہوئے تھے ، اسٹیج پر موجود علمائے کرام داد وتحسین کے ساتھ نواز رہے تھے ، یہ تمام مباحث خالص علمی تھے ، افسوس کہ میرے پاس

اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے، بہرحال اس مناظرے میں پہلے ہی سے فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ غیر مقلد کو شکست کھانی پڑے گی، چنانچہ مجھ کو برسر عام اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا ،اور مولانا خلیل احمد صاحب اجلاس سے فاتح بن کر نکلے، ان کو چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر لیا، اور پھولوں کے ہار سے ان کو لاد دیا گیا، ان کو بڑی واہ واہی ملی، ایسے وقت میں مجھ کو سخت خجالت کا احساس ہوا، اور بار بار میرے ذہن میں یہ آرہا تھا کہ کاش میں نے غیر مقلدین کا پارٹ نہ ادا کیا ہوتا، کہ مجھ کو کسی طرف سے کوئی شخص داد و تحسین تو بڑی بات دل جوئی کرنے کے لیے آمادہ نہیں، بلکہ سب لوگ میری شکست خوردگی پر بہت خوش تھے کہ ایک غیر مقلد ہار گیا۔

اس مناظرے کا قبیح پہلو یہ تھا کہ یہ کوئی حقیقی و واقعی مناظرہ نہ تھا، رسماً سنیوں کو سوال و جواب کے انداز میں یہ دکھانا تھا کہ غیر مقلدیت کی بنیاد نہایت کمزور ستونوں پر قائم ہے، اور احناف کی طرف سے آخر کار مضبوط دلائل کا مظاہرہ کرنا تھا، اس لیے اس میں نہ کوئی واقعی طور پر فاتح تھا نہ کوئی مفتوح، لیکن داد و تحسین کے علاوہ جب انعام و اکرام کی باری آئی تو مولانا خلیل صاحب کو خوب خوب نوازا گیا، اس سے مجھ کو بہت اذیت پہونچی، اور اتنے بڑے مجمع میں کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ یکطرفہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے، حتیٰ کہ میرے اساتذۂ کرام کے ذہن ثاقب میں بھی یہ بات نہ آئی کہ میرے دل و دماغ اس سے متاثر ہو رہے ہیں، میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم یہ کہہ کر میرے اوپر کچھ نوازش ہوتی کہ انھوں نے غیر مقلدوں کی طرف سے بھرپور ترجمانی کی، اور ان کے مذہب کے بیان کے سلسلے میں نہایت بے باکانہ روش اختیار کی، لیکن چونکہ وہ مذہب سرے سے کمزور بنیادوں پر قائم ہے ،اس لیے ان کو اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا، یہ بھی انعام کے مستحق ہیں، نہ یہ کہ ان کو محروم قرار دے کر ان کی دل شکنی کی جائے اور حوصلہ افزائی کی بجائے ان کو پست ہمتی کے دل دل میں ڈھکیل دیا جائے، جس سے ان کی حوصلہ شکنی ہو۔

میں نے اس واقعے کو تفصیلاً اس لیے ذکر کیا تا کہ اہل علم معلوم کر سکیں کہ طالب

علموں کے احساسات کی دنیا کتنی عجیب وغریب ہوتی ہے،اس لیے ان کے نفسیات کا خیال رکھنا ضروری ہے ،ایک ماہر استاذ کی ذمہ داری ہے کہ ان کے کیفیات نفسی کا جائزہ لیتا رہے،اور ایسے عمل وحرکت سے باز رہے،جس سے طلبہ کے ذہنی الجھن میں اضافہ ہو،اور ان میں اپنی محرومی کا احساس پیدا ہو۔

سوال: دوران طالب علمی میں کیا معلومات عامہ کے لیے آپ کے اندر کچھ دل چسپی پیدا ہوئی تھی؟

جواب: میرا عہد طالب علمی بڑا ہنگامہ خیز تھا ،عہد غلامی آخری سانس لے رہا تھا ،حریت وآزادی کا سورج طلوع ہو گیا تھا،مسلم لیگ کے عروج کے بعد اس کا زوال ہو رہا تھا، ہر طرف لوگوں میں خوف ودہشت کا ماحول طاری تھا، پہلے مجھ کو اخبارات کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا ،اخبارات میں لرزہ خیز واقعات کا ذکر ہوتا تھا،جس کو پڑھ کر دل دہل جاتا تھا،اور کامل معلومات کا ذخیرہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، جب ان خبروں کو پڑھا جائے ،جن کو شہ سرخی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے،تو ان کے محل ومقام کے پس منظر میں ان کو دیکھا جائے ، چنانچہ جب میں مثلاً ٹوکیو کی خبریں پڑھتا تھا تو نقشہ اتار کر اس کا محل وقوع بھی دیکھ لیتا تھا،اس کے نتیجے میں دنیا کے متعدد ممالک کی راجدھانیوں کا محل وقوع معلوم ہو گیا تھا،اور سیاسی خبروں سے گونا گوں دل چسپی پیدا ہو گئی تھی ،لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ نظری سیاست کی بجائے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہ لیا، پھر رفتہ رفتہ اردو ادبیات کا مطالعہ کیا ،اردو ادب وشاعری میں میری دل چسپیوں کا زیادہ تر مرکز اقبالیات تھیں، چنانچہ ''بال جبرئیل'' ''بانگ درا'' ''شرح اسرار خودی و بے خودی'' ''فلسفۂ اقبال'' ''روح اقبال'' ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' وغیرہ کے علاوہ بہت سے مصنفین وادبا کی کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں،ان کے مطالعے سے میری معلومات میں اضافہ ہوا اور میری دل چسپیاں صرف درسیات کی حد تک محدود نہ رہیں ، بلکہ میں نے اردو زبان میں علم اقتصادیات ،معاشیات وسیاسیات کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں ،حتی کہ ہیگل اور مارکس کے اشتراکی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ، یہ ساری معلومات تلسی

پور کے عہد طالب علمی سے شروع ہو کر اب تک کچھ نہ کچھ برقرار ہیں، اس لیے کہ علم کے سلسلے میں میرا مخصوص نظریہ یہ ہے کہ ایک ہی دائرے میں محصور نہیں رہنا چاہیے، گو کہ اصالۃً میرے مطالعے کا بہترین موضوع دینیات و مذہبیات تھے اور اب بھی ہیں، لیکن اسی دائرے میں رہ کر میں اپنے آپ کو مقید رکھنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ میری کاوش فکر یہ رہتی تھی کہ خوب سے خوب تر معلومات میرے ذہن و فکر کو مستنیر کرتی رہیں، گویا میں اس شعر کا مصداق تھا۔ ؎

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می باید

کیوں کہ وسعت نظر و فکر کے لیے اس سے بہتر کوئی راہ نہیں۔

سوال: آپ یہ بیان کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں کہ آپ نے انوار العلوم تلسی پور کتنے دن قیام فرما کر تعلیم حاصل کی، بہتر ہوتا کہ اس مدت کی تعیین کے ساتھ فرما دیتے۔

جواب: مہینے کی قید کے ساتھ قیام کی مدت کو بیان نہیں کر پاؤں گا، لیکن اگر اس ادارے کے کاغذات موجود ہوں تو مدت قیام کی تعیین کی جا سکتی ہے، مگر مجھ کو یہ امید نہیں ہے کہ تقریباً 54 سال پہلے کے کاغذات وہاں محفوظ ہوں، البتہ جب میں اپنے حافظہ پر زور دے کر سوچتا ہوں تو ضرور یہ خیال آتا ہے کہ سن ۱۹۵۱ء سے سن ۱۹۵۴ء کے اوائل تک تلسی پور کے اس ادارے میں زیر تعلیم رہا، ۱۹۵۳ء میں احقر کو یہ خیال آیا کہ اپنے اساتذہ کی مرضی سے مبارک پور دار العلوم اشرفیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجھ کو چلا جانا چاہئے، اس کا تذکرہ بھی بعض اساتذہ سے کیا، اسی سال بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان صاحب کے ہمراہ مبارک پور دار العلوم اشرفیہ کی زیارت کے لیے گیا، اور اسی سال میرے والد مکرم مرحوم زیارت حرمین شریفین کے لیے علاقے کے مشہور رئیس حاجی بسم اللہ خان مرحوم کے ساتھ جانے والے تھے، اس لیے والدین کی مرضی یہ ہوئی کہ مبارک پور تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا حج و زیارت کی واپسی کے بعد ہونا چاہیے، چنانچہ ۱۹۵۳ء میں صرف اس وجہ سے کہ

میرے والد زیارت حرمین کے لیے جانے والے تھے ،مبارک پور جانا معرض التوا میں پڑ گیا۔

ابھی ابھی میں نے بیان کیا کہ میں اپنے استاذ گرامی کے ہمراہ مبارک پور گیا تھا،میری والدہ مرحومہ نے مجھ کو پیسے دے کر یہ ہدایت کی تھی کہ وہاں سے اپنے باپ کے لیے کپڑے لے آنا،لیکن مبارک پور کے سفر میں اتنی فضول خرچی میں نے کی کہ جو پیسے اپنے ساتھ والد صاحب مرحوم کے کپڑے کے لیے لے گیا تھا، بغیر کپڑے کے گھر واپس ہوا،میری والدہ مرحومہ اس پر سخت برہم ہوئیں اور انھوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے کہا کہ تمھارے باپ اتنے لمبے سفر پر جانے والے ہیں اور تم ان کے لیے کپڑے نہیں لائے ؟ یہ تمھاری حرکت سخت نازیبا ہے،ان کی یہ برہمی میرے لیے تازیانۂ عبرت ثابت ہوئی ، پھر کبھی میں نے ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی اور ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا کہ وہ مجھ سے خوش رہیں، یہ واقعہ تقریباً تینتالیس سال پہلے کا ہے،لیکن آج تک گوکہ سوء حافظہ کا شکار ہوگیا ہوں اور تھوڑی ہی دیر میں بہت اہم باتیں بھول جایا کرتا ہوں تاہم ان کی برہمی کا واقعہ آج تک میرے نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ ۱۹۵۳ء کی بجائے ۱۹۵۴ء میں مبارک پور تعلیم حاصل کرنے گیا تھا،اس طرح انوارالعلوم تلسی پور میں میری مدت قیام تقریباً آٹھ سال رہی، میں انوارالعلوم میں اس طویل عرصے تک زیر تعلیم رہا۔

سوال: اتنی طویل مدت تک انوارالعلوم میں آپ زیر تعلیم رہے،اس عرصے میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہوں گے،عروج وارتقا کی بہت سی منزلیں طے کیے ہوں گے،کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس ادارے کی تعلیمی ترقی کی رفتار کیسی رہی؟ اور ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک اس دارالعلوم میں کام کرنے والے اساتذۂ کرام خصوصاً شعبۂ عربی فارسی کے اساتذہ کون کون تھے؟ اوران میں سے آپ کو کن کن لوگوں سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل ہوا؟

جواب: ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۴ء تک ترقی کی اتنی منزلیں طے کر چکا تھا کہ ہندوستان کے

گوشے گوشے سے اکابر علما و مشائخ طلبہ کے امتحان کے لیے مدعو کیے جاتے تھے، جو اس کی تعلیمی پیش رفت کو دیکھ کر خوب خوب سراہتے تھے، بلکہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق دارالعلوم اشرفیہ کے بعد واحد یہ ادارہ تھا کہ تعلیمی میدان میں مسلسل پیش قدمی کر رہا تھا، اس مدرسے کی تعمیر و ترقی میں میرے اپنے خیال میں حضرت سلطان المناظرین علامہ عتیق الرحمن صاحب مرحوم نے نمایاں کردار ادا کیا، اور انھوں نے بدمذہبوں کے مقابلے میں نہایت بہادری و شجاعت کا مظاہرہ کیا، اہل سنت و جماعت کے ساتھ اس زمانے میں بدمذہبوں کا اختلاف پورے شباب پر تھا اور حضرت علامہ عتیق الرحمن علیہ الرحمہ فن مناظرہ کے ماہر تھے ،وہابیوں، دیوبندیوں کے ساتھ مناظرے میں اس ادارے کے علماے کرام بھی شریک ہوتے تھے، گو کہ میں طالب علم تھا، ایک مناظرے میں جو ضلع بستی کے ایک گاؤں میں ہوا تھا، تاہم مجھ کو بھی شریک کیا گیا تھا، بلکہ میرے اساتذہ میری جرأت و بے باکی دیکھ کر مناظر کی حیثیت سے لے گئے تھے، میں نے اس مناظرے میں اپنی کم عمری کے باوجود وہابیوں کو بڑا چیلنج دیا تھا، مناظرہ تو نہیں ہو پایا لیکن انوارالعلوم کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

اس ادارے کی تعمیر و ترقی میں اگرچہ قائدانہ حیثیت مولانا عتیق الرحمن صاحب مرحوم کو حاصل تھی، لیکن تمام اساتذۂ کرام کامل اتفاق و اتحاد کے ساتھ اس کو فروغ دینے میں شریک رہے، اس دارالعلوم میں جو اساتذہ تھے، ان میں سے بیشتر حضرات سے میں نے استفادہ کیا، قابل ذکر حضرت مولانا عتیق الرحمن صاحب مرحوم، مولانا محمد علی صاحب مرحوم ،مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی علیہ الرحمہ ،اور مولانا مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی مدظلہ العالی (علیہ الرحمہ) ہیں، ان اساتذہ نے میری شخصیت کی تعمیر میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

سوال: آپ نے اپنے اس انٹرویو میں بار بار خلوص و عقیدت کے ساتھ حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** کا ذکر جمیل کیا، اور آپ نے مجھ کو یہ بھی بتایا کہ اس صدی کے اس بزرگ ترین ہستی سے آپ کو بیعت و ارادت حاصل تھی، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کب ان کے سلسلۂ

ارادت میں منسلک ہوئے اور کیا آپ اپنے قلبی رجحان سے یا کسی نے آپ کو آپ کی سعادتوں کے لیے حضرت حافظ ملت **نوراللّٰہ مرقدہ** کی ذات والا صفات کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہونے کی ترغیب دی؟

جواب: زمانۂ طالب علمی میں بار ہا حافظ ملت **نوراللّٰہ مرقدہ** سے شرف ملاقات حاصل تھا، ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتا تھا، متعدد بار انھوں نے اس ذرۂ ناچیز کو سالانہ امتحان میں امتیازی نمبروں سے نوازا، ان کی دین داری، اتباع سنت اور ان کا علمی مقام، ان کے خلوص و شفقت و عنایت اور بہت سارے ایسے امور تھے جو ہم جیسے طالب علموں کو ان کی عظمت و بڑائی کا اعتراف کرنے پر مائل کرتے تھے، علاوہ ازیں ہمارے اساتذۂ کرام خصوصاً مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی علیہ الرحمہ و مولانا مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی بڑے احترام و تعظیم و تکریم کے ساتھ حضرت حافظ ملت **نوراللّٰہ مرقدہ** کا تذکرۂ جمیل فرماتے تھے، یہ حضرات گو کہ اس ادارے کے اونچے درجے کے اساتذہ میں سے تھے، تاہم حضرت علیہ الرحمہ سے ایسے انداز سے پیش آتے تھے کہ دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ گویا یہ طفلان بے مایہ ہیں، جو اپنے بلند ترین استاذ سے بے حد متاثر ہیں کہ کبھی کبھی ان دونوں اساتذہ سے اشارۃً و کنایۃً اور کبھی صاف لفظوں میں یہ ترغیب ملتی تھی کہ ان کی ذات سے ہم لوگ منسلک ہو جائیں۔

جب میں گھر جاتا تھا تو اپنے والدین کریمین اور اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں سے برابر حافظ ملت کا تذکرہ کرتا تھا کہ ایک بزرگ مبارک پور سے امتحانات اور سالانہ جلسوں میں تشریف لاتے ہیں، ان کے خدا رسیدہ اور نیک ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ،ان کی نگاہیں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں، وہ جب بھی بات کرتے ہیں، خدا و رسول کی باتیں کرتے ہیں، اور برابر قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں، ان کی دعاؤں کا بڑا اثر ہوتا ہے، وہ مستجاب الدعوات معلوم ہوتے ہیں، جو شخص ان کی ذات سے وابستہ یعنی سلسلۂ ارادت میں داخل ہو جائے گا، یقیناً ان کے فیضان کرم سے محروم نہیں رہے گا۔

اسی اثنا میں ہمارے بڑے والد حاجی چھیدی خان مرحوم نے حضور حافظ ملت سے شرف ملاقات حاصل کیا، وہ بھی ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے، اوران کے تاثر کا عالم یہ تھا کہ تاحیات ان کی تعریف وتوصیف میں ایسا رطب اللسان رہتے تھے کہ گویا وہ ان کے عاشق زار ہیں۔

حضرت استاذ کریم مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ سے غالباً ۱۹۵۲ء میں حاجی صاحب نے درخواست کی کہ میں حضور حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** کو اپنے غریب خانے پر لے جانا چاہتا ہوں، حضرت مبارک پور سے تلسی پور کے سالانہ اجلاس میں تشریف لائے تھے ،مفتی صاحب مدظلہ العالی (علیہ الرحمہ) نے حافظ ملت کو ہمارے گاؤں ناوڈیہہ تشریف لے جانے کے لیے آمادہ کیا ،آپ تشریف لائے ،محفل میلاد منعقد ہوئی ،جس میں ہمارے عزیز واقارب کے علاوہ دوسرے گاؤں کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے ،اور پند وعظ سے بے حد متاثر ہوئے ، پھر ہم لوگ اور ہمارے خاندان کے دوسرے بہت سے لوگ بھاری تعداد میں آپ کی ذات سے وابستہ رہنے کے لیے آپ کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہو گئے ،میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ضلع گونڈہ میں آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے والے لوگوں میں ہمارے گاؤں کے لوگوں کو سبقت حاصل ہے، پہلے ہماری ہی آبادی کے لوگ آپ کی ذات سے وابستہ ہوئے ، پھر اس کے بعد دوسرے لوگوں کو یہ شرف حاصل ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے عہد طالب علمی میں جب میں تلسی پور میں زیر تعلیم تھا، حضور حافظ ملت **نور اللہ مرقدہ** سے اپنی نوعمری ہی میں شرف بیعت وارادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سوال: جب آپ تلسی پور میں زیر تعلیم تھے ،تو کیا آپ نے کچھ طلبہ کو بھی پڑھانے کا کام کیا ہے یا محض حصول علم میں لگے رہے؟ اگر آپ نے بحیثیت معین المدرسین نیچے درجے کے طلبہ کو پڑھایا ہے تو اس کی کچھ تفصیل بتانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

جواب: جب میں تلسی پور میں زیر تعلیم تھا، تو آج کل کے معیار کے مطابق پانچویں جماعت کی کتابیں پڑھتا تھا تو نیچے درجے کی کتابیں درس کے اوقات کے علاوہ میں طلبہ کو پڑھاتا تھا، یہ میری زندگی کا روشن باب ہے، کیوں کہ یہیں سے میرے اندر حصول علم کے شغف میں اضافہ ہوا۔

اس زمانے کے طالب علم جو اونچے درجے میں پڑھنے والے ہوتے تھے، ان کو اساتذہ اپنی شفقتوں، عنایتوں سے بہت نوازتے تھے، اس لیے اونچے کلاس کے طلبہ کو اپنا معین بنالیتے تھے، جس کے لیے ''معین المدرسین'' کا لفظ عام ہوگیا تھا، یہ ابتدائی کتابیں پڑھا کر اپنے علم کو تازہ کرلیا کرتے تھے، اس کے بہت سے فوائد ہیں، سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ ایسی تربیت مل جاتی تھی، جس سے تدریس کا فریضہ انجام دینے میں فراغت کے بعد ان معین المدرسین میں ایک گونہ صلاحیت پیدا ہوجاتی تھی، اس سے ٹریننگ وتربیت کی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی، کئی سالوں تک میں نے بھی معین المدرسین کی حیثیت سے نیچی جماعت کے طلبہ کو دارالعلوم اشرفیہ، دارالعلوم انوارالعلوم میں پڑھایا ہے، جو میرے لیے بہت سودمند ہوا۔

سوال: تلسی پور کے زمانۂ طالب علمی میں آپ نے بحیثیت معین المدرسین طلبہ کو تعلیم دی، کیا آپ ایسے طلبہ کو بتاسکتے ہیں کہ وہ کون کون ہیں، اور آپ ان کے ساتھ کس انداز سے پیش آتے تھے، زحمت تو ضرور ہوگی مگر تفصیل سے بیان فرمائیں!

جواب: ۱۹۵۴ء سے پہلے دارالعلوم انوارالعلوم کا طالب علم ہوتے ہوئے کافی تعداد میں طلبہ کو میں نے پڑھایا ہے، میں ان کا نام وپتہ بتانے سے قاصر ہوں، لیکن چند ایسے مخصوص طلبہ جو اپنا ایک علمی مقام رکھتے ہیں، ان کو میں بتاسکتا ہوں، اس میں احتیاط کا یہ پہلو ملحوظ رہے گا کہ انھیں حضرات کے اسمائے گرامی کو بتاؤں گا، جو صدق دل سے میری شاگردی کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ میرا بڑا احترام بھی کرتے تھے۔

لاریب مجھ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ گو کہ میں ایک طالب ہی تھا اور دوسرے طلبہ کو

پڑھاتا تھا، تاہم یہ ایسے وسیع الظرف طلبہ تھے، فراغت کے بعد جب اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہو گئے تو ان کو میری شاگردی کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس ہوتا تھا، نہ اس پر ان کو عار وشرم ہوتا تھا، بلکہ جب بھی ملاقات ہوتی تو یہ حضرات خلوص وعقیدت سے جھکے ہوئے نظر آئے، حالانکہ میں ان حضرات کے ساتھ سبق یاد کرانے یا پڑھانے میں بڑی سختی سے پیش آتا تھا، بلکہ زدوکوب بھی کرتا تھا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) جناب مولانا قاری تراب علی صاحب سابق خطیب وامام منارہ مسجد ممبئی (۲) جناب مولانا قاری ظہور احمد صاحب استاذ دارالعلوم تنویرالاسلام امرڈوبھا (۳) جناب مولانا محمد طیب صاحب **رحمۃ اللہ علیہ** سابق صدرالمدرسین وشیخ الحدیث منظرحق ٹانڈہ (۴) جناب مولانا شعبان علی حبابؔی صاحب شاعر اسلام (۵) جناب مولانا امین الدین **رحمۃ اللہ علیہ** ۔(۶) جناب مولانا عزیز الرحمن صاحب لوکھوا بلرام پور (۷) جناب مولانا قاری محمد یعقوب صاحب عندلیب انوارالعلوم تلسی پور۔

آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا کہ ایسے عزیزوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیسا تھا؟

ایسے طلبہ کے ساتھ میرا رویہ بڑا مشفقانہ تھا، اسی وجہ سے اگر میں انھیں زدوکوب کرتا تھا تو وہ میرے خلاف صف آرائی نہیں کرتے تھے، بلکہ میری سختی کو بھول جایا کرتے تھے، اور میرے لیے ہمیشہ نیازمند ہی رہے، اس سلسلے کی ایک بات سناؤں تو آپ کو حیرت ہوگی وہ یہ کہ حضرت مولانا شعبان علی حبابؔی صاحب جو آج کل ممبئی کے اونچے حلقوں میں اچھا خاصا اثر ورسوخ رکھتے ہیں، اور ان کو شاعری کا ملکہ بھی ہے، جب میں ان کو پڑھا رہا تھا علم صرف کی کتاب ''میزان ومنشعب'' وہ ازبر کر کے نہیں لائے تھے، یعنی سبق یاد کر کے نہیں آئے تھے، معمولی تنبیہ کے بعد ان کو ہدایت کی کہ کل دوسرے روز اگر سبق یاد نہ رہا، تو سخت سزا دوں گا، مگر وہ اپنی غفلت ولاپرواہی سے دوسرے روز مکمل طور سے سبق یاد کر کے نہیں لائے، اور سنانے میں بھول جایا کرتے تھے، اور رک رک کر بلکہ اپنی یادداشت پر زور دے کر سبق سناتے تھے، اس پر مجھ کو طیش آ گیا اور بڑے زور سے ایک طمانچہ رسید کر دیا، یہ ضرب

شدید ایسا تھا، کہ ان کے کان کے پردے پھٹ گئے، فوراً ان کے کان سے خون آ گیا، اس سے مجھ کو دو طرح کا خوف لاحق ہوا، ایک یہ کہ اساتذۂ کرام کو جب اس واقعے کی خبر ہوگی تو ان کی سخت سرزنش وملامت کا سامنا کرنا پڑے گا، بلکہ وہ جز روتو بیخ بھی کریں گے، دوسرے جب ان کے والدین کو خبر ہوگی تو وہ بھی میرے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے، اور عجب نہیں کہ دست درازی کردیں، یہ خیال آتے ہی تلسی پور کے سرکاری اسپتال میں مولانا حبابؔی صاحب کو ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا، اور اپنی مدد کے لیے ایک دوسرے صاحب کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا تھا، اس وقت ان کا نام یاد نہیں آ رہا ہے، ڈاکٹر نے معاینہ کرنے کے بعد پوچھا اس بچے کے کان سے کیسے خون آ گیا؟ مولانا حبابؔی صاحب جو اس وقت بارہ تیرہ سال کے کمسن بچے تھے، نے بتایا کہ راستے میں دوڑتے ہوئے آ رہا تھا، مجھ کو سخت ٹھوکر لگی اور میں کان کے بل ایک اینٹ پر گر پڑا، ڈاکٹر نے کہا: میاں صاحبزادے! صحیح صحیح بتانا چاہیے، تم جھوٹ بول رہے ہو، کسی چیز پر گرنے کی وجہ سے کان کے پردے پھٹ نہیں سکتے، تمھارے کان کے پردے پھٹے ہوئے ہیں، کسی شخص نے کان پر کسی بھاری چیز سے مار دیا ہے، بات یہ صحیح تھی، لیکن دروغ مصلحت آمیز سکھا کر ہم لوگ مولانا حبابؔی کو لے کر گئے تھے، اور انھوں نے اس دروغ مصلحت آمیز کے بولنے میں کوئی جھجھک محسوس نہ کی، اس طرح انھوں نے میرے وقار کو محفوظ رکھا، دوا علاج کے بعد وہ اچھے ہو گئے، اور ان کے کان میں درد ہوتا تھا، وہ زائل ہو گیا، لیکن عرصۂ دراز تک اس کان سے کم سنتے رہے، آج کل ان کی عمر میرے اپنے اندازے کے مطابق ۶۰ رسال سے کم نہ ہوگی، جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو شرم وندامت سے میرا سر جھک جاتا ہے، مگر وہ بڑے احترام کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور ایسے شاگردوں سے زیادہ فروتنی وتواضع اختیار کرتے ہیں، جن کو میں نے طویل مدت تک پڑھایا ہے، ان کی شان اتنی بلند وبالا ہے کہ وہ میرے ساتھ نہایت ادب واحترام کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

اپنی اس مظلومیت کی انھوں نے کسی سے شکوہ وشکایت نہیں کی تھی، ان کے والدین

کو جب اس واقعے کی خبر ہوئی تو انھوں نے میرے اوپر کسی برہمی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اپنی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ اتفاقی واقعہ ہے، جو ہونا تھا وہ ہوگیا اب اس سے آگے کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔

مولانا غلام نبی صاحب! آپ اسی ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ طلبہ کے ساتھ میرا سلوک کیسا تھا، اور طلبہ میرے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے تھے، اگر میں یہ کہوں کہ جس طرح ایک باقاعدہ استاذ طلبہ پر حاوی ہوتا ہے، اسی طرح میں بھی طالب علم ہوتے ہوئے بحیثیت معین المدرسین طلبہ پر حاوی تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔

اگر میرا حکم رات کے گیارہ یا بارہ بجے ہو جاتا تو میرے ماتحت طلبہ ہی نہیں بلکہ دوسرے طلبہ بھی میری اطاعت سے سرتابی نہیں کرتے تھے۔

آج بھی جب قاری ظہور صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو بار بار یہ بات بیان کرتے ہیں کہ عہد طالب علمی میں جب آپ مجھ کو پڑھاتے تھے تو رات کے گیارہ بجے آپ کا نادرشاہی حکم ہوتا تھا کہ انوار العلوم کے جانب شمال ریلوے لائن پار کر کے ایک دوکاندار کے یہاں سے پان اور سگریٹ لے آؤ، میں بے چارہ مارے خوف کے رات کے گیارہ یا بارہ بجے آپ کے حکم کی سرتابی کا مجال نہیں رکھتا تھا، اور فوراً رات کے سناٹے میں چلا جاتا تھا، حالانکہ ایسے وقت میں مرغوب چیزیں نایاب ہو جاتی تھیں، دوکان بند ہو جانے کے بعد یہ چیزیں کہاں ملتیں، تاہم حکم کی پابندی کی مجال نہیں تھی۔

آپ نے حضرت مولانا حبابیؔ کے واقعے اور قاری ظہور صاحب کے بیان کردہ معاملے سے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ طلبہ کا میرے ساتھ کیا برتاؤ تھا، اور طلبہ میرے ساتھ کس وقار سے پیش آتے تھے، ویسے تو ان تفصیلات کی چنداں ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ اس سے انانیت، خودی اور تکبر کی بُو آتی ہے، لیکن آپ کے مطالبے پر اپنے اوپر جبر کرتے ہوئے ان واقعات کو بیان کر دیا، شاید کسی کے لیے سامان عبرت و نصیحت ہو۔

❁❁

خطبہ استقبالیہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد!

حضرات سامعین کرام ومہمانان عالی وقار!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

سب سے پہلے ہم اپنے معزز مہمانوں کا استقبال بڑے احترام کے ساتھ کرتے ہیں جن کی تشریف آوری ہمارے لیے باعث مسرت ہی نہیں بلکہ لائق فخر بھی ہے۔

پھر دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی کے متعلق چند امور کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں، آپ کے جذبہ خلوص سے یہی توقع ہے کہ میری باتوں کو بغور سماعت فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

مبلغ اسلام حضرت علامہ مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی **رحمۃ اللہ علیہ** کی ذات ستودہ صفات سے موسوم یہ ادارہ آج سے چونتیس (۳۴) سال پہلے جناب سیٹھ شمس الحق صاحب علیمی مرحوم اوران کے ساتھیوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کی پرائمری تعلیم اور ناظرہ قرآن حکیم کے لیے عالم وجود میں آیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ عربی وفارسی، حفظ قرآن وقراءت کا انتظام کیا گیا اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہا، اس کے مخلصین ومعاونین ترقی کی کسی ایک منزل پر پہنچ کر جمود وتعطل کا شکار نہیں ہوئے، ان کا جذبہ خلوص، ان کی دینی لگن اور جوش ہر مرحلہ پر ان کو آگے بڑھنے کے لئے آمادہ کرتا رہا تاکہ ان کا یہ ادارہ ملک میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلے اور اس کی تعلیم وتربیت سے فیضیاب ہونے والے علما قوم وملت کے لیے زیادہ مفید وکارآمد ثابت ہوں، اس لئے انہوں نے اس ادارہ کی ترقی میں بڑی سرگرمی دکھائی اور اس گاؤں کے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں سے لے کر بڑے تاجروں تک نے اس کی تعمیر وترقی میں اپنی

وسعت کے مطابق حصہ لیا، کاشتکاروں نے اپنے غلہ وغیرہ سے مدد کی ،تاجروں نے اپنے سرمایہ ودولت سے اس کوفروغ دیا، بالخصوص رئیس الملۃ ، جناب سیٹھ غلام مصطفی صاحب نے اپنی دولت اور سرمایہ سے اسے خوب خوب نوازا، ان کا یہ عظیم الشان کارنامہ سنہری حروف سے لکھنے کے لائق ہے کہ اس ادارہ سے متعلق جملہ تعمیرات خواہ مسجد ہو یا درس گاہیں سب میں ان کی توجہ خصوصی شامل رہی، اس ادارہ کے ساتھ ان کے خلوص وعقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی حالت میں اس کوفراموش نہیں کرتے ، بلکہ اپنے بیشتر اوقات میں اس کی تعمیر وترقی کے لئے سوچتے رہتے ہیں، ابھی ایک تعمیر ختم نہیں ہوتی کہ دوسری تعمیر کا پروگرام مرتب کرتے ہیں ،یعنی ان کا ذہن وفکر ہمیشہ اس ادارہ کی طرف مائل رہتا ہے، چنانچہ اس احقر سے ممبئی کی ایک ملاقات میں بڑی بے خودی کے ساتھ انھوں نے کہا تھا کہ آپ جمدا شاہی تشریف لے چلیں اور ہمارے ادارے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں، میں آپ کی قیام گاہ اور جامع مسجد کی تعمیر سے **ان شاءاللہ** جلد ہی فارغ ہو جاؤں گا،تو پھر میرے لئے مدرسہ ہی مدرسہ ہے، آپ یہ دیکھیں کہ علیمیہ کا فوٹو میری اس دوکان پر لگا ہوا ہے، اور میرے گھر پر بھی آویزاں ہے تا کہ میں سوتے جاگتے ،اٹھتے بیٹھتے کسی حال میں اپنے دارلعلوم کو نہ بھول سکوں۔

سیٹھ صاحب موصوف کے یہ سب جملے اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اس ادارہ کے ساتھ ان کا روحانی تعلق عشق وشیفتگی کی حدتک پہنچا ہوا ہے۔

بلاشبہ موصوف اس ادارہ کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے امکان میں ہوگا **ان شاءاللہ** کرتے رہیں گے، لیکن اس کی ترقی کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا جارہا ہے کہ اس کا بار کسی ایک کے کندھے پر ڈال کر ہم کو مطمئن نہیں رہنا چاہیے، اسی سال اس کی تعمیری ترقی اور ٹھوس تعلیم کے سلسلہ میں جو اقدام کیے گئے ان سے میرے اندازے کے مطابق ادارے کے سالانہ اخراجات میں تقریبا ستر، اسی ہزار روپے کا اضافہ ہوا جن کی تفصیل یہ ہے، آپ حضرات غور سے سماعت فرمائیں:

(ا) شعبہ تجوید وقراءت کی تعلیم نو، جس میں مزید دو قاریوں کا اضافہ کیا گیا اور اس

شعبہ کا صدر جماعت کے نامور قاری جناب قاری عبدالحکیم صاحب (**علیہ الرحمہ**) کو مقرر کیا گیا، بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شعبہ **ان شاء اللّٰہ العزیز** قاری صاحب موصوف کی زیر نگرانی لائق و فائق قاریوں کو پیدا کرے گا، جو اپنی سنی جماعت کی سرخروئی کا باعث ہوں گے، اراکین کی خواہش تھی کہ حفظ قرآن و قراءت کی دستار و سند ٹھوس تعلیم کے بعد دی جائے، محض نام و نمود کے لیے تکمیل کے بغیر سند فراغت نہ دی جائے، ان کا حوصلہ بلند استحسان کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(۲) درجات عالیہ میں اساتذہ کا اضافہ ہوا، مدرسین و اساتذہ کی تعداد اتنی نہ تھی کہ اعلی تعلیم کے انتظام کرنے میں سہولت ہو، تعلیم کو اونچے معیار پر پہنچانے کے لیے مزید اساتذہ کی تقرری ضروری تھی، چنانچہ اس سال احقر کے علاوہ مزید دو علما کا تقرر ہوا، ان تقرریوں سے تعلیمی نظام کو حسن و خوبی سے جاری رکھنے میں کافی مدد ملی۔

(۳) نصاب تعلیم مرتب کر کے باضابطہ طور سے جاری کیا گیا، اس میں تین امور کا خاص طور سے لحاظ کیا گیا، ایک یہ کہ نصاب تعلیم سے طلبا کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ اجاگر ہو، دوسرے یہ کہ قرآن فہمی کی طرف طلبا کا ذہن زیادہ مائل ہو، اور عربی ادب و انشا پر ان کو زیادہ دسترس حاصل ہو، تیسرے یہ کہ زمانے کے مقتضیات کے مطابق انگریزی زبان و ادب کی تعلیم خاص طور سے ہو، ابتدائی درجہ سے آخری درجہ تک انگریزی کو لازمی طور سے نصاب میں شامل کیا گیا۔

(۴) ہمارے نصاب تعلیم کی بنیادی کمزوری یہ تھی کہ مدت دراز تک طلبا قواعد و گرامر پڑھنے کے باوجود عربی بولنے اور لکھنے پر قادر نہیں ہوتے تھے، اس کمزوری کو بھی دور کرنے کی کوشش اس طرح کی گئی کہ الگ سے عربی ادب و انشا پڑھانے کے لیے ایک نوجوان عالم کا تقرر کیا گیا، انہوں نے ادب و انشا کی کتابوں کے پڑھانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''**النادی العربی**'' کے نام سے ایک بزم قائم کی جس میں طلبہ ہفتہ کے پروگرام میں تقریری و مکالماتی مشق کرتے ہیں، جس کی نگرانی وہ خود کرتے ہیں، **ان شاء اللّٰہ العزیز** جلد

ہی اس کے فوائد واضح ہو کر سامنے آئیں گے۔

(۵) **دارالافتا:** میرے تصور سے بالاتر بات تھی کہ نسبتاً اس چھوٹے سے ادارے میں افتا کا کام ہو سکے گا، اس لئے جب مولانا مفتی عبدالسلام صاحب کا تقرر درس وتدریس کے علاوہ فتوی نویسی کے لیے ہوا تو میں سوچتا تھا کہ ابھی ابتدائی مرحلے میں اس کا کام بہت محدود ہوگا، مگر دارالافتا میں استفتا کی تعداد روز بروز بڑھتی ہوئی نظر آرہی ہے، یہاں سے مدلل ومفصل فتاوے لکھے جاتے ہیں، مجھے مسرت ہے کہ مفتی صاحب اس سلسلہ میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کر رہے ہیں۔

(۶) دارالعلوم کی طرف سے درسی وغیر درسی کتابوں کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا، اس سال ہزار روپیوں کی کتابیں خریدی گئیں، اور نہایت خوشی کی بات یہ ہے کہ جمد اشاہی کے ایک نوجوان جناب اعجاز احمد صدیقی نے جو سعودی عربیہ میں سروس کرتے ہیں دارالعلوم سے اپنے قلبی لگاؤ اور دینی جذبہ کا اظہار اس طرح کیا کہ عربی زبان کی سب سے بڑی اور مشہور ومستند لغت کی کتاب ''لسان العرب'' فراہم کی، جو ضخیم پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی مالیت کئی ہزار روپیہ ہوگی، اللہ تعالی ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور ان کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

(۷) **تعمیر جدید:** اس سال تعمیر کا کام بھی چار پانچ مہینوں کے اندر بڑی تیزی کے ساتھ ہوا، احقر کی قیام گاہ اور فلش سسٹم بیت الخلا وغیرہ کی تعمیر پر تقریباً اسی نوے ہزار روپیے صرف کیے گئے، آپ حضرات اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس محدود آمدنی والے ادارے نے چند مہینوں کے اندر تعمیر کا کتنا بڑا کام انجام دیا۔

ان تمام تفصیلات سے عیاں ہو کر یہ بات آپ کے سامنے آرہی ہوگی کہ تعلیمی و تعمیری ترقی کی رفتار اس ادارے میں تیز کر دی گئی، جس کے فوائد وثمرات جلد ہی حاصل ہونا شروع ہو جائیں گے، ظاہر ہے کہ ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ کسی ایک کاندھے پر نہیں ڈالا جا سکتا نہ ہی کوئی قوی سے قوی کاندھا اس کو برداشت کر سکتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ

ہماری جماعت کے مخیر حضرات تھوڑا تھوڑا سہارا دیں، آج جب کہ دوسری جماعتوں اور گروہوں کے لوگ جو فاسد عقائد اور غلط نظریات کے حامل ہیں، اور مسلمانوں کو بدعقیدگی وگمراہی کے دلدل میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں، بڑی تیزی کے ساتھ اپنے مخصوص ذرائع آمدنی سے لوگوں کے ذہن وفکر کو متاثر کرنا چاہتے ہیں، اسی ضلع کے مرکزی مقام شہر بستی میں بڑی جد وجہد اور دوڑ دھوپ جاری ہے، تو ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہیے، کامل توکل و اعتماد کے ساتھ آیئے! محمد نبی امی **فداہ ابی و امی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جشن ولادت مناتے وقت اس مبارک ومسعود شب میں ایک ساتھ یہ عزم مصمم کریں کہ اپنے اس دینی قلعہ کو مستحکم اور ٹھوس بنائیں گے، جہاں سے علما فضلا پیدا ہوکر باطل پرستوں کی سرکوبی کا فریضہ انجام دیں گے، اور شیشہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ومتفق ہوکر یہ عہد کریں کہ اپنی کم مائیگی کے باوجود حق و صداقت کے اس مینار کو بلند رکھنے میں اپنی پوری توانائی صرف کریں گے، خداے تعالی ہمارے ارادوں میں استحکام بخشے آمین۔

آخر میں ہم حضرت عزیز ملت سربراہ الجامعۃ الاشرفیہ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت کو منظور کر کے زحمت سفر فرمائی اور اپنے کلمات طیبات سے نوازنے کے لیے یہاں تشریف لائے۔

اور بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم الحاج سیٹھ احسان اللہ صاحب کا شکریہ نہ ادا کریں جن کو قوم کی زبان نے بجا طور پر محسن ملت کے لقب سے یاد کیا، اس لیے ہم ان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے مسرت وشادمانی کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے کرم فرما کر مصروفیتوں کے باوجود یہاں تشریف لائے، یہ انھیں کی ذات گرامی ہے جس نے قوم کی سربلندی کے لیے اپنی داد ودہش اور جود وسخا کا دریا جاری کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول فرمائے، آمین۔

❁❁

خطبہ صدارت

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد!

حضرات علمائے ملت اسلامیہ، لائق احترام سامعین ،معزز طلبہ، شریکِ اجلاس دانشوران قوم وملت!

السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

دارالعلوم علیمیہ جس کا نام ابتدامیں مدرسہ علیمیہ تھا ،یعنی اس عظیم ہستی کی طرف منسوب کر کے اس کو مدرسہ علیمیہ کہا جاتا تھا جس کو اگر مبلغ اعظم کے لقب سے یاد کیا جائے تو زیادہ صحیح بات ہوگی، اس لئے کہ اپنے اور پرائے سبھی آپ کے تبلیغی کارناموں سے متاثر نظر آتے ہیں، وہ آپ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں، کیوں کہ حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی مدنی رحمۃ اللہ علیہ دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی شمع فروزاں لے کراس کے احکام وشرائع کی تکمیل فرماتے رہے، انہوں نے تمام امت مسلمہ کی طرف سے یہ فرض کفایہ تن تنہا ادا کر دیا، بلکہ بحسن وخوبی ایسے دور میں یہ فریضہ ادا فرمایا جب کہ آمدورفت کی برق رفتار سہولتیں فراہم نہیں تھیں، اگر وہ ادا نہ فرماتے تو بارگاہ ایزدی میں سب سے باز پرس ہوتی، اورسب کو محاسبہ کا سامنا کرنا پڑتا۔

میں نے عرض کیا کہ یہ فرض کفایہ ہے کیوں کہ قرآن حکیم میں ارشادفرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ (التوبة:١٢٢)

ایسا تونہیں ہوسکتا کہ تمام مسلمان طلب علم کے لئے اپنے گھروں سے نکل جائیں، تو

کیوں نہیں ایسا کیا جاتا کہ ہر طبقہ سے ایک جماعت نکل پڑے جو دین کا علم حاصل کر کے اپنی قوم اور دوسری اقوام میں لوگوں کو متنبہ کرتی ، اس امید پر کہ وہ برائیوں سے بچیں گے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمانوں میں ایک گروہ ہونا چاہئے جو اسلام کے عقائد وعبادات ،معاملات و اخلاقیات پر گہری نظر رکھتا ہو، اسی عظیم مقصد کے لیے مدارس اسلامیہ کا وجود عمل میں آیا ،ان ہی مدارس میں دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی یو پی بھی ہے، ایک چھوٹے سے گاؤں میں دینداروں اور خدا پرستوں نے اپنی محنت و کاوش سے جس کی بنیاد رکھی ، خداے تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے ،میں ادارہ کی طرف سے ایسے لوگوں کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے کے ساتھ دعاے مغفرت کرتا ہوں کیوں کہ انھوں نے اپنے خلوص کا زبردست مظاہرہ کیا، انہیں کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ اس ادارہ نے مبلغ اسلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بڑا علمی کارنامہ انجام دیا، تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دور دراز ملکوں میں بھی عظیم الشان شہرت حاصل کی ،اس کے تعلیم یافتہ علما وفضلا ،حفاظ وقرا ہندوستان کے مختلف حصوں اور بیرونِ ہند کے متعدد مما لک میں اپنی اپنی خدمات سے لوگوں کے قلوب کو مسخر کر رہے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی آبادی کے خلوص نے ایسی شہرت حاصل کی کہ اس کو دور جدید میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہ کیسے ہو گیا؟ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو یقین ہوگا کہ حضرت مبلغ اسلام علیہ الرحمہ اور ان کے فرزند بلند اقبال قائد اہل سنت ،حضرت علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیوض کا بحر بے کراں اس ادارے کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے، چنانچہ یورپ وایشیا، امریکہ و برطانیہ سمندر پار کے ملکوں میں بھی اس کے لکھے پڑھے دین اسلام کی تبلیغ میں سرگرم عمل ہیں۔

آج سے تقریباً چالیس پچاس سال پیشتر جمدا شاہی کی آبادی غربت و افلاس کا شکار تھی ،لیکن جب سے انھوں نے ان دو عظیم شخصیتوں کے ساتھ اپنی وابستگی کی تو انقلاب عظیم برپا ہوا، یہ کوئی صنعتی شہر یا قصبہ نہیں ہے بلکہ ایک گاؤں ہے، لیکن اس کی قسمت کا ستارہ

عروج پر ہے، کیوں کہ جب باہر سے آنے والا کوئی شخص عظیم درس گاہ میں پھیلی ہوئی عمارتوں کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا ہے تو وہ دنگ رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اللہ کے مخلص اور دیندار بندوں کی کاوشوں کا بہت بڑا اثر ہے کہ ادارہ عروج وارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے بلند وارفع مقام پر پہنچ گیا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اور یہ تحسین کے الفاظ اس کی زبان سے نکلتے ہیں کہ: تعلیم وترقی کے میدان میں اس کی برق رفتاری واقعۃً حضرت مبلغ اسلام کی روحانیت کا کرشمہ ہے۔

بلاشبہہ اس کی تعمیر وترقی حیرت واستعجاب میں ڈال دیتی ہے، البتہ اس مقام پر کسی کے دل میں یہ خلش پیدا ہو سکتی ہے کہ اپنے منہ سے اپنی تعریف ہو رہی ہے، لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ زیر تعمیر عظیم الشان عمارت اور اس کے عزائم و منصوبے میری ہر بات کی تصدیق کریں گے، اور جتنے اہل قلب ونظر ہیں اس بات کو سوچنے کے لئے مجبور ہوں گے کہ ادارہ علیمیہ اپنی منزل کی جانب صحیح سمت میں رواں دواں ہے، اس کی مادی توجیہ حسب ذیل ہے:

(۱) اپنے منفرد نظام تعلیم اور متوازن نصاب تعلیم کے باعث یہ ادارہ اتنا پرکشش ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے نادار طلبہ داخلہ کے لیے یہاں آتے ہیں، اب تو دوسرے ممالک کے بھی طالبان علوم اسلامیہ یہاں قطار در قطار نظر آنے لگے ہیں، ۱۰؍شوال المکرم کو جب ادارہ کھلتا ہے تو داخلہ کی کاروائی لائق نظارہ ہوتی ہے، ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اس شبہے میں پڑ سکتا ہے کہ یہ کوئی درگاہ ہے جہاں لوگ فیض روحانی کے لئے آئے ہوئے ہیں، لاریب یہ درگاہ ہے، لیکن محض درگاہ نہیں، بلکہ تعلیمی میدان میں سرفروشی کے لیے ایک مستحکم قلعہ ہے۔

(۲) اس ادارہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور ذہن سازی کی طرف توجہ دینے کے علاوہ صوم وصلوٰۃ کا پابند رکھنے کی عملی تربیت دی جاتی ہے، تا کہ یہاں سے فارغ ہو کر نکلنے والے اپنے اعمال وکردار کے لحاظ سے اسلام وسنیت کی صحیح نمائندگی اپنے غیروں کے درمیان کر سکیں۔

(۳) پرائمری درجات میں بچوں اور بچیوں کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں ہے، ان میں تربیت یافتہ باذوق معلمین ومعلمات احساس ذمہ داری کے ساتھ تعلیم دیتے ہیں، علاوہ ازیں اس کے ماتحت مدرسۃ البنات یعنی لڑکیوں کا اسکول بھی چلتا ہے، اس میں فارغہ وفاضلہ معلمات تعلیم دیتی ہیں، جن کی قابلیت وصلاحیت پر حرف گیری وانگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔

(۴) اس عظیم الشان ادارہ میں تقریباً سات سو ایسے طلبہ درجات عالم، فاضل، منشی، کامل ودرجات عالمیت وفضیلت ودرجات حفظ وقراءت میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جن کی خورد ونوش، دوا کا انتظام، اور بغیر کسی معاوضہ کے درسی کتابوں کی فراہمی ہوتی ہے۔

(۵) اس ادارہ کا یہ طرّۂ امتیاز ہے کہ یہاں کا منہاج تعلیم عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا گیا ہے، لیکن یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ دینی تعلیم میں کسی قسم کی خامی وکمی کا احساس پیدا نہ ہونے پائے، چنانچہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی زبان وادب میں کم ازکم انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، حساب وسائنس باقاعدہ طور سے پڑھایا جاتا ہے، جس کے لیے ماہر اساتذہ کی ایک ٹیم اپنی نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیتی ہے۔

یہ ہے مختصر خاکہ اس ادارہ علیمیہ کا جو ابتداء مدرسہ علیمیہ تھا، پھر ترقی کرتے کرتے دارالعلوم علیمیہ ہوگیا، لیکن اس کی یہی آخری منزل نہیں ہے، اس کی منزل بہت دور ہے، اگر معاونین ومخلصین نے اپنی جدوجہد جاری رکھی تو یہ جامعہ علیمیہ بن کر نمودار ہوگا، یعنی صاف لفظوں میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''علیمی یونیورسٹی'' منصۂ شہود پر آئے گی، جس کا ایک وائس چانسلر ہوگا، اس کے تحت مختلف کالجز اور شعبے ہوں گے، یہ دنیا بھر میں اپنے علمی تفوق سے مشہور ومعروف ہوگا، میری نگاہیں مستقبل کے آئینے میں دیکھ رہی ہیں کہ اس کی رفتار ترقی رکنے والی نہیں ہے، منزل گوکہ دور ہے تاہم وہاں تک پہنچنا مستبعد نہیں ہے، شاعر کے بقول:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

میرا یہ دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے، بلکہ رات کی تنہائی میں بھی جب میں علیمیہ کے متعلق غور وفکر کرتا ہوں تو میرا وجدان شہادت دیتا ہے کہ ضرور جامعہ علیمیہ اپنے تمام لوازمات

وضروریات کے ساتھ ایک چھوٹی سی آبادی میں نمودار ہوگا، کیوں کہ اکابر اہل سنت کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں، اوران کے روحانی برکات بھی، ظاہر ہے ایسی خوش آئندبات میں آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں تو یہ احساس مجھ کو برابر ستارہا ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ تصور کرلے کہ یہ محض خیالات کی پرواز ہے، لیکن حقیقت کبھی خیالات کا پرتو ہوتی ہے تو اسی کے مطابق اس مادی دنیا میں بہت حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں، ان ہی میں سے دارالعلوم علیمیہ بھی ہوگا، **ان شاءاللہ**، بس آپ آگے بڑھیں، اور چند قدم اپنے قائدین کے ساتھ چلیں، دعا ہے کہ مولائے قدیر جامعہ علیمیہ، کے سارے منصوبے وعزائم تکمیل تک پہنچائے، اور قوم و ملت کی سرخروئی کا ذریعہ بنائے، آمین ثم آمین۔

تقدیم

بر کتاب مسائل سود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداو مصلیا

میں سخت بیمار و علیل تھا، دل و دماغ بہت متاثر تھے، محب مکرم مولانا معین الحق صاحب علیمی کی طلب پر علاج کیلئے ۱۹؍جولائی ۱۹۹۱ء بمبئی پہنچا، اور یہی ''سفر علاج'' خدائے قدوس کی کرم فرمائی کا سبب بن گیا، کہ ہمارے قدیم ملاقاتی اور مخلص ومحترم جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب ڈوسا سے ملاقات ہوئی، تو وہ بڑی نیازمندی اور نہایت خلوص ومحبت سے پیش آئے، ان کے توسط سے بمبئی کے ایک مشہور ومعروف معالج کا علاج ہوا، جب طبیعت کچھ رو بصحت ہوگئی اور جسم میں اتنی توانائی آگئی کہ آنے جانے میں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہ رہا، تو حاجی صاحب موصوف ایک روز اپنے فرزند جناب عبدالمجید صاحب کے ہمراہ اپنے برادر کلاں عالی مرتبت الحاج احمد عمر صاحب ڈوسا کے دولت کدے پر مجھ کو لے گئے، یہ حاجی صاحب مشہور صاحب خیر، مشائخ کے معتقد، اولیاے کرام کے نیازمند، علماے اسلام سے گہری عقیدت و نیاز رکھنے والے، مذہباً حنفی، مسلکاً بریلوی، حضرت شیر بیشۂ اہل سنت علامہ ومولانا حشمت علی خاں صاحب **نور اللہ مرقدہ** کے مرید باصفا ومعتقد خاص ہیں، بڑی تکریم واحترام کے ساتھ پیش آئے، نہایت خوش اخلاقی وخندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے میری خیریت دریافت کی، میں نے مختصراً اپنی علالت اور علاج کے بارے میں کچھ باتیں بتا کر یہ کہا کہ خداے شافی جس حالت میں رکھے وہی بہتر ہے۔

یہ دونوں برادران آپس میں بڑی بے تکلفی سے محو گفتگو ہو گئے، اور ایسی زبان میں بات کر رہے تھے کہ میں ان کی باتوں کو قطعاً نہیں سمجھ رہا تھا، کافی دیر تک بات چیت کے بعد محترم جناب حاجی احمد عمر صاحب ڈوسا نے میری طرف مخاطب ہو کر یہ کہا کہ آپ ایک کتاب

تصنیف فرمادیں،جس میں بینکوں سے ملی ہوئی زائد رقم کا حکم تحریر فرمائیں،اور وہ مسائل جو موجودہ عہد سے تعلق رکھتے ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کے بھی احکام بیان فرمادیں، میں نے حاجی صاحب موصوف سے کہا:''اس وقت میں بیمار ہوں، میرا علاج چل رہا ہے، ذہنی و دماغی الجھن میں مبتلا رہتا ہوں،اور چونکہ میں ایک مشہور ومعروف دارالعلوم کا صدر مدرس ہوں،اس لئے میری مصروفیتیں بھی بے حد بڑھی ہوئی ہیں،تصنیف وتالیف کے لیے وقت نکالنا مشکل امر ہے،البتہ آپ جیسے مخلص ،ملت کے خادم کی فرمائش بایں طور پوری کرنے کی کوشش کروں گا کہ میرے شاگردوں میں بہت سے ایسے اہل علم وارباب دانش پائے جاتے ہیں، جواعلیٰ درجے کی علمی صلاحیت رکھتے ہیں،اوران میں سے بعض فتویٰ نویسی کے کام پر مامور بھی ہیں، ان میں سے دوایک کوطلب کر کے اپنی نگرانی میں ایسی کتاب کی تالیف کا کام لوں گا،لیکن میرے یہ عزیز اہل ثروت نہیں ہیں، بلکہ معمولی مشاہروں پر دین حنیف کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے ہیں،اس لیے جب میں ان سے کام لوں گا تو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کی مالی خدمت بھی کرنی پڑے گی''۔

حاجی احمد عمر ڈوسا صاحب نے برجستہ کہا کہ اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں جو بھی اخراجات آئیں گے میں ان کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں،اورآپ کے وہ شاگرد جنھیں آپ اس کام پر مامور کریں گے ان کو میں ماہ بماہ مشاہرہ بھی ادا کرتا رہوں گا ،آپ اس کتاب کی تصنیف اوراس کی کتابت وطباعت کے مصارف کا ایک تخمینہ دوتین روز کے اندر میرے یہاں ارسال فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

اپنے جن شاگردوں کے ذمے یہ اہم علمی کام لگانا ممکن تھا،ان میں سے ایک مولانا الحاج حفیظ اللہ صاحب نعیمی سلمہٗ استاذ دارالعلوم فضل رحمانیہ پچپڑوا بلرام پور اور دوسرے محب مکرم عزیز سعید جناب مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور تھے ،ان دونوں علمائے کرام کا تعارف میں نے ان الفاظ میں کرایا کہ:''میرے یہ دونوں شاگرد بڑے لائق وفائق،نہایت نیک طینت ،اسلامی علوم وفنون میں ایک گونہ بصیرت و دسترس

رکھنے والے، متدین عالم دین ہیں، انہیں دونوں علماے کرام سے کام لینے کا ارادہ ہے‘‘ حاجی صاحب نے فرمایا کہ حضرت آپ جس سے چاہیں کام لیں یہ آپ کی مرضی پر موقوف و منحصر ہے، ہم کو تو صرف اخراجات کا تخمینہ چاہیے۔

میں حاجی صاحب کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، اور خوش خوش وہاں سے اس خیال کے ساتھ واپس ہوا کہ گویا میری علالت اور اس کے علاج کے لیے بمبئی کا سفر ایک اچھے اور اہم کام کے لیے بہانہ ہے، خداے قدوس اس حقیر ناچیز سے اپنے دین کا کام لینے کی سبیل پیدا فرمارہا ہے۔

اپنی قیام گاہ (مصطفیٰ بازار) بمبئی پر واپس آیا، عزیز سعید مولانا معین الحق علیمی سلمہٗ ربہ (علیہ الرحمہ) سے اپنی اس ملاقات کی تفصیل بتائی، اور ان کو یہ بھی بتایا کہ حاجی صاحب نے تخمینہ طلب کیا ہے، اس پر وہ بھی بہت خوش ہوئے، میں نے کہا کہ ان کے سامنے کیا اندازہ پیش کروں، سمجھ میں نہیں آتا، مولانا علیمی صاحب نے کہا کہ حضرت اگر آپ اس کتاب کا کام مولانا حفیظ اللہ صاحب و مولانا مفتی نظام الدین صاحب کو اپنے یہاں طلب کر کے لینا چاہتے ہوں خواہ یہ دو تین مہینے وقفے وقفے کر کے ہو تو ان کا تصنیفی مشاہرہ کم از کم تین ہزار روپیہ ہونا چاہیے، اس طرح دس بارہ ہزار روپیے ان کی تنخواہوں میں صرف ہوں گے، اب کتاب کی کتابت و طباعت میں کیا خرچ آئے گا میں اس کا اندازہ نہیں بتا سکتا، کیوں کہ وہ کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے متعین ہوگا، فی الحال آپ حاجی صاحب سے بیس ہزار روپئے کا تخمینہ بتا دیں، تنخواہوں اور کتابت و طباعت کے لئے اگر یہ رقم پوری ہو جائے تو مزید طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر کم پڑ جائے تو اس کا حساب بھیج کر جو کمی ہو اس کو بلا جھجک طلب فرمائیں، میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ بہت دیندار، صاحب خیر، دینی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے اور ملت اسلامیہ کے سچے خادموں میں شمار کیے جاتے ہیں، ساتھ ہی وہ علما کے قدر نواز، نیک طینت و با اخلاق مسلمان ہیں، وہ فوراً آپ کی اعانت فرمائیں گے، لیکن حضرت یہ تصنیف نہایت شاندار، دیدہ زیب و دلفریب زبان و

بیان کے اعتبار سے دلچسپ، اور ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہو۔

مولانا علیمی صاحب کی اصابت رائے معروف و مسلم ہے، چنانچہ حاجی ابراہیم صاحب ڈوسا کے یہاں اس نیت سے گیا کہ ان کو ساتھ لے کر حاجی احمد عمر صاحب کے دولت کدے پر جاؤں گا، لیکن حاجی صاحب اپنی مصروفیت یا کسی مصلحت کی وجہ سے میرا ساتھ نہ دے سکے، میں ایک طالب علم کے ہمراہ حاجی صاحب موصوف کے بنگلے پر پہنچ گیا، وہ کہیں گئے تھے ابھی انتظار میں چند منٹ گزرے ہوں گے، کہ وہ واپس تشریف لائے، سلام و مصافحہ کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ حیرت انگیز اور خلاف توقع تھی۔

انہوں نے کہا کہ ضرور میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا، اور کتاب کے اخراجات کا تخمینہ بھی طلب کیا تھا، لیکن اب میں معذور ہوں میں کچھ نہیں کر سکتا، اس گفتگو میں ان کا تیور اور طرز کلام نسبتہ بدلا ہوا تھا، انہوں نے مزید یہ کہا کہ گزشتہ روز آپ نے فرمایا تھا کہ دار العلوم اشرفیہ کے ایک مفتی جناب مولانا نظام الدین صاحب سے یہ کتاب تصنیف کرواؤں گا، اور ان کے متعلق کل ہی یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مفتی صاحب ہیں، جنہوں نے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس بات کی صراحت ہے کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال کر کے نماز پڑھنا جائز ہے، دار العلوم اشرفیہ سنیوں کا ایک عظیم الشان ادارہ ہے، انہوں نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف یہ کہ دار العلوم میں اختلاف و انتشار پیدا کیا ہے، بلکہ میرے مرشد برحق حضور شیر بیشۂ اہل سنت علامہ و مولانا حشمت علی خان صاحب علیہ الرحمہ اور حضور مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی ہے، میں ایسے مفتی صاحب سے کام لینے کے حق میں نہیں ہوں۔

حاجی صاحب ایک دیندار، اللہ والوں کی بارگاہ میں اپنی نیاز و اخلاص کی پیشانی جھکانے والے، اپنے مرشد برحق حضور شیر بیشۂ اہل سنت علیہ الرحمہ کے عاشق زار، بلکہ ان کے جاں نثار و فدائی کے لئے یہ بات بڑی غمناک و کرب ناک تھی، کہ اپنی جماعت کے ایک عالم دین نے ان کے مرشد کے فتوے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر دی، جذباتیت اگرچہ بالعموم مستحسن امر نہیں ہوتی ہے، تاہم دینی معاملات میں جن کے احساسات بیدار رہتے ہیں

اور مسائل شرعیہ میں جو اپنے مشائخ کے مسلک کے پابند ہوتے ہیں، اگر ان کے اندر ایسا جذباتی عنصر نہ پایا جائے تو گویا درحقیقت اپنی نیاز وعقیدت کی پیشانی ظاہراً جھکاتے ہیں، اور باطن میں ان کا دل عقیدت ومحبت سے لبریز نہیں ہوتا، اس موقع پر اگر حاجی صاحب کے بجائے کوئی دوسرا ہوتا، اور وہ اپنے مرشد کا عاشق زار ہوتا تو وہ بھی مضطرب و بے قرار ہوجاتا، اس لئے میرے اپنے خیال میں حاجی صاحب کی یہ بات استحسان کی نگاہ سے دیکھنے کے لائق ہے، کہ علماے حق کی بارگاہ میں اتنے زیادہ نیاز مند ہیں، یہی ان کی نیازمندی، ان کی حرارت ایمانی بلکہ قوت ایمانی کو برقرار رکھتی ہے۔

جب وہ اپنی عقیدت مندانہ گفتگو سے فارغ ہوگئے، تو میں چند ثانیہ تک حیرت میں ڈوبا ہوا، سکوت کے عالم میں رہا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی گفتگو کیسے آگے بڑھاؤں، اور کس عنوان سے ان سے بات چیت کا آغاز کروں، بجائے کچھ کہنے کے میں نے ان کی طرف دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی کا تعارفی کتابچہ پیش کیا، اور صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ حاجی صاحب اگر موقع میسر آئے تو یہ چند ورقی کتاب ایک نظر ضرور دیکھ لیں، انہوں نے کہا کہ میں اس کو کیا کروں گا؟ (پھر میری طرف کتاب بڑھا کر) یہ کہا کہ اگر یہ کتاب میرے یہاں رہی تو اس کو دریا بُرد کر دیا جائے گا، اس انداز گفتگو پر برجستہ میں نے ان سے یہ محاسبہ کیا کہ ''دریا برد'' کا لفظ کتاب کے بارے میں استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس سے اہانت کا ایہام ہورہا ہے، اور اس میں قرآن حکیم کی آیت کریمہ اور احادیث شریفہ درج ہیں، اس لیے یہ لفظ نہیں بولنا چاہیے، میں نے اپنے طور سے سمجھا تھا کہ شاید حاجی صاحب جذبات کی رو میں ایسا کہہ رہے ہوں، لیکن انہوں نے نہایت سنجیدگی ومتانت بلکہ نرم لہجے میں کہا کہ میرا منشا وہ نہیں تھا، جو آپ نے سمجھا بلکہ بات یہ ہے کہ میرے یہاں ایسی کتابیں اور کتابچے آتے رہتے ہیں، جب وہ کافی مقدار میں جمع ہوجاتے ہیں، تو میں ان کو ادب واحترام کے ساتھ کپڑے میں بندھوا کر سمندر میں ڈال دیتا ہوں، تاکہ یہاں رہ کر ان کی بے ادبی نہ ہو، میرے کہنے کا مقصد یہی تھا، میں نے کہا حاجی صاحب آپ نیک

اور دیندار آدمی ہیں، آپ کی زبان سے جو الفاظ نکل گئے ان میں ایک طرح اہانت کا پہلو ضرور مضمر ہے، اس پر آپ توبہ کرلیں، تو کوئی حرج نہیں، توبہ واستغفار مومن کی شان ہے، حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام خطاؤں اور گناہوں سے محفوظ و معصوم تھے، آپ سے صغائر و کبائر کا صدور علمائے حق کے نزدیک محال ہے، لیکن اس کے باوجود روایتوں میں آیا ہے کہ ایک ہی مجلس میں ستر بار استغفار پڑھا کرتے تھے۔

میں محسوس کررہا تھا کہ میری مخلصانہ تنبیہ سے حاجی صاحب بہت متاثر ہورہے ہیں، ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہورہا تھا کہ ان کو اپنی باتوں پر یقیناً ندامت ہو رہی ہے، فوراً انہوں نے توبہ کیا، اور استغفار پڑھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا، میں ان کی اس مومنانہ شان سے بہت خوش ہوا، بالعموم جن کو دنیاوی وجاہت حاصل ہوتی ہے یا جو صاحب ثروت ہوتے ہیں، اگر ان کو ان کی کسی غلط بات پر تنبیہ کی جائے، تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو قبول کریں، الٹے وہ اپنی غلط بات کی توجیہ و تاویل عجیب ڈھنگ سے کرتے ہیں، اور تنبیہ کرنے والے عالم دین کی تعظیم و تکریم کے بجائے ان سے متنفر ہوجاتے ہیں، لیکن ہمارے حاجی صاحب کا معاملہ اس کے برعکس رہا، ابتداء ان کا انداز گفتگو سخت تھا، ان کے کلام سے ان کے اندرونی احساسات کی عکاسی ہورہی تھی، مگر جب میں نے ''دریابرد'' والی بات پر ان سے توبہ واستغفار کا مطالبہ کیا، تو وہ بہت نرم پڑ گئے، اور وہ فروتنی و خاکساری کے ساتھ مجھ سے ہمکلام ہوئے، ان کی باتوں سے یک گونہ معذرت کا احساس ہورہا تھا، یہ ان کی بلندی کی دلیل کے علاوہ ان کی دیندارانہ روش سے بالکل ہم آہنگ تھا۔

بہرحال اس گفتگو کے بعد بڑی عزت و احترام کے ساتھ حاجی صاحب نے رخصت کیا، لیکن راستے بھر میں سوچتا رہا کہ ابھی چند گھنٹے پیشتر میرے ذہن کے اندر یہ خیال گردش کررہا تھا کہ میری بیماری بھی ایک عمل خیر کا بہانہ بن گئی، مگر آج کے واقعے نے ثابت کردیا کہ انسان کا خیال کچھ ہوتا ہے، اور خارجی دنیا میں اس کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے، جو مسرت کے بجائے غم کا باعث ہوتی ہے، انہیں خیالوں میں ڈوبا ہوا اپنی قیام گاہ واپس آیا اور عزم مصمم

کرلیا تھا کہ یہ عنوان اچھا ہے، اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود میں خود ہی اس موضوع پر کام کروں گا، خواہ اس راہ میں کتنی ہی دشواریاں پیش آئیں، اور چاہے میری کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے، تاہم عزم و حوصلے کے ساتھ مطالعہ کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنے اشہب قلم کو اس میدان میں تیز گام رکھوں گا، چنانچہ کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا، اس موضوع پر جتنی کتابیں مجھ کو دستیاب ہوئیں شاید ہی کوئی کتاب ہو جو میری نگاہ سے نہ گزری ہو، اس موضوع سے متعلق رطب و یابس باتیں بھی ملیں، اور اچھی باتیں بھی، مگر میرے مطالعے کی اہم کتاب فاضل بریلوی **رضی اللہ عنہ** کی فتاویٰ رضویہ رہی، مسلسل علماے کرام سے تبادلہ خیال بھی کیا، کیوں کہ اس سے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے، اور ہمہ دانی کا جو کیڑا ذہن کے نہاں خانے میں پرورش پاتا ہے، اس کو باہر پھینکنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس طرح یہ کتاب تھوڑی تھوڑی کر کے ذہن کے خلوت کدے سے صفحۂ قرطاس کی جلوہ گاہ میں آ ہی گئی، لیکن اب بھی یہ مسئلہ پریشان کن رہا کہ یہ کتاب منظر عام پر کیسے آئے گی؟ جتنی کچھ جانفشانی و جانکاہی اس حقیر تالیف کے سلسلہ میں برداشت کی گئی، اس کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں کا سابقہ رہتا ہو، مختلف گلستانوں سے پھولوں کا چننا پھر ان سے ایک حسین گلدستۂ علم تیار کرنا، وہ بھی اس حالت میں کہ قدم قدم پر کانٹوں سے دامن الجھ رہا ہو، اور ہر الجھاؤ سے ذہن وفکر متاثر ہو رہے ہوں، کوئی آسان کام نہیں ہے، پھر اگر یہ پر خار وادی طے کر لی گئی ہو، اور منزل مقصود پر اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے نہ پہنچ سکا یعنی کتاب منظر عام پر نہ آئی، تو کتنی ذہنی کوفت کی بات ہوگی، اور کتنے مایوسیوں کے کانٹے دامن امید سے الجھ کر عزم و حوصلے کو تار تار کر دیں گے۔

لیکن قدرت الٰہیہ ہر اس بندے کی یاوری کرتی ہے، جو نام و نمود سے بے نیاز ہو کر بلکہ گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار کر دینی خدمت کا فریضہ انجام دیتا ہو، علمی دنیا میں اگر چہ مجھ کو درس و تدریس کی راہ سے تھوڑا بہت جانا پہچانا جاتا ہے، لیکن شعلہ بار مقرروں اور خطیبوں یا بلند پایہ ادیبوں اور صحافیوں کی طرح مجھ کو عوامی شہرت حاصل نہیں ہے، کچھ مخصوص حلقے مجھ

سے ضرور آشنا ہیں، مگر ان سے کتاب کی طباعت کے سلسلے میں کسی اعانت کی امید رکھنا کارعبث ہے۔

یہ خدائے قدوس کی کارسازی ہے کہ زندگی میں پہلی باردارالعلوم محمدیہ بمبئی کے طلبہ کے امتحان کے لئے بمبئی ۱۷رشعبان المعظم ۱۴۱۲ھ کو پہنچا، امتحانات اور دیگر تقریبات میں شرکت سے فراغت کے بعد خیال آیا کہ جناب الحاج احمد عمر ڈوسا صاحب سے پھر ملاقات ہونی چاہیے، اس ملاقات کے لیے بھی ہمارے مخلص قدیم جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب ڈوسا وسیلہ بنے، ان کے ہمراہ ۲۴رشعبان المعظم ۱۴۱۲ھ کو حاجی صاحب کے آفس میں پہنچ گیا، انہوں نے بڑی خندہ پیشانی وکشادہ روئی بلکہ پرتپاک انداز میں اپنے اخلاق کا مظاہرہ کیا، کہ اپنی کرسی کو چھوڑ کر اپنی جگہ بٹھانا چاہا، میں نے ان کو ان کی کرسی پر بیٹھے رہنے کی فرمائش کی، جس وقت ہم لوگ پہنچے تھے، بہت سے علمائے کرام موجود تھے، تھوڑی ہی دیر میں ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوگئے، اب حاجی صاحب موصوف اپنی پرشکوہ عمارت کی چوتھی منزل پر مجھ کو لے گئے، اور جس ادب واحترام کا مستحق میں نہیں تھا، اس کے لائق انہوں نے مجھ کو تصور کیا، اور ایک امتیازی جگہ پر مجھے بٹھایا، اور خود مؤدب انداز میں میرے قریب بیٹھ گئے، وہاں انہوں نے کوئی طویل گفتگو نہیں کی، کتاب کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کر کے یہ کہا کہ حضرت جس کتاب کے لکھنے کا آپ سے تذکرہ ہوا تھا، وہ کتاب مکمل ہوگئی یا نہیں؟ میں نے کہا جلد ہی وہ تکمیل کے مرحلے میں داخل ہونے والی ہے، لیکن کتابت وطباعت اور اس کو منظر عام پر لانے کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے، انہوں نے کہا **ان شاء اللہ العزیز** اس دشواری کا بھی حل نکل آئے گا، یہ کہہ کر انہوں نے تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول فرمالی۔

اس طرح سے یہ کتاب ناظرین کرام کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے، اس میں کیا ہے؟ اور حقیر متعلم کو اس موضوع پر کتنی کامیابی حاصل ہوئی، اس کا فیصلہ ایسے اہل علم پر چھوڑتا ہوں جو کتابوں کے پڑھنے اور اس کی گہرائی میں اترنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، اب اس

مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاجی احمد عمر صاحب ڈوسا نے فرمائش کی یہی اس کتاب کا سبب تالیف بنی، اس بات کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا، لیکن میرے نزدیک اس کے سوا یہ بات بھی ہے کہ خدائے قدوس جب اپنے کسی بندے سے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے تو بے سروسامانی کے عالم میں بھی اسباب ووسائل پیدا فرما دیتا ہے، ورنہ میں کہاں؟ اور کسی کتاب کی تالیف کہاں؟ میں تو درس وتدریس کا آدمی ہوں، اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزر گیا۔

دعا ہے کہ مولا تعالیٰ میری اس کتاب کو قبول عام فرما کر مسلمانوں کو دین کے راستے پر گامزن رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اور اس ناکارہ اور اس کے والدین کی بخشش کا ذریعہ بنائے، نیز حاجی احمد عمر ڈوسا و حاجی محمد ابراہیم ڈوسا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ ان حضرات کو دنیا وآخرت میں سرخرو رکھے، اور ان کے عمل نیک اور حسن نیت کی بہترین جزا عطا فرمائے، آخر میں دعا ہے کہ رب کریم ان دونوں صاحبان کے والدین مرحومین کی قبروں کو رحمت و نور سے بھر دے، اور آخرت میں ان کو بلند مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

دعائیہ کلمات

بر کتاب نشان منزل (ماهنامه اهل سنت وپیام حرم کے اداریوں کا مجموعه)

حضرت مولانا فروغ احمد اعظمی صدر المدرسین دار العلوم علیمیہ **زید مجدہ** نے اولاً ماہنامہ ''اہل سنت'' ثانیاً ماہنامہ ''پیام حرم'' میں اداریے لکھے، جو اپنے موضوع وعنوان کے لحاظ سے نہ صرف جامع ومانع ہیں، بلکہ ان میں یک گونہ ندرت پائی جاتی ہے، ان اداریوں کو پڑھنے کے لیے ضعف بصر کی بنا پر وقت نکال نہ سکا لیکن جستہ جستہ دو تین اداریوں کا ضرور مطالعہ کیا ہے، بڑی مسرت یہ ہوئی کہ اسلوب بیان نہایت شگفتہ اور دل آویز ہے، اور جس عنوان پر قلم اٹھایا بالیقین اس کا حق ادا کر دیا ہے، مثلاً ''قرطاس وقلم کی فرماں روائی'' یہ غالباً پہلا اداریہ ہے، اس پر مولانا موصوف کے قلم کی روانی پورے آب وتاب کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے، اتنی عمدہ عبارتیں لکھی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے (۲) لہولہان فلسطین ولبنان اور یہودی عزائم (۳) مسلمانوں کا سالانہ عالمی اجتماع۔ حج (۴) چودہویں صدی ہجری کا ایک صوفی مجاہد (۵) اسلامی ہند: عروج وزوال کی تاریخی جھلک۔

ان عنوانات کو پڑھ کر مدیر اعلیٰ کے اسلوب بیان میں جو ندرت پائی جاتی ہے، اس کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے، تخیل کی بلند پروازی، ذہنی طہارت وسلیقہ مندی وغیرہ کی جھلکیاں صاف دیکھی جاسکتی ہیں، مدیر اعلیٰ کے اداریے ایسے نہیں ہیں، جن کو وقتی اور ہنگامی کہا جائے، کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور اس پر قلم کی جولانی دکھائی گئی ہو، عام طور سے جو اداریے لکھے جاتے ہیں، ان میں محض وقتی تقاضوں کی خانہ پری کی جاتی ہے، اس میں دوام واستمرار نہیں ہوتا، لیکن میری اپنی نگاہ میں جناب مولانا فروغ احمد اعظمی **زید مجدہ** نے جتنے اداریے تحریر فرمائے ہیں، وہ عرصۂ دراز تک نہ صرف ذہنوں کو متاثر کرتے رہیں گے، بلکہ ادب وصحافت کی دنیا میں ہمیشہ جگمگاتے ہوئے نظر آئیں گے، اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ

ان کے اداریوں کو جو مستقل مقالات کی شکل میں ہیں ،ان کو کتابی شکل میں جمع کیا جائے ،چنانچہ اس وقت میرے روبروان مقالات کا مجموعہ بنام ''نشان منزل'' موجود ہے جو دینی وعلمی دنیا کا حسین گلدستہ ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقہ وطفیل میں مولانا موصوف کے قلم میں مزید جولانی وروانی مرحمت فرمائے ،اورزمانے کے حوادثات وآفات سے محفوظ رکھ کران کودین اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دینے کی توفیق عطافرمائے ،آمین۔

منقبت درشان شیخ القرآن علیہ الرحمہ

شیخ قرآں ،صدرعلما،صاحب عزووقار
تیری فرقت میں ہوا چمن علیمی سوگوار

دے کےتم درس محبت چل دیئے سوئے جناں
بچہ بچہ اہل جمدا کا ہے غم میں اشکبار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ مفسر، شیخ قرآں ،رہنما جاتارہا
کشتئ اہل سنن کا ناخدا جاتارہا

تذکرہ کرتے رہیں گے صاحبان علم وفن
مسند تدریس کا حق آشنا جاتارہا

بزم عزیزی ،کیوں نہ ہو ماتم کدہ انور حزیں
حافظ ملت کا پیارہ باخدا جاتارہا

تعارف مولف

پیش کش: غلام سید علی علیمیؔ

نام: کمال احمد علیمیؔ نظامی

ولدیت: شاہ محمد

نسب: کمال احمد بن شاہ محمد بن راج بہادر بن چھٹکان۔

تاریخ ولادت: ۱۰رفروری ۱۹۸۵ء

جائے پیدائش و مستقل پتہ: مقام و پوسٹ رام نگر، ضلع بلرام پور، یوپی۔

سکونت: بچھیا گنج، جمدا شاہی، بستی، یوپی۔

ابتدائی تعلیم: مدرسہ عارف العلوم، رام نگر۔ پرائمری تک۔

متوسطات: دارالعلوم فضل رحمانیہ، پچپیڑوا، دارالعلوم ہدایت الاسلام، بمہیاں، بلرام پور۔ منشی و مولوی تک۔

اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی۔ عالمیت وفضیلت تک۔

اساتذہ: ☆ ماسٹر شہزاد، ماسٹر سعید، ماسٹر آیس صاحبان، اساتذہ عارف العلوم رام نگر۔ ☆ مولانا منیر احمد، ماسٹر نیاز، اساتذہ فضل رحمانیہ، ☆ حضرت علامہ محمد احمد صاحب، حضرت علامہ سعی محمد صاحب، حضرت ماسٹر اصغر علی صاحب وغیرہ، اساتذہ بمہیاں۔

☆ حضرت علامہ فروغ احمد اعظمیؔ، سابق پرنسپل علیمیہ جمدا شاہی، حضرت علامہ محمد تفسیر القادری قیامیؔ صاحب، قمر العلما حضرت علامہ محمد قمر عالم صاحب قادری، شیخ الحدیث علیمیہ جمدا شاہی، تاج الفقہا حضرت علامہ مفتی اختر حسین قادری، (صدر دارالافتا علیمیہ جمدا شاہی)

حضرت علامہ امید علی صدیقی صاحب، حضرت علامہ مفتی نظام الدین صاحب، حضرت علامہ محب احمد علیمیؔ، حضرت ماسٹر سراج الدین صاحب، حضرت مولانا حافظ منصور عالم علیگؔ صاحب، حضرت قاری حبیب اللہ صاحب، حضرت علامہ ڈاکٹر انوار احمد خان بغدادی، حضرت علامہ شفیق الرحمٰن صاحب، حضرت علامہ معراج الحق بغدادی صاحب، حضرت مولانا حافظ وقاری نصیر احمد عزیزی۔

تعلیمی لیاقت: منشی، مولوی، عالم، فاضل ادب، فاضل دینیات، کامل عربی، کامل فارسی، مدرسہ تعلیمی بورڈ لکھنؤ، یوپی۔
عالمیت، قراءت، فضیلت، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی۔ ادیب ماہر، ادیب کامل، جامعہ اردو، علی گڑھ۔

اسانید: سند عالمیت، سند فضیلت، سند قراءت۔
سند حدیث از علامہ فروغ احمد اعظمیؔ بروایت بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ، سند دیگر علوم اسلامیہ از فروغ احمد اعظمی بروایت شرف ملت علامہ عبد الحکیم شرف قادری، پاکستان۔

بیعت: خطیب البراہین، حضرت علامہ الشاہ صوفی محمد نظام الدین علیہ الرحمہ۔

خلافت: شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی کچھوچھوی مدظلہ العالی۔

اعزازات: علیمیؔ ایوارڈ (چار مرتبہ)، سند توصیف از امین ملت ڈاکٹر سید محمد امین میاں مارہروی، بموقع خطاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سند امتیاز از علامہ سید محمد اسید الحق قادری بدایوں شریف بموقع مسابقہ حدیث بدایوں شریف۔

تدریسی خدمات: فراغت کے بعد سے تا حال: دارالعلوم علیمیہ رنسواں جمدا شاہی بستی۔

مناصب: ممبر علیمی دارالافتا بورڈ (علیمیہ جمدا شاہی)، نائب صدر رویتِ ہلال کمیٹی بلرام پور، چیف ایڈیٹر سہ ماہی ''ضیائے علیم'' جمدا شاہی، **سرپرست** جامعہ ام الخیر نسواں، نصیب گنج بستی، **جنرل سکریٹری** مدرسہ اہل سنت، پیڑا، بستی، **نگراں** مدرسہ عارف العلوم رام نگر، **جنرل سکریٹری** تنظیم ابنائے علیمیہ، متعدد تنظیموں اور رفاہی اداروں کی نگرانی و سرپرستی۔

علمی و قلمی حصولیابیاں: ☆ مبلغ اسلام نمبر کی ترتیب (مطبوع) ☆ فتح المبین در رد غیر مقلدین کی تخریج و اشاعت ☆ تاج الشریعہ نمبر، مجموعہ مقالات طلبہ علیمیہ کی ترتیب و تصحیح (مطبوع) ☆ خطیب البراہین نمبر کی اشاعت میں حصہ داری (مطبوع) ☆ اسلام سمجھو اور سمجھاؤ (مطبوع) ☆ قواعد عربی از علامہ محمد ایوب شریف القادری کی تحقیق و تخریج و تحشیہ (مطبوع) ☆ شرح ہدایۃ النحواز علامہ موصوف کی تحقیق، تخریج و تحشیہ (مطبوع) ☆ حیات شریف العلما (مطبوع) ☆ شیخ القرآن، حیات و خدمات (مطبوع) ☆ مقالات شیخ القرآن (مطبوع) ☆ تحفہ رفاعیہ (مطبوع) ☆ معمار ملت حیات و خدمات (مطبوع) ☆ عقائد اہل سنت (غیر مطبوع) ☆ الخواطر، عربی مقالات کا مجموعہ (غیر مطبوع) ☆ مقالات علیمی، تین درجن سے زاید مقالات کا مجموعہ (غیر مطبوع) ☆ تجزیات، متعدد کتب پر لکھے گئے تبصروں کا مجموعہ (غیر مطبوع) ☆ قلادۃ الجواہر کا ترجمہ (غیر مطبوع) ☆ اصول الدعوۃ کی کچھ بحثوں کا ترجمہ (غیر مطبوع) ☆ حدوث الفتن کی کچھ بحثوں کا ترجمہ (غیر مطبوع) ☆ شمس العلما نمبر (زیر ترتیب) ☆ تفسیر ایوبی از علامہ محمد ایوب شریف القادری (مطبوع) ☆ حیات شریف العلما حصہ دوم وسوم (مطبوع) ☆ تدوین قرآن پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ

علاوہ ازیں بہت سارے مجلّات ورسائل کی مجلس ادارت ومشاورت میں شمولیت۔ مبلغ اسلام سیمینار علیمیہ جمدا شاہی، سید العلما سیمینار مارہرہ شریف، فکر وتدبیر کانفرنس، مارہرہ شریف، بحر العلوم فرنگی محلی سیمینار، مشائخ چشت سیمینار، شیخ عبد الحق محدث دہلوی سیمینار، انوارِ قرآن سیمینار زیر انتظام خانقاہ قادریہ ایوبیہ پیرا کنک، کشی نگر اور متعدد سمپوزیم میں شرکت۔

خراج عقیدت

اس عظیم علمی کاوش کو مرتب کتاب کی اجازت سے ہم سبھی برادران سب سے پہلے سلطان الاساتذہ، شیخ القرآن حضرت علامہ عبد اللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ کی خدمت میں نذر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب کو حضرت کے روحانی فیضان سے مالا مال فرمائے۔ پھر اس کتاب کے ذریعے ہم سب خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اپنے والدین کریمین کی خدمت میں جن کے وجود سے ہمیں وجود ملا، جن کی دعائے نیم شبی سے ہم سب خدمت دین کے لائق ہوئے، جن کی عنایات کے طفیل آج ہم سب برادران خوش حال زندگی گزار رہے ہیں اور حسب استطاعت خلق خدا کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہیں۔ کتاب مندرجہ ذیل محسنین کی بارگاہوں میں بطور خراج عقیدت پیش ہے۔

۱۔ شیخ القرآن حضرت علامہ عبد اللہ خان عزیزی علیہ الرحمہ

(ولادت ۱۵ نومبر ۱۹۳۵ء، وفات ۱۷ جولائی ۲۰۱۱ء)

۲۔ مرحومہ محسن نجیب النسا اہلیہ محترمہ حضور شیخ القرآن علیہ الرحمہ

(ولادت ۲۰ جون ۱۹۴۲ء، ۱۰ مارچ ۱۹۱۸ء)

۳۔ والد ماجد الحاج معین الدین خان مرحوم

(۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء، وفات ۲۴ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

۴۔ والدہ ماجدہ محسن زلیخا خاتون مرحومہ مغفورہ

(۱۰ اگست ۱۹۴۷ء، وفات ۲۹ جون ۲۰۱۵ء)

اللہ جل شانہ ہمارے ان پیاروں پر کرم فرمائے اور اس کتاب کو ان کے لیے سامان بخشش بنائے۔

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہرباری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

من جانب:

الحاج وصی الدین خان نورانی، الحاج بشیر الدین نورانی
الحاج شمس الدین برکاتی، الحاج شہنشاہ حسین برکاتی
و جملہ اہل خانہ جمد اشاہی بستی

MUBALLIGHE ISLAM RESEARCH CENTRE
Jamdashahi, Basti